خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

دسمبر 2011

نگران اعلیٰ
معراج رسول

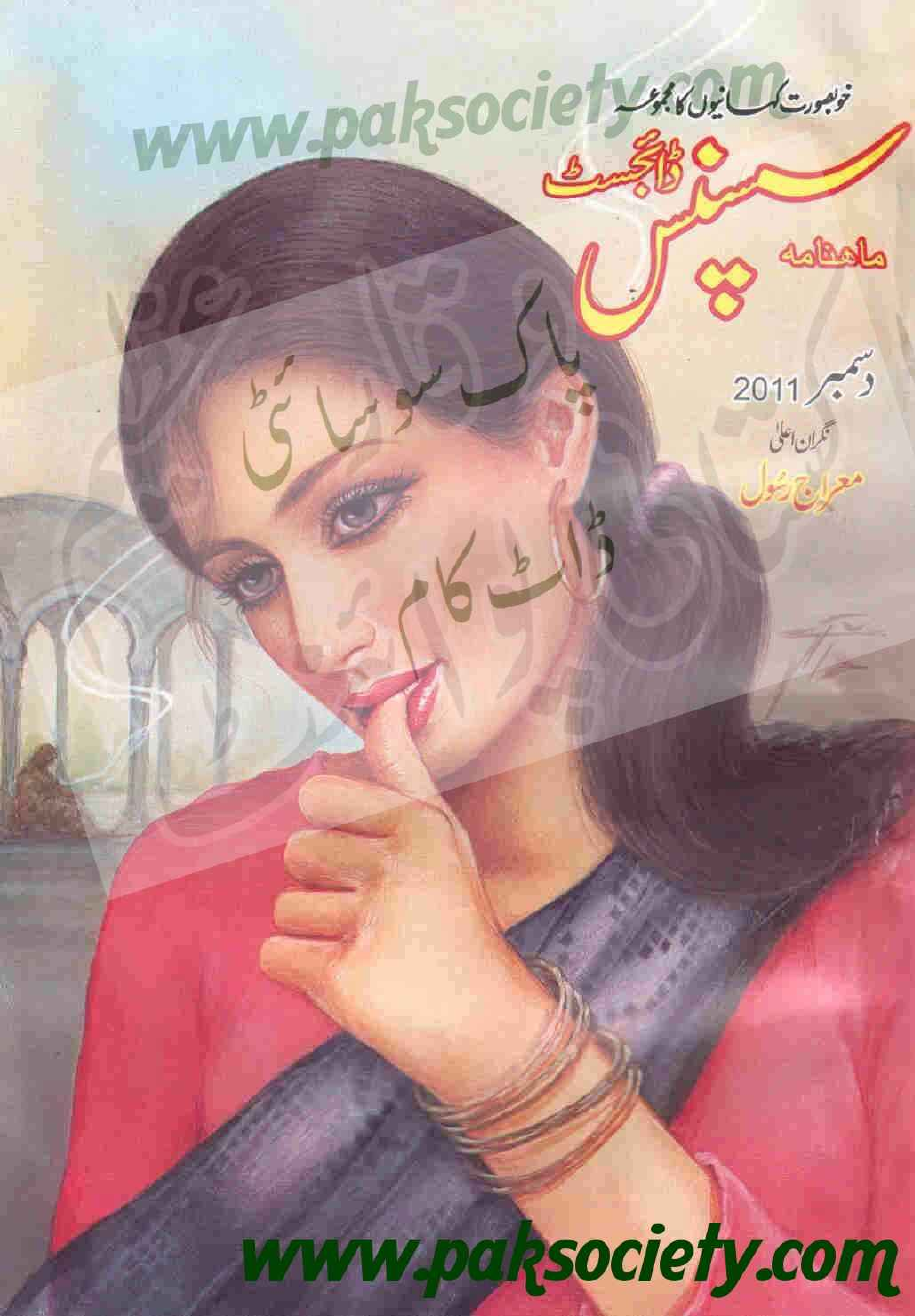

www.paksociety.com
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

سسپنس ڈائجسٹ

مدیرِ اعلیٰ: عذرا رسول

انشائیہ — جون ایلیا — 11
حیوانِ ناطق کو خواب سے جگانے کی اجازت دیتے ہوئے جون ایلیا کا اندازِ بیان۔ ایک فکر انگیز تحریر

آپ کے خط — مدیرِ اعلیٰ — 12
سسپنس کی محفل میں شامل قارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پُرخلوص مشورے

جنگ آزما — ڈاکٹر ساجد امجد — 20
ماضی کا آئینہ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت آثار واقعات

کرشمۂ قدرت — کاشف زبیر — 51
"انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا" کی منہ بولتی تصویر

اغوا پیکج — سلیم انور — 61
لرزہ خیز لمحات..... پل پل بدلتے حالات پر مشتمل نتیجہ خیز تحریر

کشکول — انوار صدیقی — 66
اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

آخری امید — تنویر ریاض — 101
فریبِ محبت میں مبتلا ایک معصوم انسان کی خوش گمانیاں

فتنہ گر — ملک صفدر حیات — 110
ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کا فرسودہ انداز

چور کو پڑ گئے مور — شمع خانم — 139
حرص و طمع کے ہاتھوں تماشا بننے والے چند بیوپاریوں کا احوال

محفلِ شعر و سخن — قارئین — 148
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ، آپ کی پسند آپ کے ذوق کے ہم آہنگ

رہنمائی — منظر امام — 151
بے روزگاری کے اندھیروں میں امید کی کرن تلاشنے والوں کا قصہ

جلاد مسیحا — ڈاکٹر عبدالرب بھٹی — 157
رستوں کے انتخاب میں منزل کا پتا کھو دینے والوں کی روداد

اناڑی — 168
حالات کی سنگینی اور دریاؤں کی روانی، کھلاڑیوں جیسا ایک اناڑی کی کتھا

اپنے دام میں — مریم کے خان — 203
میں نہ مانوں ہار..... کی تفسیر اور تعزیر کا دلچسپ منظر نامہ

حضرت حزقیل علیہ السلام — رضوانہ ساجد — 213
حضرت یرمیاہ علیہ السلام کے پیروکار ایک اور نبی کا احوال

ناممکن چوری — عبدالقیوم شاد — 223
فتح و شکست کی جنگ میں عقل کے گھوڑے دوڑانے والوں کا ماجرا

جنت — ناصر ملک — 230
دنیا سے بیزار اور کچھ الگ سا کر گزرنے کی دھن میں مگن عجیب انسانوں کی عجیب داستان

کترنیں — ادارہ — 000
دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے، چٹکلے، انتخابات، سرخیاں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

CPNE — MEMBER APNS

جلد 40 • شمارہ 12 • دسمبر 2011 • زرِ سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

گزشتہ نمبر کی بھرپور پذیرائی اور قارئین کے اصرار پر

ماہنامہ سرگزشت

پراسراریت نمبر II

نئے سال کا نیا رنگ - خاص نمبر خاص شمارہ

ہر کہانی خاص کہانی، ہر واقعہ یاد رہ جانے والا
ہر تحریر اس معیار کی جو سرگزشت کا خاصہ ہے
ایسے حیران کن واقعات جو عقل کو ماؤف کر دیں
جن کا کوئی جواز ہو یا نہ ہو مگر جو زندگی کی اٹل حقیقتیں ہوں
سحر زدہ کر دینے والی پراسرار، انوکھی اور محیر العقول سچ بیانیاں
سچے قصے، تاریخی شواہد

ایسا خاص شمارہ جو صرف ماہنامہ سرگزشت ہی پیش کرسکتا ہے
آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنی کاپی محفوظ کرالیں

جنتِ ارضی

جون ایلیا

میرا خیال ہے کہ چیل کوّے، چڑیاں، سانپ، بچھو، نیولے، کن سلائیاں، گلہریاں، تتیے، بھڑیں، مچھر، مچھلیاں، کچھوے، گائے بیل، کتے، شیر اور ہاتھی...... اور شاید بندر اور لنگور بھی خواب نہیں دیکھتے۔ یہاں خواب سے خواب کا ایک خاص مفہوم اور ''دماغ'' کا ایک خاص عمل مراد ہے۔

منطق نے انسان کو ''حیوانِ ناطق'' کے خطاب سے نوازا ہے اور میں اسے ''خواب دیکھنے والا جاندار'' قرار دینے کی خواہش رکھتا ہوں۔ یہاں میں یہ بات دہرادوں کہ خواب سے ''دماغ'' کا ایک خاص عمل مراد ہے۔ میں نے ''ذہن'' کے بجائے دماغ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے جس کا بیان کرنا اس موقع پر غیر ضروری ہے۔ بہر حال خواب کے عام مفہوم کے مطابق انسان کے علاوہ بہت سے دوسرے جاندار بھی خواب دیکھ سکتے ہیں مگر دماغ کے ایک خاص عمل کے مفہوم کی رو سے صرف انسان ہی خواب دیکھتا ہے اور اس کی یہ خصوصیت اس کی بے حد اہم فضیلت ہے۔

اس خصوصیت کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب ہے، بد سے بہتر اور بہتر سے بہترین کی خواہش۔ میں یہ بات فرض کرنے کی ادنیٰ اہلیت بھی نہیں رکھتا کہ ہرن، نیل گائیں اور پاڑے ایک ایسے جنگل کا خواب دیکھ سکتے ہوں گے جہاں وہ شیر اور چیتے کی خوں خواری سے محفوظ رہ سکیں یا چھوٹی مچھلیاں ایک ایسے سمندر کو تلاش کرنے کی تحریک چلاسکتی ہوں گی جس میں وہ بڑی مچھلیوں کے ''سامراج'' سے چھٹکارا پاسکیں۔

تو ہے یوں کہ جانداروں میں صرف انسان ہی وہ جاندار ہے جو خواب دیکھتا ہے اور خواب دیکھنے کی جزا یا سزا پاتا ہے۔ انسانوں میں جو انسان سب سے زیادہ پرمایہ اور دراز سایہ خواب دیکھتے اور دکھاتے ہیں وہ حکیم، فلسفی اور شاعر کہلاتے ہیں۔ اگر انسانوں کے علاوہ دوسرے جاندار بھی خواب دیکھ سکتے تو ان میں بھی حکیم، فلسفی اور شاعر پیدا ہوتے۔

ڈینوسار کی نسل تو فنا ہوگئی لیکن ہاتھی اپنے حجم اور ضخامت کے اعتبار سے اس امر کا حقدار ہے کہ وہ دوسرے جانوروں کے سامنے یہ اعلان کرتا کہ میں تمہاری فلاح اور بہبود چاہتا ہوں اور تمہیں نجات کی راہ دکھانے آیا ہوں۔

لیکن میری معلومات کے مطابق کسی بھی مغربی، افریقائی اور مشرقی ہاتھی نے کسی بھی دور میں اپنی حاکمیت اعلان نہیں کیا اور یہ کہ انہیں بد سے ''بہتر'' اور بہتر سے ''بہترین'' کی امید نہیں دلائی۔

ہاں تو خواب دیکھنے اور دکھانے کی بات ہو رہی تھی اور عرض کیا گیا تھا کہ خواب دیکھنا انسان کی بے حد اہم فضیلت ہے (یا شاید سب سے بڑی فضیلت ہے) اگر کوئی انسان یا انسانوں کا کوئی گروہ خواب دیکھنے کی اہلیت سے محروم ہو تو اس پر فاتحہ پڑھ لینی چاہیے۔

انسانیت کی ساری سرگزشت اور تہذیب کی ساری روداد دراصل خواب دیکھنے اور خواب دکھانے والوں کی ماجرا طلبی اور ماجرا سازی کی سرگزشت اور روداد ہے۔ خواب انسانیت کا سب سے زیادہ قیمتی اندوختہ اور سرمایہ ہیں۔ اگر یہ اندوختہ اور سرمایہ نہ ہوتا تو انسان ''نساسوں'' قسم کی کوئی ''شے'' ہوتا اور وہ آج بھی اسی حالت اور ہیت میں پایا جاتا جس حالت اور ہیئت میں آج سے لاکھوں برس پہلے پایا جاتا ہوگا۔

جو لوگ اپنے اور اپنی نوع کے دوسرے لوگوں کے لیے خواب نہیں دیکھتے، وہ نیم انسان ہوتے ہیں۔ خواب دیکھنا اپنے میں اپنے آپ سے آگے ہوتا ہے۔ جو شخص یا جو معاشرہ خواب دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا وہ اپنے آپ میں اپنے سے پیچھے ہوتا ہے یا کم سے کم وہیں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے اور وہیں کا وہیں رہتا ہے اور اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے۔

آپ کے خط

عزیز قارئین!

تسلیمات

دن رات کے اس مسلسل سفر میں لپیٹے جناب زندگی کا ایک اور سال تمام ہوا...... دسمبر 2011ء کا آخری شمارہ...... جاتے لمحوں کی سوغات بن کر آپ کے ہاتھوں میں ہے... اگرچہ یہ لحہ جاتے والے سال کے کھو جانے کا تکلیف دہ احساس تو دے رہا ہے مگر آنے والے لمحوں میں پنہاں نئے خوابوں کی بُنت کا اشارہ بھی دے رہا ہے۔ ملنے اور بچھڑنے کے اس سنگم پر چاہے دن رات کی بات کی جائے یا زمین و آسمان کی...... جانے اور آنے والے دنوں کا یہ سفر صرف ایک لمحے پر منحصر ہوتا ہے اسی لیے دل کہتا ہے...... وقت کا دریا سمجھاتا ہے...... کب لوٹ کے لمحہ آتا ہے...... اسی فلسفے میں کامیابی کا راز اور اسی میں ناکامی کی وجوہات پوشیدہ ہیں۔ بہرحال بات آگے بڑھاتے ہیں، سب سے پہلے تو حجاج کرام کو بے حد مبارکباد جنہیں خانہ کعبہ کا دیدار نصیب ہوا کہ جس کی حدود میں کالا گورا، بادشاہ فقیر سب ایک ہی لباس میں ملبوس اس کے دربار میں حاضر تھے۔ جہاں انفرادیت اور برتری اگر کسی نے پائی تو اپنی نیتوں اور اعمال کی بنیاد پر...... ان تمام قارئین کو بھی مبارکباد جنہوں نے اس سال قربانی کا فرض...... اور اپنے اردگرد حقداروں کا حق ادا کرتے ہوئے دعاؤں کے نادر تحائف وصول کیے۔ عیدِ قرباں کیا ہے...... یہ سنت ہے ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ کے جدِ امجد حضرت اسماعیل علیہ السلام ذبیح اللہ کی جو، اسلامی سال کے آخری مہینے میں ادا کی جاتی ہے۔ قربانی کے اسی جذبے کو زندہ رکھتے ہوئے آپؐ کے پیارے نواسے حضرت امام حسینؓ نے بھی کربلا کے میدان میں جامِ شہادت نوش کیا...... قربانی کا یہی جذبہ اقوامِ عالم کی ترقی اور بقا کا ضامن ہے، مگر جس معاشرے میں انصاف کا بول بالا اور قانون کی بالادستی نہ ہو وہاں افراتفری عام ہوتی ہے۔ جس کی مثال آج بھی ہمارے یہاں کاروکاری اور وَنی جیسی جاہلانہ اور قبیح رسوم ہیں مگر ان فرسودہ روایات کے خلاف پارلیمنٹ میں قانون سازی کرنے کی کوئی بھی اخلاقی جرأت نہ کر سکا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے وقت...... اپنے رشتوں اور اپنے حقوق و فرائض کے ادراک اور ادا کرنے کی سمجھ بوجھ عطا فرمائے آمین۔ ارے رے جانے سے پہلے ایک اور اہم بات تو رہ ہی گئی...... عیدِ قرباں تو گزر گئی مگر دسمبر کی 25 تاریخ بھی مسیحی برادری کے لیے ایک خوش گوار احساس لاتی ہے۔ ہماری جانب سے کرسمس کی ڈھیروں مبارکباد اور ساتھ ہی اہالیانِ وطن کو اپنے قائد کی سالگرہ بھی مبارک ہو اور اب چلتے ہیں جناب اپنی چہکتی محفل کی جانب، جہاں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی۔

✠ **بلیک کیٹ**، رشید آباد سے لکھتی ہیں "طویل غیر حاضری کے بعد کالی بلی بالا گزیلوں کا رستہ کاٹنے کے لیے پھر سے حاضر ہے۔ (یہ آپ خود کہہ رہی ہیں، ہم نہیں...... بہرحال خوش آمدید) امید ہے کہ کچھ پرانے دوست مجھے ابھی تک بھولے نہیں ہوں گے۔ اگر بھول گئے ہیں تو بھی کوئی بات نہیں، مابدولت ایسی باتوں کو دل پر نہیں لیتے (کیوں؟) سب سے پہلے ذکر کیا جائے ٹائٹل کا جس نے ہماری محفل کے اکثر ممبران کے دل پر ایٹم بم گرا دیے ہوں گے۔ غزالی آنکھیں، حسین بال، معصوم چہرہ، مہندی لگے ہاتھ۔ اے پرفیکٹ گرل۔ ہاں ایک بات ہمیں کچھ بھائی نہیں۔ وہ دی پرفیکٹ گرل کی پرفیکٹ ساڑی تھی۔ ہمارے الیکٹرک میڈیا کی طرح اب پرنٹ میڈیا پر بھی انڈین کلچر کی چھاپ نظر آنے لگی ہے۔ اپنی محفل میں جا پہنچے تو کرسی صدارت پر قاضی قیصر شہزاد کو براجمان دیکھا۔ پچھلی بار بھی ایسے ہی ایک لنگور اس شاخ پر لٹکے نظر آئے تھے۔ انکل جی! کیا آپ نے تہیہ کر لیا ہے کہ صنفِ نازک کو اس کرسی پر نہیں بیٹھنے دینا؟ قاضی صاحب، جب آپ کی کسی حسینہ سے ملاقات سے دو منٹ پہلے اس کے والد صاحب تشریف لے آتے ہیں تب آپ کی شکل پر بھی ایسی ہی اداسی ہوتی ہے نا؟ انکل جی تجربہ بول رہا ہے قاضی صاحب کا! سمجھا کریں نا! ماہا ایمان کا تبصرہ بہت جامع تھا۔ اشتیاق احمد نے پورے سسپنس کا جوس نکال کر رکھ دیا تبصرے میں۔ بھائی صاحب آپ گنے کے رس کا ٹھیلا تو نہیں لگاتے ہیں؟ سید شکیل آپ کو تفسیر عباس سے ادھار تو نہیں مانگنا جو اس قدر کثیر مقدار میں مکھن لگایا جا رہا ہے؟ تفسیر عباس بہت مبارک ہو بیٹے کی پیدائش خدا اسے لمبی زندگی دے۔ ایسے دعوت فکر آپ کو بھی ملتی ہے۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ کو اس کام سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا ہے جس میں دماغ کا استعمال کرنا پڑتا ہو۔ محسن علی موم بتی صاحب موم آپ کا تخلص ہے یا خصوصیت...... روشنی سے محفل کو اندھیرا کر دیا ہے آپ نے۔ کیونکہ آپ کالی موم ہیں اور بلیک لائٹ دیتے ہیں۔ آپ اسٹیلو کیوں استعمال نہیں کرتے...... اپنا راز کیوں بتا رہی ہیں۔ سب کے سامنے بھانڈا پھوڑ دیا) ہمایوں سعید راج! واہ جی واہ آپ کا تبصرہ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ اللہ...... آپ جیسی عقلِ سلیم عطا کرے آمین۔ ویسے آپ کے منہ سے اقوالِ زریں نہیں جھڑتے۔ اتفاقاً ہی قلم سے جھڑ گئے ہیں۔ شاید کسی قانون کا استعمال کیا ہے آپ نے (آپ کو کیسے پتا چلا) فیضان غنی صاحب ایمپائر والی کہانی سے ایک بات اور بھی عیاں تھی کہ مردوں میں...... پائے جاتے ہیں (آپ کو کیسے پتا) شاہانہ انداز لیے شارقہ سلجوق کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ خدا کرے زورِ بیاں اور زیادہ...... آپ کی نظر کمزور ہے یا دماغ ناتواں ہے بھائی صاحب آپ نے اپنے خط کی شمولیت کو ہی غنیمت سمجھا۔ بھائی اور بھی لوگ ہیں محفل میں...... کر لیتا ہے بندہ! آخر پورے ایک ماہ بعد ملاقات ہوتی ہے۔ یوسف مرزا، حکیم رضا مختصر تبصرہ کر کے بغیر کسی سے چھیڑ چھاڑ کیے چلے...... تھوڑی سی بہادری پیدا کریں خود میں۔ جاوید بلوچ آپ ممتاز مفتی والے علی پور میں رہتے ہیں؟ راجا ثابت کیسے ہیں آپ۔ بڑھاپے کے اثرات آپ...... میں بھی آنا شروع ہو گئے۔ حاجی اے حکیم پہلی بر تھ ڈے انکل! قدرت اللہ نیازی آپ کو لڑکی کے پیچھے کھڑا ہوا اس کا بھائی نظر آ گیا ہو گا...... آپ پتلی گلی سے نکل گئے، ورنہ ہمایوں کے لیے اتنی بڑی قربانی آپ ہرگز نہ دیتے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سسپنس کا معیار اس ماہ کے رسالے میں اپنے درجے سے کافی حد تک...... تھا۔ نظارت نصر کی بیٹی شاہد میں جانوروں کی معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا بندہ بھی نقائص نکال سکتا ہے۔ یہ آوارہ گرد ہیں، اسٹیوی کے پاس بیٹی کو قتل کرنے کا کیا جواز تھا؟ قانونی زبان میں "کاز آف ایکشن" کے سلسلے میں کہانی بالکل خاموش تھی۔ جنت میں ناصر ملک صاحب نے نواب صاحب کے طرزِ عمل کی نقل

اتارنے کی انتہائی ناکام کوشش کی ہے۔ بے ربط جملے، زندگی کے حقائق کو جھٹلاتے واقعات، کہانی کے کمزور پلاٹ پر رائٹر کی کمزور گرفت سے سخت ...... ہوئے۔ سوئے دار کو شاید علامتی انداز میں لکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ جس میں مصنف کو خاطر خواہ ناکامی ہوئی ہے تاہم مرکزی خیال اچھا تھا۔ ...کی محبت کی عکاسی کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن کہانی پر رائٹر کی گرفت کمزور رہی۔ محفلِ شعر و سخن میں بھی کوئی شعر پسند نہ آیا۔ محبت زبردست البتہ اچھی کہانی تھی موت کے خوف کے باوجود لارنس نے اپنی محبوبہ کے ساتھ دھوکا کرنا پسند نہ کیا۔ یہ الگ بات کہ اس کی محبوبہ کے لیے وہ ایک ٹائم پاس ہی تھا۔ زرم چارا میں بیگ صاحب وکلا حضرات کے شکوے شکایات جابجا کرتے نظر آئے۔ بیگ صاحب بار میں جہاں مخالفت ہوتی ہے وہاں حمایت بھی ہوتی ہے۔ آپ بار کے الیکشن میں حساب برابر کر لیجیے گا۔ تلاش میں کاشف زبیر نے بہت مایوس کیا۔ بے چارہ اگر پیسے لے لیتا تھوڑی دیر اور زندہ رہ کے۔ ویسے ایک مشہور اردو افسانے کا چربہ تھا لیکن لفاظی اور پلاٹ میں تھوڑی سی تبدیلی سے حالات کچھ بہتر ہو گئے تھے۔ کندہم جنس، منظر امام کی ہمیشہ کی طرح بہت خوبصورت تحریر تھی۔ کالے راستے ایم اے راحت کے بڑے نام کے ساتھ ایک چھوٹی کہانی تھی جو متاثر کرنے میں ناکام رہی۔" (لو جی بلیک کیٹ نے آتے ہی سب کی دھجیاں اڑا دیں۔ ہمیں ان کے تبصرے میں کچھ پسند آئے یا نہ آئے لیکن انداز پسند آیا۔ باقی محفل کے ساتھی جانیں اور بلیک کیٹ۔ ہم تو میزبان ہیں اور مہمانوں کی عزت ہمارا فرض ہے)

✠ **حکیم سید محمد رضا شاہ**، تورنگہ میانوالی سے محفل میں تشریف لائے ہیں "سسپنس ملا، بے حد خوشی ہوئی۔ آپ کے خطوط میں جناب شکیل حسین کاظمی، تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ اور محمد قدرت اللہ نیازی آف خانیوال کے تبصروں پر خوشی ہوئی کہ خاکسار کو ان اصحاب نے اپنے خطوط میں یاد رکھا۔ جناب الیاس سیتاپوری مرحوم و مغفور کے بعد ڈاکٹر ساجد امجد صاحب تاریخی کہانیوں میں گزشتہ تاریخ کو دہراتے رہتے ہیں اور اس مرتبہ فرید خان عرف شیر شاہ سوری افغان بادشاہ کی زندگی کے متعلق معلومات کا ذخیرہ لائے ہیں۔ تاریخ کے مورخ کہتے ہیں کہ شیر شاہ سوری کے پانچ سال (عرصۂ حکمرانی) عظیم مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے پچاس سال پر بھاری ہیں۔ ایم اے راحت کی کالے راستے عمدہ تحریر ہے۔ کیا ایم اے راحت وہی پرانے ادیب ہیں جن کا شہرہ ہر سو ہے؟ (جی بالکل) انوار صدیقی کی کشکول ایک بہتر طویل سلسلہ ثابت ہوگا۔ لیاقت حسین کی پراسرار صلاحیت برائیوں کے خلاف استعمال ہوگی۔ منظر امام صاحب کی کندہم جنس ایک خوبصورت اور ہلکی پھلکی تحریر ہے اور مخصوص حالات کی عکاسی کرتی ہے۔ کاشف زبیر کی تلاش میں سراغ رساں صاحب کو انجام کار جارج کیمٹ کی بازیابی کے بعد غیر معمولی صورتِ حال سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ مرزا امجد بیگ کی کہانیاں قاری کے لیے ایک درس کا درجہ رکھتی ہیں۔ جس میں زرم چارا بھی شامل ہے۔ دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے والے خود اس میں گرتے ہیں۔ عینی شاہد ایک بے زبان پرندے کی قتل میں گواہی ایک لاجواب تحریر ہے۔ ناحق قتل کسی صورت میں چھپتا نہیں ہے۔ اناڑی میں نواب صاحب چوکھی جنگ لڑ رہے ہیں۔ امید ہے آخر میں نور صاحبہ نواب صاحب کو دستیاب ہو جائیں گی۔ ثمر عباس کی سوئے دار میں سیماب صاحبہ کو دانش صاحب کی سوئی ہوئی محبت کو قبول کر لینا چاہیے تھا کیونکہ یہ ایک عمدہ کہانی کا انجام ہوتا۔ انبیا کے واقعات میں حضرت حزقیلؑ کی کہانی صبر و شکر کا درس دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی اصلاح کے لیے متواتر انبیائے کرام کو دنیا میں بھیجا۔ تنویر عباس کی آوارہ گرد کا انجام پڑھ کر جیسے کو تیسا کی مثال یاد آتی ہے۔ مریم کے خان کی محبت زبردست میں مافیا کی چپقلش کا حال عمدہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ ناصر ملک کی طویل کہانی جنت کی دوسری قسط کا انتظار رہے گا۔ انسان ایک سماجی جانور ہے۔ انسان معاشرے سے قطعی لاتعلق ہو کر نہیں رہ سکتا ہے۔ آخر کار پروفیسر وسیم بزدار کو بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا اور خاص کر سموں کو ڈوبنے سے بچانے میں یہی کردار مستعمل ہے۔ کہانی لطیف پیرائے میں عمدہ کاوش ہے۔" (تبصرے کا شکریہ)

✠ **سعدیہ بخاری**، اٹک سے چلی آ رہی ہیں "کافی عرصے بعد حاضری دے رہی ہوں اس لیے امید کرتی ہوں کہ آپ اور سب دوست ویلکم کریں گے (خوش آمدید) نومبر کا سسپنس 19 تاریخ کو ملا۔ ویلڈن ذاکر انکل آپ نے تو پچھلے شمارے کی کسر بھی پوری کر دی ہماری تو عید سے پہلے عید ہو گئی، نیلی آنکھوں، سنہری زلفوں والی، چہرے پر معصومیت لیے، ساڑی باندھے حسینہ لگتا ہے قربانی کے گوشت کا انتظار کر رہی ہے۔ انشائیہ میں جو یونانی خدوخال، لمبے بالوں والا انشیان ہے یہ جون ایلیا خود ہیں نا؟ حسبِ روایت اداس کر دینے والی باتیں، وہ تو ہمیشہ ناخوش رہے لیکن ہماری قسمت بھی شاید ان سے ملتی جلتی ہے خوشی مختصر عرصے کے لیے آتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔ ہمارا المیہ تو المیہ ہے یہاں دو فریق ایک دوسرے کی بات کو Own نہیں کرتے۔ انہی سوچوں کے ساتھ اپنی کھٹی میٹھی محفل میں قدم رکھا تو خط کے ابتدائیہ نے پھر اداس کر دیا۔ کیا کہیے کہ جب رہنما ہی رہزن بن جائیں تو ...سیاست ہی کیا ہر شعبۂ زندگی کی حالت ایسی ہو جاتی ہے، ہمارے الیکٹرونک میڈیا کو دیکھ لیں، سرکاری اداروں، تعلیم، مذہبی رہنماؤں کو دیکھ لیں ...اپنے اپنے مفاد میں لگے ہیں۔ اپنے بحالی موڈ کے لیے جلدی سے خطوط کی طرف متوجہ ہوئے۔ قاضی قیصر صاحب مبارک باد صدارت کی آپ کی ...کافی عرصے بعد حاضری دے رہی ہوں، اچھا ہے ناخوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے پرانے دو۔ (بہت خوب) ماہا ایمان زبردست، ...بلکہ چھکے لگائے ہیں بلکہ چھڑائے ہیں، آپ فکر ہی نہ کرو اب ایک تفسیر عباس ہی کیا سب اپنی اپنی چونچیں اپنے پروں میں چھپا لیں ...فلو کا خطرہ ہے بلکہ "برڈ فلو" کا۔ (کیا مطلب ہے بھئی) ہمایوں سعید آپ اپنی حاجن صاحبہ کی تلاش کا کام اپنی والدہ کو ...اور نہیں کھولا۔ طاہرہ یاسمین آپ کو پتا ہے اللہ میاں کی گائے کسے کہتے ہیں؟ تمام دوستوں کے تبصرے اچھے اور معیاری تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے پڑھی جنت۔ اسٹارٹ میں تو لگا کہ کہانی کچھ خاص نہیں لیکن جنت (بحری بیڑا) اینڈ پروفیسر کے کردار نے کہانی کو خاص رنگ ...دریا کو ...کرتا ہے، دریا کے متعلق کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ مرزا امجد بیگ کی زرم چارا نے لاسٹ تک سسپنس کری ایٹ کیے رکھا ٹیلسن کے بیان تک تو یوں لگ رہا تھا کہ قاتل وہ ہی ہے اور یہ پیشہ ورانہ رقابت ہے پھر جوزف کا

ذکر آیا تو لگا کے یہ محبوبانہ رقابت ہے، آخر میں معلوم ہوا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ بیچارہ مورس بھینٹ چڑھ گیا۔ کہانی کا انجام غیر متوقع تھا۔ تاریخی کہانی میں ہمایوں کے بعد شیر شاہ سوری سے متعلق تاریخی واقعات اور حالات زندگی نہایت عمدہ طریقے سے پیش کیے گئے۔ پہلی بار شیر شاہ سوری سے متعلق تاریخ پڑھی اب سے پہلے صرف نام ہی سنا تھا۔ یہ اچھا سلسلہ ہے پلیز ایسے تاریخی کردار بھی سامنے لائے جائیں جن پر آج سے پہلے نہیں لکھا گیا۔ اناڑی اور کشکول سلسلہ وار کہانیوں کا ٹیمپو اس بار تیز رہا۔ واقعات تیزی سے اور دلچسپی سے آگے بڑھتے رہے، بوریت محسوس نہیں ہوئی۔ ایم اے راحت اینڈ منظر امام ہمارے موسٹ فیورٹ رائٹرز ہیں۔ کالے راستے اور کند ہم جنس دونوں ہماری معاشرتی خرابیوں کی داستان جس کے ہم اجتماعی طور پر ذمے دار ہیں۔ کالے راستے میں نبیلہ کو اس طرح جمال پر اندھا اعتماد نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کند ہم جنس میں جس طرح سسر اور داماد نے بھیک کے پیشے کو مستقل جاری رکھنے کا فیصلہ کیا وہ حیران کن تھا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ آج کل اس پیشے میں جو فراڈ ہو رہا ہے (بھکاریوں کو) کو دیکھتے ہوئے کچھ ایسا عجب بھی نہیں لگتا۔ (ہماری تو سب کے لیے یہی دعا ہے کہ اے اللہ جو ہاتھ تیرے حضور پھیلتے ہیں انہیں بندوں کے آگے پھیلنے سے بچا۔ آمین) مغرب سے تلاش کا انجام افسوس ناک تھا، جارج جیسے لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں جو اپنی موت کے بعد بھی بہت سے سوالات چھوڑ جاتے ہیں اور کائل بیورگ جیسے ایماندار بھی۔ اشعار میں تمام اشعار ہی عمدہ ہیں سب کو مبارک باد۔ بھئی قارئین سسپنس کا انتخاب اور معیار ہے ہی اعلیٰ چاہے خط ہوں یا اشعار (بہت شکریہ) اور ہاں سب کو عید کی بہت بہت مبارک باد۔"

✠ **محمد قدرت اللہ خان نیازی**، حکیم ٹاؤن، خانیوال سے محفل میں تشریف لائے ہیں "میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرا خط میرے نمبر کے ساتھ شائع کیا۔ (سب کی جانب سے آپ کی محبت کا شکریہ) نومبر کا شمارہ غیر متوقع طور پر 17 اکتوبر کو ہی موصول ہوگیا۔ (واہ بھئی واہ) سرورق بلاشبہ اس بار ایک شاہکار تھا عید کی مناسبت سے حسینہ نے تیاری کی ہوئی تھی۔ ذاکر انکل ویلڈن آپ کا Taste بہت اچھا ہو رہا ہے، لگتا ہے کہ......؟ (اچھا کیا آگے کچھ نہیں لکھا ورنہ ذاکر صاحب آپ کو بتاتے) انشائیہ ہمیشہ کی طرح نصیحت آموز تھا یہ حقیقت ہے کہ ہم واقعی نہ سننے والوں کی طرح سنتے ہیں اور نہ سمجھنے والوں کی طرح سمجھتے ہیں اللہ ہمیں ہدایت عطا فرمائے، آمین۔ اداریہ میں آپ نے ہمارے رہنماؤں کے بارے میں بجا فرمایا۔ اب تو قوم کی یہی صدا ہے کہ ابن مریم ہوا کرے کوئی۔ میرے درد کی دوا کرے کوئی۔ قاضی محمد قیصر صاحب کا [illegible] واپس آئے اور آتے ہی چھا گئے، مبارک ہو جناب آپ نے درست فرمایا کہ ہر قاری کی نظر ماہا اور طاہرہ یاسمین کے خطوط پر ہوتی ہے۔ ماہا [illegible] نظر آئیں۔ ماہا جی! جو کبھی نہیں ہوتا وہ کبھی کبھی ہو بھی جاتا ہے اور یہ بھی خوش فہمی ہے آپ کی کہ آپ کے بغیر محفل پھیکی پھیکی ہوگی۔ [illegible] داستانوں میں۔ (ایسی بات نہیں ہے جناب، سسپنس کے تمام قارئین ایک دوسرے کو بہت خلوص دل سے یاد رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ [illegible] ان کا تذکرہ ہوتا ہے اور انہیں دوبارہ شامل ہونے کی دعوت دی جاتی رہتی ہے) اشتیاق احمد! نور کی گمشدگی سے پریشان نہ ہوں سب اسے [illegible] میں لگے ہوئے ہیں۔ سید شکیل صاحب! حیدر عباس کے تبصرے سے خوشبو ہمیں تو نہیں آئی، آپ نے کیسے سونگھ لی؟ (دل سے دل کو راہ ہوتی ہے [illegible]) تفسیر عباس ہمیشہ کی طرح الفاظ کی جادوگری دکھاتے نظر آئے۔ خوش ہو جائیں طاہرہ یاسمین کہ آپ کی سفارش کی وجہ سے تفسیر عباس [illegible] کو بخش دیا۔ محمد فیضان غنی (ہزارہ) خوش آمدید اور شکر ہے کہ کسی نے ہمارے بلیک لسٹ ہونے کو بھی محسوس کیا۔ شارقہ سلجوق اپنے تن و توش کو نشانہ بنانے پر محمد جاوید بلوچ کو پنجے مارتی نظر آئیں۔ محمد جاوید بلوچ صنف نازک سے کچھ زیادہ ہی نالاں نظر آرہے ہیں۔ حاجی عبدالحکیم صاحب، اللہ آپ کی زوجہ اور ہماری چچی جان کو صحت عطا فرمائے۔ آمین اور ہم معذرت خواہ ہیں اگر ہماری کسی بات سے آپ کی دل آزاری ہوئی ہو تو۔ حسب معمول سب سے پہلے اناڑی پڑھی، بہت سے قاری اناڑی کو "وائنڈ اپ" کرنے کی تجویز دیتے نظر آئے میرے خیال میں تو اس کہانی کو چلنا چاہیے۔ اب لگتا ہے کہ نور کے اغوا کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ کشکول میں کوئی خاص پیش رفت نہ ہوگی۔ راحیلہ اور عثمان کی واپسی اچھی لگی لوچن اور ڈوما وغیرہ کی آمد سنسنی خیز لگ رہی ہے۔ منظر امام کی کند ہم جنس بھیک کے عادی افراد کی کہانی تھی جو حیران کن ثابت ہوئی کہ وہ کتنے مالدار ہوتے ہیں تاہم ایسے لوگوں کی وجہ سے مستحق افراد محروم رہ جاتے ہیں۔ کاشف زبیر کی تلاش غیر یقینی اور افسانہ محسوس ہوئی۔ جارج جو ایک جرائم پیشہ شخص ہے اور معمولی جرائم کرتا ہے وہ 6 لاکھ ڈالرز کا بریف کیس واپس کر دیتا ہے۔ یہ ناقابل یقین بات ہے تاہم مسٹر کائل کی نرمی و شفقت اچھی لگی۔ نظارت نصر کی عینی شاہد ایک [illegible] تھی۔ ثمر عباس کی سوئے دار ایک سبق آموز کہانی تھی جانے لڑکیاں کیوں والدین کی محبت و شفقت کے مقابلے میں ہوس کے پجاریوں کا ساتھ [illegible] ہیں اور پھر ذلیل ہوتی ہیں۔ ایم اے راحت کی کالے راستے، ام الخبائث کی تباہ کاریوں پر مشتمل ایک بہترین کہانی تھی۔ اس لیے اسے حرام قرار [illegible] ہے کہ اس سے انسان اچھے برے کی تمیز کھو بیٹھتا ہے۔ نبیلہ کو بھی اس طرح ایک مرد کی تنہائی میں نہیں جانا چاہیے تھا۔ نرم چارا مرزا امجد بیگ کے [illegible] کیس کی کہانی تھی۔ فاروق مورس کے قتل میں تو سزا سے بچ گیا مگر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ حسام بٹ صاحب جب سے مرزا امجد بیگ کے [illegible] کہانی کی صورت میں لکھ رہے ہیں، چند باتیں ایسی ہیں جو ہر کہانی میں شامل ہوتی ہیں۔ قارئین کو بتاتا چلوں کہ قتل کے ملزم کی ضمانت آسان نہیں ہوتی۔ جب میں نے جرح ختم کی تو عدالت کا وقت ختم ہونے میں پانچ یا سات منٹ باقی تھے۔ اس لیے کارروائی ملتوی کر دی گئی۔ یہاں صرف ان گواہوں پر جرح کا ذکر آئے گا جن کی گواہی اس کیس میں اہم کردار ادا کر رہی ہے باقی گواہوں کا تذکرہ حذف کر دیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ جو حقائق مجھے معلوم ہوئے وہ کارروائی کے دوران مناسب وقت پر بیان کروں گا۔ قارئین انتظار کریں۔ پلیز حسام بٹ صاحب اب یہ باتیں دہرانا بند کر دیں، سب قارئین کو زبانی یاد ہو گئی ہیں بے شک سن لیں۔ ناصر ملک کی جنت ارے یہ کیا "جاری ہے" چلو جی اب پھر اگلے ماہ کا انتظار کرو۔ ناصر ملک، نواب محی الدین سے بھی متاثر نظر آئے۔ ڈاکٹر ساجد صاحب کی جہد حاصل زیر مطالعہ ہے۔ یہ ہیں ایمان اور دعا ایمان کیا ماہا ایمان کی رشتہ دار ہیں۔" (شاعری کے سلسلے میں آپ کی شکایت بجا نہیں ہے۔ ایک ہی شعر دو قارئین کے نام سے نہیں لگائے جا سکتے اور غلط شعر شائع کرنے سے بہتر ہے کہ درست شعر آپ کے نام سے شائع کیا جائے)

✠ **انعم رشید**، تونسہ شریف سے محفل میں جلوہ افروز ہوئی ہیں "آج کسی کام سے کالج گئی تو وہاں مجھے میری ایک کلاس فیلو ملی۔ اس نے پوچھا کہ انعم تم نے سسپنس ڈائجسٹ میں خط لکھا تھا؟ تو میں تو ایک دم بیٹھے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اس سے پوچھا کہ کیا واقعی تم نے میرا خط پڑھا تھا۔ تو معلوم ہوا کہ مارچ 2011ء کے ماہنامے میں میرا خط شائع ہو چکا تھا۔ اس وقت میں کتنی خوش ہوئی اس کا اظہار لفظوں میں نہیں کر سکتی۔ دل برداشتہ ہو کر میں نے دوبارہ خط بھی نہیں لکھا (حیرت ہے کہ اتنا بڑا فیصلہ آپ نے بغیر تحقیق کیے کر لیا) ہوا در اصل یہ تھا کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اگلے مہینے کا ڈائجسٹ قریباً 15 دن پہلے مل جاتا ہے۔ تو جب میں نے ڈائجسٹ منگوایا تو وہ ملا ہی نہیں۔ ایک بات اور کہ جون کے ڈائجسٹ میں نجمہ مودی کے نام سے ایک تحریر شگفتہ کی چوری کے نام سے تھی، تو بہت حیرت ہوئی مگر مجھے اس چیز کی سمجھ نہیں آئی کہ اتنے برسوں بعد یہ کہانی نجمہ مودی کے نام سے دوبارہ کیوں شائع ہوئی؟ (شکریہ آپ نے اس طرف توجہ دلائی) اب آتے ہیں نومبر کے شمارے کی طرف۔ ڈائجسٹ مجھے 21 اکتوبر کو مل گیا تھا۔ سب سے پہلے منظر امام کی کند ہم جنس پڑھی، سویرا کی قسمت پر بہت افسوس ہوا۔ کاشف زبیر کی تلاش پڑھ کر عجیب محسوس ہوا کہ انسان بھی کیا عجب شے ہے، کبھی نیکی کر کے کسی کی نظر میں اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ چھ سو ملین ڈالرز کا مالک بن جاتا ہے اور کبھی نشے کی وجہ سے اتنی پستی میں جا گرتا ہے کہ صرف بیس ڈالرز کے لیے اپنی زندگی کی بازی ہی ہار جاتا ہے (یہی زندگی کے رنگ اور ڈھنگ ہیں) جنت کے آخر میں جب "جاری ہے" لکھا ہوا دیکھا ہے تو یقین ہو گیا کہ اناڑی سسپنس ڈائجسٹ میں آخری سانسیں لے رہی ہے مگر کہانی پڑھ کر ایسا بالکل محسوس نہیں ہوتا۔ انوار صدیقی کی کشکول نہایت کامیابی سے آگے بڑھ رہی ہے اور مجھے پسند بھی بہت ہے۔ باقی ساری کہانیاں اچھی ہیں، مجھے یہ پوچھنا ہے کہ ڈاکٹر ساجد امجد، رضوانہ ساجد اور محمود احمد مودی اور نجمہ مودی کے درمیان کیا رشتہ ہے؟ (ڈاکٹر ساجد امجد اور رضوانہ ساجد، محمود احمد مودی اور نجمہ مودی کے درمیان میاں بیوی کا رشتہ ہے) رضوان تنولی صاحب سے یہ کہنا ہے کہ مئی میں انہوں نے جو شعر میرے لیے لکھا تھا وہ خاصا گھسا پٹا تھا اور مجھ پر بالکل فٹ نہیں بیٹھتا تھا۔" (آپ کی خیال آرائی پہنچائی جا رہی ہے)

✠ **ہمایوں سعید راج**، بنوں سے تبصرہ کر رہے ہیں "اس بار سرورق کو بہت توجہ سے دیکھا اور بار بار دیکھا مگر پھر بھی متاثر نہ کر پایا۔ ذاکر انکل یہ آپ کا نہیں ماہا ایمان کا قصور ہے۔ ماہا جی! ضروری تو نہیں کہ انسان وہی مانگے جو ڈیزرو کرتا ہو، کبھی کبھار کوئی چاند کا تمنائی بھی بن جاتا ہے۔ کاظمی صاحب خواتین سے پہلو بچاتے ہوئے چلتے ہیں ماشاءاللہ کیا اونچے وچار (لگتا ہے آپ بھی بھارتی ڈراموں سے مرعوب ہو گئے ہیں!) ہے۔ تفسیر صاحب! لگتا ہے ٹھیک ٹھاک ٹھکائی کی ہے بھابھی جی نے، جب ہی تو سمناتے ہوئے دکھائی دے رہے ہو۔ شارقہ جی! مطالعہ تو خیر کچھ خاص نہیں مگر آپ کی انجان دیکھ کر کسی شہزادی کا ہی گماں ہوتا ہے۔ جاوید صاحب! ابھی آپ سب نے مل کر کسی گہری سازش کے تحت ماہا کی ناک میں دم کر رکھا ہے۔ تو کسی کو تو ماہا کی سائڈ پر بھی ہونا چاہیے نا؟ قدرت اللہ صاحب! کیا شاندار شاٹ ماری ہے۔ ایک تفسیر کو نمبر دینے کے چکر میں جانے کس کس کو نمبر دے بیٹھے۔ طاہرہ جی حسب عادت پارسائی سے بہت شدید انسپائرڈ ہو گئی ہیں۔ محسن صاحب! او جی! تمہارا شیر شاہ سوری پوری آب و تاب کے ساتھ ابتدائی صفحات پر راج کر رہا ہے۔ ابتدائی صفحات پر ڈاکٹر صاحب شیر شاہ سوری لیے حاضر تھے اور ہم چونکہ مغلیہ سلطنت کے فین ہے اور اسی شیر شاہ نے مغلوں کو محلوں سے [illegible] سفر کرنے پر مجبور کیا۔ لہٰذا ہم شیر شاہ کی کسی بھی اضافی خوبی سے متاثر ہونے والے نہیں۔ اناڑی اب وہ اناڑی نہیں رہی۔ اس کا اصل کمال اس کے [illegible] جملے تھے، ریشم کی انگریزی اور راجا کے طنزیہ ڈائیلاگ تھے۔ مگر اب سب کچھ ناپید ہے۔ کشکول میں لیاقت کی روحانی قوت کے بدولت ایک بار پھر میڈم کی عصمت سلامت رہی۔ کچھ نئے کرداروں کی انٹری بھی سسپنس پیدا کرنے میں کامیاب رہی۔ مرزا امجد بیگ کا یہ کیس گہرے اثرات چھوڑنے میں ناکام رہا۔ آخری صفحات پر کافی عرصے بعد ناصر ملک تشریف فرما تھے۔ پروفیسر صاحب کے جنت نے اور اوپر سے ان کی خود غرضی اور تنہائی پسندی نے زیادہ متاثر نہیں کیا۔ سلطان اور اس کی بیوی کو تینوں بچوں نے مایوس اور رنجیدہ کیا۔ نہ جانے اولاد والدین کی لامحدود محبت کو چند دنوں کی عارضی محبت کے سامنے کیوں بھول جاتی ہے۔ شہاب کے مقابلے میں افگار کا کردار زیادہ متاثر کن لگا۔ کند ہم جنس میں منظر امام نے ایک اور معاشرتی المیے کی خوبصورت نشاندہی کی۔ ثمر عباس کی سوئے دار بہت نازک کہانی تھی۔ سیماب کا خود کو سزا دینے کا منصفانہ انداز پسند آیا۔ محبت زبردست بھی اچھی لگی۔ لارنس پر قسمت بہ یک وقت مہربان بھی ہوئی اور نامہربان بھی۔ بہرحال کرس نے دوستی کا فرض نبھاتے ہوئے اس کی جان بچالی۔ اس ماہ کی سب سے خاص الخاص کہانی کاشف زبیر کی تلاش تھی۔ بیورگ کے ہمدرد، انسان دوست اور احسان شناس کردار نے بے حد متاثر کیا۔ تو دوسری طرف جونی کی [illegible] تھی۔ جارج خوش قسمت ترین انسان ہو کے بھی بدنصیبوں کی موت مرا۔ کاشف زبیر یو آر گریٹ......"

✠ **[illegible] مدنی**، چوک ظاہر پیر سے چلے آرہے ہیں "نومبر کا شمارہ 15 اکتوبر کو ہی مل گیا۔ سرورق پر نظر پڑی تو ایک خوبصورت ہیروئن اپنے [illegible] محفل دوستاں میں پہنچا تو قاضی محمد قیصر شہزادہ کو کرسی صدارت پر پایا۔ مبارکاں جی۔ اپنے خط کو نہ پا کر بہت دکھی ہوئے خط تو پوسٹ کیا تھا اور آپ [illegible] (آپ کا خط موصول نہ ہونے پر ہمیں بھی افسوس ہے) چلو کوئی بات نہیں۔ ہمت مرداں مدد خدا۔ (یہ ہوئی نا بات) سب سے پہلے انوار صدیقی صاحب کی کشکول پڑھی۔ ایک محبت کا جوڑا یعنی سیٹھ عثمان اور ان کی بیگم صاحبہ تو واپس آ گئیں لیکن لیاقت اور فرحین جدا ہو گئے اور میڈم روبی کی عزت [illegible] پتا نہیں آگے کیا ہوتا ہے۔ اناڑی میں ابھی تک نور غائب ہے لگتا ہے دلاور اسے مشکل ہی چھوڑے گا۔ اس کے بعد ناصر ملک کی جنت پڑھی جو اس ماہ کی Excellent کہانی ہے لیکن آخر میں جا کے پتا چلا کہ ایک ماہ اور انتظار کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد ڈاکٹر ساجد امجد کی جہد مسلسل پڑھی جس میں فرید خان منزل پہ منزل طے کرتا ہوا شیر شاہ سوری بنا اور پورے ہندوستان پر حکومت کی۔ ایم اے راحت کی کالے راستے پڑھی۔ جمال شاہ نے نبیلہ کو مارا تھا اور اب اس کی بیٹی کو دھمکیاں مل رہی تھیں یہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے جو دوسروں سے برا کرے گا وہ اس

کے ساتھ برا کرائے گا۔ کندہم جنس منظر امام کی اچھی کاوش تھی۔ تلاش کاشف زبیر ویلڈن۔ اس مرتبہ بھی آپ بازی لے گئے۔ مسٹر کاٹل بیورگ جیسا بزنس مین بہت کم اس دنیا میں ہوئے ہیں۔ جارج کلیمنٹ کو وہ آخری وقت تک ڈھونڈتے رہے۔ نرم چارا میں مرزا امجد بیگ ایک اور کیس نمٹانے میں کامیاب ہوئے۔ سوئے دار ثمر عباس کی... اچھی کاوش سیماب نے شہزاد کو پسند کرکے اپنی زندگی تباہ کرلی لیکن کیا کریں، محبت تو اندھی ہوتی ہے نا۔ رضوانہ ساجد کی اسلامی معلومات پر مبنی تحریر حضرت حزقیلؑ نے اسلامی معلومات سے آشنا کیا۔ ماہا ایمان جی ویسے پوچھ سکتے ہیں کہ بہاولپور میں کیا خاص ہے؟ اور اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو آپ کے مسٹر رائٹ کے بارے میں پوچھ سکتے ہیں؟ سید شکیل حسین کاظمی صاحب آپ کا تبصرہ بھی اچھا لگا۔ تفسیر عباس بابر صاحب آپ کا تبصرہ بھی لاجواب تھا۔ محمد فیضان غنی خوش آمدید۔ شارقہ سلجوق جی سلجوق کا کیا مطلب ہے؟ محمد جاوید بلوچ تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ طاہرہ یاسمین جی آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ حاجی اے حکیم صاحب پلیز ہم سے ناتا نہ توڑیں۔ سارے دوستوں کو عید مبارک۔" (آپ سب کو بھی عید مبارک)

✠ **حسنین عباس بلوچ،** ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا سے تبصرہ کرتے ہیں "اس ماہ کا شمارہ لمبی مسافت طے کرکے آیا جبکہ شرف دیدار بیس کو نصیب ہوا۔ ٹائٹل پر موجود دوشیزہ کو دیکھ کر ذہن کچھ سال پیچھے چلا گیا۔ محفل میں دوڑے چلے گئے تو خدا جانے ہمارا خط کہاں گیا، خیر صدارت قاضی محمد قیصر شہزاد کے حق میں ٹھہری بہت مبارک ہو، ماہا ایمان جی بلیک لسٹ بھی ہمارے ہی لیے بنائی گئی، اس میں شکوہ کا تو جواز نہیں بنتا اور آپ یہ جانے کی بات کیوں کررہی ہیں پتا ہے آپ کو جو میدان چھوڑ کر بھاگے اسے کیا کہتے ہیں؟ (کیا ماہا کے پاس اس سوال کا کوئی جواب ہے؟) سید شکیل کاظمی کا تبصرہ بڑا عمدہ تھا، محترم تفسیر عباس بابر صاحب انکل بابر عباس کی کمی شدت سے محسوس کی۔ ہمایوں سعید راج جناب کیا جن کے علاوہ کام نہیں چل سکتا۔ شارقہ سلجوق صاحبہ گل سوجنڑیوں کہ کس دور میں کس خاندان نے حکومت کی تھی کیا یہ بتانا ضروری ہے۔ ادریس احمد خان جی مختصر اگر خوبصورت الفاظ تھے، یوسف مرزا پیروں کے دیس ملتان سے بھی میرا ایک کام کریں اور میری طرف سے شاہ شمس تبریز کے آستانہ پر جاکے حاضری لگوادیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف سب سے پہلے اناڑی پڑھی۔ نواب صاحب اپنی جان ماہ نور سے کوسوں دور ہیں۔ کہانی میں روانی ضرور آئی شاکر اور قدوائی اب نہیں رہے اور شاہی بادشاہ کی واپسی پر انجانی سی خوشی محسوس ہوئی۔ کشکول میں لیاقت حسین کی بروقت اطلاع نے میڈم روبی کو بچالیا اور خود لیاقت حسین اس بارے میں لاعلم رہے۔ سیٹھ صاحب کی واپسی اب اگلے ماہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔ کاشف زبیر تلاش لے کے آئے۔ کاشف صاحب ہمیں بھی کسی کی تلاش ہے کیا آپ ہمیں آزادی تلاش کرکے دے سکتے ہیں (آزادی تو ہمارے پاس ہے محافظ کوئی نہیں) محفل شعر و سخن میں پہلے نمبر والا شعر دیکھ کر اور سمجھ کر داد دیے بنا نہ رہ سکا۔ ماہا ایمان کے شعر کو بھی سراہا۔"

✠ **احسان سحر،** زاوے خیلہ توالہ، میانوالی سے تشریف لائے ہیں "اس ماہ کا سسپنس مجھے 17 کو مل گیا۔ ٹائٹل تو ہمیشہ کی طرح سسپنس کی جان تھا۔ جون ایلیا صاحب کو پڑھا اس مرتبہ انشائیہ تھوڑا اساہٹ کر مگر خوبصورت تھا۔ اس مرتبہ قاضی محمد قیصر شہزاد صاحب براجمان تھے۔ مبارکاں جی مبارکاں۔ سسپنس میرے لیے اس دفعہ دہری خوشی لے کر آیا کیونکہ 15 اکتوبر 2011ء کو میرا بھائی پیدا ہوا، اس لیے میری تو ڈبل عید ہوگئی۔ تفسیر عباس آپ سے میں متفق ہوں، یہ محکمہ ڈاک والوں کی مہربانی ہے جو وقت پر لیٹر پہنچا کر ہمیں خوشی فراہم کرتے ہیں۔ ذیشین بلوچ صاحب آپ کے لیے میری خصوصی دعائیں ہیں، اللہ پاک آپ کو شفا دے۔ باقی طاہرہ یاسمین صاحب، ہمایوں سعید راج، قدرت اللہ نیازی، ماہا ایمان ان کے تبصرے شاندار تھے۔ اب بات ہوجائے اسٹوریز کی سب سے پہلے کشکول پڑھی، کہانی شاندار رہی تھوڑا بہت بار رسین بھی دکھایا گیا جو متاثر کرگیا۔ کہانی بہتری کی جانب گامزن ہے۔ اناڑی کوئی خاص نہیں رہی تھی لیکن شاہی بادشاہ کے آنے کے بعد کہانی میں جان آئی ہے۔ کالے راستے، ایم اے راحت صاحب نمبر لے گئے، اس ماہ سسپنس کی لاجواب تحریر تھی، برے دوستوں کی محبت ہی انسان کو شرافت کے پردے سے نکال کر گمراہی کی طرف لے جاتی ہے، شراب ایسی چیز ہے جو اپنے بیگانے کا ہوش بھلادیتی ہے۔ کندہم جنس، سچ ہے کہ سچی محبت انسان کو بھیک کیا ہر کام کرنے پر مجبور کردیتی ہے اس میں ڈوب کر انسان اپنا آپ بھی بھول جاتا ہے۔ سوئے دار ثمر عباس کی عمدہ تحریر تھی جو کہ آج کل کی نسل کی ترجمانی تھی۔"

✠ **عمران حیدر بلوچ،** ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے محفل میں تشریف لائے ہیں "اس ماہ کا شمارہ شدتِ انتظار کے بعد 20 تاریخ کو ملا۔ سسپنس کی ایک ہی جھلک نے خوشی سے نہال کردیا۔ سرورق پر دوشیزہ کھلے بال لیے اپنی سحر گھول دینے والی آنکھوں سے عید مبارک کا پیغام دے رہی تھی آگے بڑھ کر محفل یاراں میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہمارا خط محکمہ ڈاک کی شفقت سے محروم رہا۔ قاضی محمد قیصر شہزاد کو کرسیٔ صدارت ملنے پر مبارک باد۔ اشتیاق احمد صاحب تبصرہ کی پسندیدگی کا شکریہ۔ تفسیر عباس دیتے ہیں۔ ماہا ایمان جی آئندہ ہم بہاولپور کو آپ کی عینک لگا کر دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ ایم ڈبل اے آئی ایس یو، بابر اپنے اچھوتے خیالات کے ساتھ موجود تھے۔ تفسیر بھائی بادیر سہی مگر دل کی گہرائیوں سے آپ کو بیٹے کی آمد پر مبارک باد۔ طاہرہ یاسمین باجی میں بالکل خیریت سے ہوں۔ اپنے اس بھائی کو دعاؤں میں ضرور یاد رکھیے گا۔ میری طرف سے تمام دوستوں قارئین اور ادارہ کے اسٹاف کو عید مبارک۔ اب کہانیوں کی طرف آتے ہیں سب سے پہلے کشکول پڑھی، لیاقت حسین کی بروقت اطلاع کی وجہ سے افضل خان اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب نہ ہوسکا اور میڈم روبی کی عزت بچ گئی۔ منظر امام کی کندہم جنس نے ہمارے معاشرے کے تاریک پہلو کی طرف توجہ دلائی اور فقیر کے پاس سب کچھ ہونے کے باوجود مانگنا اور اس کے داماد نے بھی وہی پیشہ شروع کردیا۔ کاشف زبیر صاحب نے تلاش کے روپ میں ایک اور ہیرا تراشا۔ ایم اے راحت صاحب کا شاہکار کالے راستے سسپنس کی زینت بنی۔ جمال شاہ نے کیسے اپنی زندگی کو غلط راستے پر ڈال دیا اور شراب کے نشے نے نبیلہ کی معصومیت اپنے گہرے اثرات چھوڑ گئی۔ مرزا امجد بیگ صاحب نے نرم چارا لکھی جو کہ ہمارے معاشرے میں انا پرستی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ عاقل مورس کے ناکردہ قتل میں کیسے ملوث کیا گیا اور امجد بیگ کی ذہانت نے فاروق کی عیاری سے پردہ ہٹایا مگر وہ خود لقمہ اجل بن گیا اور اپنے کیے

کی سزا پا گیا۔ محفل شعر و سخن میں حمیرا اقبال، شاہدہ ظفر، طاہرہ یاسمین اور محمد رشید سیال کے اشعار اچھے تھے۔"

✠ **راجا ثاقب نواز ثاقب،** رتی ممی ساہیوال سے تبصرہ کررہے ہیں "نومبر کا سسپنس اکتوبر میں ملا۔ قریباً ایک صدی سے زائد وقت گزر گیا ہے، نومبر کا ہی مہینا تھا۔ ایک معصوم فرشتہ سیرت بچہ جنم لیتا ہے۔ جسے آج ہم حکیم الامت حضرت علامہ اقبال کے نام سے جانتے ہیں۔ شاعر مشرق کا دیا گیا درس آج ہم صرف ان کا جنم دن منا کر گزارتے ہیں اور بس...... خدارا ہم عوام میں سے کوئی اٹھے اور ہمارے اپنے پاکستان کے غیر حکمرانوں کو جا کر کوئی بتلائے کہ ہمیں نئے صوبے نہیں، پورا پاکستان چاہیے۔ ملک میں بڑھتی ہوئی عصبیت اور انارکی کو روکنے، تقسیم در تقسیم کے خواب دیکھنے والوں کی رہنمائی کے لیے آج ہم میں کوئی ایک بھی مفکر پاکستان جیسا نہیں۔ سرورق کی حسینہ کی عید کے حوالے سے سجاوٹ اور لگاوٹ بھری نظریں اچھی لگیں۔ جون ایلیا نے ہمیشہ کی طرح لاجواب کردیا۔ بزم یاراں میں تفسیر عباس بابر اپنی موجودگی کا احساس دلانے میں کامیاب رہے۔ تاریخی کہانی جہد حاصل میں مصنف فرید خاں (شیر شاہ سوری) کی زندگی کے ان گنت اوراق پلٹتے نظر آئے۔ کالے راستے میں نبیلہ کی جمال شاہ کے بارے میں دی گئی بددعا آخر پوری ہوئی۔ کندہم جنس میں عاشق نامہ بھکاری یا بھکاری نما عاشق سے پالا پڑا۔ تلاش کا افسوس ناک انجام ہوا۔ جارج ملا بھی تو کیسی حالت میں۔ نرم چارا میں مجرم رپورٹر فاروق دنیاوی سزا پانے سے قبل ہی خدا کی بے آواز لاٹھی کا شکار ہوگیا۔ یعنی شاہد میں انسپکٹر شاہد علی تو اپنے ملک صفدر جیسے ہی لگے۔ محبت زبردست قدرے طویل ثابت ہوئی، مگر تھی بڑی طوفانی انداز کی محبت۔ سوئے دار میں سیماب نے اپنے آپ کو جو سزا تجویز کی، شاید وہ اس کی حق دار نہ تھی۔ حضرت حزقیلؑ کی روح پرور داستان ہنوز جاری و ساری ہے۔ آوارہ گرد کے انجام نے چونکنے پر مجبور کردیا اور یوں ہم ناصر ملک کی جنت میں جا پہنچے، جس کے اگلے حصے کا ابھی سے انتظار ہے۔ ادب سے گزارش بھی ہے کہ ہمارے سسپنس کو "جاری ہے" کے الفاظ سے تھوڑا بہت تو بچایا جائے، میرا مطلب اکثر اوقات تاریخی کہانی، اسلامی داستان، کشکول، اناڑی اور اب آخری صفحات بھی اس چکر کی نذر ہورہے ہیں۔ امید ہے آپ کو میری یہ گستاخی ناگوار نہیں گزرے گی (بالکل بھی نہیں، ہمیں قارئین کی رائے سے پرچے کو آپ کے معیار کے مطابق سنوارنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ تاہم آپ بھی ہماری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ تاریخ کو تسلسل کے ساتھ پڑھنے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔ اسی طرح انبیا کے حالات زندگی کو اگر مختصر کرکے پیش کرنے کی کوشش کی جائے تو ممکن ہے، بہت سے اہم واقعات کا ذکر رہ جائے اور پھر..... کچھ کہانیاں ایسی ہوتی ہیں کہ جنہیں اگر صرف صفحات بچانے کے لیے مختصر کیا جائے تو وہ دلچسپی کھودیتی ہیں۔ لیکن ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ اس مسئلے کا کوئی جامع حل تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے گی) میری طرف سے آپ کو خصوصی طور پر اور محفل شعر و سخن کی پوری ٹیم کو مجموعی طور پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے آنے والی عید قربان کی مبارکباد۔"

✠ **آغا فرید احمد خان،** سکھر سے محفل میں آئے ہیں "کافی عرصے کے بعد سسپنس میں حاضر ہورہا ہوں، امید ہے کہ ناامید نہیں کیا جائے گا (بالکل بھی نہیں) نومبر کا سسپنس ٹائم پر مل گیا۔ شربتی آنکھیں، دلکش ہونٹ، اخروٹی گھنے بال، متناسب ناک، سبز ساڑی تن پے اور سب سے بڑھ کر کلائی پر نفاست سے حنائی گل بوٹے سجائے اس حسینہ نے دل موہ لیا (واہ بھئی واہ! آپ کی نظر کے کیا کہنے) فہرست کے ملاحظے کے بعد جون انکل کی کلاس اٹینڈ کی (یہ نہیں لکھا کہ کیسی لگی) پھر آئے اپنی پیاری سی محفل میں۔ آپ کی چند سطریں پڑھیں جس میں امریکا کی دھمکیاں، APC کا انعقاد اور اس پر مختصر مگر جامع روشنی ڈالی ہے (شکریہ) قاضی محمد قیصر شہزاد! کرسیٔ صدارت تک رسائی پر مبارک باد، اگر کوئی ماہا ایمان اور طاہرہ یاسمین پر نظر رکھ رہا ہے تو آپ کیوں سوکھ کے کانٹا ہورہے ہیں؟ اور ماہا کی خوشامدیں نہ کریں۔ دوسرے نمبر پر ماہا ایمان چھیل کر بیٹھی تھیں، اس کے تبصرے کا پہلا حصہ پڑھے لکھوں کی طرح قابل تحسین تھا، لیکن آخر میں اپنے اصلی ڈگر پر آگئیں۔ تفسیر عباس بھائی! آپ نے یاد کیا اور ہم حاضر ہوگئے، ویسے ہم دیکھ رہے تھے کہ پچھلے چند مہینوں سے آپ ایک چڑیل کے سائے میں آگئے ہیں، اب ہم آگئے ہیں تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہمایوں بھائی! تفسیر کو اتنی تنبیہ کافی ہے۔ شارقہ سلجوق جی! ٹوتھ پیسٹ لو تو برش فری، شربت لو تو گلاس فری، جوڑا لو تو دوپٹہ فری، ہم لو تو سوکا بیلنس فری، لیکن! کسی تبصرے پر رسالہ فری نہیں ملے گا، منہ دھو کر رکھو (غلط...... رسالہ پڑھ کر خط بھیجو تو محفل میں جگہ بالکل فری ملتی ہے...... کیسا؟) طاہرہ یاسمین! کچھ خدا کا خوف کرو، پچھلے دس سال سے خود کو 25 کی ہی گردانتی ہو۔ قدرت اللہ نیازی جی! ہمیں آپ کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ حاجی اے حکیم انکل! یہ محفل ہمارا گھر ہے اور ہم سب اس کے مکین ہیں اور آپ سینئر قاری ہمارے لیے بزرگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں پر۔ سب سے پہلے اناڑی پڑھی۔ فیکا پتر اور [illegible] والے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہوسکا۔ فیکا پتر کتنا بھی گیٹ اپ بدلے لیکن دلاور سے نہیں بچ سکے گا، عنقریب یہ لڑائی ہونے ہی والی [illegible] کی [illegible] آخری [illegible] کا خاص [illegible] تھی۔ ٹکڑوں میں ہی اس تحریر نے اپنے سحر میں پوری طرح جکڑے رکھا، البتہ پروفیسر کے کردار کو بے [illegible] مرزا امجد بیگ کی نرم چارا میں جرح کے وہ ایکشن نہیں پڑھنے کو ملے جو مرزا صاحب کا خاصا ہیں۔ کندہم جنس میں منظر امام [illegible] یعنی شاہد میں ایک طوطے کی گواہی نے قاتل تک رسائی دلادی۔ جو بر [illegible] کی آوارہ گرد میں [illegible]... کی آوارہ گردیاں، پیسے کی ہوس اور رقابت میں پروئی تحریر اچھی لگی۔ ثمر عباس کی سوئے دار اچھی تحریر تھی لیکن سیماب اگر وائل کی محبت کو قبول کرلیتی تو اور مزا آتا۔ ایم اے راحت کی کالے راستے بہت بہت پسند آئی۔ شراب اس لیے حرام ہے کہ اس کے پیتے ہی آدمی اپنے پرائے کی تمیز بھول جاتا ہے۔ کشکول نئے سرے سے شروع کیا ہے جس کی دو اقساط پڑھ چکا ہوں، آئندہ ماہ تک نئی قسط تک پہنچ جاؤں گا (جلدی کریں کیونکہ ہمیں کشکول پر بھی آپ کے تبصرے کا انتظار ہے)

✠ **طاہر الدین بیگ،** میرپور خاص سے لکھتے ہیں "ذکر ہوجائے کچھ محفل میں آپ کے خط کا۔ سلجوقی شہزادی صاحبہ ہیں تو طاہرہ یاسمین

صاحبہ بھی ہیں۔ ادھر ماہا ایمان اپنے زبردست تبصرے کے ساتھ اپنی موجودگی کا زبردست اظہار کر رہی ہیں۔ سرفہرست قاضی صاحب بھی ہیں اور بہت خوب ہیں پھر اپنے تفسیر عباس صاحب بھی ہیں اور ہمایوں سعید صاحب بھی اپنے اچھے تبصرہ کے ساتھ حاضر ہیں اگر نہیں ہیں تو دلنشین بلوچ۔ ڈاکٹر صاحب کا جہد حاصل تاریخ کے اوراق سے تخت اور تختہ کا نمونہ لیے ہوئے ہے اور تاریخ کی طرح یہ بھی مار دھاڑ سے لبریز ہے، بھاگ دوڑ بھی خوب ہے اور جو عالم بننے آیا تھا ڈاکو بن گیا۔ شہنشاہ ہند ہمایوں کے دور حکومت کی کہانی بھی۔ ڈاکٹر صاحب کی ایم اے راحت کے کالے راستے زبردست کہانی راحت صاحب کسی وقت جاسوسی ناول بھی لکھا کرتے تھے، بہت زبردست کہانی لکھی ہے انسان گناہ کرتا ہے مگر احساس جرم اس کا کس طرح پیچھا کرتا ہے راحت صاحب نے خوب ہی لکھا ہے جرم، احساس جرم اور ندامت لیے ہوئے بہت خوبصورت کہانی ہے، کہانی تو خوبصورت منظر امام صاحب نے بھی لکھی ہے بالکل نئے طرز کی کہانی کند ہم جنس پڑھ کر مرحوم معین اختر صاحب کی بہت ہی یاد آئی۔ منظر صاحب اتنی دل کش کہانی لکھنے پر مبارک باد۔ کاشف زبیر صاحب نے بھی کمال کر دکھایا ہے بدیسی کہانی کو زبردست اسکرین پلے کے ساتھ تلاش کے روپ میں ایسا پیش کیا ہے کہ شروع سے آخر تک سسپنس برقرار رہتا ہے اور انجام کاشف صاحب نے خوبصورت ترجمہ کیا اور خوبصورت کہانی دی ہے۔ نظارت نصر یہ محترم ہیں کہ محترمہ مگر جو بھی ہیں کہانی کمال کی پیش کی ہے کہ کس طرح ایک طوطے نے شرلاک ہومز کی روزی پر لات مار دی ہے۔ سب لکھاری جہاں بہت زبردست رہے تو مریم کے خان کیوں پیچھے ہوں، محبت زبردست زبردست کہانی زبردست ...... ترجمے کے ساتھ جینی کا کردار پھر لارنس کا کردار اوپر سے ایک جاسوس صاحب۔ اچھی کہانی جسے بہت عمدگی سے تحریر کیا گیا ہے۔ آخر میں سسپنس کی کہانیوں کا چھکا جو سوئے دار کے نام سے ثمر عباس کی تحریر ہے اور بہت ہی زبردست ہے انسانی رشتوں کی کہانی محبت اور فرض کی کشمکش سیماب کا کردار اور دانش بھی اپنی موجودگی کا بھرپور ذکر کرتے ہوئے ایک کلاسک کہانی جس کا انجام بھی کلاسک تھا۔ پڑھتے ہوئے جب انجام تک آئے تو آنکھیں پرنم ہو گئیں۔" (سب لکھاریوں کی جانب سے بہت شکریہ۔ ہم چاہیں گے آپ کا خط بلیک کیٹ بھی پڑھ لیں کیونکہ ان کے خیالات آپ کے برعکس ہیں، بہرحال پسند اپنی اپنی)

✠ **سید شکیل حسین کاظمی**، اسلام آباد سے محفل میں تشریف لائے ہیں "سب سے پہلے آپ کو اور ادارے سمیت تمام دوست احباب کو جو رونق محفل ہیں عید بقر کی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ سرورق پر موجود دوشیزہ کا چہرہ کسی جاپانی گڑیا کے نقوش کی غمازی کر رہا تھا۔ سرورق کا مجموعی تاثر کافی متاثر کن تھا۔ آگے بڑھے تو شیان نے روک لیا۔ جون ایلیا کا یہ ہمزاد ہمیشہ دور کی کوڑی لایا ہے۔ انشائیہ پڑھ کے ہم پر بلاغت کی ایک اور نہج کا در کھلا۔ خطوط کی محفل میں وارد ہوئے اور مدیرہ اعلیٰ بھی ہماری طرح اپنا خون جلاتے میں کشاں کشاں نظر آئیں۔ قاضی محمد قیصر شہزاد اس دفعہ قافلے کے سالار منتخب ہوئے۔ تبصرہ بہت عمدہ اور بھرپور تھا سو بہت اچھا لگا۔ ماہا ایمان کا تبصرہ بھی خوب رہا مگر پورے تبصرے میں "جاتے جاتے" والے دو لفظوں نے ضرور متوجہ کیا۔ شاید محترمہ شوہر کو پیاری ہونے والی ہیں۔ تفسیر بابر عباس صاحب ہم آپ کے پیچھے پیچھے اب یہاں بھی پہنچ گئے ہیں، کیونکہ جاسوسی اور سسپنس کی کافی مخلوق دونوں محفلوں میں موجود ہے۔ ہمایوں سعید راج نے بھی محفل میں خوب رنگ جمایا ہوا تھا۔ شارقہ سلجوق کا سادگی میں کیا گیا تبصرہ پسند آیا۔ محمد جاوید بلوچ صاحب آپ نے تو دل کی بھڑاس خوب نکالی۔ اس کے علاوہ محمد قدرت اللہ نیازی صاحب کا تبصرہ کافی بھرپور تھا۔ جبکہ طاہرہ یاسمین نے بھی محفل کی رونق میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ اس کے بعد کشکول کا مطالعہ کیا۔ میڈم روبی حسب توقع سراج کی کوششوں سے بچ گئی۔ اناڑی کی یہ قسط بھی کافی سنسنی خیز رہی۔ نواب صاحب اب بڑے لوگوں کے نشانے پر آ گئے ہیں۔ اب دیکھتے ہیں ان سے کیسے جان چھڑاتے ہیں اور ہاں ناصر کا کردار بہت خوب ہے اور مجھے امید ہے جتنا یہ مخلص ہے جلد ہی نواب پر قربان ہو جائے گا۔ کاشف زبیر کی تلاش بہت ہی کمال کی کہانی تھی، سراغرسانی تو عمدہ تھی مگر جارج کا انجام بہت دردناک تھا کہ حالات انسان کو کہاں سے کہاں تک لے آتے ہیں۔ نرم چارہ بیگ صاحب کی ایک عمدہ تحریر تھی، کیس تو حل ہو ہی گیا مگر فاروق کا انجام عبرت ناک تھا۔ ایم اے راحت کی کہانی کالے راستے ایک منفرد تخیل کی ملفوظی شکل تھی۔ اس کہانی میں دو پہلو بہت واضح تھے، ایک ام الخبائث کی تباہ کاری اور دوسرا مکافات عمل۔ اسی لیے اسے حرام قرار دیا گیا ہے کہ انسان رشتوں کی تمیز بھول جاتا ہے۔ کند ہم جنس منظر امام کی مزاح کے پیرائے میں لکھی مزے کی تحریر تھی۔ عینی شاہد نظارت نصر کی بہت ہی ہلکی تحریر لگی مجھے تو سوئے دار کسی انڈین فلم کی کہانی لگ رہی تھی جیسے اکثر بیس سال بعد کوئی بدلہ لیتا ہے جوان ہو کر یا پھر امیر ہو کر۔ تاریخی کہانی جہد حاصل میں شیر شاہ سوری کی فرید خان سے شیر شاہ ہونے تک کی پراثر داستان ملاحظہ کی اور واقعی شیر شاہ سوری کی ہمت اور حکمت دونوں کی داد دینی پڑی۔ آوارہ گرد میں بیٹی کو بھی اپنے کیے کی سزا خوب ملی۔ حضرت حزقیل کی داستان کا ایک اور باب علم و آگہی کا سبب بنا۔ اس ماہ کی خاص کہانی ناصر صاحب کی جنت تھی، ایک عجیب وغریب طرز کی کہانی، جس میں بیک وقت بہت سے معاشرتی پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا۔ اس کے دوسرے حصے کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ اس کے تمام کردار بہت ہی اچھے ہیں خاص طور پر پروفیسر بزدار، مصباح اور شہاب۔ مصباح اور شہاب کے مکالمات نے بہت ہی گہرا تاثر چھوڑا۔"

✠ **رضا دی گریٹ**، سرگودھا سے یوں تبصرہ کرتے ہیں "شمارہ 22 تاریخ کو لیٹ ملا۔ سرورق کی حسینہ کافی خوبصورت مہندی لگائے، عید مبارک کہہ رہی تھی۔ انشائیہ کو کراس کیا اور محفل میں پہنچ تو کرسی صدارت پر قاضی صاحب کو پایا۔ بھائی ہماری طرف سے مبارک قبول ہو۔ ماہا ایمان بہت شور وغل مچا کر سب کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ ماہا جی ایک خط ہمارا ابھی نہ کھل سکا۔ نہیں تو آپ کی بھی بولتی...... ویل ایم اے اور پرنس نظر نہ آئے اور اس دفعہ سرگودھا کی جیل سے بھی کسی نے حاضری نہیں دی۔ کاظمی صاحب کا تبصرہ اچھا تھا۔ تفسیر عباس جی کیا حال ہے، جہاں تو ہر کوئی صنف نازک کے پیچھے پڑا ہوا ہے، یہ طاہرہ یاسمین ہر دفعہ خط شائع ہونے کا کمھن لگاتی نظر آتی ہیں۔ پاکستان کا برا حال حال ہے۔ سندھ والے سیلاب سے تباہ و برباد ہو رہے ہیں اور ہمارے حکمران ایسے کمروں میں بیٹھ کر بیان دیتے ہیں ملک میں امن وامان خراب کرنے کی اجازت کسی کو نہیں دی جائے گی۔ انگریز اپنے قوم اور ملک کا مفاد دیکھتے ہیں اور ہمارے حکمران اپنی جیبوں کا مفاد دیکھتے ہیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف تو سب سے پہلے اناڑی پڑھی، اناڑی ابھی تک نور کو ڈھونڈ رہا ہے، میرا خیال ہے رفیق اور نور کی شادی کروا دیں اور رفیق کے بجائے رانا یعقوب کو گرفتار کروا لیں۔ اس کے بعد کشکول

پڑھی، اس میں نئے کردار سامنے آ رہے ہیں، کہانی اچھی جا رہی ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر ساجد امجد کی جہد حاصل پڑھی، کہانی پڑھ کر ایسا لگا کہ انسان خود اس ماحول میں موجود ہے کہ کس طرح فرید خان سے شیر شاہ سوری بنا۔ ناصر ملک کی جنت اچھی کہانی ہے، پر وسیم کی جنت سمجھ میں نہیں آ رہی۔ مصباح اور شہاب کو نہیں ملنا چاہیے۔"

✠ **ریاض بٹ**، حسن ابدال سے چلے آ رہے ہیں "ماہ نومبر 2011ء کا شمارہ اس وقت میرے ہاتھوں میں ہے۔ اگر میں سرورق کی زیادہ تعریف کروں گا تو قارئین یہ کہیں گے۔ آپ تو سرورق میں ہی الجھ کر رہ گئے۔ جون ایلیا کا انشائیہ "تین شعر" ہمارے لیے سوچ کے بے شمار در کھولے کھڑا ہے۔ محفل میں قدم رکھا تو مدیرہ صاحبہ کی دانشورانہ باتوں پر نگاہ پڑی۔ یہاں بھی بات کشکول کی ہے۔ جب تک ہم مانگنے والا کشکول توڑیں گے نہیں۔ امریکا کے پھیلائے ہوئے جال سے نکلنا ممکن نہیں۔ قاضی محمد قیصر شہزاد کافی عرصے کے بعد آئے اور اپنے خوبصورت اور جامع تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر براجمان ہو گئے۔ ویل ڈن۔ ماہا ایمان کبھی کبھی محکمہ ڈاک کی مہربانیوں سے بلیک لسٹ میں بھی قیام کرنا پڑتا ہے۔ اشتیاق احمد آخر آپ دوبارہ آئے تو۔ چاہے کشکول کی وجہ سے بھی آئے میرا خط پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ سید شکیل حسین کاظمی، آپ بہت محتاط ہیں۔ جو اشتہارات کی خواتین سے بھی پہلو بچاتے ہیں۔ تفسیر عباس بابر آپ نے بڑی اچھی بات کی۔ ہمایوں سعید راج واقعی آپ کے خیالات خوبصورت اور قابل تقلید ہیں۔ محمد فیضان غنی خوش آمدید۔ شارقہ سلجوق صاحبہ اور ادریس احمد خان کا تبصرہ واقعی بہت اچھا تھا۔ حاجی اے حکیم صاحب واقعی آپ مدیرہ صاحبہ کی بات پر ضرور غور کیجیے گا۔ ہم سے یوں ناتا نہ توڑیے گا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تاریخی کہانی جہد حاصل واقعی عبرت آمیز اور سبق آموز ہے۔ شیر شاہ سوری واقعی تاریخ کا ایک ایسا کردار ہے۔ جسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ایم اے راحت کے کالے راستے پسند آئی۔ واقعی شراب ہو یا شباب انسانی عقل کا جنازہ نکالنے کا باعث بنتا ہے۔ کشکول کی قسط بھی اس بار بہت آگے بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ آخر میڈم روبی کو افضل خان کی دسترس سے بچا لیا گیا۔ منظر امام کی کہانی کند ہم جنس بھی خوب ہے۔ محبت کے کئی روپ ہیں ...... یہ ہر روپ میں خود کو منواتی ہے۔ بقول شاعر۔

مانا کہ پرخطر ہیں محبت کی منزلیں
لیکن سکون دل بھی انہی منزلوں میں ہے

کاشف زبیر صاحب بھی ایک منجھے ہوئے رائٹر ہیں۔ اس بار ان کی کاوش تلاش اچھی لگی۔ مرزا امجد بیگ صاحب کی تحریر نرم چارا بھی ہمیشہ کی طرح ان کی پیشہ وارانہ چابکدستی کا کارنامہ ہے۔ عینی شاہد بھی اچھی کاوش ہے۔ خون رنگ تو ضرور رلاتا ہے۔ بے زبان نے واقعی کیس کو حل کرنے میں بڑی مدد کی۔ محفل شعر وسخن میں راجا افتخار علی (چوآسیدن شاہ)، رضوان احمد (لاہور) کے اشعار زیادہ اچھے لگے۔ باقی اشعار بھی خوب ہیں۔ صفحہ نمبر 95 پر ماہا ایمان کی شرارت پسند آئی۔ اس کے علاوہ صفحہ نمبر 195 پر فاطمہ واحد (کراچی) کے اقوال زریں ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔"

✠ **حاجی عبدالحکیم**، شاہدرہ ٹاؤن، لاہور سے محفل میں تشریف لائے ہیں "میرا پیارا راج دلارا سسپنس مجھے مورخہ 2 نومبر سسپنس اور جاسوسی کے قارئین، مالکان اسٹاف اور سسپنس میں کام کرنے والے تمام اسٹاف کی دعاؤں اور دلی جذبات کا ترجمان بن کر میرے سینے سے آ لگا۔ پچھلے خط میں، میں نے آپ کو آگاہ کیا تھا کہ میں آئندہ آپ کو خط نہیں لکھوں گا میں ان تمام قارئین کا مشکور ہوں اور خاص طور پر آپ کے چند پرخلوص الفاظ نے جن میں آپ نے لکھا ہے (ہم سے یوں ناتا نہ توڑیں۔ قارئین کی معمولات میں اضافے کے لیے نصیحت آموز ارشادات اور اقوال ضرور بھیجیے) ان خوبصورت خیالات اور اظہار کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جن میں، میں آپ سب کا شکریہ ادا کروں۔ بس آنکھوں میں خوشی کے آنسو ہیں اور لب پر آپ سب کے لیے دلی دعائیں۔ آپ سب کی دعاؤں اور اللہ کے کرم اور حضرت داتا گنج بخش کے وسیلے سے مانگی ہوئی دعاؤں کے طفیل میری زوجہ محترمہ چار سال تک بستر پر صاحب فراش رہنے کے بعد صحت یاب ہو گئیں اور حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر اپنے پیروں پہ چل کر ان کو نذرانہ عقیدت پیش کر کے آئی ہیں۔ انشا اللہ تعالیٰ آپ سب سے قلم کا رشتہ قائم رہے گا۔ اب آتے ہیں پیارے سسپنس کی نگارشات کی طرف۔ سرورق پر عید مبارک کا تحفہ اور عید کی نسبت سے ہی سرورق کی حسینہ کے ہاتھوں پر لگی ہوئی مہندی اور سبز لباس عید کی خوشیوں کو دوبالا کرنے پر ذاکر صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ قاضی محمد قیصر شہزاد کو کرسی صدارت پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ ماہا ایمان بیٹی آپ کو اپنا نام بلیک لسٹ میں دیکھ کر اتنا مایوس نہیں ہونا چاہیے تھا حالانکہ ہمیں اپنے پہلے ہی خط کا جواب بلیک لسٹ میں ملا تھا، بہرحال تمام قارئین نے آپ کا نام بلیک لسٹ میں دیکھ کر مایوسی کا اظہار کیا ہے آپ اپنی مقبولیت کا اندازہ اسی سے لگا سکتی ہیں۔ شارقہ سلجوق صاحبہ نواب صاحب نے اپنی دوسری کہانی لکھ کر واپسی کا گلہ دور کر دیا ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے کشکول کا مطالعہ کیا۔ کشکول کے ہیرو کا [illegible] ابھی یہ کہانی بہت سے موڑ لے گی۔ ساجد امجد صاحب کے جہد حاصل کا مطالعہ کر لیا ہے کاش وہ درجہ بہ درجہ ہندوستان کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر تک لے جا کر اس کا اختتام کرتے۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

عصمت علی، نیاز علی، سوات۔ طاہرہ یاسمین، سرگودھا۔ محمد نعمان پیارے، تلمبہ۔ غلام عباس، گلشن ٹاؤن، گڑھ موڑ۔ ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی۔ تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ۔ ایم اے ایل اے، مانسہرہ۔ محمد جاوید بلوچ، علی پور۔ ریاض حسین شاہد جیانی، تونسہ شریف۔ عدنان یوسف، بنوں۔ حبیب الرحمن، سینٹرل جیل لاہور۔

اور اب جناب اس کے ساتھ ہی ہمیں بھی اس محفل سے اجازت دیجیے۔ انشا اللہ اگلے ماہ پھر آپ کی رائے اور ہماری میزبانی اس محفل کی زینت بنیں گے۔

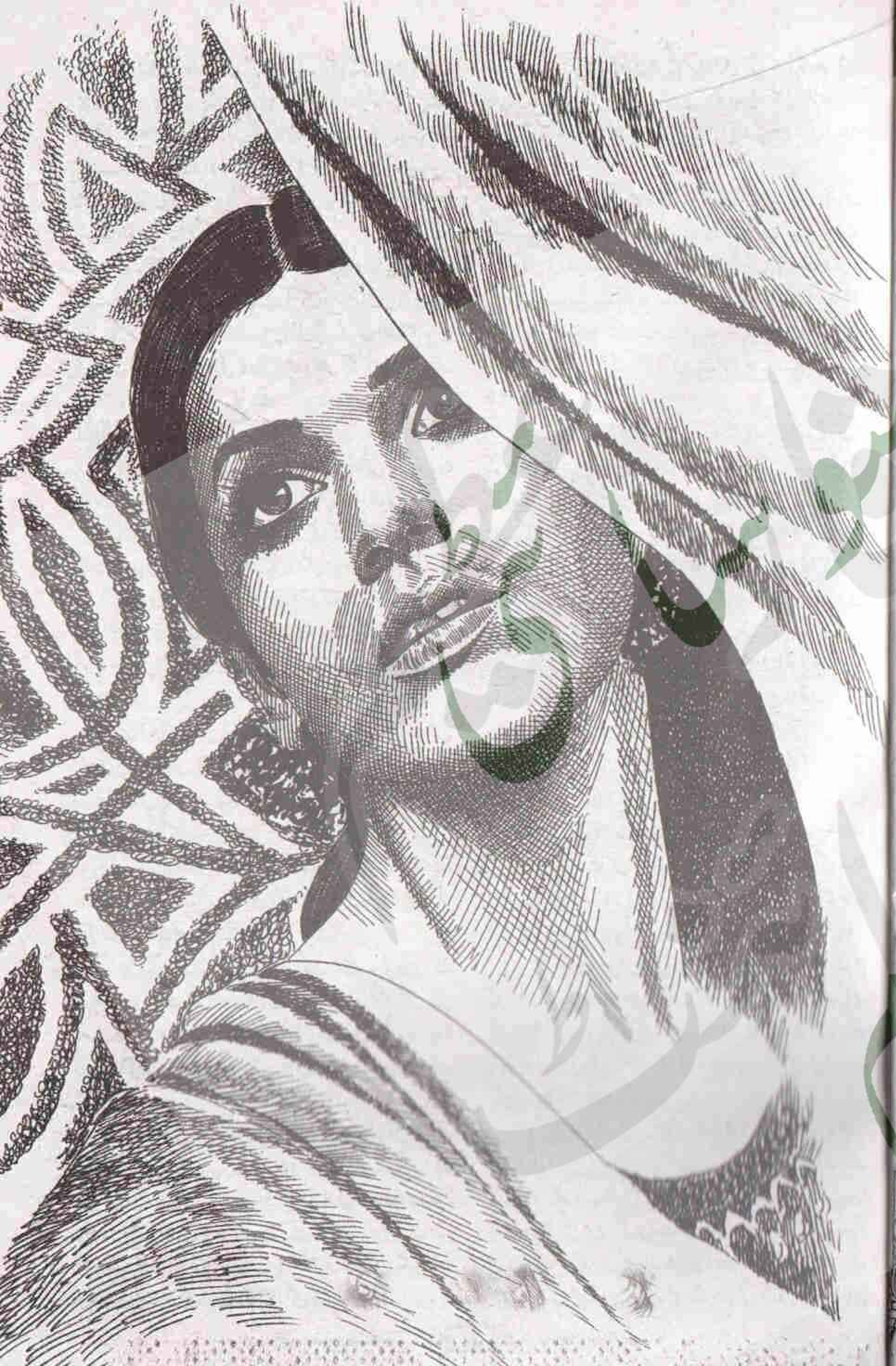

جنگ آزما

ڈاکٹر ساجد امجد

سمرقند ایک تاریخی مقام... کہ جس کے دامن میں بے شمار واقعات نے جنم لیا... کتنے ہی یادگار چہروں نے اس کی شان بڑھائی... جس کے ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم ہوتی رہی... تاریخ کے اوراق اس شہر زرنگار کے ذکر سے خالی نہیں رہ سکتے۔ ایک بارہ سالہ بچہ... امیر تیمور کا پوتا، ظہیر الدین بابر... جس کا باپ اچانک اقتدار کی مسند سے ہٹا تو وہ ایک بھرپور جوان کی سج دھج سے مرد مجاہد کے روپ میں میدان میں اتر آیا... ایک اور تاریخی کردار خانزادہ، جس نے اپنے بھائی بابر کو اولاد کی طرح چاہا۔ تاریخ نے بہن کی قربانی اور بھائی کی اس محبت کو ایک دلسوز فسانے میں ڈھال دیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جدائی کے مقام پر وہ نم آنکھوں سے مڑمڑ کر پیچھے دیکھ رہا تھا حالانکہ وہ پلٹ کر دیکھنے کا قائل ہرگز نہ تھا مگر... کسے خبر تھی کہ وہ پیچھے رہ جانے والی دھول کو نہیں بلکہ بہن کی اس محبت کو تلاشنے کی کوشش کر رہا تھا جو انتہائی نرمی سے ریت کے مانند اس کی بند مٹھی سے پھسلتی جا رہی تھی مگر وہ اپنے بلکتے جذبوں پر بادشاہت کا پردہ ڈالے آگے بڑھ جانے پر مجبور تھا۔ تاریخ کی یہ کتاب جب جب کھولی جائے گی... ماضی کے یہ اوراق اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ رہیں گے۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

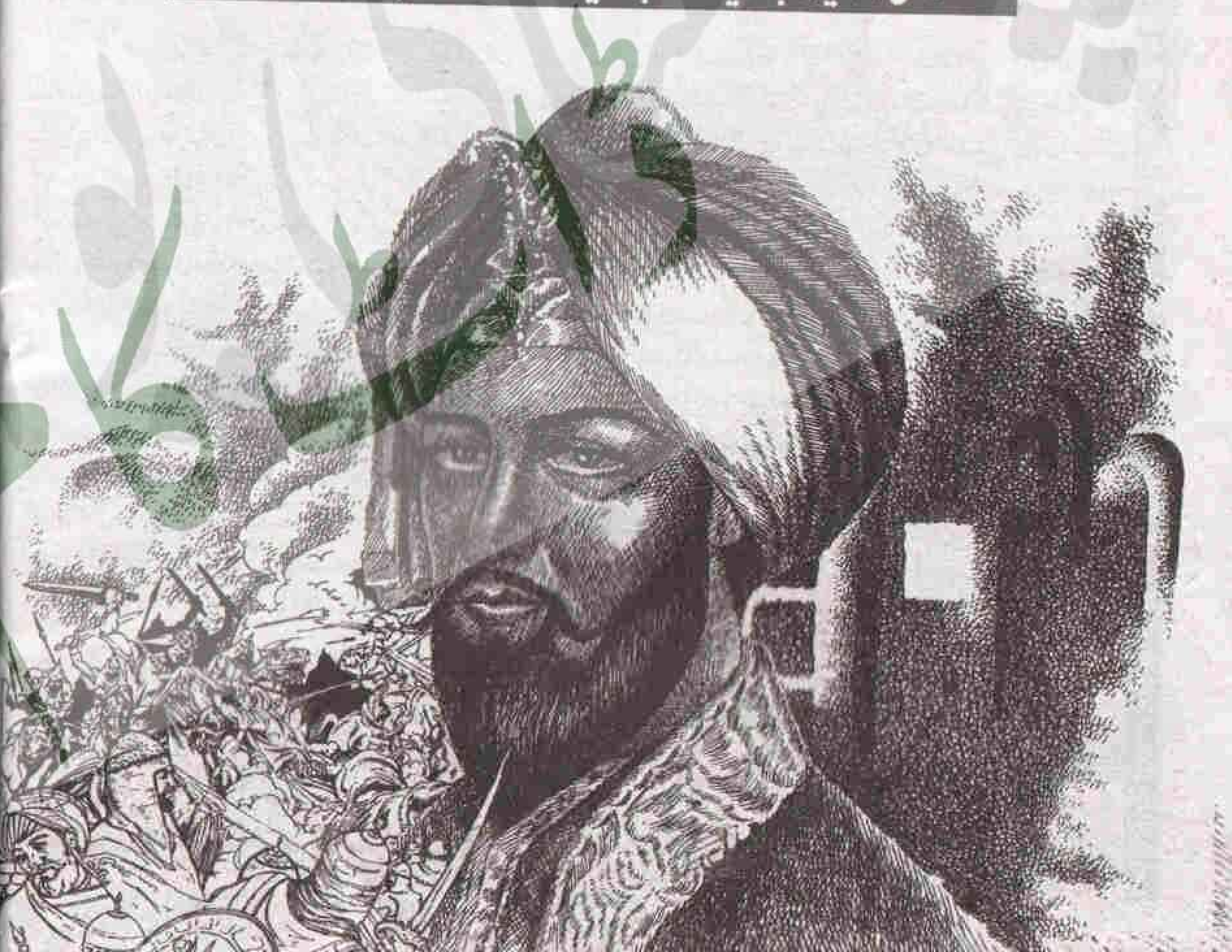

وادی فرغانہ میں فصلیں پک چکی تھیں۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ پہاڑوں کی چوٹیوں سے شاہ دانہ کے باغوں تک دھوپ پھیلی ہوئی تھی لیکن اچانک بادلوں کے چند ٹکڑے آتے تھے اور وادی پر شامیانہ سا تن جاتا تھا۔ دھوپ چھاؤں کا یہ کھیل بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی کھلکھلا کر ہنسے اور پھر خاموش ہوجائے۔

فرغانہ کوئی زیادہ بڑی سلطنت نہیں تھی۔ اس میں کل سات نمایاں شہر تھے۔ اندجان، آخشی، مرغنیان یا مرغیناہ، اوش، اسفرہ، خجند اور کاشان۔ ان میں بھی آخشی اور اندجان ہی قابل ذکر تھے۔ وادی کا رقبہ زیادہ نہیں تھا لیکن یہاں غلہ اور پھل افراط سے ہوتے تھے۔ اگر بندوبست میں بہتری آتی تو مزید خوش حالی آسکتی تھی۔

وادی کے مشرق میں کاشغر، مغرب میں سمرقند اور جنوب کی طرف بدخشاں کی پہاڑیاں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ مغرب کی سمت پہاڑیاں نوکیلی نہیں تھیں۔ یہی وہ راستہ تھا جہاں سے دشمن فرغانہ میں داخل ہوسکتا تھا۔

دریائے سیحون اس وادی کے شہر خجند سے گزر کر شمال کا رخ کرتا ہوا ترک قبائل کی میدانی زمینوں میں پہنچتا تھا اور پھر کوئی معاون ندی نہ ملنے کی وجہ سے ریگستان میں جذب ہوجاتا تھا۔

پہاڑی پر نرسل کے جھنڈ تھے، نیچے سرسبز چراگاہ میں مویشی چرتے پھرتے تھے۔ کہیں کہیں قبائلی لوگ چری جھول داریوں میں فرش پر بیٹھے ہوتے اردگرد چند بھیڑیں اور کالی بکریاں ہوتی تھیں۔

فصل کی تیاری اور بہار کی آمد پہ بستیوں میں میلے لگتے تھے۔ خوب شراب پی جاتی تھی، خوب پانسا کھیلا جاتا تھا۔ گھڑ دوڑ کے مقابلے ہوتے تھے۔

ہر بستی کے اپنے الگ رنگ تھے۔ آخشی کے خربوزے لذت میں اپنی مثال آپ تھے۔ خجند میں رس بھرے انار ہوتے تھے۔ اس کی پہاڑیوں میں اعلیٰ درجے کا فیروزہ ملتا تھا مگر سانپوں کی کثرت بھی تھی۔ مرغینان کی خشک خوبانیاں اور مکا باز پہلوان مشہور تھے۔

آخشی اپنے خربوزوں کے علاوہ اس لیے بھی اہم تھا کہ یہاں فرغانہ کا سب سے قدیم و مستحکم قلعہ تھا۔ یہ قلعہ ایک بلند پہاڑی پر بنایا گیا تھا۔ ڈھلوان ندی نالے اس کے پہلوؤں میں خندق کا کام دیتے تھے۔ قلعے کے سامنے دریا بہتا تھا۔ قلعے اور بستی کے درمیان صحرا تھے جن میں سفید ہرنوں کی بہتات تھی اور باز کا شکار بھی خوب ہوتا تھا۔

وادی فرغانہ کا والی عمر شیخ مرزا اسی بستی میں مقیم تھا لیکن بعد میں وادی کے مشرقی سرے پر ''اندجان'' میں مقیم ہوگیا۔ یہاں بھی ایک قلعہ تھا۔ خندق کا کام ایک چھوٹی ندی انجام دیتی تھی۔

عمر شیخ مرزا کو کبوتر پالنے اور انہیں ہوا میں پلٹیاں کھاتے ہوئے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے نامہ بر کبوتروں کی نایاب نسل اپنے کبوتر خانے میں رکھی ہوئی تھی۔ یہ کبوتر خانہ دریائے سیحون کے ایک بلند کنارے پر بنا ہوا تھا۔ عمر شیخ یہاں کے گھنے جنگلات میں شکار کھیلتا تھا اور کبوتروں کی نگہداشت باقاعدگی سے کرتا تھا۔ اپنے ہاتھ سے دانہ ڈالتا تھا۔

''عمر شیخ مرزا کی فیاضیاں وسیع تھیں۔ اسی طرح اس کا دل وسیع تھا۔ بڑی بڑی امیدوں اور شاندار منصوبے باندھتا تھا اور ہمہ وقت کشور کشائی کی تجویزیں سوچا کرتا تھا لیکن جب کبھی مہم جوئی پہ نکلا شکست کھا کر مایوس و نامراد واپس آیا۔

وہ امیر تیمور کے چوتھے جانشین ابوسعید مرزا کا چوتھا فرزند تھا۔ کسی قدر پستہ قامت، تراشیدہ نکیلی ڈاڑھی، سرخی مائل بال اور بھاری بھرکم جثہ۔ اتنا تنگ لباس پہنتا کہ پیٹ دبا کر بند باندھے جاتے اور بدن ڈھیلا چھوڑتا تو اکثر ٹوٹ جاتے۔ غذا اور لباس کے بارے میں بے پروا تھا۔ ڈھیلی دستار کے دونوں سرے لٹکے رہتے تھے۔ گرمیوں میں مغلی ٹوپی اوڑھا کرتا تھا۔ اپنے عقائد میں پکا تھا۔ پابندی سے پنج وقتہ نماز ادا کرتا اور اکثر قرآن شریف کی تلاوت کرتا تھا لیکن شاہ نامہ پڑھنے کا اسے بہت شوق تھا۔ تیرانداز بھی برا نہ تھا لیکن اس کے مکے میں غضب کی قوت تھی۔ جس کے بھی مارتا وہ گرے بغیر نہ رہتا۔ ناؤنوش کی محفلوں میں شریک ہوتا تھا۔ اکثر چوسر اور کبھی کبھی پانسوں سے کھیلتا تھا۔'' (تزک بابری)

اس کی کئی بیویاں تھیں۔ ان بیویوں میں قتلق نگار خانم کا مرتبہ سب سے بلند تھا۔ کیونکہ وہ ولی عہد ظہیر الدین محمد بابر کی والدہ تھی۔ بابر کی ایک بہن خانزادہ بیگم تھی جو اس سے پانچ سال بڑی تھی۔ قتلق نگار خانم کے بعد اگر کسی کی اہمیت تھی تو وہ فاطمہ سلطان تھیں۔

کہنے والے کہتے تھے کہ 1483ء کا موسم سرما تھا۔ فرغانہ کی وادی کو برف نے محصور کر رکھا تھا۔ پہاڑ برف کے بن گئے تھے جب عمر شیخ کے چوبی محل میں اس کا ولی عہد پیدا ہوا تھا۔ عمر شیخ مرزا تقریبات کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔ یہ تو ایسا موقع تھا کہ اس کا وارث پیدا ہوا تھا۔ وادی کے سب گھروں کی عورتوں نے رسم کے مطابق رنگا رنگ قالین

گھروں کی دیواروں کے باہر لٹکا دیے تھے۔ وادی کے گوشے گوشے سے قبائلی سردار گھوڑوں پر سوار جوق در جوق چلے آتے تھے۔ کئی روز تک خوب دعوتیں ہوئیں۔ شراب کے دور چلتے رہے۔

اس کی بہن خانزادہ بیگم صرف پانچ سال کی تھی لیکن بڑی بوڑھیوں کی طرح اسے گود میں لیے بیٹھی رہتی تھی۔ بھائی کی شکل میں اسے کھلونا مل گیا تھا۔

قتلق نگار خانم کو اس خوشی کے موقعے پر اپنے باپ یونس خان اور ماں ایسان کی بہت یاد آرہی تھی جو تاشقند کا حاکم تھا۔ اس کے علاقے میں کچھ ایسے حالات ہوگئے تھے کہ وہ بہت دن تک نہ آسکا۔ یہاں تک کہ ایک سال گزر گیا۔ پھر اس کے آنے کا غلغلہ بلند ہوا۔ عمر شیخ مرزا اپنے سسر کے استقبال کے لیے ایک منزل آگے تک گیا۔ وہ آیا تو پوری شان و شوکت کے ساتھ۔ قبائل کی فوج کی فوج اس کے ساتھ تھی جن کی نفیریوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ گھوڑوں پر بڑے بڑے دف دھرے ہوئے تھے جو زور زور سے بجائے جارہے تھے۔ یونس خاں بوڑھا ہوچکا تھا لیکن اس کا بدن کسا ہوا تھا۔ اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ تھی۔ گہرے رنگ کا پوستین پہنے ہوئے تھی۔ سفید رومال اس کے سر پر بندھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کسی شکرے کی آنکھوں کی طرح ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ خطرے کو بھانپ جانے والا مزاج ہے۔

یونس خاں ننھے نواسے کے لیے تحائف لے کر فرغانہ آیا تھا۔ قلعے کی سب عورتیں اسے دیکھ کر آداب بجالائیں۔ ایسان کو ایک بلند جگہ بٹھایا گیا۔ خانزادہ بیگم نانی کے پہلو سے لگ کر بیٹھ گئی۔ ایک سالہ ظہیر الدین نانا، نانی کے روبرو پیش کیا گیا۔ بوڑھا مغل یونس خاں چونکہ بچے کا نام ظہیر الدین محمد ادا نہ کرسکتا تھا لہٰذا اس نے پیار سے اسے بابر کے نام سے مخاطب کیا جس کے معنی چھوٹے شیر یا شیر کا بچہ تھے۔ پھر یہی عرفیت تاریخ کا حصہ بن گئی۔ ظہیر الدین کسی کو یاد بھی نہ رہا۔ سب اسے بابر پکارنے لگے۔

بابر پانچ سال کا ہوا تو اسے سمرقند جانے کا موقع ملا۔ یہاں اس کا چچا سلطان احمد مرزا حکمران تھا۔ جانے کی سبیل یہ بنی تھی کہ عمر شیخ مرزا نے اپنے بھائی سلطان احمد مرزا سے تنازعات ختم کرنے کے لیے اس کی بیٹی عائشہ سے اس کی منگنی طے کردی تھی لہٰذا دلہن کے گھر جانا ضروری تھا۔

یہ پہلا موقع تھا جب اس نے وادی سے باہر قدم رکھا تھا۔ سمرقند کی زیب و زینت دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا۔ شاندار باغات اور ان میں بنے محلات، دھوپ میں چمکتے مقبرے، لاجوردی گنبد، امیر تیمور کا مقبرہ گور امیر اور سب سے زیادہ حیران کن گونجتی مسجد جس کا پکارنے والا نظر نہیں آتا۔ یہ سب چیزیں اس کے لیے جادو کی دنیا جیسی تھیں۔ جب اسے ''باغ دلکشا'' لے جایا گیا تو بارہ دری میں امیر تیمور کی فتح ہند کی منقوش تصویریں دیکھ کر اس کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ یہ دیکھ کر تو وہ مبہوت ہی ہوگیا کہ اسی جیسے شہسوار عجیب قسم کے جانوروں کو بھگا رہے ہیں۔ یہ جانور اس کے لیے اجنبی تھے۔ اپنی وادی میں یہ جانور اس نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ پھر اسے بتایا گیا کہ یہ ہاتھی ہیں، ہندوستان ایک ملک ہے اور یہ وہاں پائے جاتے ہیں۔

ان عجائبات کو دیکھنے کے بعد منگنی کی رسم ادا کرنے کا وقت آیا۔ رسم کا وقت آیا اور شہزادی عائشہ کو لایا گیا تو کسی نے پوچھا، عائشہ تمہیں کیسی لگی۔ اس نے عجیب و غریب جواب دیا۔ ''باغ دلکشا میں ہاتھی کی تصویر بہت اچھی تھی۔'' بات ہی ایسی تھی کہ ہر طرف قہقہے گونجنے لگے۔ عائشہ ایسی گھبرائی کہ الٹے پاؤں بھاگ کھڑی ہوئی۔ قہقہے اب بھی اس کا پیچھا کر رہے تھے۔

خانزادہ بیگم جب شام کو عائشہ کے پاس گئی اور پوچھا کہ اس کا بھائی اسے کیسا لگا تو اس نے بھی بدلہ چکا دیا۔ ''بالکل پہاڑی بکرا جس کے سینگ بھی ابھی نہیں نکلے۔'' خانزادہ اب دس سال کی ہوگئی تھی۔ اس نے ضروری نہیں سمجھا کہ پانچ سال کی بچی کی بات کا جواب دے۔ اس نے یہ بات بابر کو بھی نہیں بتائی لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ بابر کبھی اس سے متاثر ہوا ہی نہیں تھا اور نہ کبھی ہوسکا۔ یہی حال عائشہ کا بھی تھا۔

نانا کے انتقال کے بعد اس کی نانی بھی فرغانہ میں آکر رہنے لگی تھی۔ نانی کی شکل میں بابر کو اس کی حمایتی مل گئی تھی جو اس کی شرارتوں سے لطف اندوز ہوتی رہتی تھی۔ اس کی جا و بے جا طرف داری بھی کرتی رہتی تھی۔

جب بابر سات سال کا ہوگیا تو اسے زنان خانے سے باہر بھیج دیا گیا۔ اب اسے اپنے باپ کے ساتھ رہنا تھا۔ اس کا باپ تعلیم یافتہ نہیں تھا لیکن چاہتا تھا کہ بابر کو تمام دنیا کا علم سکھا دے۔ اندجان کے میوہ باغ میں وہ استاد کے آگے دوزانو ہوکر پڑھنے لگا۔ استاد کو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ کیا پڑھانا ہے۔ استاد اسے حساب کے مسائل، ستاروں کے نقشے، اسلامی تعلیمات اور خاندان کی کئی پشت کی تاریخ تیمور و چغتائی تک پڑھاتا رہا۔ بہت جلد اس کے حافظے میں معلومات کا خزانہ جمع

ہوگیا۔ فردوسی، سعدی اور نوائی کے سیکڑوں اشعار اسے زبانی یاد ہوگئے تھے۔ پرانی ترکی، کوچہ و بازار کی فارسی بولی اور اہل علم کی فصیح فارسی و عربی پر اسے قدرت حاصل ہوگئی کہ یہی تین زبانیں اس کے گرد و پیش بولی جاتی تھیں۔ انہی زبانوں کے اثر سے وہ خود بھی شعر کہنے لگا تھا۔

بابر شہزادہ تھا پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ صرف کتابوں تک محدود رہتا۔ فنِ سپہ گری بھی اس کی تعلیم میں شامل تھے چنانچہ اسے دربار کے ماہرینِ جنگ کی شاگردی میں دے دیا گیا۔

سردار قاسم محل سرا کا داروغہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بابر کو دشمن کو تیز رفتار تیر سے پہلے ضرب لگا کر بے کار کر دینے کی ترکیب سیکھنی چاہیے۔

ایک اور بہادر جو سلاخ کے عرف سے مشہور تھا، اس نے بابر کو سواری کی حالت میں ڈھیلی زرہ اور ہلکا خود پہن کر لڑنا سکھایا۔ گھوڑے پر بیٹھ کر تلوار گھمانے اور دشمن کے وار سے بچنے میں ڈھال کو حرکت دینے کی مشق کرائی۔

ایک اور امیر حسن یعقوب نے اسے گھٹنے کے زور سے گھوڑا بھگانے کے گر سکھائے۔

ایک اور بڑی درس گاہ خود اس کا باپ عمر شیخ مرزا تھا جو اسے سمرقند، موروثی تخت اور میدانی علاقے کے تاشقند پر قبضہ کرنے کے منصوبے سنا سنا کر اس کے خون کو گرماتا رہتا تھا۔ جب شکار کے لیے نکلتا تو بابر اس کے ساتھ ہوتا۔ شکار کے یہ جھمیلے اس کی عملی تربیت کا حصہ تھے۔

اس کے دو سوتیلے بھائی جہانگیر مرزا اور ناصر مرزا بھی اب اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے تھے۔

☆☆☆

امیر تیمور جب اس دنیا سے رخصت ہوا تو دنیا کے ایک بڑے حصے پر اس کی فتوحات کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ بڑے بڑے بادشاہوں کے سروں کو نگوں کیا اور ہر معرکے سے کامران و سرخ رو نکلا۔ اس کی فتوحات سلاطینِ عالم میں ضرب المثل ہیں۔ اس نے چھتیس سال کی مدت میں ماوراءالنہر، خوارزم، ترکستان، خراسان، آذربائی جان، فارس، مازندران، کرمان، خوزستان، مصر، شام، اکثر بلاد روم اور ہندوستان کا پائے تخت دہلی تک فتح کرلیا۔ اپنے مفتوحہ ممالک میں اس نے شکست خوردہ سلاطین کو ہی مامور رکھا البتہ خطبہ و سکہ اپنے نام کا جاری کر دیا۔

یہ مفتوحہ علاقے اس کی وفات کے بعد اس کی اولادوں کے ہاتھوں سے آہستہ آہستہ نکلتے گئے۔ ان میں مغلوں کی دو بڑی شاخوں کی معرکہ آرائیوں کا بھی بہت ہاتھ تھا۔

اس کے چوتھے جانشین ابو سعید مرزا کو موقع ملا تو اس نے بخارا میں علم بغاوت بلند کر کے اپنے چچا زاد بھائیوں کو مغلوب کیا اور تختِ موروثی پر جلوس فرمایا۔ بہت ہی کم مدت میں اس کی سلطنت میں ماوراءالنہر، بدخشاں، کابل اور غزنی شامل ہوگئے۔ پورے ترکستان میں اس کا خطبہ و سکہ جاری ہوگیا۔ سلطنت کے آخری ایام میں عراق پر بھی اس کا تسلط ہوگیا۔ اس کی سلطنت اس کے چار بیٹوں میں تقسیم ہوئی۔ باقی علاقے مغلوں اور ترکوں میں بٹ گئے۔ سلطان احمد مرزا سمرقند کا فرماں رواں ہوا۔ دوسرے بھائی سلطان محمود کی حکومت مازندان میں تھی۔ عمر شیخ کی ان دونوں سے کبھی نہیں بنی۔ دونوں کی نظر خوبصورت وادی فرغانہ پر تھی۔ اس کے حصول کے لیے وہ بار بار ادھر کا رخ کرتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ عمر شیخ کے پاس زیادہ فوج نہیں۔ ویسے بھی وہ طالع آزما نہیں۔ ازحد بے پروا اور لاابالی ہے۔ اس پر قبضہ آسان ہوگا لیکن عمر شیخ کی شادی یونس خاں کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ یونس خاں اس کی پہرے داری کرتا رہتا تھا۔ عمر شیخ کے بھائیوں پر اس کا خوف طاری تھا، اس لیے ذرا دور دور رہتے تھے۔

یونس خاں کے مرنے کے بعد وہ سب آزاد ہوگئے۔

اسی صورت حال کو دیکھتے ہوئے عمر شیخ مرزا نے بابر کی منگنی سلطان احمد کی بیٹی عائشہ سے کی تھی تاکہ دشمنی کی حدت میں کمی آجائے لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔

☆☆☆

بھورے گھوڑوں کا ایک غول چراگاہوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ان پر بیٹھے ہوئے سوار سب کے سب مسلح تھے۔ عام طور پر چراگاہوں کا رخ کرنے والے سوار مسلح نہیں ہوتے تھے۔ یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ ہر گھوڑے کی پیٹھ پر ایک سوار ہو۔ گھوڑوں کو چرانے کے لیے چند سوار ہی کافی سمجھے جاتے تھے۔ یہ تو کوئی اور ہی ماجرا تھا، البتہ یہ لوگ جلدی میں نہیں تھے۔ انداز سے یہی ظاہر ہوتا تھا جیسے واقعی گھوڑے چرانے نکلے ہیں۔ کھلے میدان میں ہری گھاس کا فرش بچھا تھا۔ پہاڑیوں کھڑے تھے جیسے حفاظت پر مامور ہوں۔

دوپہر ہوگئی تھی۔ چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ سوار آپس میں ہنسی مذاق کرتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے تھے کہ اچانک کسی نے سب سے آگے چلنے والے سوار کو پکارا۔

”سلطان احمد! موسم کے تیور دیکھ رہے ہو۔ مشرق کی سمت سے کیسی کالی گھٹا بڑھتی چلی آرہی ہے۔“

”دیکھ تو رہا ہوں۔“ سلطان احمد نے گھوڑے کی باگیں کھینچیں اور گردن گھماتے ہوئے کہا۔ ”کچھ دیر نہیں گزرے گی کہ سورج بادلوں میں گھر جائے گا۔“

”موسم کا بھی کچھ ٹھیک نہیں۔ ابھی کیسی چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔“

”یہ بارشوں کا موسم نہیں۔ بادل بغیر برسے گزر جائے گا۔“

”سلطان احمد، میرے خیال میں ہمیں واپس سمرقند لوٹ جانا چاہیے۔ اگر واقعی بارش ہوگئی تو ہماری مہم ناکارہ ہوجائے گی۔ فرغانہ کے دریا چھلک گئے تو اور بھی مصیبت آجائے گی۔“

”اب لوٹنا مردانگی کے خلاف ہے۔ بس کچھ ہی فاصلہ رہ گیا ہے۔ سلطان محمود اپنے گھوڑوں کے ساتھ آخشی کی طرف چلا جائے گا۔ ہم اندجان کے سامنے جا کر کھڑے ہوجائیں گے۔ اتنی دیر میں ہماری باقی فوجیں بھی ہماری کمک کے لیے آجائیں گی۔“

”اندجان کوئی یہاں رکھا ہے۔“

”بزدلی کی باتیں مت کرو۔ کان دبا کے چلتے رہو۔ بس اتنا کرو کہ گھوڑوں کی رفتار تیز کردو۔“ سلطان احمد نے کہا اور اپنے گھوڑے کی باگیں قدرے ڈھیلی کردیں۔

باتوں میں انہیں خیال ہی نہیں رہا تھا کہ دھوپ کی جگہ اندھیرے نے لے لی تھی۔ کچھ ہی دور آگے چلے تھے کہ بادلوں کی چھلنی اپنا بوجھ ہلکا کرنے لگی۔ سلطان احمد نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھا اور ایک مرتبہ پھر گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔

”بارش تیز ہونے والی ہے۔ اب واپس جانا بھی مشکل ہے اور آگے بڑھنا بھی۔ آخشی اور اندجان کے قلعوں کی خندقیں پانی سے بھر چکی ہوں گی۔ موٹے عمر شیخ کی قسمت اچھی ہے جو بے موسم کی بارش نے میرے قدم پکڑ لیے۔ اب یہی ہوسکتا ہے کہ کسی پہاڑ کو سائبان بنا کر بارش تھمنے کا انتظار کریں اور فی الوقت واپس لوٹ چلیں۔ اگر بارش جلدی رک جائے تو آگے بڑھیں گے ورنہ نہیں۔“

وہ بارش سے بچنے کے لیے پہاڑوں میں ادھر ادھر پھیل گئے۔ کچھ سواروں نے اپنے گھوڑوں کو چرنے کے لیے میدان ہی میں چھوڑ دیا تھا۔

عمر شیخ کی محل سرا کا داروغہ قاسم بیگ کسی کام سے خجند گیا ہوا تھا۔ واپسی میں بارش نے اسے گھیر لیا۔ اس کے دو محافظ بھی اس کے ساتھ تھے۔ بارش تیز ہوگئی تھی اور ... جانے

کہاں سے پانی آ گیا تھا کہ دریائے سیحون لباب لب بھر گیا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ ایسے علاقے میں تھا جہاں پہاڑیاں نوکیلی نہیں تھیں۔ فرغانہ میں داخل ہونے کا یہی ایک محفوظ راستہ تھا۔ اس نے دریا پار کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا اور پہاڑوں میں داخل ہو کر اس محفوظ راستے کی طرف چل دیا جہاں سے بیرونی دشمن بہ آسانی داخل ہوتے تھے۔ سلطان احمد مرزا کے گھڑسوار بھی یہیں پناہ لیے ہوئے تھے۔

اس نے چند گھوڑوں کو چرتے ہوئے دیکھا تو چوکنا ہو گیا۔ ہاتھ کے اشارے سے اپنے محافظوں کو رکنے کے لیے کہا۔ خطرے کی بو سونگھ لینے کی اس میں خاص صلاحیت تھی۔ اس وقت بھی وہ اپنی اس صلاحیت سے پوری طرح کام لے رہا تھا۔ وہ فوراً ایک پہاڑ کی اوٹ میں ہو گیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کون اس طوفانی بارش میں اپنے گھوڑوں کو یہاں چھوڑ گیا ہے۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ جو بھی ان کا مالک ہوگا وہ ضرور ان پہاڑوں میں چھپا ہوا ہوگا۔ وہ گھوڑے سے اتر گیا۔ اپنے محافظوں کو وہیں چھوڑا اور خود پہاڑوں کو ٹٹولتا ہوا کوئی آواز سننے کے اشتیاق میں آگے بڑھنے لگا۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازوں نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔ اس کا مطلب ہے چراگاہ میں چند ہی گھوڑے ہیں۔ باقی گھوڑے یہاں بندھے ہوئے ہیں۔ وہ چٹان کی ایک دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ یہاں بارش سے بھی محفوظ تھا اور اندر سے آنے والی آوازیں بھی سن سکتا تھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ایک آواز ابھری۔

”سلطان احمد، کیا اب بھی تم فرغانہ کی طرف جاؤ گے؟“

اس کے جواب میں کیا کہا گیا.... یہ وہ نہیں سن سکا کیونکہ وہ اس نام میں الجھا ہوا تھا۔ کہیں یہ والی سمرقند سلطان احمد مرزا تو نہیں جسے آواز دے کر مخاطب کیا جا رہا ہے۔ کچھ دیر بعد اسے کوئی شک نہیں رہا کہ یہ وہی ہے۔

”اکبر محمود، تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس وقت فرغانہ کی طرف جانا بے کار ہوگا۔ بارش ذرا کم ہو تو میں اپنے علاقے کی طرف لوٹ جاؤں گا تم اپنے علاقے کی طرف چلے جاؤ۔ موقع آتے ہی ہم پھر ایک جگہ جمع ہوں گے۔“

قاسم بیگ کے لیے یہ نام بھی اجنبی نہیں تھا۔ اکبر محمود، یونس خاں کا بیٹا یعنی بابر کا سگا ماموں تھا۔ اب اسے کڑیاں جوڑنے میں دیر نہیں لگی۔ یہ دونوں یہاں موجود ہیں غالباً دونوں کے درمیان معاہدہ ہو چکا ہے۔ دونوں مل کر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں لیکن بارش نے ان کے منصوبے کو خاک میں ملا دیا ہے۔ اسے اپنے آقا پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ دشمنوں میں گھرا ہوا ہے اور فرسنگ دو فرسنگ پر کوئی چوکی تک قائم نہیں کی ہے جو دشمن کو کچھ دیر کے لیے روک سکے یا کم از کم اطلاع پہنچا سکے۔

اس نے چٹان کی دیوار چھوڑ دی۔ اب میدان سے ہو کر گزرنا اس کے لیے ٹھیک نہیں تھا۔ غنیم کی نظر اس پر پڑ سکتی تھی۔ اس نے دونوں محافظوں کو ساتھ لیا اور میدان کی طرف جانے کے بجائے جنگل میں اتر گیا۔ یہاں سے بھی ایک راستہ اندجان کی طرف جاتا تھا بس ذرا طویل تھا۔

قاسم بیگ اندجان پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ عمر شیخ حرم کی خواب گاہ میں جا چکا تھا۔ اس نے ابھی ایک نئی شادی کی تھی اس لیے خواب گاہ کا رخ ذرا جلدی کر لیتا تھا۔ اس وقت اسے خبر پہنچا کر پریشان کرنا ٹھیک نہیں تھا۔

قاسم بیگ نے رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ تاشوں کی تڑتڑ نے بتا دیا کہ فجر کا وقت ہو گیا ہے۔ قاسم بیگ کو معلوم تھا کہ عمر شیخ مرزا سحر خیز ہے۔ نماز کے لیے ضرور اٹھتا ہے۔ پھر تمام بیگمات کے ساتھ ناشتے پر بیٹھتا ہے۔ بس کچھ ہی دیر بعد اس سے ملاقات ممکن ہو جائے گی۔

خواب گاہ سے دو کمروں کے بعد ایک آراستہ و کشادہ طعام گاہ میں لگا ہوا شاندار دسترخوان عمر شیخ کا منتظر تھا۔ بیگمات اور بچے موجود تھے، صرف عمر شیخ کا انتظار تھا۔

”نئی بیگم کے چونچلے ہی ختم نہیں ہوتے۔ میاں کو کمرے سے نکالنا ہی گوارا نہیں ہوتا کہ وہ دسترخوان تک آئیں۔“ فاطمہ سلطان بیگم نے قتلق نگار خانم سے کہا۔

”انہیں خود بھی سوچنا چاہیے۔ سترہ سال کی بیٹی گھر میں ہے اور وہ سترہ سال کی بیاہ کر لے آئے ہیں۔“

ابھی کچھ اور باتیں ہوتیں کہ خواب گاہ کی طرف کھلتے ہوئے منقش دروازے سے عمر شیخ کی نئی بیوی اندر داخل ہوئی۔ دونوں سوکنوں نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا۔ سترہ سالہ خانزادہ بیگم اور بارہ سالہ بابر ایک گوشے میں چپ چاپ بیٹھے تھے۔ خانزادہ بیگم کی آنکھوں میں بھی وہی نفرت تھی جو اس کی ماں کی آنکھوں میں تھی۔

”ہمیں اور کتنا انتظار کرنا ہوگا۔“ خانزادہ بیگم نے ماں کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم سے تو جہانگیر مرزا اور ناصر مرزا ہی اچھے ہیں کہ ابھی تک سو رہے ہیں۔“

اماں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کے

لیے کہا۔

اتنی دیر میں عمر شیخ مرزا کے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ وہ خاص دروازے سے اندر داخل ہوا۔ طعام گاہ میں زردوزی کے کام کے بچھے ہوئے گدوں تک آیا، بیگمات معمول کے مطابق کورنش بجا لائیں اور اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں۔

ملازمہ نے ناشتا چن دیا تھا۔ ہرن کے گوشت کے کباب، بھنے ہوئے تیتر، آخشی کے خربوزے، شربت سب ہی کچھ تو تھا۔ عمر شیخ نے ایک ایک کباب سب کی پلیٹوں میں رکھ دیا۔ یہ اس بات کی اجازت تھی کہ اب کھانا شروع کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد جس کو جو لینا ہو وہ خود لے سکتا تھا۔

ناشتے کے بعد وہ دیوان خانے میں آیا جہاں قاسم بیگ اس کا منتظر تھا۔ وہ نہایت بے دلی سے اٹھا اور کورنش بجا لانے کے بعد اجازت لیے بغیر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

”قاسم بیگ! تم اتنے پریشان پہلے تو کبھی نہیں ہوئے تھے۔ کیا بات ہے خجند سے ایسی کیا خبر لے آئے؟“

”خبریں بہت تشویش ناک ہیں۔ سلطان احمد مرزا آپ کے بڑے بھائی اور یونس خاں کے بیٹے اکبر محمود خاں میں خفیہ معاہدہ ہو گیا ہے اور یہ دونوں گھوڑے چرانے نکلے ہیں لیکن فرغانہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ درحقیقت ان کا مقصد لشکر کشی ہے۔“

”کیا وہ چند گھوڑوں پر سوار ہو کر مجھے شکست دیں گے؟“

”ہو سکتا ہے انہوں نے اپنا لشکر کہیں چھپایا ہوا ہو جو بروقت ان کی مدد کو پہنچ جائے۔“

”یہ اطلاع تمہیں کس نے دی؟“

”میں نے خجند سے واپس آتے ہوئے خود انہیں دیکھا ہے اور ان کی باتیں سنی ہیں۔“

”اب تک تو انہیں یہاں تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔“

”اس مرتبہ ہمیں بارش نے بچا لیا۔ وہ کہہ رہے تھے بارش تھم جائے گی تو وہ پھر آئیں گے۔“

”اچھا ہوا تم نے اطلاع دے دی۔ اس کی بیٹی میرے بابر کے گھر آ جائے پھر دیکھتا ہوں وہ کیا کرتا ہے۔“

قاسم بیگ اس کی بے پروائی پر شانے اچکا کر رہ گیا۔ عمر شیخ کو تو یہ چاہیے تھا کہ لشکر جمع کرتا، ہتھیار بند ہونے کا حکم دیتا، شہروں کی مزید حفاظت کا بندوبست کرتا۔ اس کے برخلاف اس نے یہ سنا کہ عمر شیخ مرزا پکی ہوئی فصلوں اور اپنے کبوتروں کو دیکھنے کے لیے آخشی جانے والا ہے۔ اس کی بیویاں بھی اس کے ساتھ ہوں گی اور خود اسے بھی ساتھ چلنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

وہ صرف اتنا کہہ سکا۔ ”خطرے کی گھڑی ہے۔ احمد سلطان کسی بھی وقت حملہ کر سکتا ہے۔“

کوئی جواب نہ پا کر اس نے پھر کہا۔ ”کم از کم میں یہاں رہ جاتا۔ بابر ابھی کم سن ہے۔“

”اس کے اتالیق قاضی عبداللہ اس کے پاس ہیں۔“

”وہ قاضی ہیں، جنگجو نہیں۔“

”یہاں بھی کون سی جنگ چھڑ رہی ہے۔ کوئی بات ہوئی تو تم گھوڑا دوڑاتے ہوئے آ جانا۔ دس فرسنگ کا تو فاصلہ ہے۔“

باپ کے روانہ ہو جانے کے بعد بابر آزاد تھا۔ دوسرے روز اس نے بھی اپنی تفریح کا ایک موقع نکال لیا۔ اس نے باز، شکرے اور چند نوکروں کو ساتھ لیا اور اندجان سے باہر ایک پہاڑی باغ کی طرف روانہ ہو گیا کہ آزاد فضاؤں میں شکار کرے گا اور آرام کے لیے بارہ دری بھی موجود ہے۔

عمر شیخ مرزا نے وہ دن آخشی کے محل میں گزارا، دوسرے دن وہ کبوتر خانے کی طرف گیا۔ وہ پہاڑی پر چڑھا اور کبوتر خانے کے اس حصے کی طرف گیا جو دریا کی طرف آگے کو نکلا ہوا تھا۔ سورج نے پہاڑوں کے عقب سے نکلنے کی ابھی تیاری کی ہی تھی۔ نسیم سحر ابھی اس کی شعاعوں سے گرم نہیں ہوئی تھی۔ دور دور کا علاقہ صاف نظر آ رہا تھا۔ نیچے دریا تھا جو دھیرے دھیرے کبوتر خانے سے اٹھکیلیاں کر رہا تھا۔ دائیں طرف وہ خندقیں تھیں جو آخشی کے قلعے سے چلتی ہوئی یہاں تک پہنچی تھیں۔ وہ ایک ایک کابک کو دیکھتا پھر رہا تھا۔ کبوتر اسے دیکھ کر بے چین ہو گئے تھے۔ وہ ان کی بے قراری کو دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ پھر اس سے صبر نہیں ہوا۔ اس نے ایک نامہ بر کبوتر کو باہر نکالا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ اسے مٹھی میں دبائے دبائے چھت پر ٹہلتا رہا۔

دریا کا تیز دھارا نہ جانے کب سے کبوتر خانے کی بنیادوں کو کھوکھلا کرتا جا رہا تھا۔ چھت معمولی سی ہلی تو وہ گڑبڑا گیا، مٹھی میں دبا کبوتر ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ اسے دوبارہ پکڑنے کے لیے اچھلا۔ بس یہ جھٹکا ہی غضب ہو گیا۔ کبوتر خانے کا چوبی ڈھانچا چرمراتا ہوا نیچے گرنے لگا۔ اگلا حصہ جہاں وہ کھڑا تھا تیزی سے نیچے گرا اور پھر پچھلا حصہ دھیرے دھیرے عمر شیخ کے بھاری جسم کے ساتھ ان خندقوں میں گر گیا جن پر لوہے کا جال بچھایا گیا تھا۔ ہزاروں کبوتر ایک ساتھ فضا

If you want to download Urdu novels,Imran series, Monthly Digests,Shuaa,Kiran,Khwateen Digest,Suspense digest, Vist
www.paksociety.com
if site is not opening send complaint at
admin@paksociety.com
or at
0336-5557121

میں بلند ہوئے۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے لوگ جو کبوتر خانے کے باہر کھڑے تھے، خندقوں کی طرف بھاگے۔ جلدی جلدی تختے ہٹائے۔ عمر شیخ کی لاش جو بری طرح مسخ ہو چکی تھی، انہیں مل گئی۔

محل تک خبر پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ قتلق نگار خانم کا حال سب سے برا تھا کیونکہ وہ اس کی پہلی بیوی تھی۔ وہی بیگمات جو ایک دوسرے کی شکل سے جلتی تھیں، اب گلے مل مل کر رو رہی تھیں۔ قاسم بیگ یہ سوچ کر ہلکان ہو رہا تھا کہ یہ خبر اندجان پہنچے گی تو بابر پر کیا گزر جائے گی۔ یہ فکر بھی تھی کہ کوئی بیگ بغاوت نہ کر بیٹھے۔

قتلق نگار بیگم بھی شدت غم کے باوجود بابر کی طرف سے فکر مند تھیں۔ کبوتر خانہ نہیں گرا سلطنت کا ڈھانچا گر گیا ہے۔ یہ بے دردلہریں کہیں بابر کو بھی نہ بہالے جائیں۔

اس نازک وقت میں وہ قاسم بیگ ہی پر بھروسا کر سکتی تھی۔

"اس سے پہلے کہ یہ خبر عام ہو فوراً جاؤ اور بابر تک یہ خبر پہنچا دو۔ وہ اپنے وفادار بیگوں کو اپنے ساتھ ملا کر اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دے۔ میری والدہ بابر کے ساتھ موجود ہیں وہ سب سنبھال لیں گی۔ میں بعد میں آ کر بابر سے مل لوں گی۔"

قاسم بیگ نے رازداری کی غرض سے کسی سپاہی کو ساتھ نہیں لیا اور اکیلا ہی روانہ ہو گیا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ بابر اس وقت قلعے میں نہیں پہاڑی باغ میں سیر و شکار کے لیے گیا ہوا ہے۔ اسے پہلے وہیں پہنچنا تھا۔

جہانگیر مرزا کی ماں فاطمہ سلطان، اقتدار کی اس رسا کشی میں کیوں پیچھے رہتی۔ اس نے ایک اور وفادار امیر سلطان احمد تنبل کو اپنے پاس طلب کیا تھا۔ اس وقت وہ اسے انعام و اکرام کا لالچ دے رہی تھی۔

"اس وقت تخت خالی پڑا ہے۔ اگر تم اپنے وفادار بیگوں کو ساتھ ملا کر میرے بیٹے کو فرغانہ کی حکومت دلا دو تو میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ وزیر اعظم تم ہو گے۔"

دس سالہ جہانگیر کے سلطان بننے کا مطلب یہ تھا کہ جیسے احمد تنبل خود ہی تخت پر جلوہ افروز ہو گیا ہو۔ اسے یہ بادشاہت گھر بیٹھے مل رہی تھی۔ کیسے کیسے خیال دل میں آئے اور چلے گئے۔ پھر اسے خانزادہ بیگم کا خیال آیا۔ قتلق نگار خانم نے ایک مرتبہ خانزادہ کی شادی احمد تنبل سے کرنی چاہی تھی لیکن خانزادہ نے اس رشتے کو سختی سے ٹھکرا دیا تھا۔ یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ ایک قاتل اور سنگ دل انسان سے شادی نہیں کر سکتی۔ احمد تنبل نے اپنی اس توہین کو ابھی تک اپنے دل میں رکھا ہوا تھا۔ فاطمہ سلطان کی اس پیشکش سے اسے اپنے عزائم پورے ہوتے ہوئے نظر آنے لگے۔ جب مجھے اقتدار مل جائے گا تو دیکھتا ہوں خانزادہ کیسے انکار کرتی ہے۔ اس وقت اگر اس نے انکار کیا تو میں اسے تصویر عبرت بنا دوں گا۔

"کیا سوچ رہے ہو بہادر امیر۔ کیا تمہیں کچھ اور چاہیے جس کا میں نے ذکر نہیں کیا۔"

"احمد تنبل کی تلوار سلامت رہے۔ جو کچھ مجھے لینا ہوگا میں خود لے لوں گا۔ آپ حکم فرمائیں مجھے کیا کرنا ہے؟"

"تم فوراً اندجان جاؤ اور تمام بیگوں کو جہانگیر مرزا کے حق میں ہموار کرو...... یاد رہے بادشاہ بیگم نے بھی کوئی نہ کوئی قاصد ضرور روانہ کیا ہوگا۔"

"میں اس کا راستے ہی میں کام تمام کر دوں گا۔"

وہ تیزی سے آخشی کے قلعے سے روانہ ہوا اور اندجان کی طرف دوڑ پڑا۔ خاصی دور جا کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ شاید کوئی دوسرا قاصد بھی اس کے پیچھے پیچھے آ رہا ہو۔ رہگزر سنسان پڑی تھی۔ کوئی بھی نہیں تھا۔ قاسم بیگ کو روانہ ہونے میں کچھ دیر ہو گئی تھی۔ اسی لیے احمد تنبل بہت آگے نکل گیا۔

دونوں کی منزل ایک تھی لیکن مقاصد جدا جدا تھے۔

قاسم بیگ، بابر کے پاس پہنچا تو وہ باپ کی موت سے بے خبر دوستوں کے ساتھ گپ شپ میں مصروف تھا۔ قاسم بیگ کو دیکھ کر حیران رہ گیا جس کی حالت سفر کی تکان اور صدموں سے دگرگوں تھی۔ قاسم بیگ نے چرمی تھیلے سے ایک پرچہ نکالا اور بابر کے سامنے رکھ دیا۔

بابر نے اس پرچے پر نظریں جما دیں جو اس کی ماں کی طرف سے لکھا گیا تھا۔ پھر اس کے ہاتھ کانپنے لگے اور پرچہ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ قاسم بیگ جو اب تک دیوار کا سہارا لیے کھڑا تھا، بابر کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

"شہزادے، یہ صدمہ بہت بڑا ہے لیکن اب آپ کو اسے برداشت کرنا ہے۔ بادشاہ بیگم کا حکم ہے کہ آپ فوراً اندجان پہنچ کر قلعے کا بندوبست سنبھالیں۔"

بابر کو بھی ہوش آیا کہ وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ اس نے لشکر انوکر کے حوالے کیا اور خود گھوڑے پر سوار شہر سے باہر بنی حویلی کی طرف بڑھا جہاں اس کی نانی مقیم تھیں۔ یہیں اس کی بہن خانزادہ بھی تھی۔ قاسم بیگ اس کے ساتھ تھا۔ حویلی کی دیواروں پر پہرے دار چوکس کھڑے تھے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کے پہنچتے ہی دروازہ کھل

گیا۔ وہ پختہ راستے سے ہوتا ہوا ناشپاتی کے درختوں کے درمیان سے گزرا۔ سب سے پہلے خانزادہ اس کا گریبان پکڑ کر جھول گئی۔ پھر نانی سامنے آگئیں۔ ان کا چہرہ سپاٹ تھا۔ فکرمندی کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔

''تم یہاں کیوں آگئے۔ فوراً قلعہ کی طرف جاؤ۔ بیگوں کو اپنے حق میں ہموار کرو۔''

''وہ میرے خلاف نہیں ہوسکتے۔''

''تم ابھی اقتدار کی بھول بھلیوں سے واقف نہیں۔ جو میں کہہ رہی ہوں وہی کرو۔''

خانزادہ اپنے بارہ سالہ بھائی کو اس کڑے وقت میں اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتی تھی لیکن وہ لڑکی تھی، کیا کرسکتی تھی۔ اگرچہ وہ بہت کچھ کر بھی سکتی تھی لیکن نانی اسے کچھ نہیں کرنے دیتیں۔

بابر نے نانی کی بات مانی اور ناشپاتی کے انہی درختوں سے گزر کر باہر آگیا جو اس کے باپ نے لگوائے تھے۔ اس شاہی محل کو اس نے اس سے پہلے کبھی اتنے غور سے نہیں دیکھا تھا جیسا اس وقت دیکھ رہا تھا۔ وہ تصورات میں کھویا ہوا تھا کہ قاسم بیگ نے اسے یاد دلایا کہ اسے کہاں جانا ہے۔

وہ ایک مرتبہ پھر گھوڑے پر سوار ہوا۔ قاسم بیگ نے اب بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ابھی شہر کے بازار میں داخل ہوا ہی تھا کہ قلعے کا ایک سردار باہر آیا اور اس کے گھوڑے کی باگیں پکڑ کر کھڑا ہوگیا۔

''شہزادے آپ قلعے میں نہ جائیں۔ یہاں بہت افراتفری ہے۔ کوئی بھی سردار جس کی جمعیت مضبوط ہے وادی پر قبضہ کرسکتا ہے۔ دشمن چاروں طرف پھیل چکے ہیں۔ اگر آپ گرفتار کرلیے گئے تو آپ کے وفادار بیگوں کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں رہ جائے گا۔ اس وقت آپ اپنی حفاظت کیجیے۔''

اس کی بات سن کر قاسم بیگ سامنے آیا۔ ''اگر آپ منظر سے ہٹ گئے تو جہانگیر مرزا سامنے آجائے گا۔ آپ کو خطروں سے لڑنا ہے، میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

آنے والا سردار کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن بابر کی سمجھ میں بات آچکی تھی۔ اس نے گھوڑا موڑ لیا۔

''آپ کہاں جائیں گے شہزادے؟'' قاسم بیگ نے پوچھا۔

''ہوسکتا ہے اوش چلا جاؤں یا پھر جنوبی کوہستان میں داخل ہوکر قبائلیوں کا مہمان بن جاؤں۔''

''میں آپ کو تنہا چھوڑنا نہیں چاہتا لیکن میرا قلعے میں ہونا ضروری ہے۔ میں بیگوں سے مل کر ان کے ارادوں سے واقف ہونا چاہتا ہوں۔''

''قاضی عبداللہ سے ضرور مل لیجیے گا اور وہ جو کہیں اس پر عمل کیجیے گا۔''

بابر اور آنے والا سردار دونوں شہر کے پار عیدگاہ کی طرف چل پڑے۔ اس علاقے میں پہنچ کر بابر انتظار کرسکتا تھا کہ حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔

احمد تنبل آخشی سے آنے کے بعد ایک سردار یعقوب بیگ کے محل میں مقیم ہوگیا تھا۔ یعقوب بیگ کے ساتھ مل کر وہ جہانگیر مرزا کے حق میں مہم چلا رہا تھا۔

اس نے یہ افواہ پھیلا دی تھی کہ دشمن چاروں طرف سے بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ عمر شیخ مرزا دشمنوں کے خوف سے دریا میں کود پڑا اور اب اس کا بیٹا بابر بھی اندجان کے لوگوں کو چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔

یہ افواہیں سن کر لوگوں میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ لوگوں کو اپنی جان کی فکر پڑی ہوئی تھی کہ انہیں کون بچائے گا۔ دشمن کی فوجیں اندر آگئیں تو لوٹ مار کریں گی۔ قلعے کے اندر موجود بیگوں کو بھی اصل حقیقت کا علم نہیں تھا۔ احمد تنبل نے رائے عامہ کو ہموار کرنا شروع کردیا تھا کہ بابر تو بھاگ کھڑا ہوا ہے اب جہانگیر مرزا کو تخت نشین کردینا چاہیے۔ لیکن ابھی وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ بہت سے سرداران اب بھی حقیقت کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کررہے تھے۔ بابر ان جنگجو سرداروں کے پاس جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا جنہیں عمر شیخ مرزا نے جاگیریں دے رکھی تھیں۔

یعقوب بیگ نے قلعے کی برجیوں سے دیکھ لیا تھا کہ بابر قلعے تک آیا اور پھر واپس پلٹ گیا۔ وہ فوراً اپنے محل میں پہنچا اور احمد تنبل کو مبارک باد دی۔

''آپ کا چلایا ہوا تیر بالکل ٹھیک نشانے پر لگا ہے۔ بابر نے قلعے سے منہ موڑ لیا ہے۔ اب میدان صاف ہے۔''

''یہ تیر میرا چلایا ہوا نہیں بلکہ تمہارا چھوڑا ہوا تھا۔ تم ہی نے ایسا بندوبست کیا کہ بابر نے راستہ خالی کردیا۔''

''وہ بارہ سال کا ناتجربہ کار، داؤ پیچ کیا جانے۔ ترکیب تو آپ کی تھی۔ میں تو ایک مہرہ ہوں۔ خدا جانے اس مہرے کو اس کا کیا صلہ ملتا ہے۔''

''یعقوب! بس کچھ دن کی بات اور ہے۔ میں اگر وزیراعظم بن گیا تو تم سپہ سالار تو ضرور ہی ہوگے۔ دس سال کے جہانگیر مرزا کی حقیقت ہی کیا۔ آہستہ آہستہ برلاسوں کی حکومت ہی ختم کردوں گا۔''

''احمد تنبل، بس ایک مصیبت ہے قاسم بیگ قلعے میں موجود ہے جو بابر کے وفاداروں کو بھڑکاتا رہتا ہے۔ قلعے میں جو ترک ہیں وہ بھی اس کی ماں کے ہم قبیلہ ہونے کی وجہ سے بابر کا دم بھرتے ہیں۔ قاضی عبداللہ بھی اس کے ساتھ ہوگیا ہے۔''

''یہ ہے تو سوچنے کی بات۔'' احمد تنبل نے اپنی ڈاڑھی کو کھجاتے ہوئے کہا۔ ''خیر وقت آنے پر اسے بھی دیکھ لوں گا۔ بس تم اتنا کرو کہ میری موجودگی کا علم کسی کو نہ ہو۔''

''اور فاطمہ سلطان؟''

''وہ کسی سے نہیں کہے گی کہ اس نے مجھے یہاں بھیجا تھا۔ میں خود ہی کسی وقت ظاہر ہوجاؤں گا۔''

ابھی دو روز گزرے تھے کہ یعقوب بیگ نے احمد تنبل سے پھر ملاقات کی۔ اس وقت وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ قاضی عبداللہ نے بیگوں کو بھڑکا دیا ہے۔ اب وہ سب بابر کا استقبال کرنے کو تیار ہیں۔ داروغۂ شہر بھی ان سے مل گیا ہے۔ ایک قاصد بھی قاضی صاحب کا خط لے کر بابر کی طرف روانہ ہوچکا ہے۔

''اگر بابر یہاں آگیا تو بہت برا ہوگا۔'' احمد تنبل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ پھر اس کے چہرے پر ایک شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''یعقوب، تمہیں اب اپنی وفاداری کا آخری امتحان دینا ہوگا۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہوگئے تو پھر کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔''

''میں تو اب بھی تمہارے ساتھ ہوں۔''

''یہ بات ایسی ہے جسے میں تمہارے کان میں ہی کہہ سکتا ہوں۔ مجھے دیواروں پر بھی یقین نہیں۔'' احمد تنبل اپنا منہ اس کے کان کے قریب لے گیا۔

وہ اپنی بات ختم کرچکا تو یعقوب سر سے پاؤں تک کانپنے لگا۔

''یہ کیسے ممکن ہوگا۔ خانزادہ مجھے پہچانتی ہے۔ کسی اجنبی کو بھیجوں تو......''

''یہ سب مجھے نہیں معلوم۔ کوئی ترکیب تو تمہیں نکالنی ہی ہوگی۔''

''یہ راز کبھی نہ کبھی ضرور کھلے گا۔''

''اگر راز کھلنے کا خوف ہو تو دنیا میں کوئی سازش کامیاب نہ ہو۔ جس وقت یہ راز کھلے گا اس وقت اقتدار ہمارے ہاتھ میں ہوگا۔''

''اور میں؟''

''تم سپہ سالار ہوگے، ہم تم مل کر سمرقند اور تاشقند پر قبضہ کریں گے۔''

بابر اوزگنت جانے والے راستے سے عیدگاہ تک پہنچ گیا تھا۔ دور برف پوش چوٹیوں والے پہاڑ نظر آرہے تھے۔ یہاں ٹھنڈک کا احساس ہوا تو بابر نے پاؤں پھیلا دیے۔ اس کے ساتھ آنے والا سردار اسے مزید آگے لے جانے پر بضد تھا لیکن بابر جاننا چاہتا تھا کہ اس وقت اندجان میں کیا ہورہا ہے۔ اسے یقین تھا کہ قاسم بیگ کسی قاصد کو ضرور بھیجے گا۔

''ہم راستے بھر گرمی سے جھلستے رہے ہیں۔ یہاں کچھ دیر آرام کرلیں۔''

''ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے۔''

''پہاڑوں کے پیچھے بہت سے قبائل آباد ہیں۔ یہ لوگ اتنے بے درد نہیں کہ ہماری خاطر مدارات بھی نہ کرسکیں۔''

وہ ان پہاڑوں کے پیچھے ایک بستی میں پہنچ گیا۔ اس کے لباس سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ کون ہوسکتا ہے۔ گاؤں کا چودھری جس کی عمر کوئی اسّی (80) سال ہوگی، ان دونوں کو اپنے گھر لے گیا۔ یہ لوگ ترکوں کی طرح بھیڑوں کے ریوڑ پالتے تھے لہٰذا فوراً دودھ کے پیالے سامنے آگئے۔ خوب سیر ہوکر پیا لیکن پھر ایک ایسی بات ہوگئی کہ اسے دوبارہ بھوک لگنے لگی۔ وہ بوڑھا چودھری اپنی بڑھیا ماں کو اس کے سامنے لایا۔ اسّی (80) سال تو وہ خود تھا اور اس کی ماں ابھی تک زندہ تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کی ماں ایک سو گیارہ سال کی ہے۔ اس بڑھیا نے بابر کو بتایا کہ اس کا کوئی رشتے دار ہندوستان پر فوج کشی میں امیر تیمور کی سپاہ میں تھا۔ وہ اس وقت پانچ یا چھ سال کی تھی۔ اسے کتنی طویل عمر ملی ہے، یہ سوچ کر بابر کو بھوک لگنے لگی تھی۔

اسی گاؤں کے علاقے میں اس بڑھیا کی اولاد یعنی بیٹے، پوتے، پڑپوتے 96 موجود تھے۔ مرنے والوں کو بھی شمار کیا جائے تو تعداد دو سو نکلتی تھی۔ ایک گبرو جوان بابر کے سامنے لایا گیا۔ معلوم ہوا یہ بڑھیا کے پوتے کا بھی پوتا ہے۔

اس دلچسپ گاؤں میں رہتے ہوئے اسے ایک ہفتہ ہوگیا تھا۔ وہ اس دوران پہاڑوں اور ٹیلوں کی خاک چھانتا پھرا تھا۔ پھر اس کا دل اکتا گیا۔ اب تک تو جو ہونا تھا ہوچکا ہوگا۔ چل کر دیکھا تو جائے۔ بارہ سال کے لڑکے سے اسی قسم کے فیصلوں کی توقع کی جاسکتی تھی۔ اس کا ساتھی سردار اسے روکنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ بضد تھا۔ دونوں اس گاؤں سے نکل آئے۔ اندجان کی طرف بڑھے ہی تھے کہ کوئی شخص گھوڑے پر سوار آتا دکھائی دیا۔

”ٹھہرو! یہ شخص اندجان کی طرف سے آرہا ہے۔ ہو نہ ہو یہ کوئی قاصد ہے جو کوئی پیغام لے کر آیا ہے۔“

دونوں ٹھہر گئے۔

جملہ ختم نہیں ہوا تھا کہ وہ شخص پہنچ گیا۔ گھوڑے سے اس طرح کودا جیسے گر گیا ہو۔ اس نے ایک خط بابر کی طرف بڑھا دیا۔ بابر نے اس کا ریشمی فیتہ کھولا۔ یہ اس کے استاد قاضی عبداللہ کی طرف سے لکھا ہوا خط تھا جس پر قاسم بیگ کی مہر بھی تھی۔ اس خط میں بیگوں کی وفاداری کا تذکرہ تھا۔ بابر سے استدعا کی گئی تھی کہ وہ واپس آجائے۔ حالات قابو میں ہیں۔

اس کے ساتھی سردار نے اسے پھر روکنا چاہا۔ ”اگر بیگوں کی وفاداری اتنی پختہ ہے تو انہیں خود یہاں آپ کو لینے آنا چاہیے تھا۔ اس میں بھی کوئی چال ہے جو آپ کو بلایا جارہا ہے۔“

”نہیں۔ قاضی عبداللہ غلط بیانی سے کام نہیں لے سکتے۔“ بابر نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ قاصد اور وہ سردار بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولیے۔

وہ شہر میں داخل ہوا تو خوف زدہ شہری دریچوں سے گردنیں نکال نکال کر باہر جھانک رہے تھے۔ شاید انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ بابر واپس آگیا ہے۔ افواہوں نے بھری سڑک پر دم توڑ دیا تھا۔ بابر ان کے سامنے تھا۔

وہ ابھی قلعے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ فصیل کی جانب سے ایک تیر سنسناتا ہوا آیا اور بابر کے پیچھے آنے والے اس سردار کی گلے میں پیوست ہوگیا جو بابر کو ورغلا کر اندجان سے دور لے گیا تھا۔

یہ یعقوب بیگ تھا جس نے راز کھل جانے کے خوف سے اپنے زرخرید سردار پر تیر چلایا۔

بابر کو اندازہ ہوگیا کہ وہ کن سازشوں میں گھرا ہوا ہے۔

اسی وقت صدر دروازہ کھلا۔ قاضی عبداللہ، قاسم بیگ اور شاہی سپہ سالار اس کے خیر مقدم کے لیے باہر نکلے۔

تمام بیگوں نے یک زبان ہوکر کہا۔ ”تمام سازشیں دم توڑ گئی ہیں۔ ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔“

اسے کشاں کشاں اندر لے جایا گیا۔ بیگوں کی اس بھیڑ میں یعقوب بیگ بھی شامل ہوگیا تھا تاکہ اس پر کسی قسم کا شک نہ کیا جاسکے۔

دیوان عام کے چبوترے پر تخت شاہی رکھا تھا جس پر قیمتی ترکمانی قالین بچھے ہوئے تھے۔ بابر کو اسی تخت پر بٹھا دیا گیا۔ تمام بیگوں نے وفاداری کا عہد کیا۔ قاضی عبداللہ نے اس کی شادمانی و کامرانی کے لیے دعا کی اور اس طرح اسے اتفاق رائے سے وادی فرغانہ کا والی تسلیم کرلیا گیا۔

اس موقعے پر اسے نانی ایسان دولت بیگم اور بہن خانزادہ کی یاد آئی جو شہر سے باہر شاہی محل میں تھیں۔ اس وقت سورج غروب ہوچکا تھا لہٰذا طے پایا کہ کل صبح صبح انہیں بھی قلعے میں طلب کرلیا جائے گا۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ سرحدوں کے حالات ٹھیک نہیں تھے۔ وہ قلعہ میں زیادہ محفوظ تھیں۔

یعقوب بیگ اپنی ہوشیاری سے قاضی عبداللہ کے بہت قریب ہوگیا تھا۔ اس وقت خانزادہ کو یہاں لانے کا سوال سامنے آیا تو اسے احمد تنبل کی وہ بات یاد آگئی جو اس نے یعقوب بیگ کے کان میں کہی تھی۔ اگر اس وقت بھی اس پر عمل پیرا ہوا جائے تو جہانگیر مرزا کے حق میں راہ ہموار کی جاسکتی ہے۔ اس نے قاضی عبداللہ کو اپنی خدمات پیش کر دیں۔

”یہ فریضہ مجھے انجام دینے دیجیے۔ میں اپنے چند آدمی لے کر جاؤں گا۔ شہزادی خانزادہ اور ان کی نانی حضور کو بہ حفاظت یہاں تک پہنچا دوں گا۔“

”تم سے زیادہ اعتماد مجھے کس پر ہوسکتا ہے۔ یہ کام تم ہی کروگے۔“

یعقوب بیگ جب رات کو اپنے محل میں گیا تو احمد تنبل سے تمام باتیں طے ہوگئیں۔ منصوبے کے مطابق خانزادہ کی سواری کو اندجان کے بجائے آخشی کی طرف موڑ دینا تھا۔ احمد تنبل کو دو فرسنگ کے فاصلے پر واقع جنگل میں موجود ہونا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے، احمد تنبل نے یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

”خانزادہ مجھے پہچان چکی ہوگی۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمیں خانزادہ کو لے کر سمرقند جانا ہے۔ سلطان احمد مرزا ہمیں ملازمت بھی دے گا اور خانزادہ کو ڈھال بنا کر ہم اپنی شرائط بھی منوالیں گے۔“

یعقوب بیگ نے چند آدمی تیار کیے اور انہیں اپنے ساتھ لے کر شاہی محل پہنچ گیا۔ قاضی عبداللہ کا رقعہ بھی اس کے پاس تھا جس میں ایسان دولت بیگم کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا کہ وہ خانزادہ کو لے کر یعقوب بیگ کے ساتھ قلعہ میں چلی آئیں۔ ایسان دولت بیگم کا خود بھی یہی خیال تھا کہ انہیں قلعے میں بابر کے پاس ہونا چاہیے۔ ابھی اسے بہت سے مشوروں کی ضرورت ہے۔

یعقوب بیگ نے یہ اہتمام کیا تھا کہ دونوں خواتین کو الگ الگ چھکڑوں میں سوار کیا جائے۔ خانزادہ کے چھکڑے میں ایک کے بجائے دو گھوڑے لگائے گئے تھے کیونکہ اسے تیز بھگانا تھا۔ دونوں چھکڑوں کو دبیز پردوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ پہلے ایسان دولت بیگم سوار ہوئیں۔ یعقوب بیگ نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ وہ اس چھکڑے کے ساتھ چلیں، میں شہزادی کے چھکڑے کے ساتھ آتا ہوں۔ چھکڑا آگے بڑھ گیا۔ خانزادہ اپنے چھکڑے میں سوار ہوئی۔ کوچوان نے اپنی جگہ سنبھالی اور یعقوب بیگ آگے آگے چلا۔ کوچوان کو پہلے ہی سمجھا دیا گیا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ اس نے چھکڑے کا رخ دوسری طرف موڑ دیا اور بے تحاشا بھگانا شروع کر دیا۔

دو فرسنگ کا فاصلہ ہی کتنا ہوتا ہے۔ ایک جگہ پہنچ کر چھکڑے نے عام شاہراہ چھوڑ دی اور جنگل میں داخل ہوگیا۔ احمد تنبل نے یہیں کہیں ملنے کو کہا تھا لہٰذا یعقوب بیگ رک گیا۔

خانزادہ کو کچھ شک ہوگیا تھا کہ اس کے ساتھ دھوکا کیا جارہا ہے۔ اس نے اپنے ساتھ لائے ہوئے خنجر سے پردہ چاک کیا۔ اس کے ہوش اڑنا لازمی تھے۔ وہ ایک جنگل میں تھی۔ اسی وقت یعقوب بیگ چھکڑے کے قریب آیا اور اس سے اترنے کے لیے کہا۔

”شہزادی صاحبہ نیچے تشریف لے آئیے۔ آپ کا قلعہ آگیا ہے۔“

”یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟“

”نیچے تو آؤ ابھی پتا چل جاتا ہے۔“

خانزادہ آرام سے نیچے اتری اور چاہا کہ اپنا خنجر اس کے پیٹ میں اتار دے لیکن غالباً وہ اس کے لیے تیار تھا۔ وہ ایک طرف جھکا اور خانزادہ کی کلائی پکڑ کر اس زور کا جھٹکا دیا کہ خنجر دور جا پڑا۔ خانزادہ نے ہاتھ چھڑانا چاہا لیکن لڑکی ہی تو تھی ایک طرف جھول کر رہ گئی۔

احمد تنبل کچھ دور سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ کل تک اس نے یہی سوچا تھا کہ وہ یعقوب بیگ کے ساتھ مل کر خانزادہ کو یرغمال بنالے گا لیکن رات بھر میں اس کے ارادے بدل گئے تھے۔ اسے یقین آگیا تھا کہ قسمت نے بابر کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ اب بابر کی نظروں میں سرخرو ہونے کا وقت ہے۔ یہ سنہری موقع اس کے سامنے تھا۔ وہ درختوں کے ایک جھنڈ سے نکلا اور یعقوب کے سر پر آپہنچا۔

”اے کیا کرتا ہے۔ چھوڑ دے شہزادی کو۔“

یعقوب بیگ نے یہ خیال کیا کہ وہ شہزادی کو دکھانے

وزن گھٹائیں عمر بڑھائیں

SMS میں اپنا مکمل نام پتہ لکھیے

لکڑی کا خاص گلاس

مرد ہو یا عورت سب کی خواہش ہے کہ اپنے آپ کو اسمارٹ رکھیں لیکن اس بھاگ دوڑ کی زندگی میں اپنے آپ کو اسمارٹ رکھنا بہت ہی مشکل ہوگیا ہے لیکن ہم ایک آسان نسخہ لے کر آئیں جس کا نہ کوئی سائیڈ افیکٹ ہے۔ اور نہ ہی کوئی تھکا دینے والی ورزش آپکو کرنی ہے۔ صرف بس ایک کام کرنا ہے۔ ہمارا تیار کردہ لکڑی کا گلاس استعمال کریں۔ جس کے استعمال سے انشاءاللہ چند ہفتے میں آپکو رزلٹ یقینی مل جائے گا۔ اور آپکے جسم سے فالتو چربی کم اور موٹاپا کم ہوجائے گا۔
اور آپ جاذب نظر آئیں گے۔ لکڑی کا خاص گلاس مارکیٹ میں دستیاب نہیں۔
صرف ان نمبروں میں رابطہ کر کے منگوا سکتے ہیں۔

رابطہ : 03442609828 ,0300-2219514

کے لیے مصنوعی غصہ دکھا رہا ہے۔ اس نے بھی پلٹ کر جواب دیا۔ ”ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔“

بس یہی موقع تھا۔ احمد تنبل نے تلوار بے نیام کی اور یعقوب بیگ کا سر اس کے تن سے جدا کر دیا۔ وہ غریب یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ جو تم نے کہا تھا میں نے وہی تو کیا ہے۔ پھر مجھے کس بات کی سزا ملی ہے؟ کوچوان نے جو یہ منظر دیکھا تو چھکڑا لے کر بھاگ کھڑا ہوا۔ احمد تنبل خانزادہ سے جھوٹی ہمدردی جتانے لگا۔

ایسان دولت بیگم قلعے میں پہنچی اور خانزادہ بہت دیر تک قلعے میں نہ آئی تو کھلبلی مچ گئی۔ بابر نے چند سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ خانزادہ کو ڈھونڈنے کے لیے نکلیں۔ ابھی یہ تیاریاں ہو رہی تھیں کہ شور مچا، خانزادہ آ گئی لیکن اس حال میں آئی تھی کہ گھوڑے پر سوار تھی۔ احمد تنبل پیدل چل رہا تھا۔ ماجرا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لیکن پھر ساری بات سب کی سمجھ میں آ گئی۔ احمد تنبل نے یعقوب بیگ کا کٹا ہوا سر، بابر کے سامنے رکھ دیا اور پورا ماجرا کہہ سنایا۔

”وہ تو اچھا ہوا کہ میں وقت پر پہنچ گیا۔ فاطمہ سلطان بیگم نے مجھے آپ کی خیریت لینے کے لیے بھیجا تھا۔ میں اگر نہ پہنچا ہوتا تو شہزادی صاحبہ پر نہ جانے کیا بیت گئی ہوتی۔“

”میں ذاتی طور پر تمہارا شکر گزار ہوں۔“ بابر نے کہا اور اپنی ایک خاص تلوار اسے بطور انعام عطا کی۔

بات بہ خیر و خوبی سلجھ گئی تھی۔ احمد تنبل پر کسی کو شک تک نہیں گزرا تھا بلکہ اس کی وفاداری کے جھنڈے گڑ گئے تھے لیکن خود اس کے دل میں چور تھا۔ اسے خوف تھا کہ اگر اس سازش کی مزید چھان بین ہوئی اور کہیں اس کا نام بھی درمیان میں آ گیا تو وہ پکڑا جائے گا۔ سب سے زیادہ اسے اس کوچوان کی طرف سے خطرہ تھا جو خانزادہ کا چھکڑا چلا رہا تھا۔ وہ ابھی تک نہیں مل سکا تھا۔ اگر وہ مل گیا اور اس نے کچھ باتیں اگل دیں تو کیا ہوگا۔

وہ اسی شام آخشی کی طرف روانہ ہو گیا۔

بازاروں میں افواہیں پھیلانے اور بیگوں کو ورغلانے والا کون تھا؟ تحقیق جاری رہی لیکن شاید سب ثبوت مٹ چکے تھے۔ بالآخر اس پر یقین کرنا پڑا کہ اس سازش کے پیچھے یعقوب بیگ تھا جو بہرحال مر چکا ہے۔

ایک صرف خانزادہ تھی جس کا شک احمد تنبل کی طرف گیا تھا لیکن خود ایسان دولت بیگم نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا تھا کہ وہ ایک ایسے آدمی پر الزام لگا رہی ہے جس نے اس کی عزت بھی بچائی اور جان بھی۔ ایسان دولت بیگم نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنی ماں کی بات مان لے اور احمد تنبل سے شادی کر لے۔ خانزادہ بیگم نے ایک مرتبہ پھر اسے قاتل کہہ کر اسے ٹھکرا دیا تھا بلکہ اس مرتبہ سازشی کے لقب کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

بابر کی ناتجربہ کاری صرف اندجان پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ اندجان کے باہر کیا ہو رہا ہے، یہ دیکھنے کی ابھی اسے فرصت ہی نہیں ملی تھی۔

اس کے تخت نشین ہوتے ہی سلطنت کے تمام وارثوں میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ ان عزیزوں میں سب سے اول تو بڑا چچا سلطان احمد تھا جو سمرقند سے بڑھا آتا تھا۔ فرغانہ کے مغربی قصبوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اب وہ اندجان کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ دوسری طرف بابر کا ماموں اکبر محمود دریائے سیحون سے اوپر چل کے قلعہ آخشی کی طرف آ رہا تھا۔ کچھ اور دشمن جاگیرداروں کو مشرقی پہاڑوں کے قریب دیکھا گیا تھا۔ یہ غالباً اسی لیے ٹھہرے ہوئے تھے کہ جس کا پلہ بھاری دیکھیں اسی کی طرف ہو جائیں۔ یہ ان جاگیرداروں کا پرانا دستور تھا۔

یہ خبریں جب قلعے میں پہنچیں تو جنگ کی تیاریاں کی جانے لگیں۔ برج اور فصیل کو اچھی طرح مستحکم کر لیا۔ ایسان دولت بیگم نے بھی یہی مشورہ دیا کہ مزاحمت کی جائے لیکن قاضی عبداللہ ان تجویزوں کے حق میں نہیں تھے۔ بعض قدیم ملازمین بارگاہ نے اپنی توہین سمجھی کہ وہ ایک بارہ تیرہ سالہ لڑکے کی رہنمائی میں جنگ کریں۔ انہوں نے حق نمک ادا نہیں کیا اور بابر کا ساتھ چھوڑ کر احمد مرزا کے ساتھ شامل ہو گئے۔ بادشاہت ابھی پوری طرح مستحکم نہیں ہوئی تھی۔ اس نازک وقت میں قاضی عبداللہ نے بابر کو مشورہ دیا کہ وہ اس وقت جنگ میں نہ الجھے۔ والی سمرقند کی خدمت میں اپنا سفیر بھیجے اور اس سے مصالحت کی درخواست کرے۔ بابر کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے طاقتور چچا کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ اس نے اپنے استاد کی بات مان لی۔ اس کی لڑکی عائشہ بابر سے منسوب تھی اس لیے اسے امید تھی کہ اس کا چچا اس کی درخواست مان لے گا۔

قاضی کی نصیحت کے مطابق بابر نے ایک سفیر سلطان احمد کی خدمت میں روانہ کیا۔ اپنے آپ کو فرزند اور خادم ظاہر کر کے اطاعت کا اظہار کیا اور درخواست کی کہ وہ اسے اپنے نمائندے کے طور پر اندجان میں رہنے کی اجازت دیں۔

”آپ میرے والد کی جگہ ہیں۔ میں آپ سے لڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ میری درخواست قبول فرمائیں

اور محاصرہ اٹھا لیں۔ اندجان پر میرا قبضہ رہنے دیں یہ میرے باپ اور آپ کے بھائی کی نشانی ہے۔ میں یہاں فرماں روا بن کر نہیں، آپ کا نمائندہ بن کر رہوں گا۔“

سلطان احمد مرزا اس دردمندانہ پیغام کو سن کر متاثر ہوا تھا لیکن اس کے سرداروں نے یہ شرط ماننے سے انکار کر دیا۔

”نوعمر لڑکا قابو میں آ چکا ہے۔ کل کو جوان ہوگا تو یہی ہمیں آنکھیں دکھائے گا۔“

سلطان احمد مجبور ہو گیا۔ اس کے گھڑ سوار سیدھے اندجان کی طرف چل پڑے۔ سفارت ناکام ہو گئی۔ بابر نے بھی ایک مختصر سی جماعت آگے روانہ کر دی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ دشمن کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جائے۔

سمرقندی سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے چلے آ رہے تھے کہ ایک دھنسی ہوئی ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ یہ ندی دلدل کی شکل اختیار کر چکی تھی لیکن اچھی بات یہ تھی کہ ندی پر پل بنا ہوا تھا۔ فوج کے ہر سپاہی کو جلدی تھی کہ وہ پل عبور کر لے۔ سب ایک ساتھ گھوڑوں سمیت پل پر چڑھتے چلے گئے۔ پل یہ بوجھ برداشت نہ کر سکا اور ٹوٹ گیا۔ گھوڑے اور اونٹ اوندھے ہو ہو کر پانی میں گرنے لگے۔ پانی کیا دلدل تھی جس میں جو گرا قسمت ہی نے اسے نکالا تو نکلا۔ کتنے ہی دلدل کی نذر ہو گئے، جو بچ گئے وہ زخمی تھے۔ انہیں بہ مشکل کنارے پر لایا گیا۔

ایک مرتبہ پھر لشکر میں بحث چھڑ گئی کہ محاصرہ جاری رکھا جائے یا سمرقند واپس چلا جائے۔ بیشتر سرداروں نے پھر یہ رائے پیش کی کہ اتنا نقصان اٹھا کر واپس چلے جائیں تو فائدہ کیا۔ اب آ گئے ہیں تو محاصرہ جاری رکھیں گے۔

محاصرہ طول پکڑتا جا رہا تھا اور یہاں بیگوں میں بددلی پھیلی ہوئی تھی کہ سمرقندی لشکر میں وبا پھیل گئی۔ گھوڑے ایک ایک کر کے مرنے لگے۔ کوئی ایسا بخار تھا جس میں سپاہی بھی مبتلا ہونے لگے۔ خود سلطان احمد بھی بیمار پڑ گیا۔

اب وہی سردار جو محاصرے کے حق میں تھے واپس جانے کی ضد کرنے لگے۔ سلطان احمد کے پاس بھی واپسی کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ سمرقندی سپاہ نے اپنے علیل ساتھیوں کو سنبھالا اور واپس چل دی۔ میدان میں اب دھوپ کے سوا کوئی نہیں تھا۔

اندجان محفوظ ہو گیا تھا لیکن سلطان احمد کا حلیف اکبر محمود آخشی پہنچ کر اس کے محاصرے میں مشغول تھا۔ اندجان میں سلطان احمد کو شکست کھا کر بھاگنا پڑا تو آخشی والوں کے حوصلے پہاڑوں سے باتیں کرنے لگے۔ بابر کی سپاہ جان توڑ کر لڑی اور دشمن کا منہ پھیر دیا۔ اکبر محمود سن ہی چکا تھا کہ اس کا حلیف اندجان سے بھاگ چکا ہے۔ اس نے بھی ہمت ہار دی اور اپنے علاقے کی طرف واپس لوٹ گیا۔

اس موقعے پر بابر کی نانی ایسان دولت بیگم نے اسے نہایت مفید مشورے دیے۔

”قسمت نے تمہیں یکے بعد دیگرے دو فتوحات سے نوازا۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ قدرت تم سے کوئی بڑا کام لینا چاہتی ہے اور اس کے لیے تمہیں ابھی سے تیاری کرنی ہوگی۔“

”میں زیادہ سے زیادہ لشکر جمع کروں گا۔“

”زیادہ لشکر سے فتح نصیب نہیں ہوتی، تمہیں تو یہ چاہیے کہ اپنے چھوٹے بڑے عزیزوں کو اراضی عطا کرو تاکہ وقت پڑنے پر وہ تمہاری مدد کریں۔ باہر نکلنے سے پہلے اپنی سلطنت کا بندوبست کرو۔ مختلف عہدوں پر لوگوں کو متعین کرو۔“

بابر نے نانی کی نصیحت پر فوراً عمل کیا۔ جن لوگوں نے بابر کی مدد کی تھی اور اسے سلطنت دلانے میں اہم کردار ادا کیا تھا، انہیں مختلف مناصب عطا کیے۔ ساتوں شہروں کو سات مختلف بیگوں کے سپرد کیا۔ اسی طرح دیگر امرا کو بھی ان کی صلاحیتوں کے مطابق ذمے داریاں دی گئیں۔ ان شہروں کی آرائش و زیبائش کی طرف بھی توجہ دی۔

سمرقند میں سلطان احمد مرزا کا انتقال ہو گیا، جو امیر تیمور کی بادشاہی کی آخری نشانی تھا۔ کوہستانی ریاستوں میں عمر شیخ کے زمانے ہی میں حالات ابتر ہو گئے تھے۔ اب بھائی بھتیجوں کے جھگڑوں نے، جن میں سے ہر ایک فوجی جمعیت رکھتا تھا اور تیموری وراثت کا دعویدار تھا، ان حالات کو اور بھی خراب بنا دیا۔ ادھر جیحون پار کی خطرناک ٹولیاں نمودار ہونے لگیں جنہیں زمین یا دولت کی تلاش تھی۔ خود سمرقند سازشوں کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ ختن اور کاشغر کے حاکم ابابکر کاشغری نے آس پاس کے علاقے میں لوٹ مار مچا رکھی تھی۔ بہ مشکل تمام اسے بھی وہاں سے بھگا دیا گیا۔

دو برس گزر چکے تھے۔ ان دو سالوں میں اس کے ساتھی دو ایک سرحدی بستیاں لینے کے سوا کوئی اور خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکے تھے۔ ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ بعض نکالے ہوئے امیر اور کچھ پیشہ ور سپاہی اس کے پاس پہنچ کر اپنی خدمات پیش کرنے لگے تھے۔ نوعمر بابر بھی ان کی خوب پذیرائی کر رہا تھا۔

بابر کی ماں اور نانی دونوں پچھلے زمانوں کو یاد کرتی رہتی

تھیں۔ انہوں نے بڑے بڑے درباروں کے ناز و نعم دیکھے تھے جواب قصۂ پارینہ بن چکے تھے۔ محل میں اکثر یہ باتیں ہوتی تھیں اور بابر کا دھیان سمرقند کی جانب چلا جاتا تھا۔

سمرقند کے حالات بہت برے تھے۔ سلطان احمد مرزا کا انتقال اسی وقت ہو چکا تھا جب وہ اندجان کا محاصرہ اٹھا کر سمرقند واپس گیا تھا۔ اس کے مرتے ہی تار و پود بکھرنے لگا۔ امرا بڑی تیزی سے حرکت میں آگئے اور اپنی من پسند حکومت قائم کرنے کے لیے جوڑ توڑ کرنے لگے۔ خسرو شاہ نامی ایک امیر نے تیز رفتار قاصد مازندان بھیج کر سلطان احمد کے بھائی سلطان محمود مرزا کو سمرقند آنے کی دعوت دی۔ وہ دوڑا ہوا آیا اور سمرقند کے تخت پر بیٹھ گیا۔ خسرو شاہ کی بدولت ہی اسے یہ حکومت ملی تھی۔ اس نے خسرو شاہ کو اپنا وزیر بنالیا۔ خسرو شاہ نے اپنے مالک کے پردے میں کھل کر کھیلنا شروع کر دیا۔ اپنے اختیارات سے ایسے ناجائز فائدے اٹھائے کہ عوام میں بددلی پھیل گئی۔ وہ سلطان محمود کے بھی خلاف ہو گئے۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سلطان محمود مرزا بیمار پڑا اور انتقال کر گیا۔ ہوشیار خسرو شاہ نے خزانہ غبن کیا اور چپکے سے سمرقند سے نکل بھاگا۔

سلطان محمود مرزا کا ایک بیٹا باپ کی طرف سے حصار کا انتظام سنبھالے ہوئے تھا۔ اسے باپ کی وفات کی اطلاع پہنچی تو منزلیں مارتا ہوا سمرقند پہنچ گیا اور قبضہ کر کے بیٹھ گیا۔

بابر کا... ماموں بھی اسی وقت اپنی ریاست تاشقند سے سمرقند کے لیے نکلا تھا لیکن سلطان محمود کا بیٹا بائے سنغور اس سے پہلے باپ کی جگہ سنبھال چکا تھا۔ اس نے بزور شمشیر سمرقند پر قابض ہونا چاہا لیکن ناکام رہا۔ شکست کا داغ لے کر اپنے علاقے کی طرف لوٹنا پڑا۔

اب بابر پندرہ سال کا نوجوان تھا۔ سمرقند کا نام بار بار اس کے کانوں میں پڑ رہا تھا۔ اس نام کے ساتھ ہی وہ یادیں سر اٹھا رہی تھیں جو ابھی تک بہ سبب کم عمری دل کے کسی گوشے میں دبکی بیٹھی تھیں۔ اس روز وہ مطالعہ کرنے کے لیے بیٹھا تو چند عاشقانہ اشعار پڑھنے کے بعد اسے ایک چھوٹی سی بچی یاد آئی جس سے منگنی کرنے کے لیے وہ سمرقند گیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر پانچ سال تھی۔ وہ لڑکی بھی اس کی ہم عمر تھی۔ اس کا نام عائشہ تھا۔ سلطان احمد مرزا کی بیٹی عائشہ، اس کی عم زاد تھی، وہ اس کی صورت نہیں دیکھ سکا تھا کیونکہ اس نے گھونگٹ نکالا ہوا تھا۔ پھر اسے وہ دلہن یاد آئی جسے سلطان احمد بیاہ کر لایا تھا اور دستور کے مطابق بابر نے (بچہ ہونے کی وجہ سے) اس عورت کا گھونگٹ اٹھایا تھا۔ اب تو عائشہ بھی اس عورت کی طرح بڑی ہو گئی ہو گی۔ اس نے عجیب سی گھبراہٹ محسوس کی اور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ کبھی کبھی خانزادہ عائشہ کا نام لے کر اسے چھیڑا کرتی تھی لیکن بابر نے کبھی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اس وقت بری طرح اس کی یاد آرہی تھی۔ نہ جانے وہ کس حال میں ہو۔ کیا سوچتی ہو گی کہ ہم اسے بھول ہی گئے۔

”ہم اسے بھولے نہیں ہیں قاسم بیگ۔ ہم نے اپنی بہن مہر نگار کو لکھ دیا ہے کہ عائشہ بیگم کو ان کی بڑی ہمشیرہ کے پاس تاشقند بھیج دیا جائے۔ اب تک تو وہ تاشقند پہنچ بھی گئی ہو گی۔“

بابر کی والدہ قاسم بیگ سے ہم کلام تھیں کہ بابر بھی وہاں آگیا اور شاید رات بھر کی بے چینی کے بعد والدہ سے بات کرنے ہی آیا تھا۔ یہاں پہلے ہی سے یہ موضوع چھڑا ہوا تھا۔ خانزادہ بھی موجود تھی۔

”لیجیے حکمران بھی تشریف لے آئے۔“

”ہاں تو آپ کیا کہہ رہے تھے قاسم بیگ صاحب۔“

”کیا میں وہ کہہ دوں جو مجھے کہنا ہے اور جو کہنے کے لیے اس وقت میں آپ کے پاس حاضر ہوا تھا؟“ قاسم بیگ نے بابر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بے کھٹک کہیے۔“

”میں یہ عرض کر رہا تھا کہ عائشہ بیگم ابھی تک سمرقند میں ہیں۔ آپ کی ہدایت کے مطابق انہیں تاشقند جانے سے روک دیا گیا۔“

”کس نے روک دیا۔ کس نے کی یہ جرأت؟“

”مرزا بائے سنغور کے سوا کس کی یہ جرأت ہو سکتی ہے۔ عائشہ بیگم نے اپنی والدہ کے ساتھ تاشقند جانے کی تیاری کر لی تھی مگر اس ظالم نے انہیں روک دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کے گھر کے سامنے پہرا لگا دیا گیا ہے۔ اب وہ ایک قیدی کی طرح ہیں۔“

”میں یہاں حکمران بنا بیٹھا ہوں اور میری منگیتر پر وہاں یہ گزر رہی ہے۔ اب سمرقند کی طرف کوچ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“ پھر وہ قاسم بیگ سے مخاطب ہوا۔ ”تمام بیگوں کو طلب کیا جائے۔ میں سمرقند پر حملے کے لیے انہیں آمادہ کروں گا۔“

خانزادہ بیگم قریب ہی بیٹھی تھی۔ جب بابر غصے میں ہوتا تھا تو وہی اس سے مخاطب ہو سکتی تھی۔

”میرے پیارے بھائی! میرے امیر، اگر آپ نے اس وقت حملہ کیا تو عائشہ بیگم کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ میرے خیال میں تو پہلے اسے رہا کرا لیا جائے اس کے

بعد لشکر کشی مناسب ہو گی۔

”میں بائے سنغور سے کمزور نہیں ہوں۔ سمرقند کے لوگ اس سے بے زار ہیں۔ بات چیت کا راستہ تو وہ تلاش کرتے ہیں جو کمزور ہوں۔ میں سمرقند جاؤں گا اور اسے مصالحت پر مجبور کر لوں گا۔“

اس کی ماں نے بھی دبے لفظوں میں خانزادہ کے مشورے کی تائید کی لیکن بابر کے دل میں کشور کشائی کا وہی جذبہ موجزن ہو چکا تھا جو اس کے جد امیر تیمور کے دل میں کروٹیں لیتا رہتا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اس خوبصورت شہر پر قبضہ کر کے رہے گا۔ یہ اس کی ہوس نہیں، اس کا حق ہے۔

☆☆☆

سمرقند اچانک فساد کی زد میں آگیا۔ بغاوت کی چنگاریاں کب سے سلگ رہی تھیں۔ خلق خدا بائے سنغور سے متنفر ہو چکے تھے۔ پھر باغی سرداروں کو ایک مضبوط نعم البدل مل گیا۔ انہوں نے اس کے بھائی سلطان علی کو قرش سے بلالیا اور اس کی سرکردگی میں بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ بائے سنغور نے اس بغاوت پر قابو پالیا۔ سلطان علی گرفتار ہو گیا۔ جلادوں کو حکم ہوا کہ وہ اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر اسے اندھا کر دیں۔ یہ جلاد باغیوں سے ملے ہوئے تھے۔ انہوں نے حکم کی تعمیل ضرور لیکن سلائی کچھ اس طرح پھیری کہ سلطان علی کا پردۂ بصارت محفوظ رہا تھا۔ بائے سنغور نے اپنے اندھے بھائی (اس کی دانست میں) کو دربدر بھٹکنے کے لیے سمرقند سے نکال دیا۔ سلطان علی اندھا تو ہوا نہیں تھا، دکھانے کو اندھا بن گیا تھا۔ سمرقند سے بھاگا تو بخارا جا کر دم لیا۔ بائے سنغور ایسا تلملایا کہ سمرقند کو خالی چھوڑ کر بخارا کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

شیبانی خاں ادھر ادھر گھوم پھر کر قسمت آزمائی کرتا پھر رہا تھا۔ ازبکوں کا ایک جم غفیر اس کے ساتھ تھا۔ یہ شخص دیسی یا اجنبی ضرور تھا لیکن اس کا نسب غیر معروف نہ تھا۔ وہ چنگیز کے سب سے بڑے بیٹے جوجی کے ایک فرزند کا ہم نام تھا۔ اس کا جد امجد باتو خاں مغلوں کی صدر عسکری تنظیم کا مالک رہا تھا جس کی عمل داری روس کے شہروں سے وسط ایشیا کی کوہستانی فصیل تک وسیع تھی۔ بابر کے زمانے میں انتشار [illegible] مغلوں کی عسکری قوت انہی ازبکوں کے دم سے قائم تھی۔ شیبانی کے دادا کے ماتحت ان کی ایک بدوی قسم کی سلطنت [illegible] سے ماسکو تک صحرائی علاقوں میں قائم ہو گئی تھی۔ [illegible] ان سے کچھ آوارہ گرد قبائل ٹوٹ کر مشرق کی طرف کٹ گئے۔ ایک جنگ میں یونس خاں نے وحشی ازبکوں کو شکست دی اور شیبانی کے باپ کو قتل کر دیا۔ اس دن سے وہ اپنی قوت کو آزماتا پھر رہا تھا۔

اس نے جو دیکھا کہ سمرقند کا سنگھاسن خالی پڑا ہے تو وہ محض اپنی طاقت آزمانے کے لیے سمرقند پر حملہ آور ہو گیا۔ اس وقت ایک معتمد خواجہ یحییٰ شہر کا دفاع کر رہا تھا۔

جس وقت بائے سنغور بخارا پہنچا۔ سلطان علی اپنے باغی ساتھیوں کے ساتھ مل کر مقابلے کی تیاریاں کر چکا تھا۔ بائے سنغور یہ سوچ کر بہت تھوڑے سے آدمی اپنے ساتھ لے کر گیا تھا کہ سلطان علی کو گرفتار کر کے ہی تو لانا ہے۔ اپنی باقی فوج وہ سمرقند ہی میں چھوڑ گیا تھا، سلطان علی سے مقابلہ ہوا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ سلطان علی اتنا طاقتور ہو گا، اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس نے کچھ دیر مقابلہ کیا اور پھر پسپا ہو کر سمرقند کی طرف بھاگا۔

اگر اس وقت شیبان خاں سمرقند پر قبضہ جاری رکھتا تو بائے سنغور درمیان ہی میں معلق ہو کر رہ جاتا لیکن شیبانی خاں کا مقصد تو اپنی طاقت آزمانا اور لوٹ مار کرنا تھا۔ طاقت اس نے آزمالی تھی، لوٹ مار کے لیے اسے کچھ ملا ہی نہیں۔ خسرو شاہ خزانہ پہلے ہی خالی کر چکا تھا۔ پھر بھی جو کچھ وہ سمیٹ سکتا تھا اس نے سمیٹا اور سمرقند کی جان چھوڑ دی۔

☆☆☆

بابر اپنے بیگوں سے مشورہ کرنے کے بعد سمرقند پر حملہ کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ اب تو اس کی نانی دولت بیگم بھی اس کی ہمنوا تھیں کیونکہ حال ہی میں ان کے بیٹے کو بائے سنغور شکست دے چکا تھا۔ اب وہ خواہش مند تھیں کہ اس شکست کا بدلہ بابر کے ہاتھوں لیا جائے۔

وہ اس وقت سلطان علی کی طرف سے بھیجے گئے پیغام پر غور کر رہا تھا جس میں اس نے بابر کا ساتھ دینے کے عہد و پیمان کیے تھے۔ یہ عہد کیا تھا کہ وہ دونوں مل کر سمرقند پر چڑھائی کریں گے کیونکہ دونوں کا دشمن ایک ہے۔

میر خدام اندر داخل ہوا اور اطلاع دی کہ حکمران کی والدہ محترمہ ملاقات کی خواہش مند ہیں۔ بابر اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ قتلق نگار اندر داخل ہوئی اور بیٹے کو دعائیں دیتے ہوئے ایک طرف بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھنے کے بعد بابر بھی بیٹھ گیا۔

”میں تم سے یہ کہنے آئی ہوں کہ سلطنت کے کاموں میں پڑ کر تم بہن کی طرف سے بالکل غافل ہو چکے ہو۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں، ایک وہی تو ہے جو میری بہن بھی

ہے میری سرپرست بھی۔ میں اس کی طرف سے کیسے غافل ہوسکتا ہوں۔''

''تمہیں معلوم ہے وہ بیس سال کی ہونے کو آرہی ہے اور اب تک اس کی شادی نہیں ہوئی۔''

''آپ اس کی شادی جہاں کرنا چاہیں گی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''میں جہاں چاہتی ہوں وہ وہاں نہیں چاہتی۔ اب تو وہ اتنی خودسر ہوگئی ہے کہ میری بات بھی سننے کو تیار نہیں۔ وہ تمہاری بات سن لیتی ہے، تم ہی اسے سمجھاؤ۔''

''آپ اس کی شادی کہاں کرنا چاہتی ہیں؟''

''میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا۔''

''میں نے اس سے پہلے بھی پوچھا تھا، اس نے انکار کردیا تھا۔''

''احمد تنبل بڑے عالی نسب ہیں۔ ان کے پردادا سلطان تھے اور چنگیز خاں کے رشتے دار۔ ان کے بڑے بھائی ان دنوں تاشقند میں تمہارے ماموں کے وزیراعظم ہیں۔ وہ تمہارے وفادار بھی ہیں۔ تمہیں یاد ہے، جب خانزادہ کے ساتھ حادثہ پیش آیا تھا تو یہی احمد تنبل تھے جنہوں نے یعقوب بیگ کا سر تمہارے قدموں میں لا کر ڈال دیا تھا۔''

''خانزادہ کہتی ہیں کہ احمد تنبل بھی اس سازش میں شریک تھا۔ اس نے محض سرخروئی کے لیے یعقوب بیگ کو راستے سے ہٹایا تھا۔''

''وہ یہ بات صرف اس لیے کہہ رہی ہے کہ احمد تنبل کسی مملکت کا حکمران نہیں۔ وہ تمہارا ملازم ہے۔ اتنی بات میں بھی سمجھتی ہوں کہ وہ کسی شاہ کی ملکہ بننے کے لائق ہے لیکن کیا، کیا جائے۔ اس کی عمر نکلتی جارہی ہے۔''

بابر نے اس عزم کے ساتھ خانزادہ سے ملاقات کی کہ وہ اسے قائل کرلے گا لیکن جب بحث ختم ہوئی تو وہ خود قائل ہوچکا تھا۔ اسے یہ کہہ کر بات ختم کرنا پڑی۔

''میں تمہاری شادی ہرگز اس شخص سے نہ ہونے دوں گا جسے تم پسند نہیں کرتیں۔''

☆☆☆

بابر نے سمرقند کی سرحد بنانے والا دریا پار کیا۔ راستے میں کئی شہر فتح کیے اور جوانوں کو بھرتی کرتا ہوا ایک پہاڑی گاؤں شیراز پہنچ گیا۔ یہاں اس کی قسمت نے پھر ایک کھیل کھیلا۔ کئی سو مسلح سپاہی گھوڑے دوڑاتے ہوئے آئے اور امان کے طالب ہوئے۔ معلوم ہوا یہ لوگ سمرقند سے بابر کو روکنے کے لیے بھیجے گئے تھے لیکن انہوں نے بابر کی ملازمت کو فوقیت دی۔ ان سپاہیوں کے ساتھ ایک سردار بھی تھا جس کا نام اویس بیگ لاغری تھا۔ یہ اتنا دبلا تھا کہ بعد میں اس کا نام ہی دبلا آغا پڑ گیا۔

بابر کے لشکر میں اچھا خاصا اضافہ ہوگیا تھا لیکن اسے سلطان علی کی آمد کا انتظار تھا۔ دونوں کے درمیان یہ طے ہوگیا تھا کہ سردیاں گزر جانے کے بعد وہ دونوں مل کر سمرقند پر حملہ آور ہوں گے۔ سلطان علی اسی مقام پر اس سے آملے گا جہاں بابر اب ٹھہرا ہوا تھا۔ سلطان علی وعدے کے مطابق وہاں نہیں آیا۔

بابر پیدائشی طالع آزما تھا۔ اسے پروا نہیں تھی کہ سلطان علی اس کا ساتھ دیتا ہے یا نہیں۔ وہ یہاں سے روانہ ہوا اور پیش قدمی کرتے ہوئے ان پہاڑی باغوں میں ڈیرے ڈال دیے جہاں سے امیر تیمور کے قلعے کے چمکتے گنبد اور خاکی فصیلیں صاف دکھائی دیتی تھیں۔

قلعے کا دروازہ کھلا اور چند جنگجو باہر آئے۔ بائے سنغور نے خود نکلنے کے بجائے یہ بہتر سمجھا تھا کہ جنگجو باہر بھیجے جائیں۔ دیکھا جائے کہ بابر کے سپاہیوں میں کتنا دم خم ہے۔ بائے سنغور کوئی اور نہیں اس کا چچازاد بھائی تھا۔ یہ جنگ دو بھائیوں کے درمیان ہورہی تھی۔

بابر کے دلیر سپاہیوں نے ان جنگجوؤں کا خوب مقابلہ کیا۔ کچھ قتل کیا کچھ واپس بھاگ گئے۔ کئی دن تک یہی کھیل جاری رہا۔ کچھ جنگجو باہر نکلتے، کچھ دیر مقابلہ ہوتا اور پھر سناٹا چھا جاتا۔

اسی دھوپ چھاؤں میں قدم بہ قدم بڑھتے ہوئے اس کا لشکر نواح شہر پر قابض ہوگیا۔ شہری اور تاجر جنہیں اس جنگ سے کوئی تعلق نہیں تھا، بابر کے لشکر میں آنے جانے اور پڑاؤ کے بازار میں اجناس فروخت کرنے لگے تھے۔ سودا سلف خریدنے کے لیے قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔ ایک دن سپاہیوں نے لالچ میں آکر تاجروں کا اسباب لوٹ لیا اور انہیں مار پیٹ کر بھگا دیا۔ یہ تاجر روتے پیٹتے بابر کے پاس گئے۔ بابر اس لوٹ مار کے سخت خلاف تھا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ سارا سامان جو لوٹا گیا ہے سمرقندیوں کو واپس کردیا جائے۔ دوسرے دن کی پہلی گھڑی ختم نہیں ہوئی تھی کہ تمام سامان ان کے مالکوں کو واپس کردیا گیا۔

سپاہیوں نے سامان واپس ضرور کردیا تھا لیکن ان کے دلوں میں بابر کی طرف سے کینہ آگیا۔ وہ آپس میں باتیں کرنے لگے کہ جنگوں میں سپاہیوں کو مال غنیمت ملتا ہے اور

ہمیں لوٹ مار بھی نہیں کرنے دی جارہی ہے۔ یہی تنازع بعد میں اور گہرا ہوتا گیا اور بابر مشکل میں گرفتار ہوگیا۔

بابر محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ ابھی قلعے پر حملہ کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ایک رات جب ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا کہ چند لوگ لشکر میں آئے اور سرداروں کو یہ باور کرایا کہ سپاہی اس محاصرے سے تنگ آچکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بابر کے شہری جلد از جلد شہر میں داخل ہوجائیں اور قلعے پر ان کا قبضہ ہوجائے۔ انہوں نے یقین دلایا کہ وہ انہیں ایک ایسی جگہ لے جاسکتے ہیں جہاں ایک دروازہ ہے جسے باب فیروزہ کہتے ہیں۔ وہاں ہمارے آدمی موجود ہوں گے جو دروازہ کھول دیں گے۔ آپ کی سپاہ اندر چلی جائے گی۔ پھر باقی دروازے وہ خود کھول دیں گے۔

بابر کے نہایت پرانے آزمودہ ساتھی ان شہریوں کی باتوں میں آگئے اور انہیں رہبر بنا کر ان کے ساتھ ہولیے۔ بھیانک رات، گھپ اندھیرا، راستوں سے عدم واقفیت، ایک غار کے دہانے پر پہنچے۔ شہریوں نے انہیں بتایا کہ اسے غار عشاق کہتے ہیں۔ بس اسے پار کرنے کے بعد باب فیروزہ آجائے گا۔ یہ غار جیسے ہی پار کیا قلعے والے گھات لگائے بیٹھے تھے۔ تلواریں چمکیں اور سب کے سب مارے گئے۔ صرف ایک بچ گیا ورنہ یہ ماجرا کبھی نہ کھلتا۔ اسی نے واپس آکر اس دھوکے کی تفصیل بابر کو بتائی۔

بابر اس قتل و غارت گری سے اتنا پریشان ہوا تھا کہ ممکن ہے محاصرہ اسی وقت ختم ہوجاتا کہ جانوروں کو چارا فراہم کرنے والے دوڑے ہوئے آئے اور خبر دی کہ مشرق کے راستے سے سواروں کا ایک لشکر آرہا ہے۔ بابر کو یہ امید ہوئی کہ شاید سلطان علی کا لشکر ہو لیکن وہ یہ سوچنے لگا کہ حلیف اس طرح چڑھے دوڑے نہیں آتے۔ کوئی قاصد آنے سے پہلے اطلاع تو لاتا۔ بالآخر مغل سپاہیوں نے بہت جلد پہچان لیا کہ یہ دریا پار کا ازبک لشکر ہے۔ ساتھ ہی شور مچ گیا کہ شیبانی خاں آگیا۔ اسے یقیناً بائے سنغور نے اپنی مدد کے لیے بلایا ہوگا۔

بابر نے اپنے قریبی سواروں کو پکارا اور انہیں لے کر چپ چاپ ازبکوں کے سامنے ایک بلند جگہ پر جاکر کھڑا ہوگیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی تمام سپاہ اس کے جھنڈے کے نیچے ٹیلے پر جمع ہوگئی۔

شیبانی خاں نے ٹیلے کی طرف دیکھا تو بابر کے لشکر سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اپنی فوج کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اب دونوں حریف آمنے سامنے تھے۔

شیبانی خاں کو شاید یہ معلوم نہیں تھا کہ بابر یہاں تک پہنچ گیا ہے ورنہ وہ اس معاملے میں ٹانگ نہ اڑاتا۔ اب تو وہ یہ سمجھنے لگا کہ پوری جنگ اسی کو لڑنا پڑے گی اور کس لالچ میں؟ اسے معلوم تھا کہ سمرقند میں فاقے ہورہے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ بائے سنغور نے اتنی دیر سے آنے پر اسے سخت سست سنا دیں۔ شیبانی خاں ناراض ہو کر شمال کی طرف فرار ہوگیا۔

بابر نے پورے موسم گرما اور پھر ساری خزاں سمرقند کا محاصرہ جاری رکھا۔ بائے سنغور نے پورے سات مہینے تک شہر کے پھاٹک نہ کھولے لیکن شیبانی کے خفا ہو کر چلے جانے کے بعد حالات اچانک تبدیل ہوگئے۔ شہر کے نواحی علاقے میں بابر کی سپاہ پڑی ہوئی تھی، شہر کے اندر اس کے سپاہی محصور تھے۔ خوراک کی شدید قلت پیدا ہوگئی تھی۔ شہری آئے دن شاہی سپاہ سے جھگڑتے رہتے تھے۔ شہریوں کو معلوم تھا کہ اس شہر کا اصل وارث کچھ فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے لیکن وہ دروازے کھولنے سے قاصر تھے۔

بابر سے مقابلہ کیا جاسکتا تھا، بھوک سے مقابلہ کیسے اور کب تک ہوتا؟ بائے سنغور کے امرا اس صورت حال سے تنگ آگئے۔ انہوں نے چپکے چپکے شہر چھوڑنا شروع کردیا۔ بائے سنغور کو اپنا انجام نظر آنے لگا۔ موسم سرما کا آغاز ہونے لگا تھا۔ برف پڑتی تو پھر راستوں کا حال بھی کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ اس نے شہریوں اور تھوڑے سے سپاہیوں کو اپنے پیچھے چھوڑا۔ ایک رات اپنے اعزا اور مقربین کے ساتھ فرار ہوگیا۔ اسے معلوم تھا اس وقت اس کا تعاقب کوئی نہیں کرے گا۔ وہ خسرو شاہ کے پاس شہر حصار بھاگ گیا۔

بابر کو اس کے فرار کی خبر جونہی ملی اور سمرقند کے بیگوں نے دروازے کھول دیے، وہ نقاروں اور قرناؤں کی گونج میں شہر میں داخل ہوگیا۔ شہریوں کے استقبالی نعرے اس سے بھی زیادہ شور مچا رہے تھے۔ بابر گھوڑے پر سوار شہر میں داخل ہوا اور محل میں اتر گیا۔

وہ جب اس شہر میں پہلی مرتبہ آیا تھا تو اس کی عمر صرف پانچ سال تھی۔ اب اسے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ وہ تو صرف یہ دیکھ رہا تھا کہ گنبدوں اور میناروں کا ایک جنگل ہے جو اس کے سامنے ہے۔ وہ ابھی کسی سے پوچھنے کے لائق نہیں تھا کہ کون سا گنبد الغ بیگ کے مدرسے کا ہے اور کون سا خانم مسجد کا۔ وہ سب کچھ فراموش کر بیٹھا تھا۔ سنی سنائی باتوں میں سے جو باتیں اسے یاد تھیں وہ انہیں تصور میں آباد کررہا تھا۔

یہ قدیم شہر سکندر کے زمانے میں آباد ہوا تھا۔ شہر کا نام

سمرقند اور متعلقات کا عنوان ماوراء النہر ہے۔ یہ علاقہ حضرت عثمان غنیؓ کے عہد میں فتح ہوا اور یہاں کے لوگوں نے اسلام قبول کرلیا۔

جب امیر تیمور کی فتوحات کا غلغلہ بلند ہوا تو اس فاتح اعظم و سالارِ بے بدل نے اس شہر کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا۔ اس سے پہلے کسی بڑے تاجدار نے اسے یہ شرف نہیں بخشا تھا۔ شہر پناہ کا بڑا شہرہ تھا۔ بابر نے اسے نپوایا تو دس ہزار چھ سو قدم تھی۔

دریائے کویک سمرقند سے دو کوس کے فاصلے پر بہتا تھا۔ اس دریا کا نام دریائے کویک اس لیے تھا کہ ''کویک'' ترکی زبان میں ٹیلے کو کہتے ہیں اور یہ دریا ایک ٹیلے کے نیچے سے بہتا ہوا آگے کی طرف چلتا تھا۔ یہی دریا چالیس کوس کا فاصلہ طے کرتے ہوئے بخارا پہنچتا تھا اور اس سے یہ سارا علاقہ سیراب ہوتا تھا۔

سمرقند کی عمارتیں امیر تیمور کے ذوقِ تعمیرات کا فیض تھیں۔ ان عمارتوں میں سب سے شاندار عمارت امیر تیمور کا وہ محل تھا جو چومنزلہ بنا ہوا تھا اور کرک سرائے کے نام سے مشہور تھا۔ محل کے بعد یہاں کی جامع مسجد کا شمار عجائبات میں ہوتا تھا۔ امیر تیمور ہندوستان سے واپسی کے وقت بہت سے سنگ تراشوں کو اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ ان سنگ تراشوں نے مسجد پر بڑی ہنرمندی کے مظاہرے کیے تھے مثلاً قرآنی آیات اس قدر جلی حروف میں لکھی گئی تھیں کہ ایک کوس دور سے پڑھی جاسکتی تھیں۔

کویک کے دامن میں جانب مغرب ایک میدانی باغ کے اندر ایک ایسی دو منزلہ عمارت بنی ہوئی تھی جس میں چالیس ستون تھے۔ سب کے سب پتھر کے، نئی نئی طرز سے تراشے ہوئے۔ بعض نالی والے، بعض پیچ در پیچ اور بعض میں دوسری ندرتیں تھیں۔ وسط میں وسیع ایوان بھی ستونوں پر قائم تھا۔ اوپر کی منزلوں میں چاروں طرف کھلی ہوئی غلام گردش بنائی گئی تھی۔ ان ستونوں کی وجہ سے یہ عمارت ''چہل ستون'' کہلاتی تھی۔

اس عمارت سے متصل ایک وسیع باغ تھا جس میں ایک عجیب و غریب بارہ دری بنی ہوئی تھی۔ یہ دراصل عوام کے لیے ایک تفریحی مقام تھا۔ اس بارہ دری میں پتھر کا ایک تخت بچھا ہوا تھا جو چودہ گز طویل اور سات گز عریض تھا۔ اس کی تمام دیواروں پر چینی کا کام بنا ہوا تھا اس لیے اس کا نام چینی کانہ رکھ دیا گیا تھا۔

بابر نے اپنے جد امجد کے شاہی تخت کا بڑے فخر سے مشاہدہ کیا۔ یہ تخت ایک کوشک کے نیچے رکھا تھا جسے ایک ہی پتھر کو تراش کر بنایا گیا تھا جس کی لمبائی تیس فٹ اور بلندی پندرہ فٹ تھی۔ یہ دیوپیکر چٹان بڑی دور سے لائی گئی تھی پھر اس پر طرح طرح کے ابھرے نقش و نگار تراشے گئے تھے۔

اس نے غور سے دیکھا تو اس پتھر کے تخت میں ایک درز (کریک) آگئی تھی۔ جب بابر نے لوگوں سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ اسے یہاں قائم کرنے کے عرصے بعد اس میں درز آگئی، پہلے نہیں تھی۔

درز نے بابر کو تشویش میں ڈال دیا۔ دوسری نشانیوں کے ساتھ یہ بھی آل تیمور کے زوال کی خبر دیتی تھی۔

وہ رات کو شمعدان کے سامنے بیٹھ کر اپنی یادداشتیں لکھنے بیٹھا تو اس نے لکھا ''اتنے پسندیدہ محل وقوع کے شہر دنیا میں کم ہوں گے۔ تب ہی تو اس کی بنیاد سکندر نے رکھی اور یہ محفوظ شہر مشہور ہوا۔ میں نے حکم دیا کہ اس کی کچی فصیل قدموں سے ناپی جائے۔ یہ پیمائش دس ہزار چھ سو قدم نکلی۔''

امیر تیمور نے اپنی زندگی ہی میں سمرقند اپنے بیٹے جہانگیر مرزا کو بخش دیا تھا۔ جہانگیر کی موت کے بعد اس کے چھوٹے بیٹے کو سمرقند کی حکومت عطا کی۔ وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو اس کے سب سے بڑے بیٹے کو سمرقند بخشا۔ مرزا شاہ رخ بادشاہ بنا تو اس نے ماوراءالنہر کا سارا علاقہ جس میں سمرقند بھی شامل تھا اپنے بیٹے الغ بیگ کو عطا کردیا، الغ بیگ سے سمرقند عبداللطیف مرزا نے زبردستی چھینا اور اسے مار ڈالا۔

عبداللطیف مرزا کے بعد عبداللہ مرزا جو الغ بیگ کا داماد اور شاہ رخ مرزا کا پوتا تھا، سمرقند کا مالک بنا۔ عبداللہ مرزا سے سلطان ابوسعید مرزا نے سمرقند لے لیا۔ اس کے انتقال کے بعد سلطان احمد مرزا سمرقند کا بادشاہ بنا۔

اس کے بعد کے بادشاہ چنگاریوں کی چمک کر بجھ گئے۔ اب وہ (بابر) سمرقند کا مالک تھا۔

اسے اس شہر میں آئے ہوئے دو دن ہوگئے تھے۔ وہ جب گھوڑے پر سوار ہوکر نکلتا تھا تو اس نوعمر فاتح کو دیکھنے کے لیے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے۔ جھروکوں سے عورتیں جھانک رہی ہوتی تھیں۔

وہ اس روز بھی بازار کی سیر سے واپس آیا تھا کہ اس پر وہی گھبراہٹ طاری ہوئی جو اس نے فرغانہ میں محسوس کی تھی، پھر اسے بتایا گیا تھا کہ عائشہ کو بائے سنقور نے تقریباً قیدی بنا کر رکھا ہوا ہے۔ اسے عائشہ کی یاد آئی۔ اس کے ساتھ اس کی خالہ مہر نگار بھی تو ہیں۔ میں اس شہر کا فاتح ہوں۔ معلوم تو ہو وہ

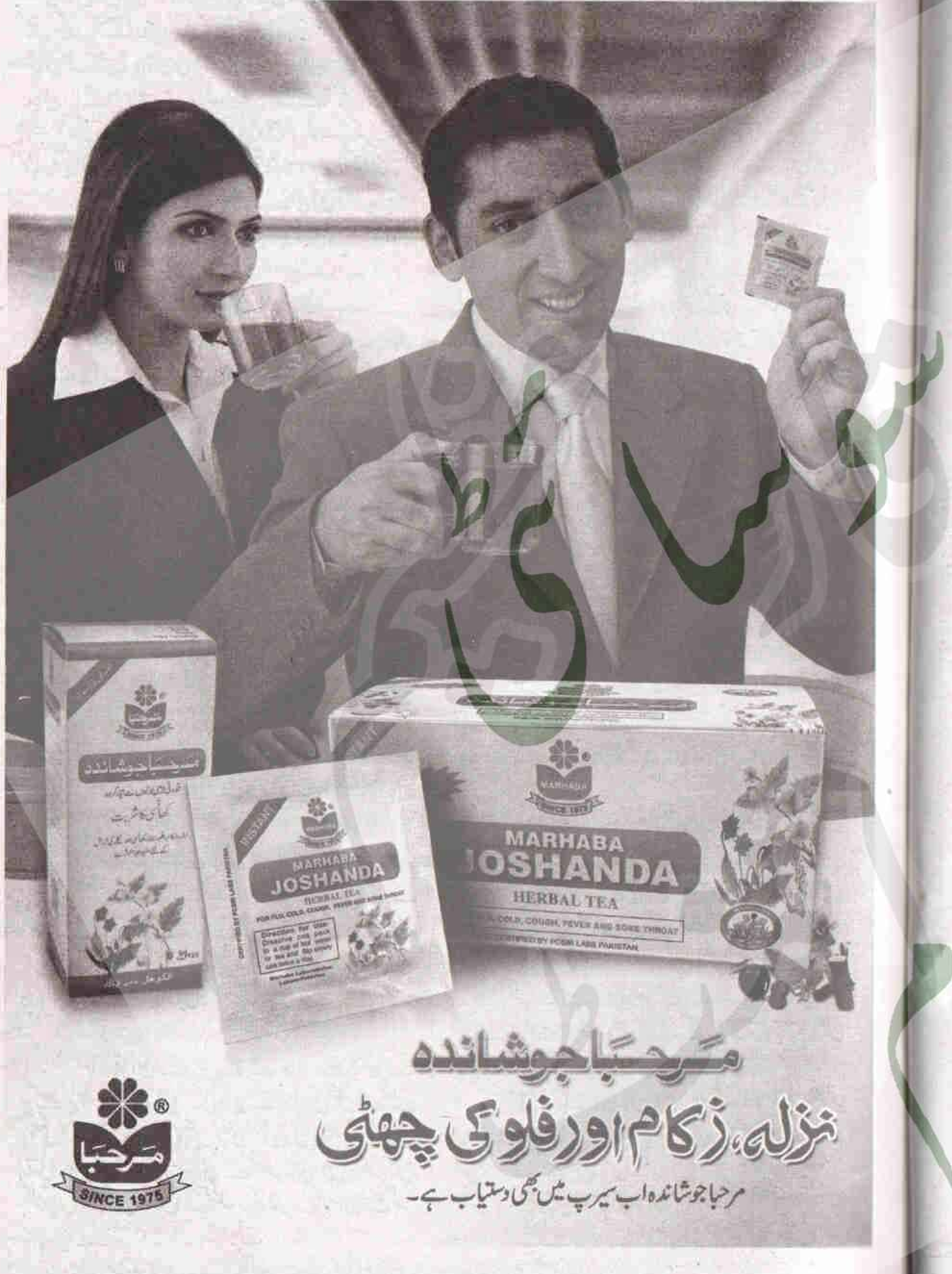

کس حال میں ہیں؟ وہ اب قیدی تو نہیں لیکن آزاد بھی نہیں۔ میں بیگوں کے درمیان گھرا ہوا ہوں۔ ان ہستیوں کا مجھے خیال تک نہیں آیا جن کی بپتا سن کر میں یہاں تک چلا آیا۔ سپاہیوں کے اس ہجوم میں وہ خود یہاں تک کیسے آئیں؟

اس نے اپنے دوست نویان کوکلتاش کو طلب کیا۔ وہی ایک ایسا تھا جس کے سامنے وہ اپنی منگیتر کا نام لے سکتا تھا۔

”نویان، کیا تم نے یہ معلوم کرنے کی بھی کوشش کی کہ سلطان احمد مرحوم کی صاحب زادی اور بیوہ مہر نگار کن حالوں میں ہیں؟“

”میں حضور کے حکم کا منتظر تھا۔“

”میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہماری طرف سے کچھ تحائف جو آپ مناسب سمجھیں لے کر ان کے گھر جائیں اور ان کی خیریت سے ہمیں فوراً آگاہ فرمائیں۔“

”جو حکم، حکمران کا۔“

”جب آپ واپس آئیں تو وہاں کی روئیداد سب کے سامنے بیان نہ فرمائیں بلکہ سب کے اٹھ کر چلے جانے کا انتظار کریں۔“

”حکمران کا یہ حکم بھی سر آنکھوں پر۔“

بابر اس وقت نیلے محل میں تھا۔ اس محل کے اس حصے میں جو کوک سرائے کہلاتا تھا، شمعیں روشن کر دی گئی تھیں۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ایک سایہ کئی مرتبہ ادھر سے گزرا اور غائب ہو گیا۔ یہ یقیناً نویان کوکلتاش تھا۔ اس وقت بابر کے پاس کچھ لوگ بیٹھے تھے اس لیے اس کی اندر آنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پھر بابر نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کیا اور سب کو وہاں سے ہٹا دیا۔

ان سب کے ہٹتے ہی نویان اندر آ گیا۔

”میں خیریت لے آیا ہوں حکمران!“ نویان نے کہا۔ ”آپ کے حکم کے مطابق تحائف بھی ان کی خدمت میں پہنچا دیے ہیں۔ آپ کی خالہ صاحبہ نے میرا استقبال کیا، بڑی شفقت سے پیش آئیں۔“

”کیسی ہیں وہ؟“

”فاقے ان کے چہرے سے ظاہر تھے۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ کئی دن سے روٹی کی شکل تک نہیں دیکھی۔ آٹا ملے تو روٹی پکائیں، کسی جنگلی بوٹی کو پیس کر اس کی روٹی بنا لیا کرتی ہیں۔ سردی سے ٹھٹھر رہی ہیں۔ گھر میں لکڑیاں تک نہیں۔ میں نے لشکر سے غلہ لے کر ان کے گھر پہنچا دیا ہے۔“

بابر یہ سن کر آبدیدہ ہو گیا۔ ”بائے سنفور کوئی غیر نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس نے ان خواتین کے ساتھ یہ سلوک کیا۔“

”بائے سنفور کا حال بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ سات مہینے کے محاصرے نے سب کچھ ختم کر دیا۔“

”چچا احمد کی صاحب زادی کیسی ہیں؟“

”میں ان کی صرف آواز سن سکا۔ وہ پردے میں تھیں لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کا حال بھی خانم سے مختلف نہیں ہو گا۔“

بابر کا بے اختیار جی چاہا کہ وہ عائشہ سے ملاقات کے لیے اس کے گھر پہنچ جائے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ رسم کے مطابق وہ اس سے نہیں مل سکتا تھا البتہ خالہ سے مل سکتا تھا لیکن انہیں بھی نیلے محل میں بلانا پڑتا۔

نویان کو کچھ یاد آیا۔ اس نے ایک تھیلی جیب سے نکالی۔ ”یہ عائشہ بیگم کی طرف سے آپ کے لیے تحفہ ہے۔“

”کیا ہے اس میں؟“

”میری یہ مجال تھی کہ میں اسے کھول کر دیکھتا۔“

بابر نے تھیلی کھول کر دیکھی۔ اس میں ایک پرچہ رکھا ہوا تھا جس پر لکھا تھا۔ ”اپنے نجات دہندہ کے لیے میرے پاس دینے کے لیے کچھ بھی نہیں۔“

یہ ایسا تحفہ تھا جس کی لذت بابر نے برسوں محسوس کی۔

عائشہ کے گھر کے حالات جان کر بابر کو شہر والوں کا خیال آ گیا تھا لہٰذا وہ دوسرے دن گھوڑے پر سوار ہوا۔ قاسم بیگ کو ساتھ لیا اور بازار چلا گیا۔ نان فروشوں کا بازار بند پڑا تھا۔

”یہ دکانیں بند کیوں ہیں؟ کیا میرے خوف نے انہیں مجبور کر دیا ہے کہ دکانیں بند رکھیں؟“

”یہ بات نہیں ہے بلکہ آٹا ہی نہیں تو یہ لوگ دکانیں کھول کر کیا کریں۔“ ایک راہ گیر نے بتایا۔

”غلہ کہاں گیا؟“

”سات مہینے کے محاصرے نے سب ختم کر دیا۔ بیج تک کے لیے جو غلہ تھا وہ بھی کھا پی گئے۔ اب تو کسانوں میں بہ سبب لاغری اتنی سکت بھی نہیں کہ غلہ اگا سکیں۔“

”قاسم بیگ، ان نان بائیوں کو لشکر سے غلہ فراہم کیا جائے۔ نان بائی روٹیاں پکائیں اور ہماری طرف سے شہریوں میں تقسیم کی جائیں۔“

”لشکر میں اتنا غلہ کہاں؟“

”لشکر والوں سے کہو کم کھائیں۔ کچھ حصہ اپنے بھائیوں میں تقسیم کریں۔“

قاسم بیگ اس کے بعد کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ احمد تنبل اور خان قلی ان کے پیچھے پیچھے چلے آتے تھے۔ احمد تنبل نے یہ حکم سنا تو اپنے ساتھی امیر خان قلی سے سرگوشی کی۔

”تمام فاتح شہریوں کا قتل عام کرتے ہیں۔ ہم سے کہا جا رہا ہے کہ ہم ان کے پیٹ بھرنے کا سامان کریں۔“

”وہ بھی اپنا پیٹ کاٹ کر۔“ خان قلی نے گرہ لگائی۔

کچھ دور چل کر بابر کو یہ معلوم ہوا کہ ایک دن پہلے سپاہیوں نے بازار میں لوٹ مار کی ہے۔ کچھ دکانوں کو لوٹ لیا ہے۔ واپس آ کر بابر نے حکم جاری کیا کہ سپاہی آئندہ لوٹ مار نہیں کریں گے۔ بازاروں سے جو کچھ لیں گے اس کی قیمت ادا کریں گے۔

اس شہر میں مال غنیمت کے نام پر ایک دھیلا بھی نہیں ملا تھا۔ اب یہ کہا جا رہا تھا کہ لوٹ مار نہیں کریں گے۔ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ لشکر کا اناج بھی شہریوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ سپاہیوں میں بددلی پھیلنے لگی اور وہ ایک ایک دو دو کر کے کھسکنے لگے۔

سمرقند آتے ہی بابر نے اپنے امیروں کے ساتھ مشفقانہ سلوک روا رکھا تھا۔ خاص طور پر احمد تنبل پر اس کی خاص عنایت تھی۔ اس کی ماں خانزادہ سے اس کا رشتہ کرنا چاہتی تھی۔ خانزادہ نے انکار کر دیا تھا لیکن بابر سوچتا تھا کہ کیا خبر خانزادہ کا انکار کسی وقت اقرار میں بدل جائے۔

اس کے برخلاف احمد تنبل شاید یہ سمجھنے لگا تھا کہ اس انکار میں خود بابر کا ہاتھ ہے۔ اس لیے وہ دل ہی دل میں اس سے نفرت کرنے لگا تھا۔

احمد تنبل ان بھاگنے والوں کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ وہ اتنا شوخ ہو گیا تھا کہ اس نے اس مسئلے پر بابر سے بحث کی۔ پہلے تو وہ اس پر ڈٹا رہا کہ عوام کو غذائی قلت کا سامنا کرتے رہنا چاہیے تاکہ وہ ہمارے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا تصور بھی نہ کر سکیں لیکن جب بابر نے یہ دلیل دی کہ غذائی قلت ہماری وجہ سے ہوئی ہے۔ سات مہینے ہم نے محاصرہ کیے رکھا تھا تو وہ چپ ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے جنگوں کا روایتی دستور بیان کیا۔ ”کیا سپاہیوں کو مالِ غنیمت حاصل کرنے کا حق نہیں؟“

”ان غریب شہریوں کے پاس ہے کیا جو تمہیں مال غنیمت میں ملے گا۔“

لشکر سے غلہ پہنچ چکا تھا۔ شہریوں کو روٹیاں تقسیم کی جانے لگی تھیں۔ پیٹ بھر کر روٹی کھانے کے دن اسی وقت آ سکتے تھے جب فصل کٹنے کے دن آ جاتے۔ اس وقت تک صبر کرنا تھا۔ صبر کس کو تھا۔ ایک ایک کر کے لوگ جانے لگے تھے۔ احمد تنبل یہ کہتا پھر رہا تھا کہ حکمران کی منگیتر یہاں رہتی ہے اس لیے وہ پورے شہر کی خدمت کر رہا ہے۔ بادشاہت اس طرح نہیں چلتی۔

ایک دن خان قلی بیگ اپنے پچاس سواروں کو لے کر نکل گیا۔ ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ احمد تنبل بھی بھاگ کھڑا ہوا۔ پھر تو جیسے بھگدڑ سی مچ گئی۔ لوگ تیزی سے فرار ہونے لگے۔ ان سب کا رخ آخشی کی طرف تھا۔ احمد تنبل اس ارادے سے گیا تھا کہ وہ جہانگیر مرزا کو ساتھ لے کر اندجان پر قبضہ کر لے گا۔ نوبت یہ آ گئی کہ سمرقند میں بابر کے ساتھ کل ہزار آدمی رہ گئے۔ ان میں سے بھی بیشتر وہ تھے جو اندر سے جہانگیر مرزا کے حق میں تھے۔

بابر کے پاس سے جو سپاہی بھاگے تھے وہ آخشی میں جہانگیر مرزا کے پاس جمع ہونے لگے تھے۔ احمد تنبل بھی وہیں پہنچ گیا تھا۔ سلطان علی جس نے بابر سے عہد کیا تھا کہ وہ دونوں مل کر سمرقند پر حملہ کریں گے اور پھر وعدہ خلافی کرتے ہوئے نہیں آیا تھا، احمد تنبل کو تلاش کرتا ہوا آخشی پہنچ گیا۔ انہوں نے جہانگیر مرزا کو بھی ورغلایا کہ وہ اسے یہاں کا بادشاہ بنا دیں گے۔ جہانگیر نے بھی دیکھا کہ اچھا خاصا لشکر اس کے حق میں جمع ہو چکا ہے تو وہ بھی لالچ میں آ گیا۔ سازشیوں نے شہر کو ہر طرف سے گھیر لیا۔

ایسان دولت بیگم اور قاضی عبداللہ کے خط آئے۔ ان میں ایک ہی مضمون کو دہرایا گیا تھا کہ ”بلا تاخیر واپس آؤ اور اپنے شہر کو بچاؤ۔“

”قاسم بیگ!“ بابر اتنی زور سے شاید کبھی نہیں چیخا تھا۔ ”فوج کو فوراً اندجان بھیجو، یہ ہمارا حکم ہے۔“

”فوج ہے کہاں جسے اندجان بھیجا جائے؟“

”کسی کو بھیجو کہ وہ اندجان سے میرے ناراض بیگوں کو واپس بلا لائے۔“

”میں ابھی حکم کی تکمیل کرتا ہوں۔“

ایک معتبر شخص کو بھیجا گیا۔ بیس دن بعد ہی یہ خبر آ گئی کہ احمد تنبل اور اس کے طرف داروں نے اس قاصد کو آخشی اور اندجان کے درمیان کسی جگہ قتل کر دیا ہے۔

اس خبر کے پیچھے پیچھے اس کی ماں کا خط بھی آ گیا۔ ”فوراً آؤ۔ احمد تنبل بغاوت پر آمادہ ہے۔ اس نے قلعے کا گھیراؤ کر لیا ہے۔ نہ جانے وہ ہمارا کیا حشر کرے۔“

اس خط نے بابر کو ایسا پریشان کیا کہ اس نازک موقعے پر وہ علیل ہو گیا۔ فکر و تشویش نے بخار میں ایسی شدت پیدا کی

کہ خط پڑھنا، احکام جاری کرنا تو ایک طرف، وہ زبان سے بات بھی نہ کرسکتا تھا۔ کھانا پینا ختم ہوگیا۔ روئی کو پانی میں تر کرکے اس کے ہونٹوں پر ٹپکایا جارہا تھا۔ ایک عالم طاری تھا جسے نزع کا عالم ہی کہا جاسکتا تھا۔ اس کے مقرب امیر بار بار اس کے پاس جاتے تھے اور مایوس ہوکر لوٹ آتے تھے۔ وہ دیارِ غیر میں پڑا ہوا تھا اور اس کا علاقہ ہاتھوں سے نکلا جارہا تھا۔

باغیوں نے ایک مرتبہ پھر سوچا کہ گھی اگر سیدھی انگلیوں سے نکل آئے تو اچھا ہے۔ انہوں نے جہانگیر مرزا کو اندجان دلانے کے لیے ایک ایلچی بابر کے پاس بھیجا۔ ایلچی کو یہاں آکر معلوم ہوا کہ بابر علیل ہے۔ اب وہ بات کرتا تو کس سے کرتا۔

”مجھے آپ مرزا بابر کے پاس لے تو چلیے۔ ہوسکتا ہے وہ اس وقت بات کرنے کے لائق ہوگئے ہوں۔“

”طبیبوں نے منع کردیا ہے کہ انہیں پریشان نہ کیا جائے۔“

”کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ لوگ چاہتے ہی نہ ہوں کہ میری ان سے بات ہو۔“

”وہ بات کرہی نہیں سکتے۔“

”میں اگر اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھ لیتا تو مجھے یقین آجاتا۔“

”ہم آپ سے غلط بیانی کریں گے؟“

”جب تک میں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیتا مجھے یقین نہیں آئے گا۔ میں اندجان جاکر آقا احمد تنبل سے یہ سفارش بھی کروں گا کہ مرزا بابر کی صحت یابی تک اندجان کی مہم کو ملتوی کردیا جائے۔“

قاسم بیگ جو اتنی دیر سے اسے روک رہا تھا، یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے سوچا اگر اندجان کی مہم ملتوی ہوجائے تو ہمیں تیاری کا موقع مل جائے گا۔ وہ ایلچی کو بابر کے پاس لے گیا۔ بابر محل کی اوپری منزل کی خواب گاہ میں لیٹا ہوا تھا۔ نرم پروں سے بھرا ہوا گدا اس کے نیچے بچھا ہوا تھا۔ دو پہرے دار اس کے سرہانے کھڑے تھے۔ بابر کی آنکھیں بند تھیں۔ ایک طبیب اس پر جھکا ہوا تھا۔ شاید اسے ہوش میں لانے کی کوشش کررہا تھا۔ کوئی موقع ہی نہیں تھا کہ ایلچی اس سے بات کرتا بلکہ اسے تو یہ یقین آنے لگا تھا شاید بابر کا آخری وقت قریب ہے۔

ایلچی کو ایسی خبر مل گئی تھی جسے اندجان تک پہنچانے کے لیے وہ بے چین تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو اس تیزی سے بھگایا جیسے اس کے پر لگ گئے ہوں۔ وہ اندجان کے پڑاؤ میں پہنچا اور خبر دی کہ بابر نزع کے عالم میں ہے۔ ”بابر نزع کے عالم میں ہے۔“ یہ آواز لشکر میں اس طرح گونجی جیسے دو پہاڑوں کے درمیان ایک مرتبہ کی آواز کئی مرتبہ سنائی دیتی ہے۔

علی دوست طغائی ابھی تک قلعے کی حفاظت کررہا تھا۔ کچھ دنوں سے اس نے یہ اہتمام بھی کردیا تھا کہ چند سپاہی قلعے سے نکلتے تھے اور احمد تنبل کے لشکر میں دہشت پھیلا کر چلے آتے تھے۔ رات رات بھر فصیلوں پر پہرا دیا جاتا تھا۔ خانزادہ خود بھی مردانہ لباس میں قلعے کی فصیل سے تیر چلارہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میرا بھائی بابر یہاں نہیں ہے۔ میں یہاں ہوں تو سمجھو بابر یہیں ہے۔ قتلق نگار خانم بار بار اسے ٹوک رہی تھیں کہ وہ اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالے لیکن وہ بضد تھی۔ قاضی عبداللہ بھی پامردی کا ثبوت دے رہے تھے۔ رات رات بھر سپاہیوں کا حوصلہ بڑھاتے پھر رہے تھے۔

علی دوست کو بابر اندجان کا حاکم بنا کر سمرقند آیا تھا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ بابر کا چل چلاؤ ہے تو اس نے اپنی جان کی امان مانگ کر اندجان دشمنوں کے سپرد کردیا۔

بابر آہستہ آہستہ صحت یاب ہورہا تھا۔ بدن میں ذرا جان آئی تو اسے سب کچھ یاد آگیا۔ وہ خطوط اس نے دوبارہ پڑھے جو اس کی ماں اور نانی نے لکھے تھے۔ اب تک تو وہاں نہ جانے کیا ہوگیا ہوگا۔ اندجان کا محاصرہ کرلیا گیا ہے۔ میرے وفادار علی دوست نے اتنی جلدی شہر کو ان کے حوالے نہیں کیا ہوگا۔ مجھے تیز رفتاری سے وہاں پہنچنا ہوگا تاکہ میں اپنے شہر کو بچا سکوں۔ وہ بستر سے اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے برہنہ پاؤں نرم قالین میں دھنس گئے۔

”آپ علیل ہیں، لیٹے رہیے۔ ابھی آپ کا اٹھنا ٹھیک نہیں ہے۔“

”نہیں، اب میں مکمل صحت یاب ہوں، میرا گھوڑا لائیے میں اندجان جارہا ہوں۔ جسے میرے ساتھ چلنا ہے، چلے۔“ یہ کہتے کہتے وہ ایک مرتبہ پھر چکرا کر بستر پر گر گیا۔ طبیب دوڑ پڑے۔ رات بھر وہ کبھی سنبھلتا رہا کبھی اس کی حالت بگڑتی رہی۔ صبح ہوئی تو وہ بالکل چاق و چوبند تھا۔ اندجان جانے کی ضد وہ اب بھی کررہا تھا۔ وہ گھوڑے کی سواری کا عاشق تھا۔ سولہ سالہ نوجوان کسی بند سواری میں سفر کرنے کے بجائے گھوڑے کی سواری کو پسند کرتا تھا۔ وہ کسی قیمت پر گھوڑا گاڑی میں بیماروں کی طرح جانے پر رضامند نہیں تھا لیکن قاسم بیگ کی ضد نے اسے مجبور کردیا۔

گاڑی میں نرم گدے بچھے ہوئے تھے۔ دونوں

پہلوؤں اور پیچھے کی طرف پردے لگے ہوئے تھے۔ بابر گاڑی میں سوار ہوا اور گاڑی کے پہیوں نے گھومنا شروع کیا تو اس نے لاشعوری طور پر عقبی پردے کو ہٹا کر دیکھا اور پھر راستے بھر وہ یہی کرتا رہا۔ ہاتھ سے جاتے ہوئے سمرقند کو دیکھتے رہنا اس کے لیے کتنا تکلیف دہ تھا، یہ وہی جان سکتا تھا۔ جانے کتنی مشکلات جھیل کر سمرقند پر قبضہ کیا اور پھر خود اپنی مرضی ہی سے اسے چھوڑ دیا۔

اسے عائشہ بیگم کی یاد آرہی تھی۔ وہ اسے ساتھ نہیں لے جاسکتا تھا۔ اس نے عزم کیا کہ وہ اسے لینے ایک مرتبہ پھر سمرقند آئے گا۔

ایک ہزار سواروں کا لشکر اس کے ساتھ تھا۔ اسے یقیناً یاد آیا ہوگا کہ جب وہ یہاں آیا تھا تو اس کے ساتھ ایک لشکر جرار تھا۔

دوستوں کی بے وفائیوں پر غور کرتے ہوئے وہ دریائے سنگ زار تک آگیا۔ شام کا وقت تھا اب رات کے لیے پڑاؤ کرنا تھا۔ سرسبز و شاداب ٹیلوں پر خیمے نصب ہوگئے۔

رات بھر کے آرام کے بعد جب پڑاؤ اٹھا تو اس کے ہمدرد یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ گاڑی میں نہیں ایک سفید گھوڑے پر سوار ہے۔ اس کے چہرے پر وہی طمانیت ہے جو کبھی ہوا کرتی تھی۔

”آپ گھوڑا گاڑی سے گھوڑے پر کیوں تشریف لے آئے؟“ قاسم بیگ نے تشویش کے ساتھ پوچھا۔

”بزرگ امیر، ہمیں ایک مرتبہ پھر ان راستوں سے ہوکر سمرقند آنا ہے۔ ہم راستوں کو اچھی طرح دیکھ لینا چاہتے ہیں۔ گاڑی کے اندر بیٹھ کر یہ سہولت نہیں مل سکتی تھی۔ میں نے ایک قاصد اندجان کی طرف بھیجا تھا۔ شاید وہ راستے میں مجھے مل جائے۔ میں اس لیے بھی گھوڑے پر آگیا ہوں۔“

”حکمران کا کہا پورا ہو، ایک مرتبہ پھر آپ سمرقند کے مالک بن جائیں۔“

ایک مقام جزخ سے آگے بڑھ کر رات کے لیے ایک بار پھر سرسبز ٹیلوں پر قیام ہوا۔ اسی طرح پڑاؤ پر پڑاؤ کرتے ہوئے وہ ساتویں دن دریائے نو کو پار کرکے خجند کے قریب پہنچ گیا۔

وہ خجند کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اس کا بھیجا ہوا قاصد واپس آتے ہوئے اسے مل گیا۔ اس قاصد کی زبانی اسے حقائق کی اطلاع ملی کہ جس دن اس نے سمرقند سے روانگی اختیار کی تھی اسی دن علی دوست نے جسے وہ حاکم بنا کر سمرقند آیا تھا، اندجان کو دشمنوں کے حوالے کردیا تھا۔ جہانگیر مرزا ان باغیوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا ہے۔ اسے یہ روح فرسا خبر بھی ملی کہ اس کے اتالیق قاضی عبداللہ کو سولی پر لٹکا دیا گیا ہے۔ ان بزرگ کی لاش کئی دن تک اندجان میں لٹکی رہی۔ ان کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ بابر کے وفادار تھے۔ اس کی وفادار تو تین خواتین بھی تھیں۔ نانی، والدہ اور خانزادہ لیکن ان کی طرف سے یہ اطمینان تھا کہ جہانگیر کی موجودگی میں احمد تنبل انہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

وہ بادشاہی کے دونوں سروں سے ہاتھ دھو چکا تھا۔ اندجان کی خاطر سمرقند چھوڑا تھا اب نہ سمرقند رہا اور نہ اندجان۔

برے وقت میں اپنے ہی یاد آتے ہیں۔ اسے بھی اپنے ماموں کی یاد آئی۔ اکبر محمود ان کا نام تھا اور وہ تاشقند کے حکمران تھے۔ ان کی بہن یعنی بابر کی والدہ اور بابر کی نانی باغیوں کی قید میں تھیں اس لیے اسے امید تھی کہ وہ اس کی مدد کو ضرور آئیں گے۔ اس کے لیے نہیں تو اپنی بہن اور والدہ کو قید سے چھڑانے کے لیے آئیں گے۔

اس نے قاسم بیگ کو قاصد بنا کر تاشقند کی طرف بھیجا۔ خان موصوف اپنی فوج لے کر چلے ضرور لیکن ہچکچا بھی رہے تھے۔ وہ ایک جگہ آکر خیمہ زن ہوئے۔ بابر بھی اپنی فوج بچا کر ان تک پہنچ گیا اور یہ طے ہوا کہ دونوں مل کر آخشی پر حملہ آور ہوں گے۔

اکبر محمود کو بابر کے مختصر سے لشکر کو دیکھ کر مایوسی ہوئی تھی۔ سمجھ گیا کہ حالات بھانجے کے لیے سازگار نہیں ہیں۔ اس کے سرداروں نے احمد تنبل کے نائبین سے تحائف قبول کیے اور اپنے خان کو مشورہ دیا کہ وادی میں خطرہ مول نہ لے، واپس ہوجائے۔ اکبر محمود نے یہ مشورہ قبول کرلیا اور اپنی فوجوں کو لے کر چلتا بنا۔

ان کی اس حرکت نے بابر کی فوج میں انتشار ڈال دیا۔ جو لوگ اندجان کے رہنے والے تھے اور ان کے لواحقین اندجان میں تھے، اب تک اس لیے بابر کے ساتھ تھے کہ اکبر محمود کی مدد سے اندجان واپس مل جائے گا، سلطان کے جاتے ہی وہ بھی بابر کا ساتھ چھوڑ گئے۔ چھوڑ کر جانے والوں کی تعداد سات سو سے کم نہیں تھی۔ اب اس کے ساتھ صرف دو تین سو آدمی رہ گئے۔ تنہائی میں بیٹھ کر اپنی حالت پر خوب رویا اور ان مٹھی بھر ساتھیوں کے ہمراہ خجند واپس آگیا۔

خجند چھوٹی سی جگہ تھی۔ اس کی آمدنی اتنی نہ تھی کہ اس سے کوئی بڑی فوج رکھی جاسکے۔ دو تین سو آدمی بھی اس میں گزارہ نہیں کرسکتے تھے۔ اس لیے ایک بار پھر سمرقند پر چڑھائی کا منصوبہ بنایا۔ موسم سرما گزار کر سمرقند کی طرف چلا

لیکن راستے ہی سے لوٹنا پڑا۔ وہ پھر خجند واپس آ گیا۔

اب وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ مایوسی میں ادھر ادھر پریشان گھومنے لگا۔ پھر وہ ان پہاڑیوں کی طرف نکل گیا جہاں غلے کے کھیت اور مویشیوں کے گلّے تھے۔ پہلے بھی اس نے ان علاقوں میں گھوم پھر کر مستعار فوج سے لشکر تیار کیا تھا، اب وہ پھر یہ تدبیریں کرنے لگا۔

اسی پہاڑی پناہ گاہ میں آتے جاتے لوگوں نے مشورہ دیا کہ پہاڑوں کے ادھر ایسی بستیاں ہیں جہاں وہ قیام کر سکتا ہے لیکن کھوج لگانے پر معلوم ہوا کہ یہاں خسرو شاہ کی عملداری ہے تو اس نے ان بستیوں کا رخ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ حالانکہ وہ ایسا طاقتور تھا کہ اس سے مدد مل سکتی تھی۔

اس نے ادھر سے منہ پھیرا اور اپنے ساتھیوں کو کوہ سفید پر لے کر چلا۔ ان چٹیل بلندیوں پر کوئی اچانک حملہ آور نہ ہو سکتا تھا اور نہ کسی تنگ گوشے میں اسے گھیرا جا سکتا تھا۔ وہ یہاں محفوظ تو تھا لیکن یہ سوچ کر پریشان بھی تھا کہ ان جنگلی قبائل کے درمیان اپنے سپاہیوں کو کب تک رکھنا مناسب ہوگا۔

اسے کسی سلطنت کے بغیر آوارہ گھومتے ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ وہ ایک مرتبہ پھر خجند آ گیا۔ شاید ایک خوش خبری تھی جو اسے کھینچ لائی تھی۔ ایک دن کا سورج طلوع ہوا تو اس کی نانی، والدہ اور بہن اچانک اس کے پاس پہنچ گئیں۔ احمد تنبل نے شاید جہانگیر مرزا کی سفارش پر بادل ناخواستہ اندجان کو چھوڑنے کی اجازت دے دی تھی۔ بابر کو ایسی قوت مل گئی جو اسے کسی سردار کی کمک سے بھی نہیں مل سکتی تھی۔

ایک روز سہ پہر کا وقت تھا کہ ایک سوار بابر کے پڑاؤ پر آیا۔ وہ بابر کے سابق قلعہ دار علی دوست کا تحریری پیغام لے کر آیا تھا جس نے اندجان کا قلعہ باغیوں کے حوالے کر دیا تھا اور اب تنبل نے اس کی وفاداری کے صلے میں فرغانہ کا تیسرا بڑا قصبہ مرغینان اس کی حکومت میں دے دیا تھا۔ اس نے تحریری پیغام بھیجا تھا کہ وہ مرغینان چلا آئے۔ وہ شہر اس کے حوالے کر کے اپنے سابقہ جرم کی تلافی کر دے گا۔

اس نے کچھ بھی سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ اس میں کوئی دھوکا بھی ہو سکتا تھا۔ کسی سے مشورے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی، بچے کھچے لشکر کو ساتھ لیا اور مرغینان کی طرف چل پڑا۔ اب اس کے قافلے میں تین خواتین بھی تھیں۔ سورج غروب ہو رہا تھا لیکن وہ ایسی سرعت سے چلا جیسے علی دوست کا ارادہ بدلنے سے پہلے پہنچ جانا چاہتا ہو۔ وہ ساری رات اور دوسرے دن دوپہر تک مسلسل چلتا رہا۔ ایک جگہ پڑاؤ کیا اور پھر چل دیا۔ دوسرے دن فجر کی نماز کے قریب مرغینان پہنچ گیا۔ علی دوست اسی طرح ملا جیسے کوئی اپنے آقا سے ملتا ہے۔ اس وقت اس کے ساتھ کل دو سو چالیس نفوس تھے۔

علی دوست کے سپاہیوں نے بابر کی اطاعت کا حلف اٹھایا۔ بابر کے پاس ایک مورچہ بند شہر اور ایک چھوٹا موٹا لشکر پھر فراہم ہو گئے۔ اس نے یہاں رہتے ہوئے قاسم بیگ اور معتمد نائبوں کو مزید فوج بھرتی کرنے کے لیے ادھر ادھر بھیج دیا۔

قبائل جو انتظار میں تھے، گھوڑوں پر سوار ہو ہو کر اپنے مرحوم بادشاہ کے بیٹے کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ کچھ اس کی محبت میں آئے تھے کچھ غارت کا مال ملنے کی طمع میں۔

اسے مرغینان آئے ہوئے چند دن ہی ہوئے تھے کہ اوزدن حسن اور احمد تنبل، جہانگیر مرزا کو ساتھ لے کر مرغینان پر حملہ آور ہو گئے لیکن اس وقت تک بابر کے پاس اتنا لشکر فراہم ہو گیا تھا کہ اس کے سپاہیوں نے اس حملے کو ناکام کر دیا اور دشمن کو پسپا ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔

یہ فتح اس طرح ہوئی تھی جیسے کئی سال کے انتظار کے بعد بارش ہوتی ہے۔ اس کا حوصلہ ایسا بڑھا کہ دوسرے دن کا سورج طلوع ہوتے ہی وہ اندجان کی طرف چل دیا۔

اندجان کے لوگ خوش مزاج بابر کو پسند کرتے تھے۔ تنبل اور باغی سرداروں کی سختی سے تنگ آ چکے تھے۔ ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ بابر اندجان کی طرف بڑھ رہا ہے تو انہوں نے ہتھیار سنبھالے۔ عوام کے تیور دیکھ کر تنبل نے اسی میں عافیت جانی کہ اندجان چھوڑ کر چلا جائے اور وقت کا انتظار کرے۔

عصر کے وقت بابر اندجان پہنچا تو بغیر کسی لڑائی کے اندجان میں داخل ہوا۔ اس کا چھوٹا بھائی ناصر مرزا اس کے استقبال کے لیے شہر سے باہر آیا تھا۔ چھنی ہوئی سلطنت دوبارہ مل گئی۔

بابر اندجان کے قلعے میں پہنچا تو تینوں خواتین اپنے اپنے پرانے دالانوں میں اتریں۔ اس کی نانی بھی اپنے برج میں متمکن ہو گئی تھیں۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا اور اب جیسے وہ خواب ٹوٹ گیا ہے۔

اوزدن حسن مرغینان میں شکست کھا کر آخشی کی طرف بھاگ گیا تھا۔ بابر نے اندجان کی فتح کے بعد آخشی کی راہ اختیار کی۔ اوزدن حسن مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور ہتھیار ڈال دیے۔ رحم کی درخواست کی اور آخشی کا قلعہ اس کے سپرد کر دیا۔

اس کے بعد وہ کاشان گیا اور اسے بھی اپنے قبضے میں لے آیا۔

اب تمام شہر بابر کے قبضے میں تھا اور وہ فرغانہ کا تن تنہا مالک تھا۔ اس کے دشمن موجود ضرور تھے لیکن اس سے بھڑنے کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے۔

اس کی منگیتر عائشہ بیگم کب سے اس کے انتظار میں تھی۔ اس کی ماں کو بھی فکر تھی کہ حالات نہ جانے کب کون سا رخ اختیار کرلیں۔ ابھی قسمت ساتھ دے رہی ہے تو بابر کی شادی کا اہتمام کیا جائے۔ بابر اب انیس سال کا ہو گیا تھا۔ کم وبیش اتنی ہی عمر عائشہ کی بھی ہو چکی تھی۔ آخر اس کی ماں نے اس کی دلہن لانے کا انتظام کرایا۔ شہزادی عائشہ اپنی دایا اور جہیز کے ساتھ سمرقند سے چل کر آئی۔

وہ اوش کے معرکے پر گیا ہوا تھا کہ شہزادی عائشہ اندجان آگئی۔ وہ واپس آیا تو محل میں چہل پہل دیکھی۔ وہ جس کے انتظار میں غزلیں لکھتا رہا تھا، وہ آگئی تھی۔ وہ تھکن بھی نہیں اتار پایا تھا کہ قاضی نے نکاح پڑھا دیا۔ اب عائشہ اس کے لیے غیر نہیں تھی۔ وہ رسم کے مطابق نکاح کے بعد آداب بجالانے کے لیے کھڑی ہوئی تو اس کے مقابلے میں خاصی پستہ قد تھی۔ نہایت دبلی، گردن اتنی پتلی کہ اس کے کانوں میں پڑے ہوئے آویزے بہت بڑے لگ رہے تھے۔ ہاتھ ایسے تھے جیسے کوئی چھوٹی بچی ہو۔ اس کی شاعرانہ طبیعت کو سخت دھچکا پہنچا۔ اس نے اپنے تصور میں عائشہ کے نام پر کیسے کیسے چہرے آباد کرلیے تھے۔ سب ایک ایک کرکے بکھر گئے۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ وہ سوچ رہا تھا، اب تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔

وہ سمجھ رہا تھا حقیقت کو تسلیم کرنا آسان ہے لیکن پہلے دن عائشہ کی طرف سے جو بے دلی پیدا ہوئی تھی اس میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ وہ امورِ سلطنت کے بہانے عائشہ سے دور ہوتا چلا گیا۔ دس پندرہ روز بعد اس کی طرف رخ کرلیتا ورنہ اپنی خواب گاہ میں اکیلا ہی پڑا رہتا۔ اس سردمہری کو بہت جلد عائشہ نے بھی محسوس کرلیا۔ جواب میں وہ بھی اس سے کترانے لگی۔ قربت میں فاصلے بڑھتے گئے۔

وہ بے لطفی کے اس دور سے گزر ہی رہا تھا کہ چھاؤنی بازار کا ایک لڑکا اس کی نظروں میں آگیا۔ اس کا نام بابری تھا۔ یہ میل جول عشق میں تبدیل ہو گیا لیکن یہ عشق عجیب طرح کا تھا۔ بابری جونہی اس کے سامنے آتا، بابر کی آنکھیں شرم سے جھک جاتیں، وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

ایک دن وہ اپنے خدام کے ساتھ ایک گلی سے گزر رہا تھا کہ بابری اور بابر میں مڈبھیڑ ہو گئی۔ بابر جیسا دلاور تھر تھر کانپنے لگا اور پھر گھبراہٹ کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

اس عشق نے اسے بہت دن تک عائشہ بیگم سے لاتعلق کردیا۔

خانزادہ بیگم اب بہت اداس رہنے لگی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کی ابھی تک شادی نہیں ہو سکی تھی۔ وہ یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ بابر اور عائشہ کے تعلقات میں سردمہری ہے۔ اس نے بھائی کا دھیان بٹانے کے لیے اسے سمرقند پر حملہ کرنے پر اکسانا شروع کردیا تھا۔ اس نے خود بھی جس حال میں سمرقند خالی کیا تھا اس کے بعد وہ سوچتا رہتا تھا کہ سمرقند پر دوبارہ قبضہ کرے۔

سمرقند سے آنے کے بعد اس نے وہاں کی خوبصورتی کے جو قصے سنے تھے اس کے بعد سے وہ سمرقند جانے کے لیے بے چین تھا۔ وہ اس مرتبہ خوب تیاری کے بعد سمرقند کی طرف جانا چاہتا تھا لیکن حالات نے اسے جلدی جانے پر مجبور کردیا۔

سمرقند پر سلطان علی قابض ہو چکا تھا لیکن ظالم اور عاقبت نااندیش تھا۔ ترخانیوں کا مضبوط گروہ جو اس کے حق میں تھا اس کے خلاف ہو گیا۔ شہری بھی بابر کے سو دن کی حکومت کو یاد کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنا ایک ایلچی بابر کے پاس روانہ کیا کہ وہ آئے اور شہر پر قبضہ کرلے۔

اس نے کسی تیاری کی پروا نہیں کی۔ اہل وعیال کو چھوڑ کر چپ چاپ اندجان سے نکل آیا۔ صرف بھروسے کے ملازمین اس کے ساتھ تھے۔ اس مرتبہ کسی جنگ کی توقع نہیں تھی اس لیے کسی بڑے لشکر کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

وہ ابھی راستے میں تھا کہ حالات اس کے خلاف ہو گئے۔ خبر آئی کہ شیبانی خاں نے بخارا پر قبضہ کرلیا ہے اور سمرقند کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس خبر کو سنتے ہی وہ پیچھے ہٹ گیا۔

مغرب کی طرف سے ازبک بڑھے آرہے تھے۔ خطرے کی پرچھائیں اس طرح پڑ رہی تھی جیسے میدان میں شاہین کا سایہ چڑیوں کو نظر آتا ہے۔ شیبانی کی دھاک ایسی بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کی آمد کی خبر سنتے ہی سارے جھگڑے ہوا ہو گئے اور شیبانی خاں کو روکنے کی تدبیریں کی جانے لگیں۔

صرف ایک ہستی تھی جو اس کے برخلاف سوچ رہی تھی اور وہ تھی تاشقند کے حکمران سلطان علی کی ماں زہرہ بیگم۔ وہ کچھ برسوں سے بیوگی کے دن گزار رہی تھی لیکن اس کے حسن وجمال میں ابھی کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اس کی سانسیں ابھی گرم تھیں۔ اسے اب بھی یہ زعم تھا کہ جس مرد کی طرف دیکھے گی اسے اپنے دام میں اسیر کرلے گی۔ اس نے بہت پہلے شیبانی خاں کو کہیں دیکھا تھا اور اسی وقت اس کی مردانہ وجاہت پر مرمٹی تھی۔ شرم دامن

گیر تھی ورنہ وہ بھاگ کر شیبانی کے قدموں میں جانے کو تیار تھی اور اب شیبانی خاں اس کے دروازے پر تھا۔

شیبانی خاں میں کچھ ایسی مردانہ وجاہت تھی کہ عورتیں اسے دیکھ کر اپنے ہوش میں نہیں رہتی تھیں۔ ایسی کشش تھی کہ اس کی طرف کھنچی چلی آتی تھیں۔ اس لیے اس کے پاس کئی بیویاں تھیں۔ کچھ کو طلاق دے چکا تھا کچھ اب بھی اس کے پاس تھیں البتہ اس میں ایک اچھی عادت تھی جو عورت پسند آتی تھی اس سے نکاح کرتا تھا۔ نکاح کے بغیر کسی عورت کو ہاتھ لگانا گناہ سمجھتا تھا۔

سمرقند کی فصیل کے پہلے گھیرے کے آگے وسیع باغات میں الغ بیگ کی رصدگاہ کے قریب واقع ٹیلوں پر اور دریائے آب رحمت کے کنارے کنارے ہر جگہ اور چاروں طرف لشکر جرار کے آگے دریائے زرافشاں کے کناروں پر مزید سیکڑوں خیمے اور شامیانے نصب تھے۔

شیبانی خاں "چہل ستون" محل میں ٹھہرا ہوا تھا۔

زہرہ بیگم دیکھ رہی تھی اور اس نے سنا بھی تھا کہ باغیوں نے بابر کو بلایا ہے۔ اگر اس کے آنے سے پہلے شیبانی خاں کا قبضہ ہو گیا تو باغیوں کا سر کچل جائے گا۔ میری اور میرے بیٹے کی حکمرانی ہوگی۔ یہ سوچتے سوچتے وہ شرما بھی گئی تھی۔

اس نے جلدی جلدی ایک رقعہ شیبانی کے نام لکھا۔

"آنکھیں قابو میں ہوں نہ ہوں دل کسی کے قابو میں نہیں ہوتا۔ میں نے ایک مرتبہ آپ کو دیکھا تھا اور دل دے بیٹھی تھی۔ اب قسمت آپ کو میرے دروازے پر لے آئی ہے۔ میرا بیٹا سلطان علی یہاں کا حکمران ہے۔ اگر آپ مجھے اپنی زوجیت میں لینے کا عہد کریں تو میں آپ کے پاس آنے اور سمرقند آپ کے حوالے کرنے کو تیار ہوں۔"

یہ رقعہ پہنچا اور شیبانی خاں نے اسے باریاب ہونے کی اجازت دے دی۔

شیبانی خاں کی سرخ مخملی ٹوپی پر سفید دستار بندھی تھی۔ بانات کی چھوٹی آستینوں والے نیلگوں ہلکے چوغے پر سونے کے بٹن بند تھے۔

زہرہ بیگم آئی تو اس کا چہرہ سفید ریشمی نقاب سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کی انگلیوں میں قیمتی ہیروں کی انگوٹھیاں تھیں۔ شیبانی اس میدان کا نیا کھلاڑی نہیں تھا۔ وہ یہ دیکھے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کے ہاتھوں کی رگیں ابھری ہوئی ہیں۔ اس کا مطلب ہے محترمہ کی عمر ڈھل چکی ہے۔

"زہرہ بیگم، ہم تمہاری دلی آرزو ضرور پوری کریں گے فی الحال تم ہماری قیدی ہو۔"

زہرہ بیگم کو اسی محل کے ایک کمرے میں بند کردیا گیا۔

اس کے بعد اٹھارہ سالہ سلطان علی کی آمد ہوئی۔ وہ اپنی ماں کے مشورے پر اپنے فوجیوں کو قلعے ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ شیبانی نے اسے اپنے برابر جگہ دی۔

"آپ کے وزیر ابو یحییٰ نہیں آئے۔"

"میری والدہ نے ان کے لیے تو کوئی حکم نہیں دیا تھا۔"

"آنا تو انہیں بھی ہوگا۔ خیر ہم خود انہیں ڈھونڈ لیں گے۔"

سلطان علی نے وہاں بیٹھے ہوئے سرداروں کی طرف دیکھا۔ کسی آنکھ میں نفرت اور حقارت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اسے خطرے کا احساس ہوا۔ بغلی دروازہ سامنے تھا۔ اس نے چاہا کہ اس دروازے سے نکل بھاگے۔ اسی لمحے ایک سردار نے اس کا راستہ روک لیا۔ "اب آپ یہاں سے کہیں نہیں جاسکتے۔"

سلطان علی کو بھی اسی محل کے ایک کمرے میں مقید کردیا گیا۔

سلطان علی کو بائے سنقور نے اندھا کرنے کے احکام جاری کیے تھے کیونکہ سلطان علی کو سمرقند کے ترخانیوں نے اپنا سردار بنا کر بغاوت کردی تھی۔ بائے سنقور نے بغاوت کچل دی۔ سلطان علی کی آنکھوں میں سلائی پھیری گئی لیکن اس میں بھی سازش تھی کہ سلائی صحیح نہیں پھیری اور اس کی بصارت محفوظ رہی۔ وہ بخارا کی طرف بھاگا۔ بائے سنقور نے اس پر حملہ کیا لیکن شکست کھا کر سمرقند بھاگ آیا۔ بابر نے بائے سنقور کو شکست دی۔ جس وقت بابر اندجان بچانے کے لیے سمرقند کو چھوڑ کر آگیا تو سلطان علی وہاں دوبارہ قابض ہو گیا اور اب وہ شیبانی کی قید میں تھا۔

شیبانی خاں کے سامنے اب کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ لڑے بغیر اسے سمرقند مل گیا تھا۔ وہ صدر دروازے سے اندر داخل ہوا تو شہریوں نے مجبوراً اس کا استقبال کیا۔

شیبانی خاں نے دربار منعقد کیا اور اس میں نہایت اہم فیصلے ہوئے۔ سلطان علی اور ابو یحییٰ کے سر کاٹ دیے گئے۔ دوسرے دن پھر قتل وغارت گری کا بازار گرم ہوا۔ جتنے باغی تھے انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کیا گیا۔ یہ سلسلہ کئی دن چلتا رہا۔ پھر اس نے اپنے ایک امیر منصور بخشی کو اپنے پاس بلایا۔ وہ چیچک رو نہایت بدہیبت شخص تھا۔

"آپ بیویوں کے معاملے میں بہت بدقسمت ہیں۔ کئی بیویاں آپ کو چھوڑ کر جاچکی ہیں۔ آج کل آپ پھر خالی ہیں۔"

''کیا کروں میری جارحانہ مردانگی کسی کو برداشت ہی نہیں ہوتی۔''

''زہرہ بیگم آپ کے لیے مناسب رہے گی۔ اسے شوہر کا بہت شوق ہے۔ وہ ضرور آپ کو برداشت کرلے گی۔ وہ میرے پاس آئی تھی مگر آپ کے ساتھ اس کا جوڑ ٹھیک رہے گا۔ کیا خیال ہے، اس سے آپ کی شادی کرا دی جائے۔''

منصور بخشی اٹھا اور شیبانی کے قدموں میں گر پڑا۔ ''آپ واقعی مجاہدِ اسلام ہیں جو اپنے غلاموں کا اس قدر خیال رکھتے ہیں۔''

زہرہ بیگم کا نکاح اس شخص سے کرا دیا گیا۔ وہ شیبانی کے عشق میں آئی تھی اور منصور کے پلے بندھ گئی۔ یہ تو اسے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے بیٹے کو بے رحم تلوار چاٹ گئی۔

یہ عورت کوئی اور نہیں بابر کے چچا کی بیوہ تھی پھر شیبانی اسے کیوں کوئی اعلیٰ مرتبہ عطا کرتا۔

شیبانی کے متعلق ایک مقولہ بہت مشہور تھا۔ ''وہ بڑا آدمی ہے مگر درباری یا کاروباری نہیں۔'' اس کی یہ عادت ہمیشہ سے رہی تھی کہ دربار میں کسی اور کو برائے نام بادشاہ بنائے رکھنے کی اور دوسروں کو نظم و نسق چلانے کی اجازت دیتا اور خود مہم جوئی میں مصروف رہتا۔ ایک قسم کی خانہ بدوشانہ زندگی گزار رہا تھا۔

سمرقند سے بھی اس کا دل بھر گیا۔ اس نے اپنے ایک امیر وفا خاں کو پانچ چھ سو آدمیوں کے ساتھ سمرقند میں چھوڑا اور خود کسی اور طرف قسمت آزمائی کے لیے نکل گیا۔

بابر کو جیسے ہی یہ خبر ملی اس نے ایک مرتبہ پھر قسمت آزمائی کے لیے سمرقند کی جانب پیش قدمی شروع کر دی حالانکہ اس وقت اس کے ساتھ صرف دو سو چالیس سپاہی تھے۔

بابر طوفانی یلغار کرتے ہوئے پل مغاک تک پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے اپنے سپاہیوں میں سے اسی (80) آدمیوں کا انتخاب کیا اور انہیں ہدایت کی کہ باب فیروزہ کی سمت جائیں اور سیڑھیاں لگا کر شہر پناہ پر چڑھ جائیں اور دروازے پر قبضہ کرلیں۔ کامیاب ہو جائیں تو ہمیں خبر دیں۔

سپاہی روانہ ہو گئے تھے۔ بابر اپنے خیمے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ نظر مستقبل پر اور کان کوئی اچھی خبر سننے کے منتظر تھے۔

رات کے اندھیرے میں سیڑھیاں شہر پناہ کی دیوار پر لگ گئی تھیں۔ یہ سپاہی اوپر چڑھے اور باب فیروزہ پر رسائی حاصل کرلی۔ پہرے دار فاضل ترخان بے خبر تھا کہ سب اس پر ٹوٹ پڑے۔ وہ اور اس کے ساتھی وہیں ڈھیر ہو گئے۔ ان لوگوں نے دروازے پر پڑے تالے پر تیر برسائے۔ دروازہ چوپٹ کھل گیا۔

بابر کو جونہی اطلاع ملی وہ خود بھی باب فیروزہ پر پہنچ گیا اور اپنی فوج کے ساتھ شہر میں داخل ہو گیا۔ شہر کے اکثر لوگ اس وقت سو رہے تھے۔ بعض دکاندار جاگ رہے تھے۔ انہوں نے یہ ماجرا دیکھا تو پہچان لیا اور بابر کی آمد کی خبر پورے شہر میں پھیلا دی۔ شہر میں شور پڑا تو وفا خاں اور اس کے ازبک سپاہیوں کو بھی خبر ہو گئی۔ وہ مقابلے پر نکل آیا لیکن ایک تو اسے دیر ہو چکی تھی دوسرے سمرقند والے بابر کے حامی تھے۔ وہ بھی بابر کے ساتھ مل گئے۔ ازبکوں کو اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ بابر کے ساتھ کتنی تعداد ہے۔ انہوں نے مقابلہ ضرور کیا لیکن بھاری نقصان اٹھایا۔ چار پانچ سو ایک ہی ہلے میں مار دیے گئے۔ وفا خاں جان بچا کر بھاگ نکلا۔

یہ معرکہ رات میں شروع ہوا تھا، رات ہی میں ختم ہو گیا۔

شہر میں رات بھر خون بہتا رہا تھا۔ لوگ کھڑکیاں بند کر کے گھروں میں بیٹھے رہے تھے لیکن جونہی صبح نمودار ہوئی اور لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اب بابر کا قبضہ مکمل ہوا تو گھروں سے نکل آئے۔

بابر نے اسی نیلے محل میں قیام کیا تھا جہاں وہ پہلے حملے کے بعد قیام کر چکا تھا۔ اس وقت وہ بالائی منزل پر کھڑا شہر کے نظارے میں محو تھا۔ اس جشن کو ملاحظہ کر رہا تھا جو اس کی آمد کی خوشی میں منعقد ہو رہا تھا۔

داروغہ خان وفا اپنے سو سپاہیوں کے ساتھ شیبانی خاں کو یہ خبر دینے کے لیے روانہ ہو گیا تھا کہ بابر کے لشکریوں نے سمرقند پر قبضہ کرلیا ہے۔

بابر نے اسی دن ایک قاصد اپنے اہل و عیال کو بلانے کے لیے بھیج دیا تھا۔

(جاری ہے)

ماخذات

تزکِ بابری - رشید اختر ندوی، ظہیر الدین بابر - ہیرلڈ لیم

منتخب اللباب - خافی خان ظہیر الدین بابر، میر تمقل قادر

کرشمۂ قدرت

کاشف زبیر

انسان اگر چاہے تو دھوپ میں سایا کردے... ویرانوں میں پھول کھلا دے... کیونکہ اس کا ایمان اسے حوصلہ دیتا ہے کہ اس کی محنت رائگاں نہیں جائے گی... ابھی وہ اسی فلسفے پر غور کر ہی رہا تھا کہ قدرت کا کرشمہ اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا... جب دور دور تک پوری بستی کو کہیں رحمت اور کہیں زحمت نے اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔

''انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا'' کی منہ بولتی تصویر

سیلی اور جوزن کھڑے افسردہ نظروں سے اپنی خشک ہوتی فصل کو دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے مکئی لگائی تھی اور اب اس پر ان کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار تھا۔ اگر ان کی فصل خشک سالی کی نذر ہو جاتی تو ان کے پاس کچھ نہیں بچتا۔ یہ گھر اور اس کے ساتھ کوئی دس ایکڑ زمین مائیکل کے قبضے میں چلی جاتی۔ مائیکل اس کاؤنٹی کا سب سے بڑا سود خور تھا۔ اس کے پاس بہت ساری دولت تھی اور اس نے رفتہ رفتہ کئی سو ایکڑ زمین بھی حاصل کرلی تھی۔ اس طرح وہ علاقے

میں سب سے زیادہ زمین کا مالک بھی تھا۔ اس کے پاس ایک بہت بڑا مویشی خانہ بھی تھا جس میں سیکڑوں کی تعداد میں جانور تھے مگر اس کی ہوس کی کوئی حد نہیں تھی۔ اب اس کی نظر جوزن کی زمین پر تھی۔

کئی سال پہلے جب سیلی بہت زیادہ بیمار ہوئی تو اس کے علاج کے لیے جوزن کو رقم کی ضرورت ہوئی اور اسے مجبوراً قرض کے لیے لوگوں کے سامنے دست دراز کرنا پڑا تھا لیکن اسے کسی نے قرض نہیں دیا۔ جوزن ایک غریب کاشت کار تھا جو بہ مشکل اپنا گزارہ کرتا تھا۔ کسی کو یقین نہیں تھا کہ وہ قرض کی رقم واپس کر سکے گا اس لیے کسی نے اسے قرض نہیں دیا اور سب سے مایوس ہو کر اسے مائیکل کے پاس جانا پڑا تھا اگرچہ اسے یقین تھا کہ مائیکل بھی انکار کر دے گا بلکہ موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے ذلیل بھی کرے گا کیونکہ سیلی نے مائیکل کو ٹھکرا کر جوزن سے شادی کی تھی اور مائیکل یہ بات بھولا نہیں تھا۔

مگر غیر متوقع طور پر مائیکل اسے قرض دینے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ اس نے جوزن سے کہا۔ ”سیلی کے علاج پر جتنی بھی رقم خرچ ہوگی، میں دینے کے لیے تیار ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔“

جوزن مرجھا گیا، اسے معلوم تھا مائیکل سود خور ہے اور وہ یقیناً اسے بھاری سود کے عوض رقم دیتا۔ ”مجھے معلوم ہے تم مجھ سے بھاری سود طلب کرو گے۔“

”نہیں، میں تم سے ایک فیصد بھی سود نہیں مانگوں گا۔“ مائیکل نے اسے یقین دلایا۔ جوزن کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔ مائیکل اور اپنے دیے قرض پر سود نہ لے، ایسا کسی نے سنا تو کیا سوچا بھی نہیں تھا۔ جوزن نے شک سے پوچھا۔

”کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟“

”بالکل، یہ یقیناً سچ ہے۔ میں تم کو جو رقم دوں گا اس پر کوئی سود نہیں ہوگا۔“ مائیکل نے واضح الفاظ میں کہا۔

”تب تمہاری شرط کیا ہے؟“

”اس رقم کے بدلے تمہیں اپنی زمین گروی رکھنا ہوگی اور اگر تم مقررہ تاریخ تک رقم ادا نہیں کر سکے تو یہ زمین میری ہوگی۔“

”یہ کیسی شرط ہے؟“ جوزن نے احتجاج کیا۔ ”میری زمین میرا واحد اثاثہ ہے اور میں اسے داؤ پر نہیں لگا سکتا۔“

”تب میں تمہیں قرض نہیں دے سکتا۔“ مائیکل نے رکھائی سے کہا۔ ”لگتا ہے تمہیں سیلی کی زندگی بچانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

یہ سنتے ہی جوزن کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ سیلی اس کی محبت اور زندگی تھی اور وہ کسی صورت اسے مرتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے مردہ لہجے میں کہا۔ ”ٹھیک ہے لیکن مجھے کتنے عرصے میں رقم ادا کرنا ہوگی؟“

”تین سال میں اور اگر تم اس دوران میں رقم ادا نہیں کر سکے تو تمہاری زمین میری ہوگی۔“

جوزن نے سوچا اور سر ہلا دیا۔ ”مجھے منظور ہے۔ لیکن مجھے سیلی کے علاج کے لیے بڑی رقم کی ضرورت ہے۔“

”تم اس کی فکر مت کرو میں نے رقم کی شرط نہیں لگائی ہے اس کے علاج کا تمام خرچ میرے ذمے ہے چاہے وہ ہزاروں ڈالرز میں کیوں نہ ہو لیکن معاہدہ تحریری ہوگا۔“

جوزن حیران ہوا تھا۔ مائیکل اسے کھلی پیش کش کر رہا تھا اور یہ اچھی بات تھی کیونکہ اسے بھی نہیں معلوم تھا کہ سیلی کے علاج پر کس قدر رقم خرچ ہوگی۔ وہ قرض کے عوض زمین دینے کو تیار ہو گیا تھا۔ مائیکل نے باقاعدہ قانونی معاہدہ کیا جس کی رو سے اگر جوزن تین سال میں اس کا قرض ادا نہیں کر سکا تو اس کی زمین اور مکان مائیکل کے قبضے میں آجائیں گے۔ جوزن نے اس معاہدے پر دستخط کر دیے اور اسے سیلی کے علاج کے لیے رقم مل گئی۔ وہ فوری طور پر اسے سان فرانسسکو لے گیا جہاں اس کا علاج ممکن تھا۔ ایک سال میں سیلی مکمل طور پر صحت یاب ہو گئی اور اس دوران میں اس کے علاج پر کوئی دو ہزار ڈالرز خرچ ہوئے۔ 1895ء میں یہ خاصی بڑی رقم تھی۔ جوزن فکرمند تھا کہ اتنی بڑی رقم کہاں سے ادا کرے گا۔ اس کے پاس صرف زمین تھی اور اس سے اتنا حاصل ہوتا تھا کہ وہ اور سیلی بس اپنا گزارہ کر سکتے تھے۔ اگر ان سے زمین اور مکان چھن جاتا تو شاید انہیں بھوکوں مرنا پڑتا۔ اس علاقے میں روزگار کی کمی تھی۔ دوسری صورت میں اسے یہ جگہ چھوڑ کر کسی شہر کا رخ کرنا پڑتا۔ اس لیے جوزن اپنی زمین اور مکان سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کسی طرح بھی مائیکل کو دو ہزار ڈالرز ادا کرے گا۔

جوزن اور سیلی نے ایک ساتھ تعلیم حاصل کی تھی اور انہوں نے آگے پیچھے ہائی اسکول پاس کیا تھا۔ پھر جوزن اپنی زمین سنبھالنے لگا اور سیلی سلائی میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹانے لگی۔ اس کی ماں درزی کا کام کرتی تھی۔ کاؤنٹی کی زمین زرخیز تھی لیکن یہاں پانی کی کمی تھی بارش کم ہوتی تھی اور زیر زمین پانی بھی خاصا نیچے تھا۔ جو زمینیں نشیب میں تھیں انہیں تو پھر بھی پانی مل جاتا تھا لیکن جو زمینیں بلندی پر تھیں ان پر کاشت کا تمام انحصار بارش کے پانی پر تھا۔ جوزن کی زمین بھی کسی قدر بلندی پر تھی اور اس کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ زمین میں اتنی گہرائی سے پانی نکال سکے۔ اس لیے فصل کاشت کر کے وہ آسمان کی طرف دیکھتا تھا کہ بادل آئیں اور اس کی زمین کو سیراب کریں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ بارش ہو گئی اور اسے اچھی فصل مل گئی لیکن کئی بار ایسا بھی ہوا کہ بادل آئے بغیر برسے گزر گئے اور آخر میں اس کے ہاتھ سوائے جلے ہوئے پودوں کے کچھ نہیں آیا تھا۔

جوزن اور سیلی ایک دوسرے کو جانتے تو تھے لیکن پسندیدگی تک بات ایک میلے میں پہنچی جہاں جوزن نے گھڑ سواری کے مقابلے میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔ اسے انعام میں ٹرافی ملی تھی لیکن سیلی نے خاموشی سے اسے اپنا دل دے دیا تھا۔ سنہرے بالوں اور شہابی رنگت والی سیلی نے جب جوزن کو پرجوش مبارک دی تو وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ ایک سال میں وہ دبلی اور کمسن لڑکی سے بھرپور اور جوان لڑکی میں بدل گئی تھی۔ جوزن کو اپنی حیثیت کا احساس تھا، وہ ایک غریب کاشت کار تھا۔ لہٰذا وہ کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ سیلی کی طرف بڑھا۔ اور جب اسے پتا چلا کہ وہ پہلے ہی اسے پسند کرتی ہے تو اسے بہت دن تک اپنی خوش نصیبی پر یقین نہیں آیا تھا۔

مائیکل عمر میں سیلی سے کوئی دس سال بڑا تھا اور ان دنوں وہ دولت مند بننے کی جدوجہد کر رہا تھا اور اس میں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل کر چکا تھا۔ اس لیے جب وہ سیلی کی طرف بڑھا تو اسے یقین تھا وہ اسے ٹھکرائے گی نہیں بلکہ ہنسی خوشی اس کی بانہوں میں آجائے گی۔ لیکن سیلی کا ردعمل حوصلہ شکن تھا اس نے بنا کسی لگی لپٹی کے مائیکل کو بتا دیا کہ وہ اسے ہرگز پسند نہیں کرتی۔ مائیکل کو صدمہ ہوا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ سیلی جیسی غریب لڑکی اسے یوں ٹھکرا دے گی اور اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا ورنہ پورے علاقے میں اس کی بے عزتی ہوتی۔ زیادہ صدمہ اسے اس وقت ہوا تھا جب سیلی نے جوزن کو شریک حیات کے طور پر منتخب کر لیا۔ جوزن اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس وقت بھی مائیکل کے پاس جوزن سے کہیں زیادہ زمین تھی حالانکہ کمانے کے لیے وہ زمین کا محتاج نہیں تھا۔ اس کا اصل کاروبار سود پر قرض دینا تھا اور جو ایک بار اس کے چنگل میں پھنس جاتا، اسے قسمت سے ہی رہائی ملتی تھی۔ قصبے کی نصف آبادی اس کی مقروض تھی۔ وہ جسے قرض دیتا، اس سے کاغذ پر دستخط لے لیتا تھا اور یہ کاغذ اس وقت تک مائیکل کی تجوری میں رہتا جب تک اس کا مقروض تمام رقم مع سود کے ادا نہیں کر دیتا تھا۔

جوزن کی زمین قصبے سے ذرا فاصلے پر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر تھی۔ پہاڑی بہت بلند نہیں تھی۔ شاید ڈیڑھ سو فٹ بلند ہوگی لیکن اس وجہ سے جوزن کی زمین کو زیر زمین پانی نہیں مل پاتا تھا۔ قصبے اور ہموار جگہوں پر پانی کوئی پچاس فٹ نیچے تھا اور اتنی گہرائی سے پانی کھینچنا بہت مشکل اور مہنگا کام تھا۔ جوزن کے لیے تو پانی کا حصول بالکل ہی ناممکن تھا۔ زمین پر ہی اس نے ایک چھوٹا سا مکان بنا رکھا تھا اور اس میں اپنے لحاظ سے تمام سہولتیں بھی دی تھیں۔ جوزن کی خواہش اور کوشش تھی کہ سیلی کو اس کے گھر میں کوئی مشکل یا پریشانی نہ ہو۔ دوسری طرف سیلی کو اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ اس نے جوزن سے محبت کی تھی۔ وہ خود بھی غریب گھر سے تعلق رکھتی تھی اس لیے جب وہ جوزن کے گھر آئی تو اسے کوئی تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔ وہ اس چھوٹے سے گھر میں بھی خوش تھی۔

بعد میں سیلی نے جوزن کو بتا دیا تھا کہ مائیکل نے بھی اسے پرپوز کیا تھا اور اس نے یہ پیش کش اس کے منہ پر مار دی تھی۔ جوزن اس لیے بھی پریشان تھا کہ وہ مائیکل کے مقابلے میں بہت غریب تھا اور وہ سیلی کو مادی سہولتیں نہیں دے سکتا تھا لہٰذا اب اس کی محبت اور اس کا سب کچھ سیلی کے لیے ہی تھا۔ یہ بات سیلی بھی جانتی تھی اور اس نے جوزن کو یقین دلایا کہ اسے سوائے اس کی محبت و اعتماد کے اور کچھ نہیں چاہیے۔ شادی کے ابتدائی دو سال انہوں نے بہت خوش گزارے تھے۔ وہ کم میں بھی خوش تھے اور ان کو مادی آسائشوں کی اتنی پروا نہیں تھی۔ سیلی زمین پر اس کے ساتھ کام کرتی تھی ساتھ ہی وہ اپنی ماں سے سلائی کے کپڑے بھی لے آتی تھی، اس کی کوشش تھی کہ شوہر کی مدد کرے۔

پھر سیلی کی طبیعت گری گری رہنے لگی تو وہ سمجھی کہ شاید وہ ماں بننے والی ہے لیکن ایک روز اس کے پیٹ میں شدید درد ہوا اور جوزن اسے مقامی ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس نے سیلی کا معائنہ کر کے شبہ ظاہر کیا کہ اس کے پیٹ میں رسولی تھی اور اسے صرف آپریشن کر کے ہی نکالا جا سکتا تھا اور یہ آپریشن کسی بڑے شہر میں ہی ممکن تھا۔ اس نے جوزن سے کہا۔ ”اسے فوری طور پر کسی بڑے اسپتال میں لے جا کر دکھاؤ اگر دیر کی تو مرض لاعلاج بھی ہو سکتا ہے۔“

جوزن اور سیلی کے لیے یہ ایک بڑا دھچکا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اس مرض کے علاج پر بہت خرچ آتا ہے۔ جوزن کے پاس جمع پونجی کے نام پر کچھ نہیں تھا۔ اس نے قرض حاصل کرنے کی کوشش کی اور بالآخر اسے مائیکل نے قرض دے دیا اور اس نے سیلی کا علاج کرا لیا۔ اب اسے دو ہزار ڈالرز

If you want to download Urdu novels,Imran series, Monthly Digests,Shuaa,Kiran,Khwateen Digest,Suspense digest, Vist www.paksociety.com

if site is not opening send complaint at admin@paksociety.com

or at

0336-5557121

کی رقم ادا کرنا تھی۔ اس کے لیے جوزن نے ہر ممکن کوشش شروع کر دی۔ اپنے فارم پر کام کرنے کے علاوہ وہ محنت مزدوری کا کام کرنے لگا۔ سردیوں میں اس نے لکڑیاں کاٹ کر فروخت کیں اور گرمیوں میں وہ لوگوں کی زمینوں کی سینچائی کرتا تھا۔ صبح سے رات تک مختلف کام کرتا اور اس کے باوجود رقم جمع ہونے کی رفتار نہایت سست تھی۔ ایک سال تو سیلی کی بیماری میں گزر گیا سان فرانسسکو میں دوسرے اخراجات کے لیے وہ محنت مزدوری کرتا تھا لیکن اس سے بس گزارے لائق ہی ملتا تھا۔ دوسرے سال کے اختتام تک وہ صرف سات سو ڈالرز جمع کر سکا تھا اور یہ اس کی اور سیلی کی شدید محنت اور کفایت شعاری کا نتیجہ تھا۔ سیلی نے صحت یاب ہونے کے بعد اپنی ماں سے کپڑے لے کر سینا شروع کر دیے تھے۔ جن سے اسے کچھ معاوضہ مل جاتا اور وہ اسے جمع کر لیتی تھی۔

اب صرف ایک سال کا وقت باقی تھا اور انہیں مزید تیرہ سو ڈالرز جمع کرنے تھے۔ جوزن نے مایوسی سے کہا۔ ”اگر میں چوبیس گھنٹے بھی محنت کروں تب بھی تیرہ سو ڈالرز جمع نہیں ہو سکتے۔“

”ہم کوشش تو کر سکتے ہیں۔“ سیلی نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

”میری زمین بھی اوپر کی ہے۔ بارش ہوتی ہے تو پانی جلد بہہ جاتا ہے۔ نیچے زمین پر پانی کئی مہینے تک موجود رہتا ہے۔ میری لگائی ہوئی فصل سوکھ جاتی ہے۔“

”اس بار تم ڈھلان کے بجائے سیڑھی نما کھیت بنا لو۔ اگر بارش ہوئی تو پانی محفوظ رہے گا۔“ سیلی نے تجویز دی۔

”اس کے لیے بہت محنت کرنا ہوگی اور میں کہیں اور کام بھی نہیں کر سکوں گا۔ اگر میں نے کہیں اور کام نہیں کیا تو اتنی رقم بھی جمع نہیں کر سکوں گا۔“ جوزن نے نفی میں سر ہلایا۔

”تب ہم کیا کریں؟“ سیلی بھی مایوس ہو گئی تھی۔

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ان کی کوششیں بہر حال جاری تھیں۔ رقم کمانے کے ساتھ وہ بچت کرنے کی بھی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے سوائے خوراک کے اپنا ہر خرچ روک لیا۔ سیلی نے دو سال سے کوئی لباس نہیں بنایا تھا اور جوزن کے پاس بھی کپڑوں کی ویسے ہی کمی تھی اور وہ اب پھٹ جانے والے کپڑوں میں پیوند لگا کر کام چلا رہا تھا۔ اس کے کام کے بہت سارے اوزار بھی ناکارہ ہو گئے تھے۔ لیکن وہ کسی نہ کسی طرح انہیں استعمال کر رہا تھا۔

دیہی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں گندم کی نسبت مکئی کی زیادہ مانگ تھی۔ اس کی قیمت بھی اچھی مل جاتی تھی اس لیے جوزن نے اس سال اپنی زمین پر مکئی لگانے کا فیصلہ کیا۔ وقت نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی زمین کو سیڑھی دار ساخت نہیں دے سکا تھا۔ اس کی زمین ڈھلان کی صورت میں تھی اور بارش کے بعد پانی اس پر سے بہہ جاتا تھا اور زمین بہت جلد خشک ہو جاتی تھی۔ اس کے مقابلے میں نیچے کی زمینیں پانی جذب کر کے دیر تک گیلی رہتی تھیں۔ اس لیے نیچے والوں کی فصل بھرپور ہوتی اور جوزن کو اس کی محنت کا آدھا صلہ بھی نہیں ملتا تھا۔

نصف سال مزید گزر گیا اور وہ اب تک صرف ہزار ڈالرز ہی جمع کر سکا تھا۔ اب صرف چھ مہینے رہ گئے تھے اور اس دوران میں اسے مزید ایک ہزار ڈالرز جمع کرنا تھے جو کسی صورت ممکن نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ مکئی لگاتا اور اسے فروخت کرتا تب بھی اسے پانچ سو ڈالرز سے زیادہ ملنے کی توقع نہیں تھی۔ یہ بھی اس صورت میں ہوتا جبکہ اس کی فصل اچھی ہوتی۔ ورنہ عام طور پر اسے چار سو ڈالرز سے زیادہ نہیں ملتے تھے۔ صبح سے شام تک چودہ گھنٹے محنت کرنے کے باوجود اسے اس سے زیادہ نہیں مل سکتا تھا۔ سیلی بھی گھر کے کاموں کے علاوہ سارا وقت کپڑے سینے میں مصروف رہتی لیکن صاف نظر آ رہا تھا کہ اس تگ و دو کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہو رہا تھا اور اس طرح کا دو ہزار ڈالرز کا ہدف پورا نہیں کر سکیں گے۔

جوزن نے سیزن شروع ہوتے ہی مکئی کاشت کر دی تھی۔ اس بار اس نے اچھا بیج ڈالا تھا جس سے اچھی پیداوار ہو سکتی تھی اگر بہت اچھی بارش ہوتی۔ شروع میں بارش ہوئی بھی جس سے اس کی زمین کو اتنی ترائی ملی کہ پودے بھرپور طریقے سے نکل آئے تھے لیکن اس کے بعد آسمان جیسے برسنا بھول گیا۔ موسم خشک رہا اور پودوں کے بڑھنے کی رفتار سست رہی۔ جوزن دیکھ رہا تھا کہ نیچے قصبے میں لوگوں کی زمینیں کنوؤں سے سیراب ہو رہی تھیں اور ان پر لگی مکئی کی اٹھان بھی شاندار تھی اس کے برخلاف اس کی فصل پانی کی کمی سے مرجھا رہی تھی۔ جبکہ اسے نمی کی اشد ضرورت تھی۔

اگست کے وسط تک صورت حال نہایت مایوس کن ہو گئی۔ پانی کی کمی کی وجہ سے اس کی فصل تباہ ہونا شروع ہو گئی تھی۔ شاید چند دن کے بعد اس کی فصل میں صرف سوکھی شاخیں رہ جاتیں۔ جوزن نے مایوسی سے سیلی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں یہ زمین اور گھر مائیکل کے حوالے ہی کرنا پڑے گا۔“

”پھر ہم کہاں جائیں گے؟“

”گھر نہ ہونے کی صورت میں ہم یہاں کیسے رہ سکتے ہیں۔“ جوزن نے سوچ کر کہا۔ ”ممکن ہے ہم یہاں رہنے کے بجائے سان فرانسسکو چلے جائیں۔“

”سان فرانسسکو۔“ سیلی گھبرا گئی۔ ”وہ تو بہت بڑا شہر ہے۔“

”ہاں اور وہاں اچھا کمانے کا مواقع بھی زیادہ ہیں۔“

لیکن سیلی کا اس جگہ سے جانے کے خیال سے دل بیٹھ گیا تھا۔ ”نہیں ہم یہاں بھی رہ سکتے ہیں۔ میری ماں کا گھر ہے۔ مجھے یقین ہے اس مشکل وقت میں وہ ضرور ہمیں پناہ دے گی۔“

”مجھے بھی یقین ہے لیکن تم جانتی ہو میں کسی پر بوجھ بننے کا قائل نہیں ہوں۔“ جوزن نے نرمی سے کہا۔

”میں جانتی ہوں لیکن ہم بوجھ کیوں بنیں گے؟ ہم تو اپنا کمائیں گے اور ماں کو اس کا حصہ دیں گے۔“

جوزن نے کچھ نہ کہا لیکن اس معاملے میں اس کی اپنی سوچ تھی۔ اب تک وہ زمیندار تھا۔ بے شک اس کے پاس زمین کم تھی اور وہ بھی اوپر کی تھی۔ اس کے باوجود اس کی ایک حیثیت تھی اور اگر اس کے پاس زمین نہ رہتی تو وہ اس قصبے میں اپنی حیثیت برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ کمتر حیثیت کے ساتھ یہاں نہیں رہنا چاہتا تھا، اس سے بہتر تھا وہ کسی شہر چلا جاتا اور وہاں لوگوں کی بھیڑ میں گمنام ہو جاتا۔ لیکن اس نے فی الحال یہ بات سیلی سے نہیں کہی۔ ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا۔ جب اس فارم کا فیصلہ ہو جاتا تب وہ اپنی زندگی کا فیصلہ بھی کر سکتے تھے۔

وہ کھڑے اپنی فصل دیکھ رہے تھے کہ انہیں نیچے سے دو گھڑ سوار آتے دکھائی دیے۔ جوزن نے مائیکل کے سفید گھوڑے سے اسے پہچان لیا۔ اس علاقے میں بالکل سفید گھوڑا صرف اس کے پاس تھا۔ اس کے ساتھ اس کا کوئی آدمی تھا۔ مائیکل لڑنے بھڑنے والا آدمی نہیں تھا، اس لیے وہ اپنی حفاظت کے لیے ہمیشہ کسی نہ کسی کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ قصبے سے باہر جاتا تو اس کے ساتھ کم سے کم تین چار محافظ ضرور ہوتے تھے۔ مائیکل سیدھا ان کی طرف آیا اور ان کے پاس رک کر پہلے اس نے تمسخرانہ نظروں سے مکئی کی فصل کا جائزہ لیا پھر جوزن کی طرف دیکھا۔

”یہ تو بے کار ہے، سمجھ لو تم نے اس سے ہاتھ دھو لیے ہیں۔“

”ایسا نہیں ہے، اگر اب بھی بارش ہو جائے تو میری فصل پھر سے ہری ہو سکتی ہے۔“

”ایسے معجزے صرف کتابوں میں پڑھے جا سکتے ہیں۔“ اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ ”میرا خیال ہے تمہاری فصل ختم ہو چکی ہے۔ اب تم میرا قرض کس طرح ادا کرو گے؟“

جوزن کو اس کے انداز پر غصہ آ رہا تھا۔ ”یہ میرا مسئلہ ہے۔ اگر میں تمہیں قرض ادا نہیں کر سکا تو تم یہ زمین اور مکان لے سکتے ہو۔“

”ہاں لیکن مجھے تمہارا خیال ہے۔“ مائیکل نے مکاری سے کہا۔ ”تم بے روزگار ہو جاؤ گے اور تمہیں اگر کام کی ضرورت ہو تو میں تم ..... دونوں میاں بیوی کو ملازمت دینے کے لیے تیار ہوں۔“ اس نے پرخیال نظروں سے سیلی کی طرف دیکھا۔ ”میرے گھر میں ایک کام کرنے والی عورت کی ضرورت ہے۔“

”شکریہ۔“ جوزن سے پہلے سیلی نے کہا۔ ”اگر ہمیں ملازمت کی ضرورت ہوئی تو ہم شہر چلے جائیں گے۔“

جوزن نے اس بات پر حیرت سے اسے دیکھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے شہر جانے سے انکار کر دیا تھا لیکن اب وہ کہہ رہی تھی کہ انہیں مزدوری کی ضرورت ہوئی تو وہ شہر چلے جائیں گے۔ مائیکل نے سیلی کو گھورا۔ ”شہر جانا اتنا آسان نہیں ہے۔“

”تو مشکل بھی نہیں ہے۔“ سیلی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”ہم پہلے بھی شہر جا چکے ہیں اور وہاں سال بھر رہ چکے ہیں۔“

”شہر تم میری وجہ سے گئے تھے۔“

”ہاں لیکن تم نے کوئی احسان نہیں کیا بلکہ ہمیں بہت بھاری شرط پر قرض دیا تھا۔“ سیلی نے اسے یاد دلایا۔

”بہر حال میں تمہیں مدد کی پیش کش کرنے آیا تھا۔“

”ابھی ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت پڑنے میں تین مہینے باقی ہیں۔“ جوزن نے سخت لہجے میں کہا۔ ”براہِ مہربانی تین مہینے سے پہلے یہاں آنے اور ہمیں تنگ کرنے کی کوشش مت کرو۔“

مائیکل نے جوزن کو گھورا۔ ”زیادہ اکڑ مت دکھاؤ۔ ممکن ہے کچھ عرصے بعد تمہیں پھر میری مدد کی ضرورت پڑے۔“

”میں تم سے ایک بار ہی مدد لے کر پچھتا رہا ہوں دوبارہ یہ غلطی نہیں کروں گا۔“

مائیکل نے ایک بار پھر زمین کا معائنہ کیا اور بولا۔ ”جگہ اچھی ہے میں یہاں اپنے لیے مکان اور باغ

بنواؤں گا لیکن اس کے لیے یہ کچرا صاف کرنا پڑے گا۔“ اس نے جوزن اور سیلی کے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

”بس اب تم جا سکتے ہو اور تین مہینے سے پہلے یہاں قدم مت رکھنا۔“ جوزن کی آواز بلند ہو گئی۔ سیلی نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک گیا۔ سیلی نے نظروں سے اسے اشارہ کیا کہ وہ چپ رہے۔ مائیکل اسے مشتعل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

”ٹھیک ہے تین مہینے اب زیادہ دور نہیں ہیں۔ میں آؤں گا تب تم مجھے یہاں سے جانے کا نہیں کہہ سکو گے۔“ اس نے سرد لہجے میں کہا اور گھوڑا موڑ کر واپس چلا گیا۔ اس کا آدمی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ سیلی کا رنگ مارے غصے کے سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔

”یہ ذلیل شخص موقعے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے اس سے شادی سے انکار کیا تھا۔ اب یہ ہم سے اس کا بدلہ لے گا۔“

”یہ زیادہ سے زیادہ ہم سے یہ زمین اور گھر لے سکتا ہے لیکن ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتا۔“

”ہاں لیکن اس جگہ سے بے دخل ہونے کے بعد ہم کہاں جائیں گے؟“

”شاید نیچے کہیں کچھ زمین مل جائے۔ میرے پاس پندرہ سو ڈالرز تو ہو جائیں گے۔“

سیلی نے حسرت سے نیچے مکئی کی شاندار اور پکنے کی طرف مائل فصل کو دیکھا۔ ”لگتا ہے ہماری فصل یونہی سوکھ جائے گی۔“

اسی لمحے مغرب کی سمت کہیں ایک کوندا سا لپکا۔ جوزن چونکا۔ اس نے کہا۔ ”شاید یہ بات درست نہیں ہے۔“

”کون سی بات؟“ سیلی نے پوچھا۔

جوزن دور افق سے آتی سیاہ لکیر کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ خدا نے اس کی سن لی ہے اور شدید قسم کی بارش ہونے والی ہے۔ گرمی کے بعد جب اس قسم کے بادل آتے تھے تو بارش ہمیشہ شدید ہوتی تھی۔ سیلی نے بھی اب بادل دیکھ لیے تھے۔ وہ خوش ہو گئی۔ ”میرے خدا بارش ہونے والی ہے۔“

”یہ تو خدا ہی جانتا ہے۔“ جوزن نے زیرِ لب کہا۔ ”لیکن لگ ایسا ہی رہا ہے۔“

کوئی نصف گھنٹے بعد آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھک گیا۔ پھر جو بارش شروع ہوئی تو ایسا لگا جیسے آسمان سے پانی کی چادر گر رہی ہو۔ سیلی اور جوزن کچھ دیر خوشی کے عالم میں

کھڑے پانی میں نہاتے رہے پھر ٹھنڈ کا احساس ہوا تو اندر بھاگے۔ ان کی ساری مایوسی اس بارش نے دھو ڈالی تھی۔ اگرچہ اس سے یہ یقین تو نہیں ملا تھا کہ وہ دو ہزار ڈالرز کا قرض اتار دیں گے لیکن جانے کیوں ان کے دلوں کو سکون ضرور ملا تھا، جیسے اب ان کا مسئلہ جلد ہی حل ہو جائے گا۔ ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا لیکن بادلوں کی سیاہی کی وجہ سے باہر بالکل تاریکی کا سماں چھا گیا تھا۔ سیلی جو کھانا بنانے کی تیاری کر رہی تھی، اس نے جوزن سے کہا۔

”اگر صبح تک بارش جاری رہی تو ہماری زمین کو اچھا پانی مل جائے گا۔“

”ہاں اگر یہ بارش چند گھنٹے بھی اسی انداز میں برس گئی تو ہماری فصل بہت شاندار ہو جائے گی۔“ جوزن نے کہا۔ ”اگر مجھے چھ سو ڈالرز مل جائیں تو باقی رقم میں کسی سے قرض لے لوں گا۔“

”سچ۔“ سیلی خوش ہو گئی۔ ”زمین اور ہمارا گھر بچ جائے گا؟“

دو گھنٹے بعد جب وہ کھانا کھا کر باہر آیا اور اس نے زمین کا معائنہ کیا تو وہاں ہر طرف جل تھل ہو رہی تھی۔ جوزن نے اس سے پہلے کبھی اتنی تیز بارش نہیں دیکھی تھی۔ بارش کے زور سے پودے جھکے جا رہے تھے لیکن جوزن مطمئن تھا پودے اتنے مضبوط ضرور تھے کہ بارش کا زور ان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ جوزن بھیگتا ہوا زمین کے کنارے تک آیا، یہاں سے اس نے نیچے قصبے کی طرف دیکھا۔ اس کی توقع کے مطابق نیچے پانی کی چادر چمک رہی تھی۔ وہ لالٹین لے کر نیچے آیا۔ ہموار زمین پر پانی گھٹنوں سے اوپر آ گیا تھا اور یہ خطرے کی علامت تھی۔ ابھی بارش شروع ہوئے صرف ڈھائی گھنٹے ہوئے تھے اور ابھی ارد گرد کے پہاڑوں سے پانی نیچے آنا باقی تھا۔ وہ واپس آیا اور اس نے سیلی کو بتایا۔

”نیچے زمین پر فٹ بھر سے اوپر پانی ہو چکا ہے۔ قصبے میں سیلاب آنے کا خطرہ ہے۔“

”میرے خدا........ ماما؟“ سیلی نے گھبرا کر کہا۔

”مجھے بھی ان کا خیال ہے۔“ جوزن نے سر ہلایا۔ ”میں گھوڑا گاڑی لے کر جاتا ہوں اور انہیں یہاں لے آتا ہوں۔“

”میں بھی چلوں؟“

”نہیں، تم یہیں رکو۔“

جوزن نے گاڑی میں گھوڑا لگایا اور قصبے کی طرف روانہ ہو گیا۔ بارش کے زور میں کوئی کمی نہیں آئی تھی اور نیچے

پانی پہلے سے زیادہ اونچا ہو گیا تھا۔ وہ قصبے میں داخل ہوا تو پریشان حال لوگ گلیوں میں نظر آئے۔ قصبہ کسی قدر اونچا تھا پھر بھی گلیوں میں پانی جمع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ وہ اپنی ساس کے گھر پہنچا اور انہیں اپنا ضروری سامان لے کر ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ پہلے ہی حیران و پریشان تھی۔ اس نے جلدی جلدی اپنا ضروری سامان سمیٹا اور جوزن کی مدد سے بگھی میں سوار کیا اور وہ روانہ ہو گئے۔ بجلی چمکنے کے دوران جوزن کو پہاڑوں کی جانب سے پانی کے ریلے آتے دکھائی دیتے۔ کھیتوں میں اب دو، دو فٹ سے زیادہ پانی جمع ہو چکا تھا وہ گھوڑے کو سنبھل سنبھل کر آگے بڑھا رہا تھا۔ پہاڑی کے راستے پر آ کر اسے زمین ملی اور اس نے سکون کا سانس لیا۔ سیلی پریشانی کے عالم میں برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی وہ لپکی کیونکہ اپنی ماں اور جوزن کو دیکھ کر اسے اطمینان ہوا تھا۔ جوزن نے انہیں اندر جانے کو کہا۔ سیلی بولی۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“

”میں نیچے جا رہا ہوں ممکن ہے کچھ اور لوگوں کو میری مدد کی ضرورت ہو۔“

سیلی اسے منع کرنا چاہتی تھی لیکن جوزن اس کی بات سنے بغیر برآمدے سے اتر گیا۔ وہ اس بار پیدل ہی گیا تھا کیونکہ نیچے پانی اب اتنا ہو گیا تھا کہ اس میں گھوڑا گاڑی لے جانا بے کار تھا۔ وہ پہاڑی سے نیچے آیا۔ پانی کمر سے اوپر آ چکا تھا۔ وہ اسی پانی میں چلتے ہوئے قصبے میں داخل ہوا جہاں پانی اب گھروں میں گھس رہا تھا۔ جن کے گھر دو منزلہ تھے وہ بالائی منزلوں پر سامان منتقل کر رہے تھے لیکن جن کے گھر ایک منزل کے تھے وہ پریشان تھے کہ وہ کہاں جائیں۔ کچھ لوگ اپنے پڑوسیوں کے ہاں پناہ لے رہے تھے اور کچھ ایسے تھے جنہیں کوئی مدد دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جوزن ایسے ہی لوگوں کی مدد کرنے لگا۔

قصبے کا لوہار، ڈیکسٹر جوزن کا دوست تھا۔ اس کا گھر خستہ حال اور چھوٹا سا تھا اور اس کے چار بچے تھے۔ وہ پناہ کے لیے پریشان تھا۔ وہ ایسے میں جوزن اس کے پاس پہنچا اور اس نے ڈیکسٹر کو پریشان دیکھ کر پیشکش کی۔ ”میرے ساتھ چلو، تم جانتے ہو میرا گھر سیلاب سے محفوظ ہے کیونکہ وہ ایک پہاڑی پر ہے۔“

ڈیکسٹر فوراً تیار ہو گیا۔ اس نے اپنے بچوں کو ساتھ لیا اور جوزن تیزی سے پہاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت وہی سب سے نزدیکی پناہ گاہ تھی۔ اس وقت کچھ لوگ اور بھی اپنے بیوی بچوں کو کسی محفوظ مقام پر لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جن کے دو منزلہ مکان تھے انہوں نے ان لوگوں کو پناہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کی حالت زار دیکھ کر جوزن سے رہا نہیں گیا اور اس نے انہیں بھی پہاڑی پر چلنے کی پیشکش کر دی۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اتنے لوگوں کو اپنے چھوٹے سے مکان میں کس طرح ٹھہرائے گا اور ان کے کھانے پینے کا کیا ہو گا؟ ذرا سی دیر میں کوئی پچاس ساٹھ افراد اس کے ہمراہ پہاڑی کی طرف جا رہے تھے۔ پانی اب چار فٹ سے زیادہ اوپر ہو گیا تھا۔ لوگوں نے بچوں کو اپنے شانوں پر بٹھا لیا اور پانی کے تھپیڑوں سے بچنے کے لیے انہوں نے ایک دوسرے کو تھام لیا۔ ورنہ ریلا اتنا منہ زور ہو گیا تھا کہ اس میں اکیلا آدمی کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح یہ تمام افراد پہاڑی تک پہنچنے میں کامیاب رہے۔ زمین تک پہنچ کر ان کی جان میں جان آئی۔ ان کی دیکھا دیکھی کچھ اور لوگ بھی پہاڑی کی طرف آ رہے تھے۔

پانی میں فصلیں غائب ہو چکی تھیں اور ان کی بربادی میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ پانی کی سطح پر مکئی کے پودے تیرتے جا رہے تھے، صرف پودے ہی نہیں بلکہ قصبے کے کمزور مکان بھی سیلاب کی زد میں آ کر ٹوٹ پھوٹ گئے تھے اور اب ان کا ملبا بھی تیرتا نظر آ رہا تھا۔ گر جانے والے گھروں کا فرنیچر اور دوسرا سامان بھی سیلاب کی نذر ہو گیا۔ مزید افراد کے آنے کے بعد پہاڑی پر لوگوں کی تعداد سو سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ یعنی قصبے کا ہر آٹھواں فرد پہاڑی پر موجود تھا اور آنے والوں میں سے کئی لوگوں کے عزیز اور رشتے دار پانی میں بہہ گئے تھے۔ جن پر وہ غم زدہ تھے۔

پانی کی سطح بہت تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ اتنی ہو گئی کہ اب اس میں چلنا ممکن نہیں رہا تھا۔ انسانوں کے علاوہ جانور بھی پانی میں تیر رہے تھے اور اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ واحد جائے پناہ پہاڑی تھی جو لوگ بچ کر آ چکے تھے اب وہ دوسروں کی مدد کر رہے تھے۔ جوزن کے پاس کچھ رسیاں تھیں وہ ان کی مدد سے پانی میں پھنسے لوگوں اور جانوروں کو نکالنے لگے۔ پانی اب آٹھ نو فٹ کی بلندی تک آ گیا تھا۔ فصلیں تو مکمل طور پر غائب ہو گئی تھیں۔ ساتھ ہی مکانات بھی گر رہے تھے۔ لکڑیاں کڑکڑانے کی دہشت ناک آوازوں کے ساتھ لوگوں کے چلانے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ جوزن اور دوسرے لوگوں نے کبھی ایسا منظر نہیں دیکھا تھا۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی زیادہ بارش کی صورت میں معمولی درجے کے سیلاب آتے رہے تھے لیکن اس درجے کے سیلاب سے کبھی ان کا

واسطہ نہیں پڑا تھا۔ یہاں اتنی بارش ہوتی ہی نہیں تھی۔ جوزن اور دوسرے لوگوں نے کوشش کر کے مزید پچاس ساٹھ افراد کو بچا لیا تھا لیکن بہت بڑی تعداد میں لوگ اپنے گھروں میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ وہ دوسری منزل یا چھتوں پر چڑھے ہوئے پانی کی بلند ہوتی سطح کو دیکھ رہے تھے۔

مائیکل کا مکان قصبے کے آخری حصے میں تھا جو بہت اونچا اور مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ کچھ لوگوں نے مائیکل کے مکان میں بھی پناہ لینے کی کوشش کی لیکن اس نے پناہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ لوگ مایوس ہو کر دوسری جگہوں پر پناہ لینے گئے لیکن انہیں کہیں پناہ نہیں ملی ان میں سے بہت سے لوگ بہہ گئے۔ نصف رات تک پانی اتنا اونچا ہو گیا کہ ایک منزلہ تمام ہی مکان ڈوب گئے اور ان کی چھتوں پر پناہ لینے والے مکینوں کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں گئے۔

پہاڑی پر پناہ لینے والوں کی تعداد ڈیڑھ سو سے زائد ہو گئی تھی۔ ان میں عورتیں اور بچے زیادہ تھے۔ عورتوں اور بچوں کو مکان کے اندر بھیج دیا گیا جبکہ جگہ نہ ہونے کی وجہ سے مرد باہر اور جوزن کے چھوٹے سے گودام میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ جان بچ جانے کے بعد اب انہیں اپنے گھروں اور فصلوں کی فکر ہو رہی تھی۔ کل تک جوزن کی زمین کو افسوس سے دیکھنے والے آج خدا کا شکر ادا کر رہے تھے کہ یہ پہاڑی موجود تھی ورنہ وہ بھی دوسروں کی طرح سیلاب کی نذر ہو چکے ہوتے۔ اس پہاڑی نے ان کی زندگیاں بچا لی تھیں اور اب وہ اس کے شکر گزار تھے۔

بارش کا سلسلہ صبح تک جاری رہا۔ سورج نکلنے سے ذرا پہلے بارش رک گئی اور پھر بادل چھٹنے لگے۔ سورج نکلتے ہی سرد ہوا چلنے لگی۔ نیچے بارش کا پانی دھارے کی صورت میں بہہ رہا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کی سطح میں کمی آنے لگی تھی۔ جب روشنی ہوئی تو لوگوں نے ایک خوف ناک منظر دیکھا۔ تقریباً پورا قصبہ غائب ہو چکا تھا۔ صرف چند ایک مکان باقی رہ گئے تھے اور ان کی چھتوں پر بھی بے شمار لوگوں نے پناہ لی ہوئی تھی اور بعض مکانات پر تو اتنے لوگ تھے کہ بوجھ سے ان کی چھتیں جھکی جا رہی تھیں۔ وہ ساری رات اس فکر میں رہے کہ یہ مکان بھی گر گئے تو ان کا کیا ہو گا۔ بارش رکنے اور پانی کی سطح میں کمی کے بعد ان کی جان میں جان آئی تھی۔ دوپہر تک پانی تین فٹ تک کم ہو گیا اور چھتوں پر موجود پناہ گزین نیچے اتر آئے تھے۔

پہاڑی پر موجود لوگوں نے دیکھا نیچے قصبہ تقریباً غائب ہو گیا تھا۔ صرف چند مکانات کھڑے تھے جن میں ایک مائیکل کا قلعہ نما مکان بھی شامل تھا۔ اگرچہ سیلاب نے اسے بھی نقصان پہنچایا تھا لیکن وہ اپنی جگہ بہرحال کھڑا تھا۔ نوے فی صد مکانات تباہ ہو چکے تھے اور مع سامان کے بہہ گئے تھے۔ فصلیں تو مکمل طور پر تباہ ہو چکی تھیں صرف پہاڑی زمین پر موجود جوزن کی فصل بچی تھی۔ بے شمار جانور بہہ گئے تھے۔ زمین والے اپنی فصل کو اور مویشی پالنے والے اپنے جانوروں کو اور مکانات کو تو سب ہی رو رہے تھے۔ سات سو کی آبادی میں سے دو سو افراد غائب تھے، پانی انہیں بہا کر لے گیا تھا۔

شام تک پانی اترنے کے بعد لوگوں نے اپنے سامان کی تلاش شروع کی لیکن وہاں کچھ ہوتا تو ملتا۔ قصبے میں اب کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ اس لیے عارضی پناہ کی تلاش میں لوگوں نے وہاں سے جانے کا فیصلہ کیا اور اگلے روز سے نقل مکانی شروع کر دی۔ جن کے پاس کچھ جمع پونجی رہ گئی تھی وہ پھر سے اپنے مکانوں کی تعمیر کے لیے رک گئے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ کچھ افراد کو دوسروں نے پناہ دے دی تھی۔ جوزن کے چند جاننے والے اس کے گھر پناہ لیے ہوئے تھے۔ جب پناہ کے لیے جانے والے آس پاس کے قصبوں میں پہنچے تو پتا چلا کہ اس سیلاب کا وہ اکیلے شکار نہیں تھے بلکہ دوسرے قصبات بھی سیلاب سے متاثر ہوئے تھے۔ مویشی بہہ گئے اور لوگ جن کے پاس پناہ کے لیے گئے وہ خود کھلے آسمان تلے بیٹھے تھے۔ تباہی بہت بڑے علاقے میں آئی تھی۔ یہ لوگ از خود اس تباہی سے نہیں نمٹ سکتے تھے انہیں حکومت کی مدد کی ضرورت تھی۔

جوزن اور سیلی چند دن پہلے تک شاکی تھے کہ ان کی زمین اونچی کیوں تھی جس وجہ سے انہیں غربت کا سامنا تھا لیکن اب وہ خدا کا شکر ادا کر رہے تھے۔ سیلاب نے خوشحال لوگوں کو ایک ہی رات میں بدحال کر دیا تھا اور اب انہیں اپنی بحالی میں برسوں لگ جاتے۔ ان کے مقابلے میں نہ ان کی فصل یا زمین کو نقصان ہوا اور نہ ان کے گھر کو نقصان پہنچا تھا۔ بلکہ سیلاب کی وجہ سے پہاڑی کے ساتھ بہہ کر آنے والی لکڑی کا ڈھیر لگ گیا جس سے وہ اپنے گھر کے خستہ حصوں کی مرمت کر سکتے تھے۔ جوزن اس لکڑی کو اٹھا کر اوپر لاتا رہا۔ یہ برسوں اس کے کام آ سکتی تھی۔ جو لکڑی تعمیراتی کام کے لحاظ سے بے کار تھی اسے وہ آنے والے سرما میں آتش دان میں استعمال کر سکتا تھا۔

بارش نے جوزن کی زمین پر لگی مکئی کے پودوں کو جھکا دیا تھا لیکن چند دن بعد یہ پودے سیدھے ہو گئے گویا ان میں جان آ گئی تھی۔ پتوں کے ساتھ بھٹے لگنے لگے اور ایک ہفتے

کے اندر پودے کچے بھٹوں سے بھر گئے۔ جوزن نے کبھی اپنی زمین پر مکئی کی اتنی شاندار فصل نہیں دیکھی تھی۔ اس علاقے میں مکئی کی بہت کم فصل بچی تھی۔ دوسرے ہفتے سے جوزن کے پاس تاجر آنے لگے جو اس کی فصل خریدنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے وہ منہ مانگی رقم دینے کو تیار تھے لیکن جوزن نے ان سے کہا۔

''دو ہفتے بعد میں اپنی فصل کو نیلام کروں گا اس میں جو سب سے زیادہ بولی دے گا وہی اس مکئی کا حق دار ہوگا۔''

تاجر اس کے جواب سے مایوس ہوئے لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری ایک تاجر نے تو اسے اس کی فصل کے عوض ہزار ڈالرز کی پیش کش کر دی لیکن جوزن نے پھر بھی یہی جواب دیا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کی فصل بہت اچھے داموں جا سکتی ہے تو اسے کیا ضرورت ہے اسے اونے پونے بیچنے کی۔ دو ہفتے بعد جب بھٹے پکنے کے قریب تھے تو جوزن نے فصل کے نیلام کا اعلان کر دیا۔ اس نیلام میں مائیکل بھی شامل تھا کیونکہ اس کی بھی ساری فصل بہہ گئی تھی اور اسے آنے والے سرما میں اپنے جانوروں کی خوراک کے لیے مکئی کی اشد ضرورت تھی۔ فی الحال تو اس کے جانور چرنے کے لیے جنوب کی طرف گئے ہوئے تھے۔ وہ نیلام سے پہلے جوزن سے ملا اور اس نے پیشکش کی۔

''اگر تم اپنی فصل میرے حوالے کر دو تو میں قرض معاف کر دوں گا۔''

جوزن اس کی بات پر ہنسا۔ ''خوب، تم فصل لے کر بھی قرض معاف کرو گے۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''نیلام میں تمہیں اتنی رقم نہیں ملے گی۔''

''ممکن ہے مجھے دو ہزار ڈالرز جتنی رقم نہ ملے لیکن میں اپنی فصل نیلام ہی کروں گا۔''

''اچھا میں تمہیں دو سو ڈالرز اوپر سے بھی دوں گا۔'' مائیکل اب التجا آمیز انداز میں بولا۔

''میں نیلام کے لیے تاجروں سے کہہ چکا ہوں۔'' جوزن نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''میں ان لوگوں کو مایوس نہیں کر سکتا۔ اگر تمہیں یقین ہے کہ میری فصل کی اتنی قیمت نہیں لگے گی تو تم نیلام میں شامل ہو کر اسے حاصل کیوں نہیں کر لیتے۔''

مائیکل لاجواب ہو گیا۔ مقررہ وقت پر تاجر جمع ہو گئے تھے نیلام فصل کے سامنے ہی ہو رہا تھا اور تاجروں نے دیکھ لیا تھا کہ فصل کتنی اچھی ہوئی ہے۔ اول تو اس علاقے میں بہت کم فصلیں بچی تھیں اور جو تھیں ان میں بھی فصل زیادہ اچھی نہیں ہوئی تھی جب کہ جوزن کی فصل بہت اچھی تھی۔ اس لیے جب نیلام شروع ہوا تو تاجروں نے بڑھ چڑھ کر بولی لگانا شروع کر دی۔ نیلام پندرہ سو ڈالرز سے شروع ہوا تھا اور جلد ہی بولی دو ہزار ڈالرز سے تجاوز کر گئی تھی۔ دس تاجروں میں سے سات تو جلد دستبردار ہو گئے پھر مقابلہ مائیکل اور دو تاجروں اسٹف کلان اور میٹ جوزف کے درمیان تھا۔ بولی ڈھائی ہزار ڈالرز تک جا پہنچی تھی۔ پھر اسٹف کلان بھی دست بردار ہو گیا اور میٹ اور مائیکل کے درمیان مقابلہ ہونے لگا۔ بولی اٹھائیس سو ڈالرز تک جا پہنچی پھر میٹ نے تین ہزار پچاس ڈالرز پر نیلام جیت لیا۔ مائیکل کی صورت دیکھنے والی تھی۔ اس نے جوزن کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ جیسے ہی جوزن کے ہاتھ میں رقم آئی اس نے مائیکل سے مطالبہ کیا۔

''مجھے معاہدے کا کاغذ لا دو میں تمہارا قرض ادا کرنا چاہتا ہوں۔''

''اتنی جلدی کیا ہے؟ وہ تم مجھے بعد میں بھی ادا کر سکتے ہو۔'' مائیکل نے خون کے گھونٹ پی کر کہا۔

''نہیں میں ابھی سب لوگوں کے سامنے یہ معاملہ نمٹانا چاہتا ہوں۔'' جوزن نے جواب دیا۔ ''برائے مہربانی تم معاہدہ لے آؤ۔''

بادل ناخواستہ مائیکل معاہدہ لے آیا اور جوزن نے کاغذ لے کر دو ہزار ڈالرز اس کے سامنے رکھے۔ ''اب رسید لکھ دو کہ میں نے تمہارا قرض ادا کر دیا ہے۔''

مائیکل نے رسید بھی لکھ دی اور رقم لے کر تنتناتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ جوزن اور سیلی خوشی سے پاگل ہو رہے تھے۔ ان کی نہ صرف زمین بچ گئی تھی بلکہ انہیں اتنی رقم بھی مل گئی تھی کہ وہ اپنی زمین کی حالت بہتر بنا سکتے تھے۔ میٹ بھی اگلے چند دن میں فصل اتارنے کا کہہ کر چلا گیا اور فصل کی حفاظت کے لیے اس نے اپنے مسلح آدمی لگا دیے تھے۔ جوزن اور سیلی شانہ بشانہ کھڑے اپنی زمین دیکھ رہے تھے۔ جوزن نے سیلی کی طرف دیکھا۔ ''اگلے سال ہم زمین اور گھر کو ٹھیک کر چکے ہوں گے۔''

''اور مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ ہمیں یہاں سے کہیں نہیں جانا پڑے گا۔''

''ہم جس چیز کو اپنے لیے زحمت سمجھ رہے تھے وہی ہمارے حق میں رحمت ثابت ہوئی۔'' جوزن نے کہا۔

سیلی نے سر ہلایا۔ ''واقعی خدا نے ہمارے لیے بہتر کر دیا۔''

وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اپنے گھر کی طرف بڑھ گئے۔

''شٹ اپ اور توجہ سے سنو۔ تمہیں اپنی بلڈنگ کے باہر کونے پر واقع کیفے سے ایک ٹو گو لنچ آرڈر پک اپ کرنا ہے۔ بغیر گریوی کے بلیو پلیٹ اسپیشل آرڈر دینا۔ سیلز گرل تمہیں ایک ٹکٹ دے گی جس پر ہدایات درج ہوں گی کہ تمہیں بریف کیس کہاں سے ملے گا۔ تمہارے پاس اب صرف دس منٹ کا وقت ہے۔ کیا میں نے تمہیں سب کچھ وضاحت سے سمجھا دیا؟'' فون کرنے والے نے جم واکین سے پوچھا۔

جم واکین سائبر میٹرکس میں بایوکیمسٹ کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔

''لیکن میں سمجھا نہیں۔ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ میری تو کوئی حیثیت نہیں ہے۔'' جم نے نروس زدہ لہجے میں کہا۔ ساتھ ہی اپنے دفتر کا دروازہ کھول کر باہر ہال میں طائرانہ نظریں دوڑانے لگا کہ کہیں اسے دفتر ہی کا کوئی فرد تو مذاق میں فون نہیں کر رہا ہے۔ لیکن ہر کوئی اپنی اپنی میز پر اپنے اپنے کام میں مصروف تھا اور کسی نے بھی فون اٹھایا ہوا نہیں تھا۔

''شاید میں اپنی بات واضح طور پر بیان نہیں کر سکا ہوں۔'' فون کرنے والے نے کہا۔ ''تمہیں ابھی ابھی ایک ای میل موصول ہوئی ہے۔ اسے کھول کر دیکھو!''

جم نے ویسا ہی کیا جیسے اسے کہا گیا تھا۔ اس نے اپنے کان پر لگا ہوا اپنا بلیک بیری سیل فون ہٹا دیا اور فلیش کرتی ہوئی ای میل کو اسکرولنگ کرتے ہوئے اسے کھول دیا۔

''اوہ مائی گاڈ! لیزا، لیزا!'' اپنی بیوی کی تصویر پر نگاہ

لرزہ خیز لمحات...... پل پل بدلتے حالات پر مشتمل نتیجہ خیز تحریر

یہ ایک حقیقت ہے کہ عہد حاضر کی انفرادیت اس کی جدت ہے... خود کو منفرد ثابت کرنے کے لیے انسان کیسے کیسے رستے اختیار کرتا ہے۔ خواہ اس سفر میں اسے کتنی ہی مشکلات درپیش ہوں لیکن وہ ہر لمحہ دنیا کو حیران کرنے کی لگن میں مصروف عمل ہے۔

اغواپیکج

سلیم انور

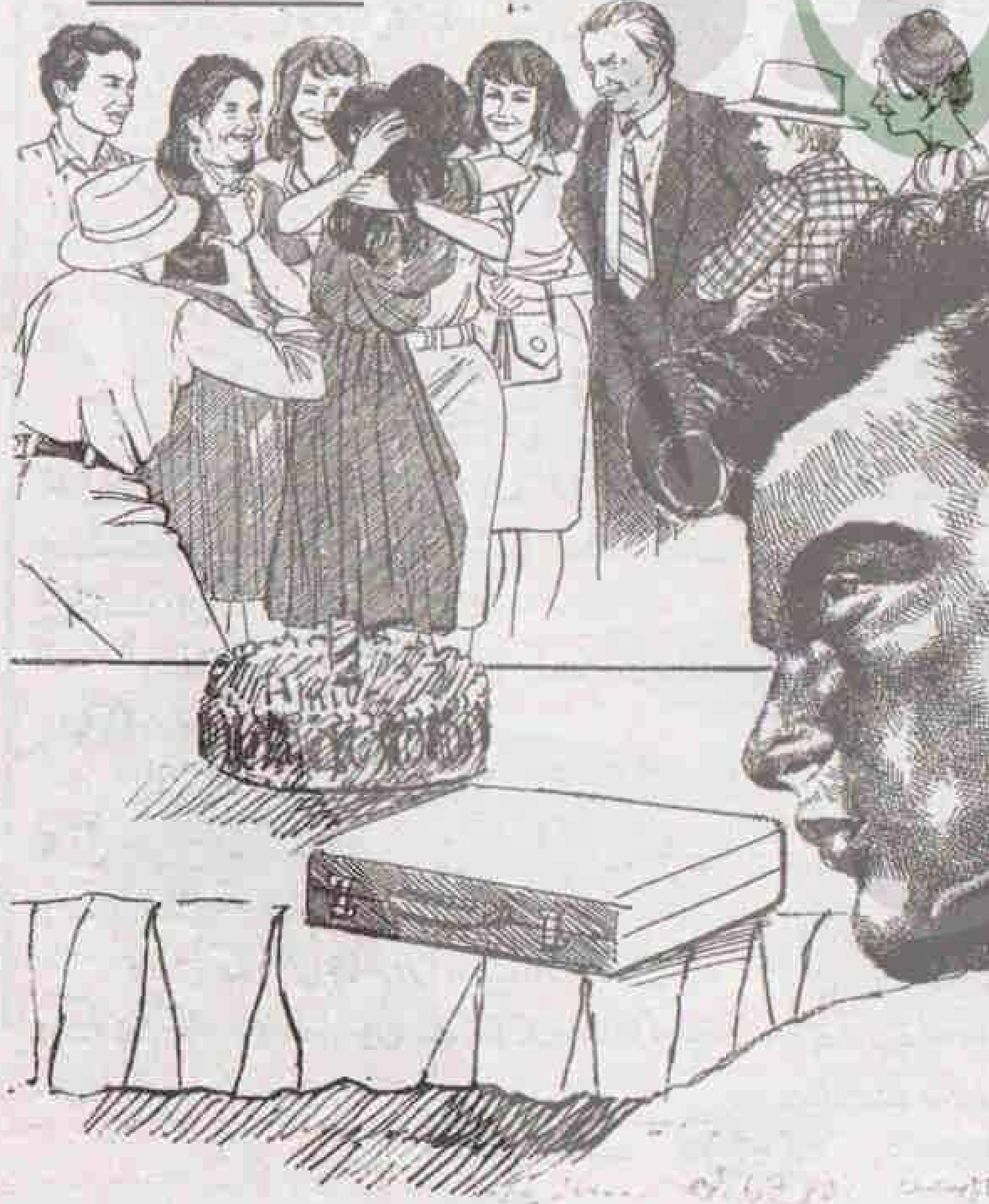

پڑتے ہی بوکھلا سا گیا۔ اس کی بیوی ان کے ڈائننگ روم کی ایک کرسی سے رسی سے بندھی ہوئی تھی اور اس کے منہ پر ایک سلور ڈک ٹیپ چسپاں تھا۔ جم کے ہاتھوں پر کپکپی طاری ہو گئی۔

اس نے سیل فون دوبارہ کان سے لگالیا۔ ''ہیلو! کیا تم موجود ہو؟''

''تمہارے پاس اب آٹھ منٹ باقی رہ گئے ہیں، جم! میرا مشورہ ہے کہ تم اب دوڑ لگا دو۔'' فون کرنے والے نے کہا اور فون بند کر دیا۔

جم اپنے دفتر سے نکل کر تیزی سے لفٹ کی جانب چل دیا۔ پھر بوکھلاہٹ کے عالم میں لفٹ کا بٹن دبانے لگا۔

''ہری اپ! لعنت ہو، ہری اپ!'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔ لفٹ کے اوپر لگے ہوئے نمبر لفٹ کے نیچے آنے کے اشارے کے طور پر وقفے وقفے سے روشن ہو رہے تھے۔

''کم آن، ڈیم اٹ۔'' اس نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے دانت پیسے۔ ''شٹ! پانچ منٹ!'' پھر اس نے سیڑھیوں کی جانب اشارہ کرنے والے نشان کی طرف دیکھا۔

''میں تو دوسری منزل پر ہوں۔ پھر بھلا لفٹ کا انتظار کیوں کر رہا ہوں۔'' اس نے خود کو کوستے ہوئے کہا۔ ''شٹ، شٹ، شٹ!'' پھر وہ بیرونی دروازے کے جانب دوڑ پڑا۔

اس نے سیڑھیوں کا دروازہ کھولا تو گرتے گرتے بچا۔ پھر وہ ایک ساتھ ہی کئی سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے ہال میں آ گیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ مرکزی داخلی دروازے پر نگاہ پڑتے ہی اس نے ایک اچٹتی نگاہ اپنی دستی گھڑی پر ڈالی۔

''شٹ، تین منٹ!'' وہ لوگوں کو دھکیلتا، کہنیاں مارتا ہوا، آٹومیٹک دروازوں کی جانب دوڑنے لگا۔

بالآخر وہ عمارت سے باہر آ گیا۔

کارنر پر سگنل کی لائٹ سبز تھی لیکن زرد ہوا چاہتی تھی۔

زیبرا کراسنگ کے اشارے پر سیکنڈز کی گنتی تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی جبکہ سڑک پر رواں گاڑیاں سگنل کی روشنی زرد ہونے سے قبل سگنل پار کرنے کے لیے ایک ٹائٹ فارمیشن میں تیزی سے رواں تھیں۔

جم نے تیزی سے آتی ہوئی کاروں کے درمیان فاصلے پر اپنی نگاہ مرکوز کر دی۔

''میں پار کر سکتا ہوں۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا اور پھر آتی ہوئی ٹریفک کے درمیان دوڑ پڑا۔ اس کی نظریں اسٹاپ لائٹ اور کراس واک سائن پر جمی ہوئی تھیں۔

کاروں کے ہارن بجنا شروع ہو گئے اور جم کاروں کے ہیڈز کو پھلانگتا اور ان کے درمیان سے چھلانگیں مارتا سڑک پار کرنے لگا۔

''اے، یہ کیا کر رہے ہو احمق!'' ایک کار کا ڈرائیور بریک دباتے ہوئے اس پر چیخنے لگا۔ جم کا داہنا پاؤں کار کی زد میں آنے سے بال بال بچا تھا۔ پھر جم زقند بھرتا ہوا فٹ پاتھ تک پہنچ گیا۔

وہ دوڑتا ہوا کیفے میں داخل ہوا اور فرنٹ لائن میں جا کر ہانپتے ہوئے اپنا آرڈر دینے لگا۔

''بلیو...... بلیو...... بلیو پلیٹ اسپیشل، بغیر گریوی کے!''

''یقیناً جم، ابھی لائی!'' خاتون آرڈر ٹیکر نے مسکراتے ہوئے کہا اور اسے وہ رسید تھما دی جس پر ہدایات درج تھیں۔

جم کو شاک لگا کہ وہ عورت بھی جانتی ہے کہ وہ کون ہے۔

''شٹ! یہ بھی اس میں شامل ہے!'' وہ اس عورت کو لنچ تیار کرتے دیکھتا رہا، پھر دھیرے دھیرے پک اپ کاؤنٹر کی جانب چل دیا۔

''یہ رہا تمہارا لنچ آرڈر جم۔ تمہارے پاس پندرہ منٹ کا وقت ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ یہاں سے جانے سے قبل تم اپنی رسید کو دوبارہ چیک کر لینا۔''

جم نے سڑک کی جانب کھڑکی کے پاس ایک میز منتخب کی اور ہدایات پڑھنا شروع کر دیں۔

اتنے میں اس کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

''ہیلو!'' اس نے نروس زدہ لہجے میں کہا اور چاروں طرف دیکھتے ہوئے رسید کو مضبوطی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا۔

''میرا مشورہ ہے کہ تم ان ہدایات کو پھینکنا مت۔ اب اپنی مٹھی کی گرفت ڈھیلی کر دو اور میری ہدایات کو توجہ سے سنو۔ اب کھڑکی سے باہر سڑک کی طرف دیکھو!''

جم نے دھیرے دھیرے اپنی گردن کھڑکی کی جانب گھما دی۔ اسے باہر سڑک پر ٹریفک معمول کے مطابق رواں دواں دکھائی دیا۔ کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی ماسوائے ایک ٹیکسی کے جو باہر فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی ہوئی تھی۔

''اب باہر نکل کر اس ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ اور اپنا فون آن رکھنا!'' جم ہدایات کی تعمیل کرتے ہوئے میز پر سے اٹھ گیا اور کیفے سے باہر نکل آیا۔ اس کا رخ فٹ پاتھ کے کنارے موجود ٹیکسی کی جانب تھا۔ ابھی وہ ٹیکسی سے چند قدم کے فاصلے پر تھا کہ اسے سامنے سڑک پر ایک پولیس کار دکھائی دی جو اس کی اور ٹیکسی کی جانب آ رہی تھی۔ جم نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ یہ بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کوئی اس کی نگرانی تو نہیں کر رہا ہے۔

پھر اس نے وہ کاغذ جس پر ہدایات درج تھیں جان بوجھ کر نیچے گرا دیا...... اس امید کے ساتھ کہ چلتی ٹریفک سے پیدا ہونے والے ہوا کے جھونکے اسے اڑا کر پولیس کار کی

جانب لے جائیں گے جو کہ ان ہی کی جانب آرہی تھی۔ اتنے میں ایک یو پی ایس ڈیلیوری ٹرک تیزی سے سڑک پر سے گزرا اور اس سے وہ ہوا کا جھونکا پیدا ہوگیا جس کی جم کو ضرورت تھی۔

جم جان بوجھ کر اس کاغذ کو پکڑنے کے لیے اس کی جانب بڑھ گیا لیکن اس کے نزدیک پہنچ کر اسے اٹھانے کے بجائے اس پر یوں ہاتھ رکھ دیا جیسے کہ وہ اب بھی اس کے ہاتھوں سے نکل کر آگے کو اڑتا جارہا ہے۔

پولیس کار بھی اس دوران میں نزدیک آچکی تھی۔

جم نے دیکھا کہ پولیس مین کی نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ جم ابھی سیدھا ہوا ہی تھا کہ اسے اپنے بلیک بیری فون کی بھنبھناہٹ سنائی دی۔ وہ سمجھ گیا کہ وہی فون کررہا ہوگا جس کی ہدایات پر وہ یہاں تک پہنچا ہے۔

اس نے دھیرے دھیرے فون اپنے کان سے لگالیا جبکہ اس کی نظریں بدستور آتی ہوئی پولیس کار پر جمی ہوئی تھیں۔

''اگر تم نے ایک قدم بھی ان پولیس والوں کی طرف بڑھایا تو میں گولی لیزا کی کھوپڑی میں اتار دوں گا اور تم اس کی آخری چیخ کے ساتھ اس کے مرنے کے آخری الفاظ ہی سن سکوگے۔''

پولیس کار آہستہ آہستہ اس کے سامنے سے گزرنے لگی جبکہ دونوں پولیس والے بدستور جم کو گھور رہے تھے۔

جم انہیں کوئی اشارہ کرنا چاہ رہا تھا، کسی قسم کا سگنل دینے کی کوشش کررہا تھا لیکن پولیس کار دھیرے دھیرے آگے بڑھ گئی۔

تب جم نے فون دوبارہ اپنے کان سے لگادیا۔

''گڈ! اب ہم دونوں کا حساب بے باق ہے۔ تم فوراً سامنے کھڑی ٹیکسی میں سوار ہوجاؤ، جم! مجھے دوبارہ کہنے کی ضرورت نہ پڑے۔''

جم چپ چاپ ٹیکسی میں جا بیٹھا۔

''اب فون ڈرائیور کو دے دو!''

جم نے ہدایت کے مطابق اپنا سیل فون ٹیکسی ڈرائیور کی جانب بڑھادیا۔

ڈرائیور نے فون کان سے لگایا اور ہدایات سننے کے دوران میں سر ہلاتا رہا۔ ساتھ ہی عقبی آئینے میں اس کی نظریں جم پر جمی ہوئی تھیں پھر ٹیکسی ڈرائیور نے فون کان پر سے ہٹادیا۔

''یہ لو، وہ اب تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

''کیا ہے؟'' جم نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ اپنا کم بخت فون واپس لے لو۔'' ڈرائیور نے فون اس کی جانب اچھالتے ہوئے کہا۔

جم نے اپنی گود میں پڑا ہوا فون اٹھالیا۔

''تم اب جلد ہی اپنی اگلی منزل پر پہنچنے والے ہو۔''

فون کرنے والے نے بتایا۔ ''جب ٹیکسی رکے تو بریف کیس اٹھالینا اور ٹیکسی سے اتر کر کارنر کے نیوز اسٹینڈ پر چلے جانا۔ وہاں تمہیں آج کا اخبار دیا جائے گا۔ اس اخبار کا صفحہ نمبر ڈی تھری کھول لینا۔ وہاں پر تمہیں اپنی اگلی ہدایات مل جائیں گی۔''

تھوڑی دیر کے بعد ٹیکسی فٹ پاتھ کے کنارے رک گئی۔ ڈرائیور نے اگلی نشست پر رکھا ہوا بریف کیس اٹھا کر اس کی جانب بڑھا دیا اور بولا۔ ''تمہیں اس کی ضرورت پڑے گی۔''

جم بریف کیس سنبھالے ٹیکسی سے نیچے اتر آیا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو کونے پر نیوز اسٹینڈ نظر آگیا۔

وہ نیوز اسٹینڈ کی جانب چل پڑا۔

نیوز اسٹینڈ پر پہنچ کر وہ وہاں رکھے ہوئے اخبارات پر نظریں دوڑانے لگا جیسے کسی خاص اخبار کی تلاش میں ہو۔

''یہ لو جم۔ صفحہ نمبر ڈی تھری۔'' اخبار فروش نے ایک اخبار اٹھا کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ڈیڑھ ڈالر!''

جم نے جیب میں سے ایک ایک ڈالر کے دو نوٹ نکالے اور اخبار فروش کو تھمادیے۔

''بقایا رکھ لو!'' جم نے کہا اور پھر اخبار لے کر نیوز اسٹینڈ سے قدرے ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ پھر اس نے اخبار کا صفحہ نمبر ڈی تھری کھول لیا۔

اس میں لکھا تھا۔ ''سڑک پار سامنے ریسٹورنٹ میں چلے جاؤ اور اپنے بیٹھنے کی باری کا انتظار کرو۔''

جم نے نگاہ اٹھا کر سڑک پار سامنے کی جانب دیکھا تو جیک اسٹیک اینڈ چوپ ہاؤس نامی ریسٹورنٹ کا بورڈ نظر آیا۔ جم نے سڑک کے دونوں جانب دیکھنے کے بعد سڑک پار کرلی اور ریسٹورنٹ میں داخل ہوگیا۔

ریسٹورنٹ کی تمام میزیں تقریباً بھری ہوئی تھیں۔ جم اپنی باری کے انتظار میں ایک جانب کھڑا ہوگیا۔

''اس طرف آجائیں سر!'' ایک دبلے پتلے لمبے سے ویٹر نے اسے مخاطب کیا۔ ''اس وقت یہ جگہ لوگوں سے پیک ہے اور تمام میزیں بھری ہوئی ہیں۔''

جم خاموش کھڑا رہا۔

''پلیز، سر اس طرف آجائیں۔'' ویٹر نے پر اصرار لہجے میں ہال کے آخر میں موجود ایک بڑے سے براؤن دروازے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جم نے اب بھی ویٹر کی بات پر توجہ نہیں دی۔

''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو زیادہ دیر انتظار کی زحمت نہیں ہوگی۔ سب کچھ جلد عیاں ہوجائے گا۔ آپ ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ اس طرف آجائیں، سر!''

جم آہستہ آہستہ قدموں سے اس ویٹر کے پیچھے چل پڑا۔

ویٹر نیم روشن ہال وے میں بڑے سے براؤن ڈبل لاک دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ دروازے کے نزدیک پہنچ کر ویٹر رک گیا اور جم کی جانب گھوم گیا۔

''اب آپ جو کچھ دیکھو گے اس کے بارے میں کسی کو کچھ بھی مت بتانا ورنہ آپ جانتے ہیں کہ کیا ہوگا۔ سمجھ رہے ہیں نا؟'' یہ کہہ کر ویٹر نے جم کی تصدیق کے لیے قدرے توقف کیا۔

''ہاں، میں...... میں سمجھ رہا ہوں......'' جم کی زبان لڑکھڑا گئی۔

تب ویٹر نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے آنکھوں پر باندھنے والی ایک پٹی نکالی اور وہ جم کی آنکھوں پر چڑھادی۔

''یہ کیا مصیبت ہے!'' جم نے اپنا ہاتھ اپنے چہرے کی جانب اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اگر اندر جانے سے پیشتر آپ نے اس پٹی کو اتارا تو پھر آپ کو بے حد افسوس ہوگا مسٹر جم! آپ اپنے ہاتھ نیچے گرا دیں۔'' ویٹر کا لہجہ درشت تھا۔ ساتھ ہی اس نے جم کے اٹھے ہوئے ہاتھ کو ایک جھٹکے سے نیچے گرادیا۔

جم کے کانوں میں دروازے کا لاک اور پھر دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ اندر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ البتہ فضا میں دھوئیں کی ہلکی سی بو رچی ہوئی تھی۔

''اوکے مسٹر جم! اب آپ اپنی آنکھوں پر سے پٹی اتار سکتے ہیں۔''

جم نے اپنی آنکھوں پر سے پٹی اتاری تو اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ کمرا لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سب لوگ ایک ساتھ چیخنے لگے۔ ''سرپرائز! شادی کی سالگرہ مبارک ہو، جم!''

تب جم کی نگاہ اپنی بیوی کے مسکراتے ہوئے چہرے پر پڑی جو ایک بڑی سی میز کے پیچھے سب سے نمایاں نظر آرہی تھی۔ میز پر ایک بڑا سا کیک رکھا ہوا تھا جس پر موم بتیاں روشن تھیں۔

''اوہ ہنی! تم نے وہی کیا جو میں چاہتا تھا۔ میں نے ہی تمہیں Gotcha انکارپوریٹڈ کے بارے میں بتایا تھا جو اس طرح کے اغوا، قتل پلاٹ کے سسپنس پیکیج کی پیشکش کرتی ہے۔ یہ کڈنیپ پلاٹ سسپنس پیکیج زبردست رہا۔ اوہ مائی گاڈ! یہ سب کچھ کتنا حقیقی تھا، میں تو اس وقت تک کچھ سمجھ ہی نہیں تھا جب تک میں نے تمہیں اور اپنے تمام دوستوں کو نہیں دیکھ لیا۔ تم واقعی حیرت انگیز ہو، ہنی! آئی لو یو سوچ!''

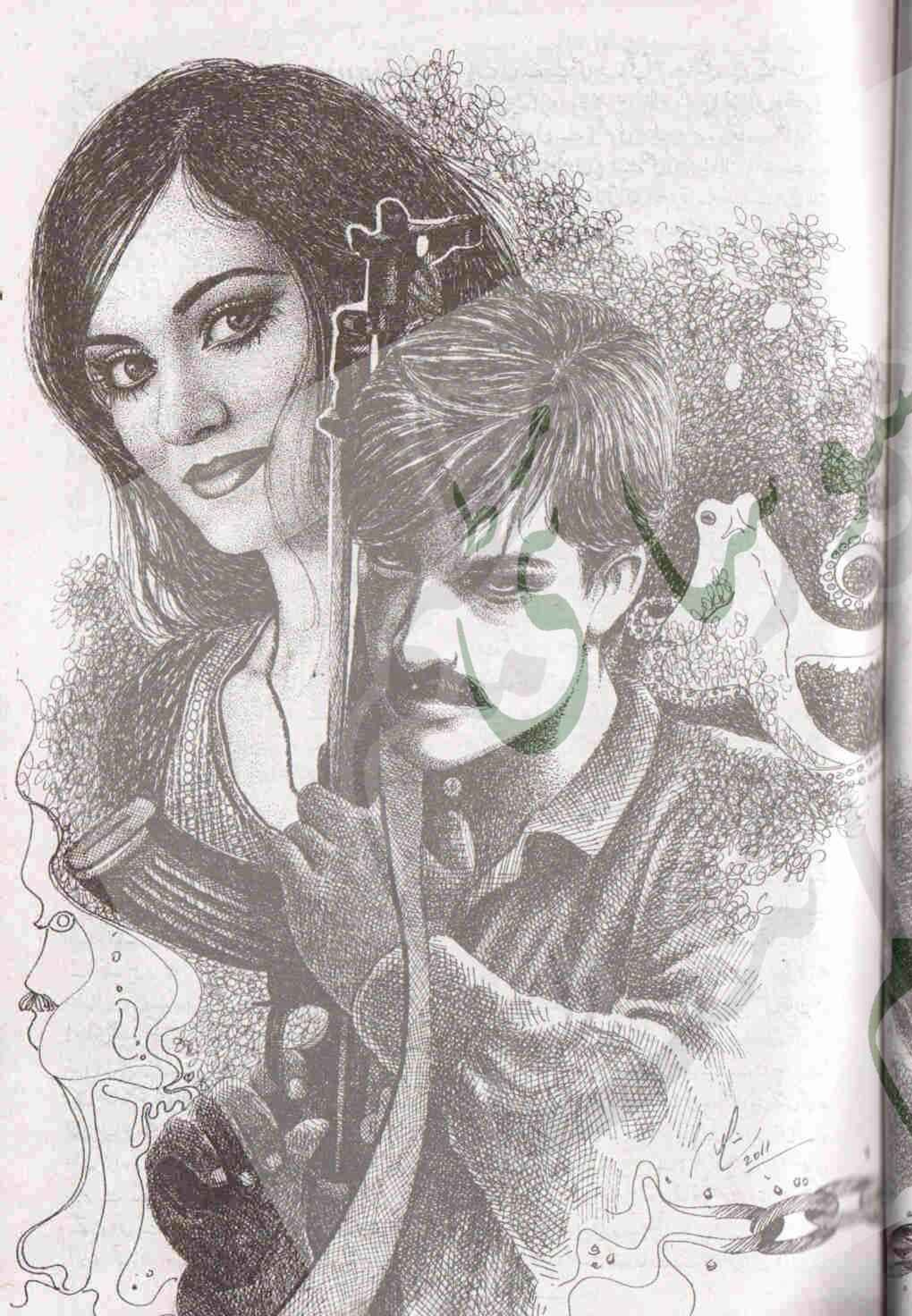

اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

قسط نمبر: 05

کشکول

انوار صدیقی

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیراثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

"ہاں...... اس کا نام ڈوما ہے اور وہ بیروت سے تعلق رکھتا ہے۔" ہاشم نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "ہوسکتا ہے خوبصورت لڑکیوں میں زیادہ دلچسپی ہی کسی دن اس کی موت کا سبب بن جائے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا......؟" لوچن چونکا۔

"اس نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنی ایک محبوبہ کو پہلے ہی وہاں روانہ کردیا ہے جہاں ہمیں جہاز سے اتر کر مختلف ہوٹلوں میں علیحدہ علیحدہ ٹھہرنے کی ہدایت ملی ہے۔ ممکن ہے اس کی محبوبہ پہلے ہی وہاں اپنے لیے کمرا بک کرا چکی ہو اور بعد میں ڈوما اس کے ساتھ اتفاقیہ دوستی کا ڈراما رچانے کی کوشش کرے۔"

"کیا تم اس کی محبوبہ کے نام سے بھی واقف ہو؟" لوچن نے ایک بار پھر حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں...... اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کا تعلق امریکا کے ایک نائٹ کلب سے ہے۔" ہاشم نے چٹخارا لیتے ہوئے جواب دیا۔ "لڑکی خاصی نمکین ہے مگر میرا تجربہ کہتا ہے کہ نمک کی زیادتی کبھی کبھی زہر سے بھی زیادہ مہلک ثابت ہوتی ہے۔"

"ہوں......" لوچن نے ایک بار پھر تیسرے مسافر کی جانب دیکھا جو بدستور فیشن میگزین دیکھنے میں منہمک تھا۔

"تم شاید یہ سوچ رہے ہو مائی ڈیئر لوچن کہ ہم اسے کس طرح اپنے پروگرام میں شامل کرسکتے ہیں۔" ہاشم نے اپنے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بڑی سادگی سے کہا۔ "تم درمیانی نشستوں پر جاکر بیٹھو۔ اسے وہاں لانا میری ذمے داری ہوگی۔"

لوچن نے اس کی تجویز پر عمل کرنے میں دیر نہیں لگائی پھر اسے یہ دیکھ کر بھی تعجب ہوا کہ ہاشم نے تیسرے شخص کے پاس جاکر مدھم آواز میں کوئی ایسی ہی بات کہی تھی کہ وہ ایک پل کو چونکا لیکن ہاشم کے ساتھ ہی اٹھ کر لوچن سے ایک سیٹ چھوڑ کر بیٹھ گیا۔ ہاشم نے درمیانی نشست سنبھال لی تھی۔ کچھ دیر تک وہ تیسرے شخص سے جس کا نام ڈوما ہی تھا، گفتگو میں مصروف رہا پھر وہ تینوں سر جوڑ کر آپس میں کانا پھونسی کرنے لگے لیکن اپنی منزل قریب آنے سے ایک گھنٹا پیشتر ہی اٹھ کر اپنی اپنی نشستوں پر چلے گئے۔ بہ ظاہر ایسا ہی لگا جیسے فضائی سفر کے درمیان تین اجنبی مسافر وقت گزارنے کی خاطر ایک دوسرے سے ملے تھے پھر ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن گئے۔ ہاشم اور ڈوما دونوں ہی کے چہروں سے بے فکری عیاں تھی لیکن...... لوچن جو مارشل آرٹ کا ماہر ہونے کے علاوہ متعدد بار دوسری مختلف پارٹیوں کے لیے بھی منہ مانگی اُجرت پیشگی لینے کے بعد اپنے جرائم پیشہ تجربوں کا بھرپور مظاہرہ کرچکا تھا، اس وقت بار بار کن انکھیوں سے ہاشم کی طرف دیکھ رہا تھا...... شاید اس لیے کہ سابقہ موقعوں پر اسے کبھی کسی سیاہ فام باشندے کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ لوچن نے اپنی عام زندگی میں جنوبی افریقا کے دور دراز قبیلوں میں بسنے والوں کے سلسلے میں بڑی عجیب و غریب کہانیاں پڑھ رکھی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کہانیاں پڑھنے والوں کی دلچسپی کی خاطر کسی رائٹر کی من گھڑت ہوں گی، مگر سیاہ فام ہاشم...... لوچن کو وہ بھی کسی پُراسرار کہانی کا ماورائی ہیرو محسوس ہورہا تھا۔ وہ ہاشم کو اپنے سابقہ تجربوں کی بنیاد پر نگاہوں نگاہوں میں تول رہا تھا پھر...... اچانک ایک خیال اس کے ذہن میں بجلی بن کر کوندا...... "کہیں خود ہاشم ہی تو وہ پُراسرار شخص نہیں جس کے اشارے پر لوچن اور ڈوما کو بک کیا گیا تھا؟"

☆☆☆

اس وقت رات کے سوا بارہ کا عمل تھا لیکن شبنم اس وقت بھی اپنے بستر پر نیم دراز کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ تاج محل ہوٹل میں نظر آنے والا دراز قد اور سنہری فریم کے لائٹ کلر گلاسز استعمال کرنے والا شخص اس کے ذہن کے گوشوں میں اس وقت بھی کسی خطرناک بچھو کے مانند رہ رہ کر ڈنک مار رہا تھا۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔ موبائل ریسیو کرنے کے بعد وہ جس انداز میں اٹھ کر تنہائی میں گیا تھا اسے محسوس کرکے شبنم کا تجسس بھی جاگ اٹھا تھا جس کے نتیجے میں بلیک ٹائیگر کا پاس ورڈ بھی اس کے علم میں آگیا تھا۔

دراز قد والے نے اسی پاس ورڈ کا حوالہ دینے کے بعد ہی کسی کو فوری طور پر ایمرجنسی کے وقت استعمال کیے جانے والے راستے سے فرار ہونے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ اس کی پوری گفتگو نہیں سن سکی تھی لیکن بلیک ٹائیگر اور سراج کا نام سن لینے کے بعد اس کے ذہن میں فوری طور پر افضل خان ہی کا نام ابھرا تھا۔ اس کے بعد ذہن میں یہ اندیشہ بھی سر اٹھانے لگا کہ شاید میڈم روبی کسی خطرے سے دوچار ہے؟ اس تجسس کو وہ فوری طور پر دور کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ سب سے پہلے ضروری تھا کہ وہ مزید کسی کی نظروں میں آئے بغیر واپس گھر پہنچ جائے۔ اگر بلیک ٹائیگر کا پاس ورڈ استعمال کرنے والا بگ باس کا کوئی آدمی تھا تو شبنم کی وہاں موجودگی کی سرجری بھی بعید از قیاس نہ ہوتی۔

اپنے اپارٹمنٹ تک جانے کے بعد بھی اس کا دل کسی انجانے خوف سے دھڑکتا رہا، کسی امکانی تعاقب کی وجہ سے اس نے مختلف سواریاں بدلیں اور کئی راستے اختیار کیے تھے۔ اپنی منزل پر پہنچ کر اس نے سکون کا سانس لیا لیکن عارضی میک اپ سے چھٹکارا پانے کے بعد جب اس نے میڈم کو فون کیا تو ہوٹل میں اس کے ذہن میں ابھرنے والے خدشے نے یقینی صورت اختیار کرلی۔ دوسری جانب سے تھریسا نے میڈم کی جو کیفیت بتائی تھی وہ بھی اس بات کی جانب اشارہ کرنے کے لیے کافی تھی کہ وہ کسی ذہنی حادثے سے دوچار ہونے کے بعد ہی گھر پہنچی ہوگی، ورنہ کسی ڈاکٹر کی آمد اور نیند کا انجکشن لگانے کی نوبت پیش نہ آتی۔

وہ ذہنی حادثہ کیا تھا؟ بلیک ٹائیگر کا پاس ورڈ استعمال کرنے والا گفتگو ختم کرنے کے بعد فوری طور پر وہاں سے کیوں ہٹ گیا؟ سراج اور علاقے کے تھانے والوں کی آمد کا مقصد کیا تھا؟ یہ تین سوالات شبنم کو الجھا دینے کے لیے کافی تھے۔ ایک چوتھا اندیشہ بھی اس کی رگوں میں خون کی سرد لہر بن کر گردش کر رہا تھا...... اگر میک اپ کے باوجود شبنم کی اصلیت بھانپ لی گئی تھی تو اس کا وجود بھی بارود کے ڈھیر پر بیٹھے ہوئے کسی معصوم خرگوش سے کم نہیں تھا۔ اسے اس بات کا بخوبی علم تھا کہ بگ باس اس کی حقیقت سے آگاہ ہوجاتا تو اسے موت کے حوالے کرنے میں ایک پل کی بھی تاخیر نہ کرتا۔

تین روز تک اس نے جس انداز میں شیر کی کچھار میں بیٹھ کر ڈیوٹی انجام دی تھی، یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ بلیک ٹائیگر کے اتفاقیہ نظر میں آجانے کے بعد افضل خان کے فلیٹ میں ہونے والی توڑ پھوڑ اور خود افضل خان کی اچانک گمشدگی نے بھی اسے اپنے سائے سے بھی محتاط رہنے پر مجبور کردیا تھا۔ اخبارات نے جن جلی سرخیوں کے ساتھ نمک مرچ لگا کر افضل خان کی خبر کو ہوا دی گئی تھی، وہ بھی اس کے لیے کچھ کم تشویشناک نہیں تھا۔ اس ضمن میں شبنم کے ذہن میں دو نام ابھرے تھے۔ ممکن ہے اس ہوٹل میں یہ صورت پیش آئی ہو، جو سانحہ گزرا تھا اس نے میڈم کو بھی جوابی کارروائی پر اکسا دیا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ خود بگ باس نے ہوٹل میں ہونے والے کسی حساس حادثے کو محسوس کرنے کے بعد شطرنج کے گھوڑے والی چال چلی ہو۔ اس نے خود ہی افضل خان کے اپارٹمنٹ میں توڑ پھوڑ بھی کرائی ہو اور وقتی طور پر اس کے اغوا کی ایف آئی آر درج کرانے کے بعد قانون کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہو کہ اس واردات کی پشت پر اس کے کسی دشمن کا ہاتھ شامل ہے۔

بہرحال، تین روز سے شبنم نے اپنی تمام بیرونی مصروفیات کو یکسر ختم کر رکھا تھا۔ خود کو اپنے اپارٹمنٹ سے دفتر اور دفتر سے سیدھے اپارٹمنٹ واپس آنے تک محدود کرلیا تھا۔ اس دوران میں اس نے میڈم کے علاوہ کسی اور کو بھی فون کرنے کی غلطی نہیں کی تھی لیکن اس وقت اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ میڈم کو فون کرکے اس کی خیریت دریافت کرلے۔

کافی غور و خوض کے بعد اس نے فون اسٹینڈ کو گھسیٹ کر قریب کیا پھر اس نے ریسیور اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ فون پر ہونے والی کال بیل کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں پھر ڈانواں ڈول ہوگئیں۔

"رات کے سوا بارہ بجے کون فون کرسکتا ہے؟" اس نے سوچا پھر چوتھی گھنٹی بجنے کے بعد اس نے ریسیور اٹھا کر نیند میں ڈوبی آواز بنا کر پوچھا۔

"ہیلو...... کون......؟"

"تین روز سے کہاں غائب ہو...... سوئٹ چاکلیٹ!"

"نان سنس!" شبنم نے جھلا کر کہا۔ "کون ہو تم......؟"

"تمہاری یہی ادائیں تو دل پر برچھیاں چلاتی ہیں، ہنی۔" بولنے والے نے بہکی بہکی آواز میں کہا۔ "سامنے ہوتی ہو تو محبت جتاتی ہو، نظروں سے اوجھل ہوتی ہو......"

"بکواس بند کرو...... ایڈیٹ۔" شبنم نے جھلا کر ریسیور کریڈل پر تقریباً پٹخ دیا۔ اس قسم کی رانگ کالز اسے پہلے بھی موصول ہوتی رہی تھیں مگر اس وقت نہ جانے کیوں اس کا دل اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ دوسری جانب سے بولنے والا شاید اجنبی نہیں...... کوئی خاص واقف کار تھا، جو فلرٹ کرنے کے بہانے اس بات کی ٹوہ لینے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اس وقت اپارٹمنٹ میں موجود ہے یا نہیں۔ اس نے فوری طور پر میڈم کو کال کرنے کا خیال ترک کردیا پھر اس آواز کے بارے میں ذہن کو کریدنے لگی جس نے کچھ دیر پہلے اسے کال کیا تھا۔

اس مس کالز کی وجہ سے وہ رات کو دو بجے کے بعد ہی سو سکی تھی لیکن صبح وقت سے پہلے ہی اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گئی۔ بگ باس وقت کی پابندی کا قائل تھا، دیر سے آنے والوں کی باقاعدہ باز پرس ہوتی تھی، جس کا عذر معقول نہ ہوتا یا بگ باس کو پسند نہ آتا اسے فوراً ہی فارغ ہونے کے احکامات صادر کردیے جاتے تھے۔

دوپہر کو گیارہ بجے تک وہ بڑی مستعدی سے اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتی رہی پھر اس وقت اس کے ہاتھ پاؤں

محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً پھول گئے جب بگ باس کی پرسنل سیکریٹری نے اسے یہ اطلاع دی کہ باس نے اسے اپنے پرسنل آفس میں طلب کیا ہے۔ یہ پہلا اتفاق تھا جب اس کا بلاوا آیا تھا۔ شبنم نے اپنی جگہ دوسری آپریٹر کو ڈیوٹی سونپی پھر دل ہی دل میں اپنی خیریت کی دعائیں مانگتے ہوئے اس نے بگ باس کے پرسنل آفس پر تعینات گارڈ سے کہا کہ اندر اس کے آنے کی اطلاع پہنچا دی جائے۔ کچھ دیر انتظار کے بعد اس نے پہلی بار دھڑکتے ہوئے دل سے باس کے آفس میں قدم رکھا۔ اس کے دل و دماغ میں سیکڑوں وسوسے کلبلا رہے تھے لیکن خلاف توقع شیخ حامد نے اس کے اندر داخل ہوتے ہی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو اسے کچھ تقویت کا احساس ہوا۔ وہ بڑی سعادت مندی سے سنبھل کر کرسی پر بیٹھ گئی لیکن نظریں اٹھا کر بگ باس کے چہرے کی سمت دیکھنے کی جرأت نہ کرسکی۔

''تمہارا نام شاید شبنم ہے؟'' نارمل انداز میں سوال کیا گیا۔

''ج ...... جی ہاں۔'' شبنم ..... جواب دیتے ہوئے گڑبڑا گئی۔

''میں نے تمہیں ایک پرسنل کام کے سلسلے میں اس وقت زحمت دی ہے۔''

''میں اسے اپنی خوش قسمتی ہی تصور کروں گی۔'' پہلی بار اس نے بگ باس کی طرف نظر اٹھا کر بڑی سعادت مندی سے جواب دیا۔

''آج رات کو تمہارا کوئی مخصوص پروگرام تو نہیں ہے؟'' شیخ حامد نے بے تکلفی سے سوال کیا کہ تو وہ پھر گڑبڑا گئی۔ مخصوص پروگرام کے حوالے سے کیا جانے والا سوال اس کی سمجھ میں نہ آسکا تھا۔

''گھبراؤ نہیں......'' شیخ حامد نے قدرے سنجیدگی سے وضاحت کی۔ ''میں تمہاری جیسی اسمارٹ اور خوبصورت لڑکیوں کے سلسلے میں زیادہ پابندیاں عائد کرنے کا قائل نہیں ہوں......تم شاید اپنے اپارٹمنٹ میں بھی تنہا رہتی ہو؟''

''جی ...... جی ہاں۔'' شبنم نے کسمسا کر جواب دیا۔

''لائف انجوائے کرنا اس عمر کا تقاضا بھی ہوسکتا ہے لیکن ...... اس بات کا خیال رہے کہ تم جس کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی ہو اس کا تعلق کس قماش کے لوگوں سے ہے۔''

شبنم نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے ذہن میں اس وقت کئی اندیشے سر ابھار رہے تھے۔

''اگر آج رات تمہارے پاس وقت نہیں ہے تو میں کسی اور کا بندوبست بھی کرسکتا ہوں۔'' شیخ حامد نے گول مول انداز میں کہا۔

''م ...... میں فارغ ہوں سر......!'' اس نے تھوک نگل کر بہ مشکل جواب دیا۔

''گڈ......'' شیخ حامد نے اس بار اصل مقصد بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''گزشتہ رات سے میری مسز کی طبیعت ناساز ہے اس لیے وہ شاید ان مہمانوں کو ٹھیک طور پر اٹینڈ نہ کرسکے گی۔ یہ فرائض داری تمہیں نبھانی پڑے گی بشرطیکہ تمہیں کوئی اعتراض......''

''مجھے آپ کے حکم سے بھلا کس طرح انکار ہوسکتا ہے سر!'' شبنم نے اپنی آمادگی کا اظہار کرنے میں دیر نہیں کی۔

''فائن......'' شیخ حامد نے تھوڑے توقف کے بعد معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔ ''ایک بات تمہیں قبل از وقت بتا دوں ...... میری مسز میرے کردار کو بہت صاف ستھرا ابھی نہیں سمجھتی، ہوسکتا ہے کہ وہ تمہیں بھی مشکوک نظروں سے دیکھے لیکن تم اس کا کوئی نوٹس نہ لینا۔ میں بھی اس بات کی پروا بھی نہیں کرتا کہ کون میرے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے۔''

''مجھے کس وقت آنا ہوگا سر......؟''

''ٹھیک آٹھ بجے۔'' شیخ حامد نے اس بار تحکمانہ انداز اختیار کیا۔ ''لباس صاف ستھرا ہو اور...... تھوڑا سا میک اپ بھی ضروری ہے۔''

''رائٹ سر......'' شبنم نے اس بار بھی سعادت مندی سے جواب دیا۔

''تم نے ابھی تک یہ نہیں پوچھا کہ میں نے کن معزز مہمانوں کو انوائٹ کیا ہے؟'' شیخ حامد نے میز پر رکھے ہوئے پیپر ویٹ پر ہاتھ جما کر اسے زور سے گھماتے ہوئے چھوڑ دیا، پیپر ویٹ چکراتا ہوا میز سے نیچے گر گیا۔ شبنم اسے اٹھانے کی خاطر اٹھنا چاہتی تھی لیکن شیخ حامد نے اسے اشارے سے منع کرتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میں نے جس مہمان اور اس کی خوبصورت اور حسین وائف کو ڈنر پر انوائٹ کیا ہے وہ ...... سیٹھ عثمان ہے، میرا سب سے بڑا کاروباری حریف...... اینڈ آئی ہیٹ ہم......''

شبنم گنگ رہ گئی۔ شیخ حامد کا وہ انوکھا مگر خطرناک روپ وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی لیکن کسی قسم کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اتنا اندازہ ضرور ہوگیا تھا کہ سیٹھ عثمان کو دعوت دینے کے پیچھے بگ باس کی نیک نیتی کو کوئی دخل نہیں تھا۔

''اب تم جاسکتی ہو مگر ایک بات کان کھول کر سن لو...... میرے اور تمہارے درمیان جو بات ہوئی ہے اسے بھول جانا۔'' شیخ حامد نے ہونٹ چباتے ہوئے تنبیہی انداز میں کہا۔ ''صرف اتنا یاد رکھنا کہ تمہیں ٹھیک آٹھ بجے میری کوٹھی پر پہنچنا ہے۔''

''رائٹ سر......'' وہ جانے کے ارادے سے اٹھی۔ شیخ حامد نے ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے پرسنل آفس سے باہر نکلنے کے بعد شبنم نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی آدم خور مگرمچھ کے منہ میں جاکر زندہ سلامت باہر نکل آئی ہو۔

☆☆☆

تاج محل ہوٹل میں پیش آنے والے حادثے کے بعد میڈم روبی آج پہلی بار گھر سے نکلی تھی۔ اس وقت وہ تنہا نہیں تھی۔ اس کی پرسنل سیکریٹری تھریسا بھی اس کے ساتھ تھی۔ پہلے اس کا پروگرام رینبو کلب جانے کا تھا لیکن راستے میں اس نے اپنا ارادہ تبدیل کرکے کار کا رخ ساحل سمندر کی سمت جانے والی کشادہ سڑک کی طرف موڑ دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق نظر آرہی تھی، جب تھریسا نے اسے دبی زبان میں مخاطب کیا۔

''میرا خیال ہے کہ گرے رنگ کی ایک ہائی روف ہمارا تعاقب کررہی ہے۔''

''ہوسکتا ہے کہ تمہارا اندازہ درست ہو لیکن......'' میڈم نے جملہ ادھورا چھوڑ کر کہا۔ ''میں کوشش کے باوجود ابھی تک اسی شاک سے دوچار ہوں جو میرے اعصاب کو جھنجوڑ دینے کے لیے کافی تھا۔''

''ریلیکس......'' تھریسا نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ''جو ہوچکا ہے اب اس کو یاد کرنے سے کیا حاصل۔ ہمیں آئندہ کے لیے بہت محتاط روی سے کام لینا پڑے گا۔ جو ڈراما دشمنوں نے اسٹیج کیا ہے اس کے توڑ کے لیے اب کوئی فوری کارروائی ناگزیر ہوگئی ہے۔''

''میں تمہارے خیال سے متفق ہوں۔''

''کوئی تاخیر ہمارے لیے......''

''تھریسا......'' میڈم نے اس کی بات کاٹ کر بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، کیا میں اپنے شوہر کی موت کو آسانی سے بھول سکتی ہوں؟''

''میں سمجھ رہی ہوں کہ اس وقت آپ کس کیفیت سے دوچار ہیں لیکن......''

''فی الحال میں صرف اس ایک اہم بات پر غور کر رہی ہوں کہ سراج ہمارے لیے کس حد تک کارآمد ثابت ہوسکتا ہے۔''

''سوری میڈم......'' تھریسا نے کسمسا کر سنجیدگی سے کہا۔ ''پولیس والوں کے بارے میں کوئی بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی۔ ہر شخص کو اپنا مفاد زیادہ عزیز ہوتا ہے، پولیس والے تو قدم قدم پر کینچلی بدلنے کے عادی ہوتے ہیں۔''

''جانتی ہوں لیکن رسک لیے بغیر جیت اور ہار کا کھیل مزہ نہیں دیتا۔'' میڈم کا لہجہ سپاٹ تھا، تھریسا نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا پھر عقبی شیشے پر نظر ڈال کر بولی۔

''کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم کچھ راستے تبدیل کرکے اس بات کا یقین کرلیں کہ گرے کلر کی ہائی روف کا ایک مخصوص فاصلے سے ہمارے پیچھے پیچھے آنا کیا معنی رکھتا ہے۔''

''نہیں......'' میڈم نے اس بار بھی بے پروائی سے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ ساحل پر اس وقت لوگوں کا خاصا ہجوم ہوگا۔ وہاں پہنچنے کے بعد ہی سوچا جائے گا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔''

''آپ بہتر سوچ سکتی ہیں مگر...... پرہجوم مقامات پر پیشہ ور قاتلوں کے لیے کسی دشمن کو راستے سے ہٹانا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ مجرم کو فرار کے موقعے ہجوم کی بھگدڑ اور افراتفری بھی فراہم کردیتی ہے۔''

میڈم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے گاڑی کی رفتار اچانک تیز کردی، عقبی شیشے کی طرف اس نے ایک بار بھی دیکھنے کی زحمت نہیں کی لیکن تھریسا پوری طرح ہوشیار تھی۔

''اب شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔'' اس نے میڈم کو کسی متوقع خطرے کا احساس دلانے کی کوشش کی۔ ''تعاقب کرنے والی ہائی روف نے بھی اپنی رفتار تیز کردی ہے۔''

''تم نے شاید کسی انسان کو بے بسی کی موت مرتے نہیں دیکھا۔'' میڈم نے بے حد کرب سے جواب دیا۔ ''جہاں ماہر شکاریوں کی تعداد زیادہ ہو اور شکار ان کے جال میں پوری طرح پھنس جائے۔ اپنے بچاؤ کے لیے صرف موت کے انتظار کے سوا کچھ بھی نہ کرسکتا ہو۔ وہاں بھی درندہ صفت قاتل اپنے شکار کو تڑپا تڑپا کر مارنے کو زیادہ ایڈونچر سمجھتے ہیں۔''

''میڈم پلیز......'' تھریسا نے یکلخت فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''گاڑی واپس موڑ لیں۔ آپ کی طبیعت اس وقت......''

''غلط خیال ہے تمہارا...... میں اس وقت بالکل نارمل

ہوں۔'' میڈم نے ہونٹ چباتے ہوئے سرد مہری سے جواب دیا۔ ''تم جس خطرے کو محسوس کر رہی ہو وہ کسی بھی وقت، کہیں بھی پیش آسکتا ہے۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے اور...... تم نے شاید وار فلمز کو کبھی دلچسپی سے نہیں دیکھا، کوئی بم بلاسٹ ہونے کے بعد جب انسانی جسم کے اعضا منتشر ہو کر فضا میں اڑتے دور دور بکھرتے نظر آتے ہیں تو اکثر تماش بین جوش میں تالیاں بجانا شروع کر دیتے ہیں۔ جانتی ہو وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟...... وہ موت اور زندگی کا کھیل دیکھتے وقت کسی ایک فریق سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ جب مخالف گروپ کے لوگ مارے جاتے ہیں تو وہ اپنے جوش پر قابو نہیں پاسکتے۔ خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔''

''میڈم...... پلیز، آپ کی طبیعت اس وقت......''

''تم کچھ حقائق سے لاعلم ہو۔ شاید اس لیے گھبرا رہی ہو۔'' میڈم نے عجیب انداز میں جواب دیا۔ ''جانتی ہو تھریسا کہ جب کوئی شخص پہلی بار کسی کو قتل کرتا ہے تو اس کے اندر خوف ہی خوف بھرا ہوتا ہے۔ پھانسی کا پھندا۔ اس کی نظروں کے سامنے لٹکتا نظر آتا ہے۔ اپنے ارادے میں کامیابی کے باوجود وہ کسی خوشی کا اظہار نہیں کرتا۔ اس کا خود اپنا انجام اس کے سامنے سوالیہ نشان بن کر اس کے خوف کو ہوا دیتا رہتا ہے۔ سب سے پہلے وہ زندہ رہنے کے لیے فرار کا راستہ تلاش کرتا ہے لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ دو چار زندگیوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد اس کا خوف دل سے نکل جاتا ہے۔ وہ اپنی کامیابی پر لاش کے اوپر جوتے سمیت اپنے پاؤں رکھ کر کھڑا مسکراتا رہتا ہے۔ دوسرے خوفزدہ ہو کر پناہ کی تلاش میں دوڑ دھوپ شروع کر دیتے ہیں۔ قانون کے رکھوالے بھی عادی جرائم پیشہ لوگوں سے دور ہی دور رہتے ہیں۔ جب وہ اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑنے کے بعد موقع واردات سے چلا جاتا ہے تو وہی قانون کے محافظ سینہ تان کر سامنے آجاتے ہیں۔ یہ بھی ایک نظام ہے جو موت اور زندگی کی آنکھ مچولی کو مزید پُراسرار بنا دیا ہے۔''

تھریسا بہت زیادہ الجھ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ میڈم اس وقت ہوش مندی کی باتیں نہیں کر رہی۔ شاید تاج محل ہوٹل کے سانحے نے اس کی شخصیت کو اس حد تک مجروح کر دیا تھا کہ وہ فرسٹریشن کے نفسیاتی مرض میں مبتلا ہو گئی تھی۔ یہ پہلا اتفاق تھا جب تھریسا نے اسے اس قسم کی باتیں کرتے سنا تھا۔ اس نے ایک بار پھر کچھ کہنا چاہا لیکن اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ میڈم اس کے خیال کے مطابق جس قسم کی بہکی بہکی باتیں کر رہی تھی وہ اس کے اندر کا غبار تھا جو کسی آتش فشاں کے بپھرے ہوئے لاوے کی طرح ابل رہا تھا۔ ایسے میں اس سے کچھ کہنا، اس کی ذہنی کیفیت کو اور زیادہ متاثر کر سکتا تھا۔ اس نے میڈم کو ہمدردی سے دیکھا پھر عقب نما آئینے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ گرے کلر کی ہائی روف جو بالکل نئی دکھائی دیتی تھی، بدستور اس کے پیچھے پیچھے آرہی تھی۔ اس کی نمبر پلیٹ پر نظر پڑی تو تھریسا کی بے چینی دوچند ہو گئی، وہ کسی ڈیلر کی عارضی نمبر پلیٹ نظر آرہی تھی۔ اس قسم کی گاڑیوں کا کسی جرم میں استعمال ہونا زیادہ موثر ثابت ہوتا تھا۔ پولیس ان کے فرضی نام کے مالکوں تک نہیں پہنچ پاتی تھی۔ جب تک چھان بین کی جاتی، مجرم قانون کی دسترس سے دور جا چکا ہوتا تھا۔

میڈم نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ پندرہ منٹ بعد اس نے ساحل پر پہنچ کر ایک مہنگے ہوٹل کے قریب دوسری گاڑیوں کی قطار میں اپنی کار روکی پھر اطمینان سے اتر کر باہر آگئی، ہوا کے سرد جھونکوں نے اس کے خوبصورت بالوں کو منتشر کر دیا۔ تھریسا نے میڈم کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ دور سمندر کی موجوں کے ٹکراؤ اور اتار چڑھاؤ کے دلکش مناظر سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھی۔ شاید اس کے ذہن کے گوشے میں ہائی روف سے کسی متوقع خطرے کا احساس ہی مٹ چکا تھا۔

تھریسا نے آگے بڑھ کر میڈم کو پروٹیکشن دینے کی خاطر اس کے سیدھے ہاتھ پر پوزیشن سنبھال لی پھر اس نے نظریں گھما کر دیکھا، گرے کلر کی ہائی روف تقریباً پچاس ساٹھ گز دور ایک ایسی جگہ پارک کی گئی جہاں زیادہ رش نہیں تھا۔ اس میں سے جو شخص اترا، تھریسا اس کو پوری طرح نہیں دیکھ سکی، صرف ایک جھلک دیکھ کر وہ یہی اندازہ لگا سکی تھی کہ وہ کوئی دراز قد آدمی تھا۔ ہائی روف کے پارک کیے جانے کے بعد ایک دوسری کار بھی اس کے سیدھے ہاتھ پر آکر رکی، اس کار میں ایک مختصر فیملی موجود تھی۔ تھریسا پوری توجہ سے حالات کا جائزہ لے رہی تھی، اس کا خیال تھا کہ اگر اس کے ذہن میں تعاقب اور خطرے کا ابھرنے والا خیال غلط نہیں تھا تو ہائی روف سے اترنے والا چند لمحوں میں کھل کر اس کی نظروں کے سامنے آجائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ہائی روف کے برابر رکنے والی کار دو منٹ بعد ہی تھوڑی سی ریورس ہوئی پھر واپسی کے راستوں پر اس کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی۔

''تھریسا......'' میڈم نے بچوں کی طرح تھریسا کا ہاتھ تھام کر سمندر کے ساحل کی طرف اشارہ کیا جہاں مرد، عورتوں اور بچوں کی خاصی تعداد جمع تھی، تین بچے ہر قریب

آنے والی بلند لہر پر اس طرح چھلانگ لگا رہے تھے جیسے پانی پر سلائڈ کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ''ذرا غور سے ان بچوں کو دیکھو، کیسی سویٹ اور معصوم اچھل کود کر رہے ہیں، جیسے انہیں دنیا کے ہنگاموں سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہ ہو۔''

یو آر رائٹ میڈم...... ویسے کیا مناسب نہ ہوگا کہ ہم ہوٹل کے فرسٹ فلور پر بیٹھ کر سمندر اور ساحل پر موج میلا کرنے والوں کا نظارہ کریں۔''

''اسی بہانے ایک ایک آئس کریم فالودہ بھی چل سکتا ہے۔'' میڈم نے ہوٹل کی جانب قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد ہم بھی ساحل کنارے چلیں گے۔''

''ایز یو وش......'' تھریسا، میڈم کو لے کر سیڑھیاں طے کرتے ہوئے ہوٹل کے اوپری حصے کی طرف لے گئی جہاں تین چار فیملیز اور بھی تھیں۔ اس فلور سے وہ گرے کلر کی ہائی روف کی پوزیشن اور کسی متوقع دشمن پر بھی نظر رکھ سکتی تھی۔

میڈم نے آئس کریم فالودہ کا آرڈر دیا پھر دوبارہ ساحل پر اچھلنے کودنے والے بچوں کو دیکھنے لگی۔ تھریسا کی نظریں بار بار ہائی روف کی جانب اٹھ رہی تھیں، اس کے اندر بہ ظاہر کوئی نظر نہیں آرہا تھا، ہوسکتا تھا کہ وہ اندر نشستوں پر لیٹے ہوں اور واپسی میں کوئی مناسب موقع دیکھ کر اپنی عملی طاقت کا مظاہرہ کریں۔

آئس کریم فالودہ آنے کے بعد میڈم اس طرح اسے کھانے میں مصروف ہو گئی جیسے ایک عرصے سے کسی ایسے موقعے کی تلاش میں تھی، تھریسا نے بھی اپنا گلاس ہاتھ میں اٹھا لیا لیکن...... ایک خوفناک دھماکے کی آواز اس قدر اچانک اور شدت سے ابھری کہ تھریسا کا گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر الٹ گیا، کئی عورتیں اس اچانک ہونے والے دھماکے سے چیخنے چلانے لگیں۔ ساحل پر موجود افراد بھی پاگلوں کی طرح اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف دوڑنے لگے۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی، فرسٹ فلور پر بیٹھی فیملیز بھی نیچے چلی گئیں۔

تھریسا نے پلٹ کر ہائی روف کی سمت دیکھا جس کی باڈی کئی ٹکڑوں میں ٹوٹ کر بکھر چکی تھی اور آگ کے شعلے اسے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔ تھریسا نے کسی خیال کے پیشِ نظر پلٹ کر میڈم کی جانب دیکھا جس کے چہرے پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ پھیل کر بتدریج گہری ہو رہی تھی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ خوفناک دھماکا اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔

''میڈم......'' تھریسا نے اسے معنی خیز لہجے میں مخاطب کیا۔

''یاد کرو مائی ڈیئر تھریسا...... یہ جملہ تم نے ہی کہا تھا کہ...... اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم بھی دشمنوں کی کمینگی کا منہ توڑ جواب دیں۔'' میڈم نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''یہ دھماکا اسی پروگرام کا ایک ذاتی تجربہ تھا...... میں اپنے دشمن کو پشت سے وار کرنے کے بجائے للکار کر کسی خارش زدہ کتے کی طرح سسکا سسکا کر مارنے کا تہیہ کر چکی ہوں۔''

جواب میں تھریسا نے اپنے بھرپور تعاون کا اظہار کرنے کی خاطر میڈم کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

☆☆☆

حسبِ عادت وہ آٹھ بجے کے بجائے سات بج کر پچیس منٹ پر ہی شیخ حامد کے عالیشان بنگلے کے باہر ٹیکسی سے اتری تھی، اس نے لائٹ اینڈ ڈارک کلر کا آف وہائٹ شلوار سوٹ پہن رکھا تھا، چہرے پر ہلکا میک اپ بھی تھا جس نے اس کے خوبصورت چہرے اور جوان شخصیت کو اور نکھار دیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے کرایہ وصول کرتے وقت اسے اچھی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کی نگاہوں کا مفہوم بھانپ کر تلملا اٹھی لیکن پھر خود کو سنبھال کر بنگلے کی سمت قدم بڑھانے لگی۔

''کس سے ملنا ہے؟'' گیٹ پر موجود دو گارڈز میں سے ایک نے اسے سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے دریافت کیا۔

''میرا نام شبنم ہے، بگ باس نے مجھے کسی دعوت کے اہتمام کے لیے بلایا تھا۔'' گارڈ نے کوئی دوسرا سوال نہیں کیا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو دونوں جانب لان کے خوش رنگ سبزے اور حد بندی کی دیوار کے ساتھ لگے قیمتی اور انمول پودوں کو دیکھ کر مسکرا دی۔ ایک خطرناک آدمی کا بھلا ان خوبصورت گل بوٹوں سے کیا تعلق؟ اس نے سوچا پھر اسے خود ہی یہ خیال بھی آگیا کہ جو لوگ اوپر سے میٹھے اور اندر سے کسی خطرناک کوبرے سے زیادہ زہریلے ہوتے ہیں، انہیں بھی اپنی شخصیت کے دونوں پہلوؤں کو بھی دنیا دکھاوے کے لیے نبھانا پڑتا ہے۔

روش عبور کر کے وہ دروازے کے قریب پہنچی تو ایک ادھیڑ عمر کی عورت سامنے آگئی۔ اس نے کوئی سوال کرنے کے بجائے شبنم کا ایک نظر میں جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ غالباً شبنم بی بی ہیں۔''

''ہاں......''

''اندر تشریف لے جائیں۔'' اس نے سپاٹ لہجے

میں کہا۔ ’’بڑے صاحب ابھی نہیں آئے لیکن بیگم صاحبہ آپ ہی کی راہ دیکھ رہی ہیں۔‘‘

شبنم نے اس کے چبھتے ہوئے لہجے کو محسوس کیا لیکن دل پر جبر کر کے اندر داخل ہوئی تو وہاں کی سجاوٹ دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ہلکے نیلے رنگ کے ٹائلز کو دیکھ کر بالکل ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے نیچے صاف وشفاف پانی بھی ضرور ہوگا۔ عالیشان بنگلے کا وہ حصہ بیرونی ہال تھا جہاں قیمتی فرنیچر بڑی نفاست سے سجایا گیا تھا، وہ خود کو سنبھالتی آگے بڑھی تو بائیں جانب نظر آنے والے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک پینتیس چالیس سال کی عورت اس کے سامنے آگئی۔ اس نے نہایت قیمتی ساڑی پہن رکھی تھی۔ لباس کے رنگ اور اس پر موجود کام کی مناسبت سے زیورات کا انتخاب بھی اس پر سج رہا تھا۔ بذاتِ خود بھی وہ گداز جسم اور خوبصورت خدوخال کی مالک تھی۔ بادامی آنکھوں میں سرمے کی ہلکی سیاہ لکیر نے اس کی آنکھوں کے حسن کو مزید نکھار دیا تھا لیکن ان خوبصورت غزالی آنکھوں میں دور دور تک ویرانیوں کا راج نظر آرہا تھا۔ زندگی اور زندگی کی مسرتیں برائے نام بھی نہیں تھیں۔ شاید شبنم اس کے سامنے ٹھٹک کر رک گئی۔ اتنے قیمتی لباس میں نظر آنے والی کوئی ملازمہ نہیں ہوسکتی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا لیکن زبان سے کچھ نہیں بولی۔ شیخ حامد کے ہاں ملازمت کے دوران میں اس نے یہ خوبی اندازہ لگالیا تھا کہ اس کی ذاتی لغت میں ناممکن کا کوئی لفظ موجود نہیں تھا۔

’’تم شاید شبنم ہو......؟‘‘ دروازے کے بیچوں وبیچ کھڑی عورت نے اسے تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

’’جی ہاں......‘‘

’’کیا کام کرتی ہو؟‘‘ اس بار بھی خشک لہجہ اختیار کیا گیا۔

’’ٹیلی فون آپریٹر ہوں......‘‘ شبنم نے اس بار بھی مختصر جواب دیا۔

’’اوہ......‘‘ عورت کے چہرے پر ایک پھیکا معنی خیز تبسم ابھر آیا۔ ’’لوگوں کو ایک دوسرے سے رابطے میں لانے کا کام انجام دے رہی ہو...... کبھی خود بھی کسی سے رابطہ کیا ہے؟‘‘ عورت کے آخری جملے میں طنز کے ساتھ ساتھ تحقیر کا پہلو بھی نمایاں تھا۔

’’جی......‘‘ اس نے چونک کر سوال کیا۔ ’’میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھی؟‘‘

’’ہوسکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔‘‘ عورت نے سپاٹ لہجے میں اگلا سوال کیا۔ ’’کب سے ملازم ہو۔‘‘

’’ڈیڑھ یا دو سال سے......‘‘ شبنم نے جواب دیا تاہم عورت کا انداز گفتگو اسے اچھا نہیں لگا تھا۔

’’پھر تم نے جو کہا...... وہ غلط نہیں ہوگا۔ اس بار عورت نے ہونٹ چباتے ہوئے بڑے درد بھرے انداز میں کہا۔ ’’میری اور تمہارے بگ باس کی شادی کو...... شاید اٹھارہ یا بیس سال گزر گئے، جب میں اتنے عرصے میں اسے پوری طرح نہیں سمجھ پائی تو تم سال ڈیڑھ سال میں بھلا کیا سمجھ پاؤ گی۔‘‘

’’خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔‘‘ شبنم نے اس کی جلی کٹی باتوں کے باوجود مسکرا کر کہا۔ ’’آپ کی طرح آپ کی شخصیت بھی بڑی خوبصورت اور دلکش ہے۔‘‘

’’نام نہیں پوچھو گی...... میرا نام صبا ہے، شاعروں نے بھی اس نام کو بہت سراہا ہے...... شروع شروع میں خود مجھے اپنی خوبصورتی پر بڑا ناز تھا لیکن......‘‘ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اس نے ایک بار پھر شبنم کو بڑی گہری اور ٹٹولتی نظروں سے دیکھا۔ ’’مہمان نو بجے آئیں گے...... حامد نے ساڑھے آٹھ بجے آنے کا کہا ہے، ابھی اس کے آنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں، تم میرے کمرے میں آجاؤ۔‘‘ اس نے دروازے سے ہٹ کر راستہ دیا تو شبنم مسکراتی ہوئی اس کے کمرے میں چلی گئی، وہاں کی ہر شے ہی قابل تعریف تھی سوائے خود صبا کے جس کی مبہم باتیں ابھی تک اسے سمجھ نہیں آئی تھیں۔

اس کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد صبا نے کمرے کو اندر سے بند کیا پھر شبنم کے قریب آکر مدھم اور پُراسرار انداز میں بولی۔

’’میں نے اٹھارہ بیس سال قریب رہ کر جو تجربہ کیا ہے وہ تم مزید دس سال گزر جانے کے بعد بھی نہیں کرسکو گی۔‘‘

’’جی......‘‘ شبنم نے پہلی بار اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ’’میں...... میں آپ کی بات کا مفہوم نہیں سمجھ سکی۔‘‘

’’میرے پاس وقت کم ہے۔‘‘ صبا نے ہونٹ چباتے ہوئے شبنم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ’’ہوسکتا ہے کہ میرا اندازہ غلط ہو لیکن دل یہی کہہ رہا ہے کہ شاید ابھی تک تم اپنے باس کے ہاتھوں شکار نہیں ہوئی ہو، وہ اتنی جلدی کسی سے بے تکلف بھی نہیں ہوتا۔‘‘

’’میڈم......‘‘ شبنم کے نتھنے غصے سے پھڑپھڑانے لگے۔ ’’یہ آپ کس قسم کی گفتگو......‘‘

’’مجھے غلط نہ سمجھو۔‘‘ صبا نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ ’’مجھے ایک ایسے دوست کی ضرورت ہے جو میرے کام آسکے۔ تم عورت ہو اس لیے میرا درد آسانی سے سمجھ سکتی ہو۔ تم میرا ایک کام کرسکتی ہو؟...... مم ...... میں اس کے عوض تمہیں منہ مانگی قیمت دینے کی پوزیشن میں ہوں۔‘‘

’’کیسا کام......؟‘‘

’’اپنے بگ باس کو کسی بھی طرح زہر دے دو۔‘‘ صبا نے بڑی رازداری سے اس کے کان کے قریب منہ لا کر کہا۔ ’’میری زندگی پر یہ تمہارا بہت بڑا احسان ہوگا...... نہیں! انکار مت کرنا......‘‘ اس نے بڑی بے بسی کے عالم میں بھرّائی ہوئی آواز میں التجا کی۔ ’’جانتی ہو مجھے کس جرم کی پاداش میں عمر قید بامشقت کی سزا بھگتنی پڑ رہی ہے۔ وقت کم ہے، کوئی سوال نہ کرنا، صرف میری بپتا سن لو۔‘‘ صبا کی آواز رندھنے لگی تو اس نے جلدی سے ٹشو اٹھا کر بھیگی پلکوں کو خوفزدہ انداز میں خشک کرتے ہوئے کہا۔ ’’میں نے تین بار لڑکیوں کو جنم دیا تھا لیکن ان کی صورتیں نہیں دیکھ سکی۔ مجھے ہر بار یہی بتایا گیا کہ تینوں بچیاں پیدائش کے بعد ہی...... فوت ہوگئی تھیں لیکن یہ جھوٹ ہے، حامد نے مجھ سے دروغ گوئی کی ہوگی اس لیے کہ وہ...... وہ ہر بار ایک وارث کی توقع کرتا تھا۔‘‘ صبا نے اپنی غمناک کہانی جاری رکھی۔ ’’وہ اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہے لیکن...... میں مشین نہیں ہوں کہ خود کو استعمال کرنے والے کو اس کی مرضی کے مطابق سو فیصدی نتائج دے سکوں اور پھر...... خدا کی مرضی کے آگے بندے کا اختیار بھی نہیں چلتا...... بولو، کیا تم میرا کام کرسکو گی؟ یہ تمہارا ایک بے بس عورت پر بڑا احسان ہوگا۔‘‘ وہ روانی میں کہتی گئی۔ ’’حامد نے تم جیسی خوبصورت اور حسین لڑکی کو محض اس لیے بلایا ہوگا تاکہ میرے زخموں پر نمک پاشی کرسکے لیکن تم میرے لیے بہت کارآمد بھی ہوسکتی ہو...... شاید...... شاید یہ موقع مجھے دوبارہ نہ مل سکے۔ پلیز، انکار نہ کرنا میں......‘‘ صبا نے اگلا جملہ ادا کرنے کے بجائے ہاتھ جوڑ لیے۔

شبنم کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ صبا کی کہانی نے اس کے اندر بگ باس سے ذاتی انتقام کے جذبوں کو اور بھڑکا دیا تھا لیکن وہ کوئی جواب دینے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔ اسے خوف تھا کہ بگ باس کسی نہ کسی طرح صبا کی باتوں کو ضرور سن رہا ہوگا۔ شاید اسی لیے اس نے شبنم کو بھی محض آزمانے کا ایک موقع تلاش کیا ہو؟...... شبنم کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس کی چھٹی حس گواہی دے رہی تھی کہ وہ اس وقت اچانک شدید خطروں سے دوچار ہوگئی ہے۔ اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک غلط جملہ بھی اس کے لیے کسی اذیت ناک موت کا سبب بن سکتا تھا۔

’’تت...... تم چپ کیوں ہو لڑکی۔‘‘ صبا نے اسے جذباتی لہجے میں مخاطب کیا۔ ’’کیا...... تم ایک عورت ہو کر بھی کسی دوسری عورت کے اوپر ایک چھوٹا سا احسان نہیں کرسکتیں......؟‘‘

’’میڈم......‘‘ اچانک شبنم نے سپاٹ لہجے میں بڑی تلخی سے جواب دیا۔ ’’آپ نے جو خود ساختہ کہانی سنائی ہے میں اس پر یقین نہیں کرسکتی۔ میرا ذاتی مشورہ ہے کہ آپ کو فوری طور پر کسی نفسیاتی معالج سے رجوع کرنا چاہیے...... ویسے بھی بگ باس کی اجلی شخصیت پر آپ بیوی ہو کر جو کیچڑ اچھال رہی ہیں وہ...... وہ آپ کو زیب نہیں دیتی۔‘‘

دوسرے ہی لمحے اس کی بات کا جواب ایک بھرپور تھپڑ سے دیا گیا۔ صبا بیگم ایک دم ہی بپھر گئی تھی لیکن اسی وقت بند دروازے کو غالباً کسی دوسری چابی سے کھول کر شیخ حامد سامنے آگیا۔ وہ صبا کی طرف خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا لیکن یہ کیفیت تیس سیکنڈ سے زیادہ برقرار نہ رہ سکی۔

اس نے کینچلی بدل کر بڑے پیار بھرے انداز میں بیوی کو مخاطب کیا۔ ’’میں نے پہلے ہی تم سے آرام کرنے کو کہا تھا۔ ڈاکٹروں کا بھی یہی مشورہ ہے۔‘‘

صبا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پتھر کی بے جان مورتی بنی کھڑی سب کچھ نفرت سے برداشت کرتی رہی۔ اس کے اندر کا کرب صرف اس کی آنکھوں سے عیاں تھا۔

’’سوری شبنم......‘‘ شیخ حامد نے شبنم کو بڑے مہذب انداز میں مخاطب کیا۔ ’’تم باہر جا کر ریلیکس کرو، میں ابھی آتا ہوں۔‘‘

شبنم نے سکون کا سانس لیا پھر وہ دھڑکتے ہوئے دل سے باہر آگئی۔ کچھ دیر بعد شیخ حامد بھی کمرے سے نکل کر باہر آگیا۔ اس نے شبنم کو خانساماں سے ملوا کر ضروری ہدایات دیں پھر مہمانوں کا استقبال کرنے کی خاطر خود باہر چلا گیا۔ ڈنر کے دوران میں بھی صبا بیگم ایک پل کے لیے بھی ڈائننگ ٹیبل پر نظر نہیں آئیں۔ ان کی عدم موجودگی کو شبنم کے علاوہ راحیلہ بیگم نے بھی محسوس کیا تھا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا بھی تھا۔ ’’کیا بات ہے حامد صاحب...... آپ نے آج ہماری بھابی کو کہاں چھپا دیا ہے؟‘‘

’’اس کی طبیعت دوپہر کو اچانک خراب ہوگئی تھی...... مجھے فیملی ڈاکٹر کے مشورے پر اسے فوراً اسپتال منتقل کرنا

پڑا۔'' شیخ حامد نے سنجیدگی سے دروغ گوئی کی۔ ''پریشانی کے باوجود میں نے ڈنر منسوخ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔''

''برا کیا آپ نے۔'' راحیلہ نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ''اگر مجھے بھنک بھی مل جاتی تو میں نہ آتی۔''

''آپ نہ آتیں تو مجھے دکھ ہوتا......''

''چلیں کوئی بات نہیں......'' سیٹھ عثمان نے مسکرا کر کہا۔ ''بھابی کے آنے کے بعد دوبارہ بھی آجائیں گے۔ اسی بہانے ایک ڈنر اور مل جائے گا۔''

''وہائی ناٹ...... وہائی ناٹ۔'' شیخ حامد نے بے تکلفی کا اظہار کیا پھر مہمانوں کی کار میں بیٹھنے اور ان کی کار کے گیٹ سے باہر نکلنے کے وقت تک وش کرنے کی خاطر ہاتھ لہراتا رہا۔

شبنم دور کھڑی تھی لیکن...... اس کے ذہن میں بگ باس کا وہ جملہ اس وقت بھی گونج رہا تھا جو اس نے سیٹھ عثمان اور اس کی بیوی کی دعوت کے بارے میں اپنے پرسنل آفس میں بیٹھے ہوئے شبنم سے کہا تھا۔ ''میں نے جس مہمان اور اس کی حسین وائف کو ڈنر پر انوائٹ کیا ہے وہ...... سیٹھ عثمان ہے...... میرا سب سے بڑا کاروباری حریف...... اینڈ آئی ہیٹ ہم۔''

مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد شیخ حامد نے شبنم کی واپسی کے لیے بڑی دریا دلی سے اسے گھر تک ڈراپ کرنے کی خاطر ڈرائیور کو بلا کر ضروری ہدایت دی پھر تنہائی میں شبنم کو ایک بند لفافہ دیتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ''تم میرے انتخاب پر پوری اتریں...... یہ تمہاری خوش قسمتی بھی ہے، میں تم کو اپنے کچھ خاص کاموں کے سلسلے میں بھی موقع دیتا رہوں گا۔''

گھر جاتے وقت بھی شبنم کے ذہن میں وہ جذباتی کہانی گونج رہی تھی جو مسز حامد نے اسے سنائی تھی۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ صبا بیگم نے جو کہانی اسے سنائی تھی وہ حرف بہ حرف سچ تھی۔

☆☆☆

قید تنہائی میں افضل خان کو وہ پانچواں دن تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس کے اندر منفی خیالات نے جنم لینا شروع کر دیا تھا۔ پستہ قد شخص روزانہ اس کے لیے کھانا اور ناشتا پابندی سے لا رہا تھا، وہ ازخود کوئی گفتگو نہیں کرتا تھا، بگ باس کی نظروں میں اس کی کیا حیثیت تھی؟ افضل خان ابھی تک اس کا درست اندازہ نہیں لگا سکا۔ وہ کوئی سوال کرتا تو پستہ قامت اس کا جواب ہمیشہ ایسے انداز میں دیتا جیسے وہ افضل خان کو اس کی موجودہ حیثیت کا احساس دلاتے کی کوشش کر رہا ہو...... پھر، افضل خان نے پچھلے چھتیس گھنٹوں سے اس سے بات کرنا یکسر ترک کر دی تھی۔ آخری بار اس نے افضل خان کو واپس جاتے جاتے رک کر بڑے عجیب انداز میں کسی کا پیغام سنایا تھا۔

''ہوسکتا ہے کہ اگر قسمت نے تمہارا ساتھ دیا تو تم دو روز بعد اس پنجرے سے نجات پانے میں کامیاب ہو جاؤ۔'' اس کا لہجہ بے حد سپاٹ تھا۔ ''لیکن یہ سب آئندہ پیش آنے والے حالات پر منحصر ہے۔''

''یہ تمہارے اپنے ذہن کی اختراع ہے یا تم کسی کا پیغام سنا رہے ہو؟'' افضل خان نے اسے ناپسندیدہ نظروں سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

''یہ بات بگ باس نے کسی کی معرفت کہلوائی ہے...... میرا کام صرف تمہیں اطلاع دینا تھا۔''

افضل خان نے بھنا کر پوچھا۔ ''چیف منسٹر کانفرنس کا اونٹ کس کروٹ بیٹھا؟''

''سوری...... وہاں مجھے نہیں بلایا گیا تھا ورنہ تمہیں تفصیل سے ضرور آگاہ کرتا۔'' اس بار بھی اس نے بات مذاق میں اڑانے کی کوشش کی۔

''میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ میرے مقابلے میں تمہاری کیا حیثیت ہے؟'' افضل خان نے اسے حقارت سے گھورا۔

''فی الحال اپنی حیثیت کے بارے میں غور و فکر کرنا تمہارے لیے زیادہ صحت مند ثابت ہوگا۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا پھر مسکراتے ہوئے باہر جا کر دروازہ بند کر دیا۔ اسی وقت سے افضل خان نے طے کر لیا تھا کہ وہ اب خود سے اسے مخاطب نہیں کرے گا۔

پچھلے چھتیس گھنٹوں میں وہ صرف اپنے مستقبل کے بارے میں ہی غور کرتا رہا تھا۔ بگ باس کی ناراضی کی صورت میں شاید وہ تہ خانے کا کمرا ہی اس کی آخری آرام گاہ ثابت ہوتا لیکن...... ایک بار کھلی فضا میں نکل جانے کے بعد اسے کچھ نہ کچھ ضرور سوچنا تھا، اپنے مستقبل کے بارے میں...... وہ جس پوزیشن سے آج دوچار تھا، یہ صورتِ حال آئندہ بھی پیدا ہوسکتی تھی۔ اس کا صرف ایک ہی توڑ ممکن تھا کہ وہ میڈم روبی کی دی گئی آفر آنکھ بند کر کے قبول کر لیتا...... اسے اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ شیخ حامد کے قریب ترین ہونے کی وجہ سے اسے کسی دوسرے کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا، اس کے بعد

اگر وہ وقت ضائع کیے بغیر پہلی فلائٹ سے ملک کی سرحد پار کر جاتا تو پھر قانون کے حرکت میں آنے میں خاصا وقت لگتا...... اس درمیانی وقفے میں وہ میڈم کی مدد سے اور بھی کئی آپشن پر عمل کر سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں اور بھی کئی منصوبے کلبلاتے رہتے تھے جن پر اگر وہ عمل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو بگ باس کے خطرے کی تلوار اس کے سر پر مستقل نہیں منڈلا سکتی تھی۔ اندرونی طور پر وہ میڈم کی مالی پوزیشن کے بارے میں بھی چھان بین کر چکا تھا جو اگر آئندہ بیس سال تک بھی اپنی موجودہ حیثیت برقرار رکھتی تو اس کے پاس دولت کی کوئی کمی نہ ہوتی۔

رات کے بارہ بجے تک وہ پنجرے میں بند کسی جنگلی درندے کی طرح ٹہلتا رہا تھا پھر بستر پر لیٹ کر آئندہ کے منصوبوں پر غور کرتا رہا۔ وہ کب بے خبری کے عالم میں نیند کی کیفیت سے دوچار ہوا، اسے یاد نہیں لیکن دوبارہ جب کسی نے اسے جھنجوڑ کر جگایا تو اس نے سب سے پہلے اپنی دستی گھڑی کی طرف نظر ڈالی۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ بستر سے بوکھلا کر اٹھنے کے بعد...... اسے وہ تین نقاب پوش بھی نظر آ گئے جو اس کے سر پر مسلط تھے، پستہ قد آدمی دروازے پر روسی ساخت کی چھوٹی مگر دور مار رائفل لیے موجود تھا۔

''کیا بات ہے......؟'' افضل کی جگہ دوسرا کوئی ہوتا تو شاید اس کی حالت بھی مختلف نہ ہوتی، باری باری اس نے تینوں نقاب پوشوں پر نظر ڈالتے ہوئے بڑے گھبرائے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ''اتنی رات گئے مجھے کیوں ڈسٹرب کیا گیا ہے؟''

جواب میں ایک نقاب پوش نے دوسرے کو اشارہ کیا جس نے قریب رکھے ہوئے جگ سے ایک گلاس پانی بھرا اور اشارہ کرنے والے کے قریب آگیا۔ شاید وہ موت کا اذیت ناک تصور ہی تھا جو افضل خان کی پیشانی پر پسینے کے ننھے منے قطروں کی صورت میں نمودار ہو رہا تھا۔

''لو، اسے پھانک کر پانی پی لو۔'' اشارہ کرنے والے نے جیب سے ایک پڑیا نکال کر افضل خان کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''جلدی کرو ہمارے پاس وقت کم ہے۔''

''یہ...... یہ...... اس...... میں کیا ہے؟'' افضل خان کسی انجانے خوف کو محسوس کر کے ہکلانے لگا۔

''اس کا اندازہ تمہیں دو تین گھنٹے بعد ہی ہوگا۔'' نقاب پوش نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ہم گفتگو میں وقت ضائع نہیں کر سکتے...... شاباش، جلدی کرو۔''

افضل خان کی آنکھوں میں موت کے سائے کپکپانے لگے لیکن وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کے پاس دیے گئے حکم پر عمل کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ اس نے ہمیشہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ کبھی بزدلی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ اس نے اس وقت بھی اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پانے کی کوشش میں زیادہ وقت نہیں لیا۔ خاموشی سے پڑیا کھول کر اس کے اندر موجود ہلکے نیلے سفوف کو منہ میں ڈالا اور ایک ہی گھونٹ میں حلق کے نیچے اتار گیا۔

''گڈ......'' نقاب پوش نے کہا۔ ''اب تم دوبارہ لیٹ جاؤ...... زیادہ سے زیادہ بیس منٹ بعد ہم اپنا دوسرا کام بھی شروع کر دیں گے۔''

افضل خان بدستور خاموش کھڑا رہا۔ اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہو چکا تھا، فرار کے سارے راستے بند تھے اس لیے اس نے بستر پر لیٹنے میں دیر نہیں لگائی۔ دو منٹ بعد ہی اس نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ بے ہوشی کا غلبہ اس کے ذہن پر پوری شدت اور تیزی سے ہو رہا تھا۔ وہ اپنی بے چارگی اور بے بسی پر مسکرا دیا پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے خیال میں اس آخری وقت میں تین مسلح نقاب پوشوں اور دروازے پر خودکار رائفل لیے تعینات پستہ قد رکھوالے کی موجودگی میں اسے کسی بہادری کا مظاہرہ کرنے سے بھی کچھ حاصل نہ ہوتا۔

بے ہوشی یا شاید موت کے سرد ہاتھ بڑی سرعت سے اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتوں کو سلب کر رہے تھے۔ ایک لمحے کو اس نے دل میں سوچا کہ جتنی سانسیں باقی رہ گئی ہیں۔ اس میں دل کھول کر اسی انداز میں فاتحانہ قہقہہ لگائے جس طرح وہ اپنے کسی شکار کو دم توڑتے دیکھ کر لگاتا تھا لیکن وہ اس پر عمل نہ کر سکا۔ اندھیرے کی ایک دبیز چادر نے اسے اپنی لپیٹ میں لے کر پوری طرح دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا تھا۔

تین ساڑھے تین گھنٹے وہ اسی کیفیت سے دوچار رہا پھر اس نے ہوش آنے پر دوبارہ آہستہ آہستہ آنکھ کھولی تو خود کو ایک کچرا کنڈی کے غلیظ اور تعفن زدہ ڈھیر پر پڑا پایا۔ اس نے اپنے جسم پر نظر ڈالی جو بے لباس نظر آیا۔ وہ مادرزاد برہنہ حالت میں پڑا تھا، اس کا جوڑ جوڑ پھوڑے کے مانند دکھ رہا تھا۔ جسم پر نظر آنے والی موٹی موٹی خون کی بدھیاں اس بات کی ترجمانی کر رہی تھیں کہ اسے پوری طرح بڑے ظالمانہ انداز میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا پھر اس کے دشمن

If you want to download Urdu novels,Imran series, Monthly Digests,Shuaa,Kiran,Khwateen Digest,Suspense digest, Vist www.paksociety.com
if site is not opening send complaint at admin@paksociety.com
or at
0336-5557121

شاید اسے مردہ سمجھ کر اسے کچرا کنڈی پر آخری رسومات کے لیے کسی رفاہی ادارے کے رحم و کرم پر چھوڑ گئے تھے۔

اسے ابھی تک شبہ لاحق تھا کہ وہ زندہ بھی ہے یا مر چکا ہے؟ زخموں سے اٹھنے والی ٹیسیں اسے زندگی کا احساس دلا رہی تھیں لیکن درد کی شدت اور زخموں کی نوعیت یہ احساس بھی دلا رہی تھی کہ شاید اب وہ کچھ ہی گنی چنی سانسیں اور لے سکے گا۔ اس نے پوری قوت جمع کر کے کسی کو مدد کے لیے پکارنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز نقاہت کی وجہ سے اس کی اپنی قوت سماعت تک بھی بہ مشکل پہنچ سکی تھی۔ تعفن سے اس کا دم بری طرح گھٹ رہا تھا۔ اس نے زور لگا کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن کراہ کر رہ گیا پھر اچانک اسے کسی گاڑی کے قریب آ کر رکنے کی آواز سنائی دی، اس نے گردن گھما کر دوسری جانب دیکھنے کی کوشش کی لیکن اسی جدوجہد میں وہ دوبارہ بے ہوشی کی کیفیت سے دوچار ہو گیا۔ قریب سے ابھرنے والی آوازیں اس بے ہوشی کے بعد دور ہوتی چلی گئی تھیں۔

☆☆☆

لیاقت حسین بڑی مستعدی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔

پچھلی نشستوں پر سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم بیٹھے انگریزی میں بات چیت کر رہے تھے۔ لیاقت حسین نے اپنی والدہ کے کہنے پر پہلے قرآنی تعلیم حاصل کی تھی پھر اسے حفظ کے لیے دو سال لگانے پڑے۔ بعد میں اس نے ایک مڈل اسکول میں داخلہ لیا لیکن چھ جماعتوں سے آگے نہ پڑھ سکا، سرفراز خان جیسے مغرور سرمایہ دار کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اسے لیاقت کا غریب لڑکوں کے درمیان کلاس میں بیٹھنا پسند نہیں تھا چنانچہ والدین کے درمیان ہونے والی کشمکش دور کرنے کی خاطر اس نے ازخود چھٹی جماعت سے آگے پڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ راحیلہ بیگم اور سیٹھ عثمان کے درمیان ہونے والی باتیں اس کی سمجھ میں پوری طرح نہیں آ رہی تھیں لیکن جو تھوڑی بہت سدھ بدھ تھی اس سے وہ یہی نتیجہ اخذ کر سکا تھا کہ راحیلہ بیگم اس دعوت کے سلسلے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر رہی تھیں جبکہ سیٹھ عثمان اسے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ کبھی کبھی انسان کو مجبوراً حالات سے سمجھوتا بھی کرنا پڑتا ہے۔

لیاقت حسین نے بہت قریب سے اپنے مالکان کا مطالعہ کیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے، ان کے درمیان کبھی کسی جھگڑے یا فساد کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس کا اندازہ کچھ اس وقت بھی لیاقت حسین کو ہوا تھا جب دشمنوں نے سیٹھ عثمان کی گاڑی میں وحید ڈرائیور کو خرید کر ٹائم بم رکھوا دیا تھا۔ سراج کے مشورے کے بعد بھی سیٹھ عثمان بیرون ملک جانے کو تیار نہیں تھے لیکن راحیلہ بیگم کے اصرار پر وہ آمادہ ہو گئے تھے اور اب انہوں نے شیخ حامد کی دعوت بھی قبول کر لی جو لیاقت حسین کی نظروں میں بھی دشمن کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

ہفتے کی وجہ سے اس وقت رات کے گیارہ بجے بھی خاصا ٹریفک رواں دواں تھا۔

''لیاقت حسین......!'' اچانک سیٹھ عثمان نے دعوت کے موضوع پر بات ختم کرنے کی خاطر اسے مخاطب کیا۔ ''تم نے کھانا تو کھا لیا تھا؟''

''جی ہاں صاحب۔'' لیاقت حسین نے مختصراً جواب دیا۔ راحیلہ بیگم کی موجودگی میں وہ عموماً کم ہی بات کرتا تھا۔

''لیاقت......'' اس بار راحیلہ بیگم نے اسے مخاطب کیا۔ ''سنا ہے تم نے اپنی بیوی کو والدین کے پاس بھیج دیا ہے؟''

''سال بھر سے زیادہ ہو گیا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ وہ کچھ دنوں اپنے گھر والوں سے بھی مل آئے۔''

''کیا تمہارے گھر والے تمہیں یاد نہیں آتے......؟''

''یاد کیوں نہیں آتے لیکن میں بعد میں بھی چلا جاؤں گا۔'' لیاقت حسین نے دل گرفتہ انداز میں جواب دیا۔ اس نے ابھی تک کراچی میں کسی کو بھی اپنے باپ کی حیثیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

''سنا ہے تم جس جگہ رہتے ہو اسے چھوڑ کر دوسرے کسی مکان میں منتقل ہونا چاہتے ہو......؟'' سیٹھ عثمان نے سوال کیا تو لیاقت نے سکون کا سانس لیا۔

''جی صاحب......!''

''کوئی خاص وجہ؟''

''وہ جگہ تنگ پڑتی ہے صاحب اور قبرستان قریب ہونے کی وجہ سے میری گھر والی کو ڈر بھی لگتا ہے۔''

''تمہیں خوف نہیں محسوس ہوتا......؟'' راحیلہ بیگم نے پوچھا۔

''ڈر کس بات کا؟'' اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''میں نے قرآن حفظ کر رکھا ہے جی۔ تھوڑی حدیث بھی پڑھی ہے اس لیے خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ موت تو برحق ہے۔ وہی ابدی زندگی بھی ہے جہاں انسان کو مستقل رہنا ہے، دنیا تو مسافر خانہ ہے۔ ایک حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ دنیا میں یوں رہو جیسے کہ اجنبی یا راہ چلتا

مسافر......"

"سبحان اللہ۔" راحیلہ بیگم نے سراہتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ "تمہاری فرحین کب تک واپس آجائے گی؟"

"ابھی تو اسے گئے ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا۔ مہینا دو مہینے تو نکال کر آئے گی۔"

"تم ابھی کسی مکان کے سلسلے میں پریشان مت ہونا۔" سیٹھ عثمان نے بڑی اپنایت سے اسے مخاطب کیا۔ "میں اپنے برابر تعمیر شدہ بنگلے کو خریدنے کی بات کر رہا ہوں، دعا کرو کہ کامیاب ہو جاؤں۔ اس میں ایک دو کمروں کی انیکسی بھی ہے وہ تمہاری ضرورت کے لیے کافی ہوگی۔"

"آپ دوسرا بنگلا کیوں خرید رہے ہیں صاحب؟" لیاقت نے روانی میں پوچھ لیا پھر وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کے لیے تو ایک ہی بنگلا......"

"میں دوسرے بنگلے کو اپنا صدر دفتر بنانے کے بارے میں غور کر رہا ہوں۔"

اس کے بعد راحیلہ بیگم اور سیٹھ عثمان کے درمیان پھر انگریزی میں گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

لیاقت حسین اس وقت سیٹھ عثمان کے بنگلے کی طرف جانے والی کشادہ اور قدرے سنسان سڑک پر سفر کر رہا تھا، جب اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے ذہن پر ہلکی ہلکی غنودگی طاری ہو رہی ہو۔ اس کا خیال تھا کہ غالباً مرغن غذا کھانے کا نتیجہ ہے لیکن دوسرے ہی لمحے ایسا لگا جیسے اس کے ہاتھ پاؤں اور نظریں تو کام کر رہی تھیں۔ ذہن بالکل خالی اور معطل ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر ایک جانی پہچانی آواز اس کے ذہن میں گونجتی ہوئی ابھری جو اس کی اپنی آواز سے حیرت انگیز طور پر ملتی جلتی تھی۔ اس آواز نے لیاقت حسین کو مخاطب کیا۔

"تمہیں کھانے میں بیہوشی کی دوا دی گئی ہے۔ دشمن نے تمہیں سیٹھ عثمان اور اس کی بیوی کو حادثاتی موت سے دوچار کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ کچھ دیر میں ایک ٹرک تمہارے تعاقب میں آجائے گا۔"

"تم...... کون ہو؟" لیاقت حسین نے خواب بیداری کی کیفیت میں سوال کیا لیکن اس کی آواز خود اس کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی، وہ کسی روبوٹ کی طرح اسٹیئرنگ سنبھال رہا تھا۔

"میں...... تمہارا ہم زاد ہوں۔" وہی آواز اس کے وجود میں گونجتی ہوئی ابھری۔ "اللہ کے کسی برگزیدہ بندے نے مجھے تمہارا محافظ بنا دیا ہے۔ تمہیں کسی متوقع خطرے سے آگاہ کرنا، بچانا اور کسی کے ساتھ نیکی پر اکسانا میری ذمے داری ہے، تم نے کسی معذور کی جان بچانے کی خاطر جو قدم اٹھایا تھا وہ قابلِ تحسین ہی تھا۔ بعد میں تم کسی نامعلوم انسان کو گندے علم سے محفوظ کر کے تم نے اپنی جان کو ایسا روگ لگا لیا تھا جس کا توڑ سوائے خدا کے اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ تمہاری یہ انسان دوستی بارگاہ ایزدی میں پسند کی گئی۔ پھر اس قادر مطلق نے تمہیں نوازنے کے لیے اپنے ایک برگزیدہ بندے کو تمہارے لیے وسیلہ بنا دیا۔ تمہیں وہ سفید ریش نابینا یاد ہے؟ وہ بھی اللہ کا فرستادہ تھا جس نے دیوانے کی چھولداری تک پہنچنے میں تمہاری مدد کی تھی۔ یہ سب کچھ تمہارے لیے عطیۂ خداوندی ہے جو سب کو نصیب نہیں ہوتا...... اور...... جو راستے سے بھٹک جائیں تو بھی وہ صاحب اختیار ہے، تدبیر اور تقدیر کے کھیل میں چت پٹ کا خیال رکھنا ضروری ہے۔"

"اس وقت میں اپنے مالکوں کا تحفظ کس طرح کر سکتا ہوں؟"

"توبہ کر لو......" اسی آواز نے کہا۔ "موت اور زندگی بھی اسی کے اختیار میں ہیں۔ وہی ہوگا جو اسے منظور ہوگا لیکن بعد میں تمہیں کچھ یاد نہیں رہے گا۔ یاد آ بھی جائے تو اپنی زبان کو لگام دیے رکھنا۔ کچھ معاملات میں خداوند کریم نے بھی اپنے نیک بندوں پر شفقت فرماتے ہوئے بعض امور میں عمداً سکوت فرمایا ہے۔ ان کے متعلق حکم ہے کہ تم بھی مصلحتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے زبانوں کو قفل لگا دو۔ زبان کھل جائے تو انسان بڑے خسارے میں رہتا ہے۔ میری اس بات کو فراموش کرنے کی غلطی کبھی نہ کرنا ورنہ......"

کانوں میں گونجنے والی آواز معدوم ہو گئی۔ لیاقت حسین کے ذہن میں کلبلانے والے بہت سارے سوالات گھٹ کر رہ گئے۔ ذہن پر جیسے اچانک دھند کی دبیز چادر پھیل گئی ہو۔ اس نے پیش آنے والے متوقع خطرے سے سیٹھ عثمان کو آگاہ کرنا چاہا لیکن نہ وہ اپنی زبان کو متحرک کر سکا، نہ اشاروں کی زبان استعمال کرنے کی صلاحیت باقی رہ گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور نظریں مشینی انداز میں حرکت کر رہے تھے لیکن اس میں اس کے اپنے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ اس نے عقب نما آئینے پر نظر ڈالی لیکن کسی ٹرک کا کوئی نشان اسے دور دور تک نظر نہ آیا۔

"لیاقت حسین......" پشت سے سیٹھ عثمان کی آواز ابھری۔ "آگے سے گاڑی بائیں ہاتھ پر موڑ کر سپر اسٹور پر روک لینا، بیگم صاحبہ کو کچھ ضروری چیزیں لینی ہیں۔"

لیاقت حسین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے کچھ دیر آگے جانے کے بعد کار کو سپر اسٹور کی طرف موڑ دیا جہاں

اور بھی کچھ گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ گاڑی پارک کرنے کے بعد بھی وہ حسب معمول اپنی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا رہا، اس نے کوشش کی تھی کہ حسب معمول تیزی سے نیچے اتر کر پچھلا دروازہ کھولے لیکن وہ اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کر سکا۔

سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم اتر کر اسٹور کے اندر چلے گئے تو اس نے نہ چاہنے کے باوجود گاڑی کو پارکنگ کی جگہ سے نکالا اور کھلی سڑک پر ڈرائیو کرنے لگا، ایک منٹ بعد اس کی نظر اچانک عقبی شیشے کی طرف اٹھی، اس کا وجود سنسنانے لگا، پشت سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے سے ایک ٹرک اپنی رفتار بڑھاتا آگے آ رہا تھا۔

"امتحان کا وقت آ گیا لیاقت حسین۔" وہی سماعت آشنا آواز پھر اس کے کانوں میں گونجی۔ "ایک بار پھر ذہن نشین کر لو، موت اور زندگی اوپر والے کے ہاتھ میں ہے، اس کے راز کو کوئی اور نہیں پا سکتا...... ڈاکٹر اور حکیم صرف اپنے تجربات کی روشنی میں قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ ہوتا وہی ہے جو مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔ رفتار بڑھا لو۔"

لیاقت حسین کے پاؤں کا دباؤ ایکسی لریٹر پر بتدریج بڑھنے لگا، سڑک تقریباً سنسان ہی تھی۔ تعاقب میں آنے والے ٹرک نے اپنی رفتار طوفانی کر دی۔ لیاقت حسین کا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔ اس نے اپنی اسپیڈ اور بڑھانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ ٹرک ہر لمحہ قریب آتا جا رہا تھا...... قریب...... اور قریب پھر...... لیاقت حسین کا پورا وجود جیسے کسی بھونچال کی لپیٹ میں آ گیا ہو، ٹرک سے ٹکرانے کے بعد اس کی کار کسی کھلونے کے مانند فضا میں اچھلی۔ اس کا سر پوری شدت سے چھت سے ٹکرایا۔ اسے صرف اتنا ہی یاد رہا کہ کار دوبارہ سڑک پر واپس گری تھی لیکن اس کے بعد دوسری ٹکر پہلے سے زیادہ شدید تھی جس نے لیاقت حسین کے تمام حواس خمسہ کو پلک جھپکتے میں معطل کر دیا۔ ساری قوتیں گھپ اندھیروں میں مدغم ہو گئیں۔

☆☆☆

ساحل سمندر پر ہونے والے دھماکے میں کسی کی موت واقع نہیں ہوئی تھی۔ بم ڈسپوزل اسکواڈ کے عملے نے یہی رپورٹ دی تھی کہ تباہ ہونے والی گاڑی میں دیسی ساخت کا ٹائم بم پہلے سے فٹ تھا لیکن وہ ہائی روف کس نے خریدی تھی؟ وہ خود سامنے کیوں نہیں آ رہا تھا، یہ بات تفتیشی آفیسر کے لیے بھی کسی معمے سے کم نہیں تھی۔ گاڑی کے آس پاس سے کہیں کوئی لاش بھی برآمد نہیں ہوئی تھی۔ گاڑی کے انجن نمبر اور دیگر نمبروں کی روشنی میں سات آٹھ گھنٹوں کی دوڑ دھوپ کے بعد اس کے ڈیلر کا پتا چل گیا جہاں سے اسے خریدا گیا تھا لیکن وہاں سے بھی جو معلومات حاصل ہوئیں وہ بھی پولیس کے لیے حیران کن ہی تھیں، ڈیلر کے ریکارڈ کے مطابق وہ ہائی روف ایک رفاہی ادارے کے نام پر فروخت کی گئی تھی۔ خریدنے والے کے دستخط اور نام کی تصدیق کی خاطر پولیس جب اس رفاہی ادارے کے مالکان تک پہنچی تو وہاں سے یہی جواب ملا کہ پچھلے دس ماہ سے اس ادارے نے کوئی نئی ہائی روف نہیں خریدی تھی۔ نہ ہی وہ اس نام کے کسی آدمی سے واقف تھے جو پولیس کو ڈیلر نے فراہم کیا تھا۔ بعد میں ایکسائز کے رجسٹریشن کے ڈیپارٹمنٹ نے بھی یہی تحریری بیان دیا کہ اس انجن اور چیسس نمبر کی کوئی ہائی روف پچھلے پندرہ دنوں میں رجسٹریشن کے لیے نہیں آئی جبکہ ڈیلر کا ریکارڈ ظاہر کرتا تھا کہ اسے دھماکے سے صرف چوبیس گھنٹے پہلے فروخت کیا گیا تھا۔ رقم کی ادائیگی بھی کیش کی صورت میں کی گئی تھی، چنانچہ پولیس نے یہی خیال ظاہر کیا کہ اسے دہشت گردوں کی کسی تنظیم نے شہر میں کوئی واردات کرنے کے ادارے سے حاصل کیا ہوگا۔

سراج کے لیے اس ہائی روف سے اہم دھماکا افضل خان کی منظر عام پر واپسی تھی۔ وہ صبح آٹھ بجے سے اس اسپتال میں موجود تھا جہاں افضل خان کو انتہائی نگہداشت وارڈ کے ایک علیحدہ کمرے میں رکھا گیا تھا۔ سراج کو جو اطلاعات فراہم کی گئیں اس کے مطابق افضل خان کو برہنہ حالت میں کچرا کنڈی میں پڑے سب سے پہلے ایک نمازی نے مسجد سے آتے وقت دیکھا تھا۔ جس نے فوری طور پر ملحقہ تھانے کو اس کی اطلاع دی تھی۔ پھر ایک رفاہی ادارے کی ایمبولینس کے ذریعے زخمی کو اسپتال پہنچا دیا گیا جہاں اسے افضل خان کی حیثیت سے شناخت کرنے کے بعد سب سے پہلے سراج کو اطلاع دی گئی تھی۔ اسپتال کے متعلقہ ڈاکٹر بھی بڑی تندہی سے اس کو اٹینڈ کرنے لگے۔

اس وقت سراج اسی اسپتال کے متعلقہ وارڈ کے بڑے ڈاکٹر کے کمرے میں موجود تھا۔

"مریض کو جس تشدد سے دوچار کرنے کے بعد کچرا کنڈی پر پھینکا گیا، اس کے بعد اس کا زندہ بچ جانا بھی تعجب کی بات ہے۔" ڈاکٹر بے حد سنجیدگی سے سراج کو بتا رہا تھا۔ "مریض کی حالت خطرناک حد تک مخدوش ہے، ہم اپنی سی کوشش ضرور کر رہے ہیں لیکن اگر وہ اگلے چوبیس گھنٹوں کے بعد بھی پوری طرح ہوش میں نہ آیا تو کیس مایوس کن بھی ہو سکتا ہے۔"

"آئی سی، گویا فی الحال چوبیس گھنٹوں تک مریض کوئی

بیان دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوگا۔‘‘

’’یور آر رائٹ۔‘‘ ڈاکٹر نے کہا۔ ’’عام حالت میں بھی ہم اس قسم کے مریضوں کو زیادہ سے زیادہ ذہنی سکون پہنچانے والی ادویات دیتے ہیں تاکہ ان کا ذہن متاثر نہ ہوسکے، اس کے ساتھ زخموں کی مرہم پٹی بھی دیگر ضروری دواؤں کے ساتھ تسلسل سے جاری رہتی ہے۔‘‘

’’آپ کی رائے میں کیا مریض جانبر ہوسکے گا؟‘‘ سراج نے کسمسا کر دریافت کیا۔

’’ڈاکٹر کی حیثیت سے ہماری کوشش ہمیشہ یہی ہوتی ہے کہ مریض زندگی کی طرف لوٹ آئے لیکن......‘‘ ڈاکٹر نے شانے اچکا کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

سراج ڈاکٹر سے کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد باہر آگیا جہاں متعلقہ تھانے کا ایک سب انسپکٹر موجود تھا۔ سراج نے اس کو قریب بلا کر سنجیدگی سے پوچھا۔ ’’کیا آپ نے میری ہدایت کے مطابق سادہ لباس والوں کو مریض کی نگرانی پر مامور کردیا ہے؟‘‘

’’یس سر......‘‘ سب انسپکٹر نے جواب دیا۔ ’’ڈاکٹروں نے بھی یہی ہدایت جاری کی ہے کہ جب تک وہ اجازت نہ دیں کسی کو بھی مریض کے کمرے میں جانے کی اجازت نہ دی جائے لیکن اگر آن ڈیوٹی اسٹاف کے کسی فرد کو استعمال کیا گیا تو......‘‘

’’آپ جس شبہے کا اظہار کررہے ہیں وہ میں بھی سمجھ رہا ہوں لیکن اگر اغوا کرنے والوں کو مریض کو مارنا ہی مقصود تھا تو پھر اس کی موت کا انتظار کیے بغیر اسے آزاد بھی نہ کرتے۔‘‘

’’میں نے ایک امکانی خطرے کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی تھی سر......‘‘

سراج کوئی جواب دینا چاہتا تھا لیکن اسی وقت اس کی نظر شیخ حامد پر پڑی جو ایک سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس اور مسلح گارڈز کے ساتھ راہداری میں نظر آرہا تھا۔ اس کا رخ بھی بڑے ڈاکٹر کے کمرے کی طرف ہی تھا۔ چہرے پر ایسے تاثرات نظر آرہے تھے جیسے وہ بڑی مشکلوں سے اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش کررہا ہو۔ سراج بھی محتاط ہوگیا پھر ایس ایس پی اور شیخ حامد کے پیچھے پیچھے وہ بھی دوبارہ ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوا جو شیخ حامد کے احترام میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

’’افضل خان میرا دست راست ہے۔‘‘ شیخ حامد نے بغیر کسی تمہید کے اپنے غصے کا اظہار کیا۔ ’’میں ہر قیمت پر اسے زندہ دیکھنا پسند کروں گا۔ اس سلسلے میں اخراجات کی فکر نہ کرنا۔‘‘

’’ہماری کوشش بھی یہی ہوگی کہ مریض اپنے پیروں سے چلتا ہوا اسپتال سے رخصت ہو۔‘‘ ڈاکٹر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

’’دنیا کے کسی گوشے میں سے کسی ماہر کی ضرورت ہو تو اسے بلانے میں کوئی تاخیر نہ کرنا۔ یہ شیخ حامد کی عزت اور وقار کا معاملہ ہے۔‘‘

’’آپ مطمئن رہیں...... ہم کسی کوتاہی سے کام نہیں لیں گے۔‘‘

شیخ حامد بڑے ڈاکٹر کو ضروری ہدایت دینے کے بعد سراج کی طرف پلٹا، اس کے چہرے پر اس وقت بھی جلالی کیفیت طاری تھی۔ ’’مسٹر سراج...... وزیراعلیٰ نے اغوا کرنے والوں کو زندہ یا مردہ عوام کے سامنے لانے کی خاطر آپ کو صرف ایک ہفتے کی مہلت دی تھی۔ آپ کے پاس اب دو دن کی مہلت اور رہ گئی ہے۔‘‘

’’مجھے معلوم ہے......‘‘ سراج نے محتاط انداز میں جواب دیا۔ ایس ایس پی کی موجودگی میں وہ زیادہ باتیں کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔

’’کوئی معمولی سا کلیو بھی ہاتھ لگے تو آپ براہ راست مجھے بھی اطلاع دے سکتے ہیں۔ میں مجرموں کو منظر عام پر لانے کے سلسلے میں آپ سے ہر قسم کا تعاون کروں گا۔‘‘

شیخ حامد نے اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد رکنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ہونٹ چباتا ہوا پلٹ کر واپس جانے لگا، ایس ایس پی کے علاوہ اس کے ذاتی گارڈز بھی اس کے ساتھ ساتھ تھے۔

’’سر!‘‘ شیخ حامد اور ایس ایس پی کے جانے کے بعد سب انسپکٹر نے دبی زبان میں سراج کو مخاطب کیا۔ ’’جہاں ایک بڑے سرمایہ دار کی اتنی بالا دستی ہو وہاں قانون کی بھلا کیا حیثیت ہوگی؟‘‘

سراج نے اس کے چبھتے ہوئے طنز کو محسوس کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ’’نو کمنٹس لیکن ایک بات ضرور یاد رکھنا۔ اگر سامنے والا اتنا اناڑی ہو جسے بادشاہ اور غلام کے درمیان فرق نہ معلوم ہو تو اس کے ساتھ کھیلنے میں کوئی لطف بھی نہیں آتا۔‘‘

’’آپ مجھ سے زیادہ تجربہ کار ہیں سر...... لیکن کیا آپ بادشاہ اور غلام کی حیثیتوں کی تشریح نہیں کریں گے؟‘‘ سب انسپکٹر نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

’’تمہاری ترقی ابھی حال میں ہوئی ہے مائی فرینڈ......‘‘ سراج نے دوستانہ انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ’’وقت کے ساتھ تمہیں بھی اس بات کا تجربہ

ہوجائے گا۔ ہاتھی اور چیونٹی میں اگر ٹھن جائے تو کون کس کے حق میں زیادہ مہلک ثابت ہوتا ہے۔‘‘

’’آئی ایم سوری سر......‘‘ سب انسپکٹر نے سراج کو باقاعدہ سیلیوٹ کرتے ہوئے شرمندگی کا اظہار کیا۔ ’’میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔‘‘

’’اٹ از فائن۔‘‘ سراج دوبارہ مسکرا دیا۔ ’’خدا کا شکر ہے کہ ایک ادنیٰ سی مثال نے تمہیں جلد بازی میں کیے گئے فیصلے کا احساس دلا دیا۔ ایک بات کو پولیس کی ملازمت میں ہمیشہ یاد رکھنا۔ جلد بازی میں اٹھایا گیا کوئی قانونی قدم بھی عدالت میں اکثر کسی قابل وکیل کے تجزیوں اور چرب زبانی کے مقابلے میں بے وقعت ہوجاتا ہے۔ کسی پر جال پھینکنے سے پیشتر اگر ایک پولیس آفیسر اس کی طاقت اور جسامت کو نظر انداز کردے تو میں اس کو دانش مندی نہیں کہوں گا۔‘‘

’’میں آپ کی بات کی گہرائی کو سمجھ رہا ہوں جناب...... آئندہ اپنی عملی زندگی میں ان باتوں کا خاص خیال رکھوں گا۔‘‘

’’ایک بات اور ذہن نشین کرلو۔‘‘ سراج نے معنی خیز انداز اختیار کیا۔ ’’جب عہدے کو بالائے طاق رکھ کر دو پولیس آفیسروں کے درمیان بے تکلفی سے کوئی بات ہو تو اسے بھی ہمیشہ امانت سمجھ کر محفوظ رکھنا شرط ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہوگے۔‘‘

اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد سراج نے دورہ کر نگرانی پر مامور سادہ لباس والوں کا سرسری جائزہ لیا پھر علاقے کے انسپکٹر کو محتاط رہنے کی تاکید کرتا ہوا پارکنگ گیٹ میں آکر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا لیکن قبل اس کے کہ وہ گاڑی اسٹارٹ کرتا، اس کا ان رجسٹرڈ سم والا موبائل وائبریٹ کرنے لگا۔ سراج نے دائیں بائیں نظر ڈالی پھر الٹی جیب میں پڑا ہوا موبائل نکال کر کان سے لگا لیا۔ اس سم کے نمبر صرف دو چار افراد کو ہی معلوم تھے، اس کا خیال تھا کہ وہ کال سیٹھ عثمان یا ڈی آئی جی کرائم نے کی ہوگی لیکن دوسری جانب میڈم روبی کی مانوس آواز سن کر وہ چونکا۔ پھر اسے یاد آگیا کہ وہ نمبر اس نے میڈم کو بھی دیا تھا۔ اس بات کی تاکید بھی بطور خاص کی تھی کہ ان نمبروں کو بہت ہی اہم موقعوں پر استعمال کیا جائے۔ بہرحال وہ اس کال کو نظر انداز بھی نہیں کرسکتا تھا۔

’’سراج بول رہا ہوں۔‘‘ اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

’’آپ کو ناوقت فون کرنے کی معذرت چاہوں گی لیکن میں نے سنا ہے کہ شاید......‘‘

’’آپ نے ٹھیک سنا ہے۔‘‘ سراج نے نامکمل جملے کے باوجود میڈم کا مفہوم سمجھتے ہوئے کہا۔ ’’ڈاکٹروں نے ابھی تک اس کے بارے میں کوئی امید افزا بات نہیں کی۔‘‘

’’بڑا اگر مجھ بھی اس کو دیکھنے آیا تھا؟‘‘

’’کسی بھی بڑے کاروباری ادارے کا جی ایم، جسم میں ریڑھ کی ہڈی ہی کی طرح کاروباری معاملات میں بے حد اہمیت رکھتا ہے۔‘‘ سراج نے اس بار بھی گول مول جواب دیا۔

’’ساحل پر ہونے پر دھماکے کے بارے میں کوئی سراغ ملا؟‘‘ میڈم نے پوچھا۔

’’آپ اس وقت کہاں ہیں؟‘‘

’’اپنے بیڈروم میں......‘‘

’’میں کچھ دیر بعد آپ کو کال کرلوں گا۔ مصروفیت کی وجہ سے اس وقت معافی چاہتا ہوں۔‘‘ سراج نے جملہ مکمل کرکے موبائل دوبارہ جیب میں ڈالا، گاڑی اسٹارٹ کرکے اسے ریورس کیا پھر تیزی سے اسپتال سے نکل کر کھلی سڑک پر آگیا۔ اس کے ذہن میں اس وقت میڈم کا ساحلی علاقے پر ہونے والے دھماکے سے متعلق وہ سوال صدائے بازگشت بن کر گونج رہا تھا۔ خاصی دیر تک وہ اس سوال کے علاوہ ان باتوں پر بھی غور کرتا رہا جو اس کے اور میڈم کے درمیان ہوچکی تھیں۔ افضل خان جیسے شیطان کے ہاتھوں سے بچ نکلنے کے بعد خود میڈم کے ذہن میں بھی اپنے ممکنہ دشمنوں کے بارے میں بہت سارے سوالات ابھرے ہوں گے۔ یہ بھی سوچا ہوگا کہ پہلی بار اسے افضل خان کے اپارٹمنٹ سے رخصت ہوتے وقت ہی اغوا کی کوشش کیوں کی گئی؟ دو اور دو چار کرنے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی ہوگی لیکن ان تمام باتوں کا ساحلی علاقے پر ہونے والے دھماکے سے بھلا کیا تعلق ہوسکتا تھا؟ سراج سوچتا رہا، غور کرتا رہا۔ کئی امکانی پہلوؤں پر عقل کے گھوڑے دوڑاتا رہا پھر اس کے ذہن میں یقیناً کوئی ایسا خیال ابھرا تھا جو اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ بن کر پھیل گیا۔

آفس پہنچ کر سراج کچھ ضروری فائلیں دیکھنا چاہتا تھا لیکن فون کالز کے سلسلے نے اسے مجبور کردیا تھا کہ ریسیور اٹھا کر میز پر رکھ دے اور کچھ دیر سکون کا سانس لے سکے۔ اخباری رپورٹروں نے افضل خان کی بازیابی کے سلسلے میں الٹے سیدھے سوالات کرنا شروع کردیے تھے۔ ہرچند کہ سراج نے سب کو سختی سے ہدایت کردی تھی کہ افضل خان کے بارے میں اخبار والوں کو کوئی بھنک نہ ملے لیکن کسی نہ کسی ذریعے سے بات ان کے کانوں تک پہنچ گئی۔ سراج چونکہ اسی

کیس کا انکوائری آفیسر تھا اس لیے اخباری رپورٹر پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ رہے تھے۔

ریسیور ایک طرف رکھنے کے بعد اس نے سکون کے چند ہی لمحے گزارے تھے کہ آفس پر تعینات اس کے کانسٹیبل نے ایک چٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''سر...... اس نمبر سے آپ کو تین چار بار کال کیا گیا تھا۔ اسے آپ سے کوئی ضروری اور اہم بات کرنی تھی۔''

سراج نے اس نمبر کو غور سے دیکھا، یادداشت کو کریدنے کے باوجود وہ یہ نہ یاد کر سکا کہ وہ نمبر کس کا تھا، پھر اس نے میز پر ایک طرف رکھا ہوا ریسیور اٹھایا ہی تھا کہ کانسٹیبل نے کہا۔

''فون کرنے والے نے کہا تھا کہ وہ آپ کو ساڑھے گیارہ بجے دوبارہ کال کرے گا۔''

''پھر...... ان نمبروں کے لکھوانے کی کیا ضرورت تھی؟'' اس نے جھلا کر کانسٹیبل سے دریافت کیا۔

''میرے دریافت کرنے پر اس نے یہی نمبر لکھوائے تھے لیکن یہ بھی کہا تھا کہ کسی پبلک کال آفس کے نمبروں سے بات کر رہا ہے۔ آپ آئیں تو تاکید کی جائے کہ اس کے فون کا انتظار کریں۔'' کانسٹیبل نے وضاحت کی۔ ''اس کی گفتگو سے یہی لگ رہا تھا سر، کہ وہ آواز بنا کر بول رہا ہے ممکن ہے اس کو کوئی ضروری اور اہم بات آپ سے کرنی ہو۔''

سراج نے کانسٹیبل کو اشارے سے رخصت کیا پھر اس نے جھلا کر چٹ کو کئی ٹکڑوں میں منقسم کر کے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ ساڑھے گیارہ بجنے میں ابھی دس منٹ باقی تھے پھر بھی اس نے احتیاطاً ریسیور اٹھا کر واپس کریڈل پر رکھ دیا۔ ایک منٹ بعد ہی فون کی گھنٹی کی آواز ابھرنے لگی۔ اس نے فون کو جھلا کر دیکھا پھر ریسیور اٹھا کر مجبوراً کان سے لگا لیا۔

''سراج......'' اس نے حسبِ معمول مختصراً اپنا تعارف کرایا۔

''میں ہاٹ لائن نیوز کا نمائندہ بول رہا ہوں۔'' دوسری جانب سے تلخی سے کہا گیا۔ ''بہت دیر سے آپ سے کال ملانے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن آپ نے شاید اسے انگیج کر رکھا ہے۔''

''جی ہاں......'' سراج کا موڈ پھر آف ہو گیا۔ ''آپ حضرات جو رائے قائم کرلیں وہی درست ہوتی ہے۔ میں خود بھی حیران ہوں کہ فون انگیج رکھنے کے باوجود میں آپ کی کال کس طرح اٹینڈ کر رہا ہوں۔ اس حیرت انگیز اور ناقابل یقین حقیقت کا ذکر بھی اپنی اخباری رپورٹ میں ضرور شامل کر لیجیے گا۔ بڑی نوازش ہوگی۔''

''میں آپ کی الجھن سمجھ رہا ہوں مسٹر سراج۔'' اس بار قدرے شستہ لہجے میں کہا گیا۔ ''مجھے یقین ہے کہ دوسری نیوز ایجنسیاں بھی آپ کو مسٹر افضل خان کی بازیابی کے بارے میں فون کر رہی ہوں گی۔''

''آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟''

''صرف اتنا کہ اس کی بازیابی کس وقت...... کس طرح ہوئی اور بحیثیت انکوائری آفیسر آپ اس سلسلے میں کیا کہنا پسند کریں گے؟''

''محض دو بات......'' سراج نے تلملا کر کہا۔ ''بازیاب ہونے والا شخص بے ہوشی کی کیفیت سے دوچار ہے۔ ڈاکٹروں نے ابھی ہمیں اس سے اگلے چوبیس گھنٹوں تک دور رہنے کا مشورہ دیا ہے...... اور کچھ؟''

''اسے کس اسپتال میں رکھا گیا ہے اور اس کی بازیابی کس طرح ہوئی؟''

''سوری...... میں فی الحال ان دونوں سوالات کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' سراج نے جملے کے اختتام کے ساتھ ہی لائن منقطع کر دی۔ ساڑھے گیارہ بجنے کے انتظار کی مجبوری کے سبب اسے اسی قسم کی ایک دو کالیں اور بھی بھگتانی پڑیں۔ اس کے بعد ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے جو کال موصول ہوئی وہ کسی نیوز ایجنسی کی طرف سے نہیں تھی۔

''میں آپ کو وقفے وقفے سے تین بار پہلے بھی کال کر چکا ہوں۔'' سراج کے کال اٹینڈ کرنے پر دوسری جانب سے کہا گیا۔

''کس سلسلے میں؟'' سراج نے سنبھل کر محتاط انداز اختیار کیا۔ دوسری طرف سے بولنے والا اس وقت بھی آواز بنا کر گفتگو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''گودام نمبر تین۔ دو عورتیں!...... کیا اتنا حوالہ کافی نہ ہوگا؟''

''اوہ...... تو یہ تم ہو......؟'' سراج کے ذہن میں فرحین اور زرینہ کے اغوا کے بارے میں پورا منظر نامہ گھوم گیا۔

''جی ہاں...... آپ کا نادیدہ خادم......''

''خادم نہیں بلکہ محسن کہو تو زیادہ مناسب ہوگا۔'' سراج نے سنجیدگی سے اعتراف کیا۔ ''دنیا کی تمام پولیس اور سراغ رساں ایجنسیوں کی کامیابی کا راز کسی نہ کسی مخبر کی اطلاع ہی کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ جو افسران اس کا اعتراف نہیں کرتے وہ......''

''مخبر بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔'' دوسری جانب سے بات کاٹ کر کہا گیا۔ ''ایک وہ جسے کسی مخبری کے عوض دولت کا لالچ ہوتا ہے۔ دوسرا وہ جو اپنی زندگی کی بازی لگا کر پولیس کو سو فیصد مجرموں تک پہنچاتا ہے۔ اسے مال کے بجائے پولیس سے اپنی جان کا تحفظ درکار ہوتا ہے۔ آپ مجھے دوسری قسم کے مخبروں میں شمار کریں تو بہتر ہوگا۔ مال کی میرے پاس کوئی کمی نہیں ہے۔''

''کس قسم کا تحفظ یا ضمانت درکار ہے؟'' سراج نے دوستانہ انداز میں دریافت کیا۔

''صرف اس بات کی یقین دہانی کہ میں جو شرط رکھوں اس پر سختی سے عمل کیا جائے۔ میں آپ کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ یہ بھی کہ آپ نے وزیرِ اعلیٰ کانفرنس میں جس دلیری کا ثبوت دیا اس کے پشت پر کون سی طاقت تھی۔'' اس بار کھل کر کہا گیا۔ ''یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ آپ دو ہاتھ ہونے کے باوجود تین چار کشتیوں کا توازن سنبھالنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

سراج ایک لمحے کو چونکا پھر اس نے دبی زبان میں اس کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم کو میری زبان پر اعتماد ہو تو میں تمہیں ہر قسم کا تحفظ دینے کو تیار ہوں۔ ویسا ہی عمل ہوگا جیسا تم چاہو گے بشرطیکہ کام بہت زیادہ غیر قانونی بھی نہ ہو۔''

''میں آپ کے ٹائپ سے واقف ہوں اس لیے زبان پر بھی اعتبار کر سکتا ہوں۔'' دوسری جانب سے کہا گیا۔ ''ڈراما اسٹیج کرنے والے سامنے آکر جو ہمدردی کر رہے ہیں۔ وہ محض دکھاوا ہے، کوئی کردار اگر سرکاری غفلت کا شکار ہو کر اپنے انجام تک پہنچ جائے تو پھر اصل مجرم بھی شیر بن جاتا ہے۔''

''آئی۔ سی......'' سراج نے کچھ کچھ سمجھتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔ ''میں سمجھ رہا ہوں کہ ڈراما ڈائریکٹر کون ہے؟''

''دو کردار اور بھی قریب ہی موجود ہیں۔'' اس بار بھی بات گھما پھرا کر کہی گئی۔ ''وہ اگر روشنی میں آجائیں تو ڈراما کرنے والے بھی ہکا بکا رہ جائیں گے۔ زبانیں کھلوانا پھر آپ کے اختیار میں ہوگا۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ انہیں جو کام سونپا گیا ہے۔ اس کو پورا کرنے کے لیے ہائی الرٹ رہنے کا حکم دیا گیا ہے، صرف ایک مخصوص سگنل ملنے کے بعد وہ ساری رکاوٹیں ہونے کے باوجود موت اور زندگی کی بازی کھیلنے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔''

''میں دو کرداروں والی بات نہیں سمجھ سکا۔ کیا ہم کھل کر گفتگو نہیں کر سکتے؟'' سراج نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''ٹھیک ہے، آپ لائن بند ہونے کے بعد ریسیور الگ رکھ دیں، میں دس منٹ کے اندر اندر آپ کو دوبارہ کال کرتا ہوں۔''

سراج نے اس کی ہدایت کے مطابق ریسیور میز پر رکھ دیا لیکن وہ یہ بات نہیں سمجھ سکا تھا کہ جب فون انگیج ہوگا تو وہ فون کس طرح کرے گا؟ اس کا خیال تھا کہ شاید دس منٹ کا وقفہ کسی خاص وجہ سے رکھا گیا ہے۔ وہ ابھی اسی معمے کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کا ان رجسٹرڈ سم والا موبائل وائبریٹ کرنے لگا۔ اسکرین پر جو نمبر روشن ہوا وہ اس کے لیے بالکل نیا تھا پھر بھی اس نے کال اٹینڈ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

''ہیلو۔'' سراج نے اپنا نام لینے کے بجائے صرف ہیلو کہنے پر اکتفا کیا۔

''آپ کا خادم بول رہا ہوں۔'' اسی مخبر کی آواز ابھری جو دس منٹ پہلے اس کے آفس کے نمبروں پر بات کر رہا تھا۔

''تمہیں میرا یہ نمبر کہاں سے ملا؟'' سراج نے تعجب کا اظہار کیا۔

''یہ بات اتنی ضروری نہیں جتنا ان دو کرداروں کا مسئلہ اہم ہے۔'' دوسری طرف سے بات جاری رکھی گئی۔ ''وہ آپ کو اس وقت ہوٹل ذیشان کے کمرا ایک سو دو میں ملیں گے۔ ایک درمیانہ قد اور دوسرا بوٹے قد والا ہے۔ ان کو قابو کرنے میں کوئی اوچھا ہاتھ نہ ڈالیے گا...... وہ اپنی گرفتاری پر اپنی موت کو زیادہ ترجیح دیں گے، دونوں میک اپ میں ہیں۔''

''کون لوگ ہیں وہ؟'' سراج نے پوچھا۔ اتنی جلدی مجرموں کا سراغ ملنے سے اس کی رگوں میں دوڑتے خون کی گردش بھی تیز ہونے لگی۔

''بگ باس کے زرخرید شکاری کتے۔'' دوسری جانب سے نفرت کا اظہار کیا گیا۔ ''چار اشتہاری مجرموں کے قتل میں بھی ان دونوں کا ہاتھ شامل تھا، ان کے علاوہ دو اور بھی ہیں جن کی اطلاع میں بعد میں دوں گا۔ آپ کے علیم احمد صاحب کو بھی ان ہی کی تلاش ہے۔ مناسب یہی ہوگا کہ انہیں گرفتار کر کے افضل خان کے سلسلے میں کھنگالنے کے بعد علیم صاحب کے حوالے کر دیں...... ہو سکتا ہے کہ انہیں پولیس کسٹڈی میں بھی موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی جائے۔''

''تم نے کسی کو تحفظ دینے کی بات کی تھی؟'' سراج نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''ممکن ہے پولیس کے چھاپے کے وقت وہ بھی لپیٹ میں آجائے لیکن وہ جرم نہیں ہوگا۔'' دوسری جانب سے جواب ملا۔ ''اگر ایسا ہوا تو میں آپ کو آپ کا وعدہ بھی ضرور یاددلاؤں گا۔''

''میں بھی تمہیں ایک بار پھر یقین دلاتا ہوں کہ اپنے وعدے کو ہر قیمت پر نبھاؤں گا خواہ اس کے لیے کوئی بھی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔'' سراج نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ دوسری جانب سے کوئی جواب نہیں ملا بلکہ رابطہ ختم کردیا گیا۔

مخبر نے جو اطلاع دی تھی وہ اہم بھی تھی اور اس پر عمل کرنے کے لیے خاصی محنت بھی کرنی ضروری تھی، جو لوگ شیخ حامد کے اشارے پر چار اشتہاری مجرموں کو گولی مار کر عام شاہراہوں پر پھینکنے کی جرأت کرسکتے تھے۔ وہ اسی کے حکم پر پستول کی نالیں اپنی کنپٹیوں پر رکھ کر ٹریگر دبانے کا مظاہرہ کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ لاش ملنے کی صورت میں ان کی زبانوں کو بولنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایک ذرا سی غفلت سارے بنے بنائے کھیل کو تباہ کرنے کو کافی ہوتی۔

سراج کا ذہن بڑی تیزی سے ان دو مجرموں کو زندہ وسلامت گرفتار کرنے کے مختلف منصوبوں پر غور کرتا رہا۔ ان کی گرفتاری میں زیادہ نفری کی نہیں، زیادہ دوراندیشی اور حوصلے کی ضرورت تھی۔ بیس منٹ تک وہ کمانڈو ایکشن کے مختلف آزمودہ طریقوں پر غور کرتا رہا پھر...... کچھ سوچ کر اپنے سیکریٹ موبائل پر ڈی آئی جی کرائمز کے مخصوص نمبروں کو پنچ کرنے لگا۔

☆☆☆

دفتر سے اٹھنے کے بعد سراج نے گھر جاتے ہوئے ایک بار پھر اسپتال جاکے ڈاکٹر سے ملاقات کی۔ افضل خان بدستور بے ہوشی کی حالت سے دوچار تھا۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ صبح سے پیشتر وہ پولیس کو کوئی بیان دینے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہوگا۔ اسپتال میں تعینات سادہ لباس والوں کی طرف سے بھی اطمینان کرلینے کے بعد سراج نے دور ہی دور سے ایک سرسری نظر ہوٹل ذیشان پر بھی ڈالی جو اسپتال سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر شاپنگ سینٹر کے قریب مین روڈ پر ہی واقع تھا، مطلوبہ مجرموں کو زندہ گرفتار کرنے کے سلسلے میں ڈی آئی جی کرائمز نے بھی اس بات کی تائید کی تھی کہ اس مہم میں کم سے کم افراد شامل ہوں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ سراج نے خاصی تفصیل کے ساتھ پورا پلان ذہن میں مرتب کر رکھا تھا، اس وقت بھی وہ ذیشان ہوٹل کی لوکیشن دیکھنے کے بعد اپنے منصوبے کو انتہائی موثر طور پر عملی جامہ پہنانے کے بارے میں مختلف زاویوں سے دیکھ رہا تھا جب اس کے موبائل کی وائبریشن نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرلی۔ اسکرین پر میڈم کے نمبر دیکھ کر اس نے موبائل آن کرتے ہوئے کہا۔

''معذرت خواہ ہوں کہ مصروفیت کی وجہ سے آپ کو جوابی کال نہ کرسکا۔''

''حالات کے پیشِ نظر میرا ذاتی خیال بھی یہی تھا کہ آپ کو سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ہوگی...... جال میں آنے والا مگر مچھ کیا ابھی تک سانسیں لے رہا ہے؟''

''آپ نے صبح ساحلی علاقے پر ہونے والے دھماکے کے بارے میں دریافت کیا تھا۔'' سراج نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے۔ ہم پولیس والے عقل سے بالکل ہی پیدل ہوتے ہیں؟''

''میں سمجھی نہیں......'' دوسری طرف سے تعجب کا اظہار کیا گیا۔

''میں تاج محل ہوٹل والے سانحے کو درمیان میں نہیں لانا چاہتا، لیکن بہرحال، آپ کو اس بات کا اندازہ ضرور ہوگیا ہوگا کہ میں آپ کا دشمن نہیں ہوں۔'' سراج نے بدستور سنجیدگی سے بات جاری رکھی۔ ''ایک دوست کی حیثیت سے...... آف دی ریکارڈ...... میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ دشمن کے مقابلے کے لیے تیار رہنے کا اختیار دوسروں کی طرح آپ کو بھی ہے لیکن...... دھماکا خیز طریقہ کار سے گریز کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔''

''آپ نے دوست کہا ہے تو میں بھی آپ کے اندازے کی تردید نہیں کروں گی۔'' جواب میں میڈم نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''میرا مقصد صرف اپنے دشمن کو یہ باور کرانا تھا کہ میں اتنی کمزور بھی نہیں ہوں جتنا وہ سمجھ رہا ہے۔''

''اس کے باوجود میں آپ کو محتاط رہنے ہی کا مشورہ دوں گا؟''

''آپ نے کچھ دنوں پہلے مجھ سے کسی کا نام بتانے کا وعدہ کیا تھا۔'' دوسری جانب سے بے تکلفی کا اظہار کیا گیا۔ ''یاد ہے آپ کو......؟''

''کچھ دنوں اور انتظار کرلیں۔ موجودہ سچویشن سے نمٹ لوں تو پھر تفصیل سے بات ہوگی۔''

''ٹھیک ہے...... میں انتظار کرلوں گی لیکن اس وقت میں آپ سے ایک اہم بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''میرے لائق کوئی خدمت......؟''

''آپ نے مجھے زندہ رہنے کا جو موقع فراہم کیا تھا اس کے پیشِ نظر میں آپ پر اندھا اعتماد کرنے لگی ہوں۔'' میڈم نے بے حد سنجیدگی سے کھل کر بات کی۔ ''مجھے امید ہے کہ آپ...... آف دی ریکارڈ ہی سہی...... لیکن میرے اس اعتماد کو کبھی مجروح نہ ہونے دیں گے۔ ایک اور ایک مل کر گیارہ بھی ہوسکتے ہیں جس کے مقابلے میں......''

''میں آپ کا مقصد سمجھ رہا ہوں۔'' سراج نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ ''آپ نے جس اعتماد کا اظہار کیا ہے اس کے لیے شکرگزار ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کچھ کچرا ٹھکانے لگانے کی خاطر مجھے بھی آپ کا تعاون درکار ہو......''

''میں اسے اپنی خوش قسمتی ہی سمجھوں گی۔'' جواب میں خوشی کا اظہار کیا گیا۔

سراج نے گفتگو کو طول دینے کی کوشش نہیں کی۔ میڈم نے کچھ کچرا ٹھکانے لگانے میں تعاون والی بات پر جس خوشی کا اظہار کیا۔ وہ سراج کے اس اندازے کو تقویت دینے کے لیے کافی تھا کہ جن لوگوں نے ساحلی علاقے پر ایک نئی ہائی روف کو دھماکے سے اڑایا اور کسی کی نگاہوں میں آئے بغیر چھومنتر ہوگئے۔ وہ شریف لوگ بھی نہیں ہوں گے۔ میڈم نے شیخ حامد جیسے گرگ باراں دیدہ سے ٹکر لینے کا جو فیصلہ کیا تھا اس کے لیے کوئی ٹیم بھی ضرور تشکیل دی ہوگی جس میں جرائم کی دنیا سے تعلق رکھنے والے نامی گرامی اجرتی قاتل اور ایسے ہی جیالے قسم کے بدمعاش بھی شامل ہوں گے جن کے لیے موت کے منہ میں چھلانگ لگانا کسی تفریح سے کم نہیں ہوتا۔ ہوسکتا تھا کہ میڈم نے انڈر ورلڈ سے تعلق رکھنے والوں کی خدمات بھی خرید لی ہوں۔ جو سیر پر سواسیر ہونے کی اہلیت بھی رکھتے ہوں گے۔

سراج کا ذہن اسی نکتے پر غور کر رہا تھا جب اس کی نظر عقب نما آئینے کی طرف اٹھی۔ اس نے چونکنے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ وہ پہلے بھی اس بات کو نوٹ کرچکا تھا کہ چیف منسٹر کانفرنس کے بعد سے اس کو برابر واچ کیا جارہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مخصوص مسکراہٹ ابھری...... وہ ایک ایماندار پولیس آفیسر تھا جسے اس قسم کے بچکانا ہتھکنڈوں سے مرعوب نہیں کیا جاسکتا تھا۔

☆☆☆

سپر اسٹور میں داخل ہونے کے بعد سیٹھ عثمان نے راحیلہ بیگم سے کہا تھا۔ ''آپ کو اس وقت کون سی خاص چیز یاد آگئی جو صبح نہیں لی جاسکتی تھی؟''

''کیا مطلب......؟'' راحیلہ بیگم نے حیرت سے جواب دیا۔ ''میں تو سمجھی تھی کہ شاید آپ کو کچھ لینا ہے اس لیے آپ نے گاڑی ادھر مڑوالی ہے۔''

سیٹھ عثمان نے جواب دینے کے بجائے اپنے ذہن پر زور دیا لیکن انہیں کچھ یاد نہیں آیا۔ ایک ثانیے کے لیے راحیلہ بیگم کے جملے پر غور کرتے رہے پھر کچھ کہے بغیر تیزی سے باہر کی جانب لپکے، انہیں سراج کی کہی ہوئی کچھ باتیں یاد آگئیں۔ سراج نے انہیں مختصر طور پر یہی بتایا تھا کہ کوئی روحانی قوت ہے جو لیاقت حسین کی مدد کرتی ہے۔ لیاقت حسین اس کی ہدایت کے مطابق عمل کرگزرتا ہے لیکن بعد میں اسے کچھ یاد نہیں رہتا۔ اس حوالے سے اس کو سراج نے میڈم روبی کے اغوا کی کچھ تفصیل کے علاوہ فرحین اور زرینہ کے اغوا اور بازیابی کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ ساتھ ہی یہ تاکید بھی کی تھی کہ اس سلسلے میں لیاقت حسین کو نہ کریدا جائے۔ لیاقت کے مکان تبدیل کرنے والی بات بھی سیٹھ عثمان کو سراج کے ذریعے ہی معلوم ہوئی تھی اسی لیے انہوں نے لیاقت حسین کو اپنے لیے بے حد کارآمد سمجھتے ہوئے نیا بنگلا خریدنے اور اس کی ٹیکسی والی بات بھی اس کے کان میں ڈال دی تھی۔

اسی وقت وہی باتیں سیٹھ عثمان کو پریشان کر رہی تھیں، راحیلہ بیگم نے سپر اسٹور کے اندر جو بات کی تھی، اس نے سیٹھ عثمان کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا، انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ انہوں نے گاڑی اسٹور کی جانب موڑنے کی بات نہیں کی تھی، سراج کی باتوں کی روشنی میں ان کے دل میں فوری طور پر یہی گمان ہوا تھا کہ ممکن ہے کسی روحانی طاقت نے کسی قسم کا خطرہ محسوس کرکے لیاقت حسین کو اس سے آگاہ کردیا ہو اور لیاقت نے اپنے ساتھ ساتھ راحیلہ بیگم اور سیٹھ عثمان کو بھی خطرے میں محسوس کرکے انہیں سپر اسٹور پر اتار دیا ہو...... لیکن راحیلہ بیگم نے کس کی آواز سنی تھی جس پر انہیں سیٹھ عثمان کی آواز کا گمان ہوا تھا؟ یہ بھی ایک معما تھا۔

سپر اسٹور کے باہر گاڑی کے علاوہ لیاقت حسین بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ سیٹھ عثمان کو اس بات کا خیال بھی پریشان کر رہا تھا کہ وہ اس وقت محض لحاظ ومروت کی بنا پر شیخ حامد جیسے دوست نما دشمن کے گھر سے ڈنر کرکے واپس لوٹ رہے تھے۔ ممکن ہے شیخ حامد نے ان دونوں کو راستے سے ہٹانے کی خاطر کوئی خطرناک پلان بنایا ہو جس کا علم لیاقت حسین کو ہوگیا ہو اور وہ......

''کیا بات ہے؟ آپ اس وقت جلدی میں باہر کیوں آگئے؟'' راحیلہ بیگم نے قریب آکر تعجب سے سوال کیا۔

"وہ...... لیاقت حسین اور گاڑی...... دونوں نظر نہیں آ رہے؟"

"اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟" راحیلہ بیگم نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔ "ہوسکتا ہے وہ پیٹرول لینے یا ٹائر میں ہوا بھروانے چلا گیا ہو۔ ڈونٹ وری...... آجائے گا تھوڑی دیر میں......"

"میرا خیال ہے کہ میں نے سراج سے شیخ حامد کے ڈنر والی بات چھپا کر اچھا نہیں کیا؟" سیٹھ عثمان کے چہرے پر گہری سنجیدگی مسلط تھی۔

"کیا بات ہے عثمان......؟" راحیلہ بیگم نے شوہر کو بہت غور سے دیکھا۔ "آپ کس وہم میں مبتلا ہوگئے ہیں؟"

"سراج نے واپسی کے بعد ائرپورٹ پر بھی یہی کہا تھا کہ ہمیں ایک ایک قدم پھونک کر اٹھانا ہوگا۔"

"میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ اس ڈنر کے بارے میں سراج کو اطلاع دینی ضروری ہے لیکن آپ مروت میں دعوت قبول کرتے وقت یہ بھی فراموش کر بیٹھے کہ گاڑی میں بم والی بات کے بعد سراج ہی نے ہمیں دو مہینے باہر جاکر گزارنے کا مشورہ دیا تھا۔"

"میں کاروباری معاملات میں پولیس کو بار بار درمیان میں لانا مناسب نہیں سمجھتا۔" سیٹھ عثمان نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ "شیخ حامد بھی ضرور جانتا ہوگا کہ سراج میرا نہ صرف کلاس فیلو رہ چکا ہے بلکہ ہمارے لیے کسی فیملی ممبر سے بھی کم نہیں ہے۔ مجھے سراج کی پوزیشن کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ہر بات میں اسے ملوث کر کے میں اسے کسی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا۔"

"آپ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔" راحیلہ بیگم نے شوہر کی بات تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن...... شیخ حامد کی ڈنر والی بات سراج کے علم میں کسی نہ کسی ذریعے سے ضرور آئے گی۔ اس وقت وہ ہم سے شکوہ کرنے میں حق بجانب ہوگا۔"

"میں اس وقت سراج کے بجائے صرف لیاقت حسین کے بارے میں پریشان ہوں۔"

"پریشان ہوں...... سے آپ کی کیا مراد ہے؟" راحیلہ بیگم نے شوہر کے چہرے پر طاری الجھن کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔ "کم آن عثمان، مجھے بتائیں کہ آپ کس فکر میں مبتلا ہیں؟"

سیٹھ عثمان عجیب شش و پنج میں مبتلا تھے۔ ایک طرف راحیلہ بیگم کی تشویش تھی، دوسری جانب لیاقت حسین کا خیال۔ وہ بیوی کو مطمئن کرنے کی خاطر کوئی مناسب جواب دینا چاہتے تھے کہ اچانک ایک پولیس پیٹرولنگ ڈیوٹی کی جیپ ان کے قریب آکر تیزی سے رکی، ایک اے ایس آئی نے بڑی عجلت میں ان کے قریب آ کر دریافت کیا۔

"آپ کس کا انتظار کر رہے ہیں......؟"

"کیا مطلب......؟" سیٹھ عثمان کی کشادہ پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ "کیا کسی کا انتظار کرنا بھی پولیس کی نظروں میں......"

"پلیز......" اے ایس آئی نے ان کا جملہ کاٹ کر پوچھا۔ "کیا آپ سیٹھ عثمان ہیں؟"

"جج...... جی ہاں۔" سیٹھ عثمان نے اس کے چہرے پر طاری کسی سنگین تشویش کو محسوس کرتے ہوئے اس بار قدرے بے چینی سے کہا۔ "کیا بات ہے...... آپ کو میری تلاش......"

"سر...... وہ، وہ آپ کی کار یہاں سے دو تین فرلانگ کے فاصلے پر کسی حادثے سے دوچار ہو کر خطرناک حد تک ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی ہے۔"

"میرے ڈرائیور کا کیا بنا......؟" سیٹھ عثمان نے دھڑکتے ہوئے دل سے سوال کیا۔

"وہ زخمی ہوا ہے...... معجزانہ طور پر اتنے بڑے ایکسیڈنٹ سے دوچار ہو کر زندہ بچ جانا کرشمہ ہی کہا جاسکتا ہے۔" اے ایس آئی نے کہا۔ "بہرحال، ہم نے فوری طور پر ایک رفاہی ادارے کی ایمبولینس بلوا کر زخمی کو اسپتال بھیج دیا ہے۔ ہمارا ایک سپاہی بھی اس کے ساتھ ہے۔ ڈرائیور ہوش میں تھا اور اس ہی نے ہمیں بتایا کہ وہ آپ لوگوں کو یہاں چھوڑ کر جا رہا تھا۔"

"ایکسیڈنٹ کی نوعیت کیا تھی......؟" سیٹھ عثمان نے بے چینی سے پوچھا۔

"ابھی کچھ یقین سے نہیں کہا جاسکتا لیکن...... اندازہ یہی ہے کہ کسی ہیوی ڈیوٹی ٹرک نے پشت سے ٹکر ماری ہوگی، ممکن ہے اس کے بریک بروقت کام نہ کرسکیں ہوں...... اس نے بعد میں بھی رکنے کی کوشش نہیں کی۔" اے ایس آئی تفصیل دہراتا رہا۔ "یہ بھی غنیمت ہوا کہ آپ کی کار غالباً اچھلنے کے بعد ڈرائیور کے برابر والی سیٹ کے رخ گری ورنہ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔"

"کیا ایکسیڈنٹ کے بعد ڈرائیور بھی ہوش میں تھا؟" راحیلہ بیگم نے سوال کیا۔

"جی ہاں...... اتنے شدید ایکسیڈنٹ کے بعد انسان کا ہوش بحال رکھنا آسان نہیں ہوتا لیکن اللہ نے بڑا کرم کیا۔

میں نے پوری طرح اطمینان کرنے کے بعد ہی اسے اسپتال روانہ کیا ہے۔ دوسری شکل میں ہمیں آن دی اسپاٹ ہی پوری قانونی کارروائی......"

"اس ٹرک کے بارے میں کوئی معلومات ہوئی......؟" سیٹھ عثمان نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"جی نہیں...... جائے حادثہ کے آس پاس کوئی بھی موجود نہیں تھا۔" اے ایس آئی نے جواب دیا۔ "کمرشل ایریا ہونے کے سبب دکانیں بھی بند ہوچکی تھیں ورنہ کوئی عینی شاہد بھی مل جاتا۔"

سیٹھ عثمان نے اس کا جواب سننے کے بعد سب سے پہلے فون کر کے اپنی دوسری گاڑی طلب کی پھر سراج کے نمبر ملانے لگا۔ "سوری......" دوسری طرف سے سراج ہی نے کال ریسیو کرنے کے بعد بے تکلفی سے کہا۔ "سارے دن کی ڈیوٹی کرنے کے بعد اس وقت کمر سیدھی کرنے لیٹا ہوں۔"

"تمہیں ایک اہم اطلاع دینی تھی......" سیٹھ عثمان نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں اس وقت گھر کے قریب والے سپر اسٹور کے باہر سے بول رہا ہوں۔ راحیلہ بھی میرے ساتھ ہے۔"

"خیریت......؟" اس بار سراج نے سنجیدگی اختیار کرلی۔ "تم آواز سے ہی کچھ اپ سیٹ لگ رہے ہو، کیا بات ہے؟"

"ہماری کار کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے...... لیاقت حسین کو پولیس پیٹرولنگ جیپ پر تعینات ایک اے ایس آئی نے اسپتال روانہ کردیا ہے۔"

"کیا ایکسیڈنٹ کے وقت تم دونوں گاڑی میں نہیں تھے؟" سراج نے گھبرا کر سوال کیا۔

"نہیں......"

"پیٹرولنگ جیپ کہاں ہے......؟" سراج نے بڑی سنجیدگی سے سوال کیا۔

"جیپ اور ایک اے ایس آئی دونوں موجود ہیں۔ تم بات کرلو۔"

سیٹھ عثمان نے موبائل اے ایس آئی کی طرف بڑھا دیا جس نے سراج کو پہچان کر صرف وہ روداد بیان کی جو سنسان سڑک پر اس کے مشاہدے میں آئی تھی۔ اس کے بعد اس نے یس سر کہہ کر موبائل دوبارہ سیٹھ عثمان کی جانب بڑھا دیا۔

"تم اس وقت کہاں سے آ رہے تھے؟" سراج نے اس بار بے حد سنجیدگی سے سوال کیا۔

"میں فوری طور پر راحیلہ کو بنگلے پر ڈراپ کرنے کے بعد اسپتال پہنچ رہا ہوں، تم بھی ادھر ہی آجاؤ......" سیٹھ عثمان نے...... سوال کا جواب دینے کے بجائے صرف اتنا کہا اور موبائل آف کر کے جیب میں رکھ لیا۔

پولیس جیپ جانے کے بعد راحیلہ بیگم نے شوہر کو فکرمندی سے دیکھا۔ اسی وقت دوسری گاڑی آگئی اس لیے سیٹھ عثمان نے بغیر کسی ردعمل راحیلہ بیگم کے لیے دروازہ کھولا۔ پھر دوسری جانب سے آکر بڑی عجلت میں خود بھی بیٹھ گئے۔

"اپنی گاڑی کا کیا ہوا سر؟" دوسری گاڑی کے ڈرائیور نے سوال کیا۔

"اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔" سیٹھ عثمان نے مختصراً جواب دیا۔ "بیگم صاحبہ کو گھر اتارنے کے بعد ہمیں ریڈ کراس اسپتال چلنا ہے۔"

"لیاقت حسین تو خیریت سے ہے؟"

"ہاں......" سیٹھ عثمان نے کہا پھر ان کے ذہن میں وہی باتیں گونجنے لگیں جو سراج نے لیاقت حسین کے بارے میں کسی روحانی قوت کے حوالے سے گوش گزار کی تھیں۔ اس کے علاوہ پولیس کے آن راؤنڈ ایس اے آئی کے بیان کی روشنی میں وہ اس فرار ہوجانے والے ہیوی ڈیوٹی ٹرک کے بارے میں بھی غور کر رہے تھے جو موقع واردات سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ کوئی بات تھی جس کی بنا پر انہیں اے ایس آئی کا خیال ہضم نہیں ہو رہا تھا کہ ایکسیڈنٹ کا اصل سبب اس کے بریک فیل ہوجانا تھا۔ ایسی صورت میں ٹرک ڈرائیور ہارن دے کر لیاقت حسین کو بھی کسی متوقع خطرے سے آگاہ کرسکتا تھا۔ وہ سڑک بھی اتنی کشادہ تھی کہ اس پر بیک وقت تین ٹرک بھی ایک ساتھ گزر سکتے تھے۔

سیٹھ عثمان کے ذہن میں راحیلہ بیگم کو گھر ڈراپ کر کے اسپتال جاتے وقت بھی ایک خیال بار بار ابھر رہا تھا۔ وہ ایکسیڈنٹ جان بوجھ کر کیا گیا تھا...... اس کی پشت پر کس کا ہاتھ تھا...... اور...... لیاقت حسین کو اس کی اطلاع کس طرح ہوگئی جو وہ دونوں کو سپر اسٹور پر چھوڑنے کے بعد آگے جانے پر مجبور ہوگیا...... چاہتا تو خود بھی اپنی جان بچانے کی خاطر کار سے باہر آجاتا...... لیکن اس نے ایسا نہیں کیا...... اس کی کیا وجہ تھی......؟

☆☆☆

سیٹھ عثمان کے اسپتال پہنچنے کے دس منٹ بعد سراج بھی آگیا۔ اس کے چہرے سے شدید تھکن کے اثرات مترشح تھے۔ رسمی گفتگو کے بعد اس نے سب سے پہلے لیاقت حسین

کی خیریت دریافت کی۔

”ڈاکٹروں نے بھی اس حادثے پر حیرت کا اظہار کیا ہے۔“ سیٹھ عثمان نے کہا۔ ”لیاقت حسین کے جسم پر معمولی چوٹیں آئی ہیں لیکن ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ اندرونی چوٹوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا اندازہ چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد ہی ممکن ہے۔“

”لیاقت سے تمہاری کوئی بات ہوئی......؟“

”نہیں۔ ڈاکٹروں نے اسے سکون آور گولیاں دی ہیں۔ میری ہدایت کے بعد اب وہ اسے پرائیویٹ وارڈ میں منتقل کررہے ہیں۔“

”تمہاری گفتگو کا انداز بتارہا تھا کہ تم کچھ زیادہ ہی نروس ہو؟“ سراج نے اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھا۔ ”بھابی تو خیریت سے ہیں؟“

”ہاں۔“

”ون منٹ......“ سراج نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”موبائل سے ملنے والی اطلاع کے مطابق ایکسیڈنٹ سپر اسٹور سے ڈیڑھ دو فرلانگ دور ہوا تھا۔ لیاقت حسین تم لوگوں کو چھوڑ کر کہاں جارہا تھا؟“

”یہی سوال مجھے پریشان کررہا ہے۔“ سیٹھ عثمان نے پوری تفصیل دہراتے ہوئے کہا۔ ”راحیلہ کا کہنا ہے کہ میں نے لیاقت حسین کو سپر اسٹور جانے کو کہا تھا جبکہ مجھے ایسی کوئی بات یاد نہیں۔ اس کے بعد حالات کے پیشِ نظر جب مجھے تمہاری فراہم کردہ روحانی قوت والی معلومات کا خیال آیا تو میں فوری طور پر سپر اسٹور سے باہر آیا لیکن...... ہونے والی بات ہوچکی تھی۔“

”کیا مطلب......؟“ سراج نے وضاحت طلب انداز میں پوچھا۔ ”کیا تمہارا خیال ہے کہ لیاقت حسین نے کسی خطرے کو محسوس کرلیا تھا جو وہ تم دونوں کو ڈراپ کرکے آگے نکل گیا؟“

”سوری سراج......“ سیٹھ عثمان نے اسے شیخ حامد کی دعوت والی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”راحیلہ نے کہا بھی تھا کہ مجھے اس کی اطلاع سب سے پہلے تمہیں دینی چاہیے تھی لیکن......“

”ڈونٹ وری...... میں سمجھتا ہوں کہ کبھی کبھی انسان مروت میں بھی اس قسم کی دعوتوں کو قبول کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔“ سراج نے سیٹھ عثمان کی مشکل آسان کرنے کی خاطر اس سے کسی قسم کی باز پرس کرنے سے گریز کیا پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔ ”شبے کے طور پر ذہن میں سب سے پہلے اسی مگرمچھ کا نام ابھرتا ہے لیکن حادثے میں استعمال ہونے والا ٹرک جب تک سامنے نہیں آتا، ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔“

”مجھے تو اس بات پر غصہ آرہا ہے کہ لیاقت کو سپر اسٹور سے دور جانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ اگر کچھ محسوس کرچکا تھا تو ہمیں بھی......“

”تم بھول رہے ہو......“ سراج نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”سکون آور دواؤں کے اثر سے باہر آنے کے بعد لیاقت حسین کو شاید خود بھی یاد نہ ہوگا کہ اس نے کیا خطرہ محسوس کیا تھا۔ یاد آ گیا تب بھی وہ زبان نہیں کھولے گا۔ پہلے بھی دو تین موقعوں پر میں اس کا مشاہدہ ذاتی طور پر کرچکا ہوں۔“

اسی وقت اسپتال کے ایک وارڈ بوائے نے آکر اطلاع دی کہ مریض کو پرائیویٹ وارڈ میں منتقل کردیا گیا ہے۔

”تمہارا کیا خیال ہے......“ سیٹھ عثمان نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ”کیا شیخ حامد ایسی حماقت کرسکتا ہے کہ دعوت کے فوراً ہی بعد کسی خطرناک منصوبے پر عمل بھی کر بیٹھے؟“

”سوچنا ہوگا......“ سراج نے کہا پھر وہ دونوں اس کمرے میں آگئے جہاں لیاقت حسین کو منتقل کیا گیا تھا۔ جو ڈاکٹر اسے اٹینڈ کررہا تھا وہ بھی اس وقت ایک نرس کے ساتھ موجود تھا۔

”آپ کا کیا خیال ہے...... مریض کو کب تک ہوش آجائے گا؟“ سراج نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن ڈیڑھ دو گھنٹے ضرور لگیں گے۔“

”آپ نے مریض کا مکمل چیک اپ تو کرلیا ہے ناں؟“ سیٹھ عثمان نے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے کہ کہیں کسی جوڑ وغیرہ کو تو کوئی......“

”ڈونٹ وری...... میں ہر طرح سے اپنا اطمینان جدید مشینوں کے ذریعے کرچکا ہوں۔“

ڈاکٹر ایمرجنسی کال پر ایک اور مریض کو دیکھنے چلا گیا تو سراج نے کچھ سوچتے ہوئے سیٹھ عثمان سے کہا۔

”کوشش کرنا کہ شیخ حامد اور اس کی دعوت کا کوئی ذکر درمیان میں نہ آنے پائے......“

سیٹھ عثمان نے اثبات میں سر کو خفیف سی جنبش دی۔ اسی لمحے سراج کا موبائل جاگ اٹھا، اسکرین پر راحیلہ بیگم کے نمبر دیکھ کر وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

”مجھے یقین تھا کہ آپ صرف قابل اعتماد آدمی ہی سے تفصیل معلوم کریں گی۔“

”لیاقت حسین تو خیریت سے ہے؟“ راحیلہ بیگم نے چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد اپنے جاں نثار ڈرائیور کی خیریت دریافت کی۔

”قدرت نے اسے بچالیا لیکن اس کی تمام تر ذے داری جس مشکوک شخص پر عائد کی جاسکتی تھی وہ بھی میری نظروں میں آگیا۔“ سراج نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔

”گڈ......“ دوسری جانب سے خوشی کا اظہار کیا۔ ”کون ہے وہ......؟“

”وہی جسے آپ نے ضرورت سے زیادہ ڈھیل دے رکھی ہے۔“ سراج نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ کے مشورے سے اتفاق نہ کرکے اس نے یقیناً ایسی غفلت برتی ہے جس کی سزا ابھی اب آپ کو ہی دینی ہوگی۔“

”خدا آپ کو اور ہماری الماس کو خوش رکھے۔“ راحیلہ بیگم نے کہا۔ ”ویسے آپ کی نظروں میں کون ہوسکتا ہے وہ......؟“

”ملاقات ہونے پر اطمینان سے بات ہوگی۔“ سراج نے جملہ مکمل ہوتے ہی موبائل آف کردیا۔ میڈم روبی کو خلافِ توقع کمرے میں آتا دیکھ کر اسے تعجب ہی ہوا تھا۔

”آپ؟...... اس وقت اور یہاں......؟“ سراج نے اس کے قریب آنے پر حیرت کا اظہار کیا۔

میڈم نے سراج کو جواب دینے کے بجائے سیٹھ عثمان سے اپنا تعارف کرایا۔ ”میں مرحوم خالد ریاض کی بیوہ ہوں۔“

”خوشی ہوئی آپ سے مل کر......“ سیٹھ عثمان نے گرمجوشی کا مظاہرہ کیا۔ ”خدا غریق رحمت کرے، آپ کے شوہر سے میری کافی ملاقاتیں رہتی تھیں لیکن آپ......“

”میں اس زمانے میں پردے کی عادی تھی......“ میڈم نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”ویسے آپ کا نام بہت سن رکھا ہے۔“

”کبھی غریب خانے پر تشریف لائیے۔“ سیٹھ عثمان نے خوش اخلاقی سے دعوت دی۔ ”مجھے خوشی ہوگی۔“

”ضرور آؤں گی......“

”اس وقت آپ کا یہاں کیسے آنا ہوا......؟“ سراج نے دریافت کیا۔

”میرے ایک محسن کو کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔ اسے دیکھنے چلی آئی۔“ میڈم کا لہجہ معنی خیز تھا، سراج کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ میڈم کا اشارہ لیاقت حسین کی طرف تھا۔

”آپ کو کس طرح پتا چلا......؟“ سراج نے تعجب کا اظہار کیا۔

”ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے، بشرطیکہ لگن سچی ہو۔“ میڈم نے بستر پر پڑے لیاقت حسین کو بڑی عقیدت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا پھر سیٹھ عثمان سے حادثے کی نوعیت کے بارے میں دریافت کرنے لگی۔

سراج کے ذہن میں کئی خیالات ابھر کر گڈمڈ ہونے لگے۔ اس نے سوچا۔ ”اگر لیاقت حسین کو پیش آنے والے حادثے میں شیخ حامد کا ہاتھ شامل تھا تو اس کے کچھ لوگ اس وقت بھی کہیں آس پاس ضرور منڈلا رہے ہوں گے۔ اس صورت میں سیٹھ عثمان کی موجودگی زیادہ تشویش طلب نہیں تھی۔ بگ باس کو بھی علم تھا کہ وہ اور عثمان کلاس فیلو رہ چکے ہیں مگر میڈم روبی نے سامنے آکر تکون کی شکل اختیار کرلی تھی۔ شیخ حامد ان تینوں کی ایک جگہ موجودگی کو کئی زاویوں سے دیکھ سکتا تھا۔ جو لوگ چیف منسٹر کانفرنس کے بعد سے سراج کے شب و روز کی موومنٹ واچ کرنے پر مامور تھے وہ بھی کہیں آس پاس ہی منڈلا رہے ہوں گے۔“

”کیا بات ہے سراج؟“ سیٹھ عثمان نے دریافت کیا۔ ”تم کہاں کھوگئے......؟“

”ایک ضروری کام یاد آگیا ہے......“ سراج نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہوسکتا ہے میں کل بھی تم سے ملاقات نہ کرسکوں۔ تم لیاقت حسین کا خیال رکھنا۔ میں موبائل پر خیریت دریافت کرتا رہوں گا۔“

”اتنی رات گئے بھی آپ لوگوں کو سکون نہیں ملتا......؟“ میڈم نے سراج سے ہمدردی کا اظہار کیا۔

”پولیس کی ملازمت میں آرام اور سکون کی بات وہ کرتے ہیں جنہیں اپنے فرائض کا احساس نہیں ہوتا۔“ سراج نے سنجیدگی سے جواب دیا پھر دیدہ و دانستہ میڈم سے رخصتی جملے کہے بغیر صرف سیٹھ عثمان سے ہاتھ ملا کر کمرے سے باہر آگیا۔ اس نے ممکنات کے طور پر کچھ پوشیدہ نظروں کو اس سے یہی تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ لیاقت حسین کے کمرے میں اس کی اور میڈم کی ملاقات محض اتفاقیہ تھی۔ باہر آکر اس نے راہداری میں ایک

If you want to download Urdu novels,Imran series, Monthly Digests,Shuaa,Kiran,Khwateen Digest,Suspense digest, Vist www.paksociety.com
if site is not opening send complaint at admin@paksociety.com
or at
0336-5557121

سرسری نظر ڈالی پھر پارکنگ لاٹ کی جانب قدم اٹھانے لگا۔ اس کے ذہن میں اس وقت پھر ذیشان ہوٹل اور اس کے کمرا نمبر ایک سو دو میں موجود ان دو افراد کا خیال گردش کرنے لگا جو مخبر کی اطلاع کے مطابق، اسٹینڈ بائی کی پوزیشن میں تھے۔ اوپر سے ایک گرین سگنل ملنے کے بعد وہ ہر قیمت پر افضل خان کو پولیس کسٹڈی کے باوجود موت کے گھاٹ تک پہنچانے کی کوشش ضرور کرتے...... اس خیال کے ساتھ ہی وہ اس منصوبے پر بھی دوبارہ غور کرنے لگا جو اس نے بہت غور و خوض کے بعد پلان کیا تھا۔

گھر جاتے وقت اس نے متعدد بار عقب نما آئینے پر نظر ڈالی لیکن غالباً اس وقت اس کا تعاقب نہیں کیا جا رہا تھا۔ سراج کو اس بات کا خدشہ ضرور لاحق ہو گیا تھا کہ اگر شیخ حامد کو کہیں اس کے اور میڈم روبی کے گٹھ جوڑ کی اطلاع مل گئی تو اس کے نتائج اچھے نہیں ہوں گے۔ اس کے پاس میڈم سے تعارف حاصل کرنے کا ایک جواز بہرحال محفوظ تھا۔ تاج محل ہوٹل کے معاملے کو میڈیا تک جانے سے روکنے میں اسی کی کوششوں کا دخل تھا۔ یہی ایک پلس پوائنٹ تھا جو وہ وقت ضرورت استعمال کر سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک سوال یہ بھی گونج رہا تھا کہ اگر میڈم، لیاقت حسین کے بارے میں پہلے سے واقف تھی تو پھر سراج سے اس ضمن میں کیوں اصرار کرتی رہی تھی؟

سراج نے گھر پہنچ کر گاڑی گیراج کے بجائے پورٹیکو ہی میں چھوڑی اور اندر جا کر لباس تبدیل کیے بغیر ہی بستر پر الماس کے برابر لیٹ گیا۔ اسے علم تھا کہ اگلا دن اس کے لیے کس قدر اہم اور ہنگامہ خیز ثابت ہوگا۔ اس کا خیال تھا کہ الماس سو چکی ہوگی لیکن وہ جاگ رہی تھی، سراج کے بستر پر دراز ہوتے ہی اس نے پلٹ کر اس سے بڑی اپنائیت سے کہا تھا۔

”آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔“

”سوری......“ سراج نے اس کی خمار آلود آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میرے رات کو وقت ناوقت آنے سے تمہاری نیند ڈسٹرب ہوتی ہے۔“

”آپ نے میرے مشورے کے بارے میں نہیں پوچھا؟“

”کہو......“

”میرا خیال ہے کہ اب آپ کو اس ملازمت کو چھوڑ دینا چاہیے۔“

”یہ خیال آپ کے ذہن میں آیا تو اس کی کوئی وجہ بھی ہوگی؟“ سراج نے چونک کر پوچھا۔

”کیوں......؟“ الماس نے جن نظروں سے سراج کو دیکھا اس میں ایک عورت کی تشنگی بھی شامل تھی۔ ”کیا آپ نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ ہماری ازدواجی مسرتوں میں آپ کی وردی کے فرائض......“

”آئی ایم سوری ڈارلنگ۔“ سراج نے کروٹ لے کر الماس کو خود سے اور قریب کر لیا۔ اس وقت اس کے تھکے ہوئے ذہن کو ایک خوبصورت بیوی کا قرب ہی سکون پہنچا سکتا تھا۔ اس بات کو محسوس کر کے الماس نے بھی ہاتھ بڑھا کر شوہر کے خوبصورت بالوں کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

”اگر درمیان میں کوئی فون آ گیا تو آپ پھر یہی کہیں گے کہ ون منٹ ڈارلنگ۔ اور آپ کا یہ ون منٹ کسی کے جذبات کو روند کر بے مزہ کر دیتا ہے۔ پھر، آپ ہی شکایت کرتے ہیں۔“

الماس کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں، نائٹ گاؤن سے سرکشی کرتا ہوا اس کا جسم مچل جانے کو تھا کہ سراج کے موبائل پر ابھرنے والی ٹیون سن کر وہ کسی ناگن کی طرح بپھر کر اٹھی اور غسل خانے میں جا کر ٹھنڈے پانی سے نہانے میں مصروف ہو گئی...... سراج نے بیوی کے جذبات کو محسوس کیا لیکن وہ اس کال کو بھی منقطع نہیں کر سکتا تھا اس لیے کہ روشن اسکرین پر میڈم روبی کے نمبر جھلملا رہے تھے۔ وہ موبائل آن کرتا ہوا تیزی سے اٹھ کر باہر لاؤنج میں آ گیا۔

”ہیلو...... سراج بول رہا ہوں۔“

”میں اس وقت آپ سے لیاقت حسین کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”جب آپ اس کے بارے میں پہلے سے واقف تھیں تو پھر......“

”میں کچھ اور باتوں سے بھی واقف ہو چکی ہوں اسی لیے آپ کو ڈسٹرب کر رہی ہوں۔“ دوسری جانب سے بے حد سنجیدگی سے کہا گیا۔

”میں سمجھا نہیں......“ سراج نے وضاحت چاہی۔ ”آپ کا اشارہ کن باتوں کی طرف ہے؟“

”لیاقت حسین کو جس ہیوی ڈیوٹی ٹرک کے ذریعے مارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ آپ اسے کیوں بھول رہے ہیں؟“ میڈم نے سرسراتے لہجے میں جواب دیا۔ ”ساحلی علاقے پر ہونے والا دھماکا کسی کے لیے ایک وارننگ ہی تھا لیکن دشمن نے شاید اسے سنجیدگی سے محسوس نہیں کیا۔“

"آپ ابھی ٹرک کی بات کر رہی تھیں؟" سراج نے اسے یاد دلایا۔

"اسپتال میں آپ نے لیاقت حسین کے سلسلے میں ایک شکوہ کیا تھا...... وہ غلط نہیں تھا۔ مجھے کسی ذریعے سے معلوم ہوگیا تھا کہ کس نے موت کے منہ میں چھلانگ لگا کر مجھے اغوا ہونے سے بچایا تھا۔ آپ کو میں صرف آزما رہی تھی۔"

"ٹرک کے بارے میں آپ کو کیا معلوم ہے؟" سراج نے جھلا کر پوچھا۔

"وہ میرے آدمیوں کی نظروں میں آچکا ہے۔" اس بار میڈم نے بڑے چیلنجنگ لہجے میں جواب دیا۔ "اطلاعاً عرض ہے کہ میرے صرف ایک اشارے پر وہ بھی ایک دھماکے سے برباد کر دیا جائے گا۔"

"وہ کس کی ملکیت ہے؟" سراج نے سنسناتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"ٹرک کی تباہی کے ساتھ ساتھ ممکن ہے وہ ڈرائیور بھی زندگی سے محروم کر دیا جائے جو حادثے کے وقت اسے چلا رہا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ اس قدر جذباتی انداز کا مظاہرہ آپ کے حق میں مناسب نہیں ہوگا۔ پلیز، اپنی معلومات مجھے فراہم کر دیں اس کے بعد...... آپ جیسا چاہیں گی، ویسا ہی ہوگا۔"

"آپ نے ٹرک کی ملکیت کے بارے میں دریافت کیا تھا...... اس کے لیے اتنا عرض کر دوں کہ ٹرک اور اس کے ڈرائیور کی خدمات کو عارضی طور پر منہ مانگے داموں خریدا گیا تھا...... کس نے خریدا تھا...... یہ آپ بھی سمجھ رہے ہوں گے، بائی۔"

دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ سراج نے فوری طور پر میڈم سے دوبارہ رابطہ کے بارے میں سوچا لیکن کسی خیال سے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے ہونٹوں پر ابھرنے والی مسکراہٹ بڑی معنی خیز تھی۔ اس کا ذاتی خیال بھی یہی تھا کہ کسی بڑے مگرمچھ کی توجہ اگر ایک شکاری کے بجائے کئی شکاریوں کی طرف بٹ جائے تو پھر اسے آسانی سے شکار کیا جاسکتا۔

☆☆☆

ذیشان ہوٹل کے روم نمبر ایک سو دو میں موجود دونوں افراد اچھی پوزیشن میں نظر آرہے تھے۔ درمیانہ قد اور گٹھے ہوئے جسم والے نے جینز کے اوپر جیکٹ پہن رکھی تھی گلے میں ہلکے سبز رنگ کا بوٹے دار لمبا ریشمی رومال بھی۔ گلے کے قریب ٹائی جیسی ناٹ لگا کر ڈال رکھا تھا، وہ کسی اسسٹنٹ فلم کا ہیرو ہی لگ رہا تھا۔ اس کا دوسرا ساتھی جو بوٹے قد کا مالک تھا، اس نے جینز کے اوپر جیکٹ کے بجائے گہرے چاکلیٹ کلر کی کالے چار خانوں والی قمیص پہن رکھی تھی۔ دونوں ہی میک اپ میں تھے لیکن میک اپ بھی اس مہارت سے کیا گیا تھا کہ فوری طور پر کوئی اس کی نشاندہی نہیں کر سکتا تھا۔ دونوں کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ درمیانہ قد والا بار بار اپنی دستی گھڑی پر اس طرح نظریں ڈال رہا تھا جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔

صبح ناشتے کے وقت وہ نائٹ سوٹ میں ملبوس تھے لیکن ناشتے سے فارغ ہوتے ہی بڑی پھرتی اور مہارت سے اپنے لباس اور حلیے دونوں تبدیل کر لیے تھے۔ خاصی دیر تک وہ اپنی اپنی سوچوں میں مستغرق رہے پھر درمیانہ قد والے نے جسے اس کا ساتھی خاص خاص موقعوں پر کیپٹن کے نام سے یاد کرتا تھا بوٹے قد والے کو مخاطب کیا۔

"کیپٹن۔ ہم جس کا انتظار کر رہے ہیں، اسے اب تک آجانا چاہیے تھا۔ روز وہ زیادہ سے زیادہ ساڑھے آٹھ بجے تک آجاتا تھا لیکن آج نو بجے کے بعد بھی دور، دور تک اس کا کوئی نشان نہیں۔"

"اس کے دو مطلب ہی ہو سکتے ہیں۔" کیپٹن کہہ کر مخاطب کیے جانے والے نے سنجیدگی سے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ "ابھی تک اس کی غیر حاضری کے صرف دو مطلب ہو سکتے ہیں...... یا تو لائن کلیئر نہیں ہے یا پھر ممکن ہے بگ باس نے اسے کسی وجہ سے روک دیا ہوگا۔"

"گویا آپریشن آج کے بجائے کل کے لیے ملتوی کر دیا گیا ہے......؟"

"یہ بھی بعید از قیاس نہیں ہے۔" کیپٹن نے شانے اچکا کر کہا۔ "ہمیں اڑتالیس گھنٹے ہائی الرٹ رہنے کو کہا گیا تھا۔ ہیڈ آف دی اسٹیٹ کی مرضی پر منحصر ہے۔ کسی وقت بھی آپریشن کا سگنل دیا جاسکتا ہے۔"

"یور آر ہنڈرڈ پرسنٹ رائٹ۔" میجر نے اپنے ساتھی کی تائید کی۔ کچھ توقف کے بعد اس کا ذہن پھر الجھنے لگا۔ "ایک بات میری سمجھ سے باہر ہے۔"

"وہ کیا......؟"

"جب پھانسی پانے والے کے چہرے پر سیاہ کپڑا پہنا دیا گیا تو کھنکا دبانے میں کیسی ہچکچاہٹ......؟"

"بات سولہ آنے معقولیت ہے لیکن...... یہ سوچنا ہمارا کام نہیں۔" کیپٹن نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "ہمیں

صرف ایکشن کے آرڈر سے مطلب رکھنا ہے۔ اسی بات کی خاطر ہمیں بگ باس نے...... پناہ دے رکھی ہے۔"

"مچھی بھات کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے......؟" میجر نے چارلی کے سلسلے میں سوال کیا۔

"بھات سے زیادہ مجھے مچھلی پسند ہے...... جل پری!" کیپٹن نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بائیں آنکھ ہلکی سی جھپکائی۔ "تم نے شاید حسینہ کو کبھی غور سے نہیں دیکھا۔ کسی رس بھرے تربوز کی طرح ہر وقت اندر ہی اندر چھلکتی دکھائی دیتی ہے۔"

"اس وقت میں اسی جل پری کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"خیریت......" کیپٹن نے اسے چونک کر دیکھا۔

"کیا تم بھی......؟"

"نہیں......" میجر نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ "اس روز ہے کھیلتے وقت تم نے اس کو اوری سے پراٹھا بنانے والی جو بات کہی تھی۔ وہ اسے اچھی نہیں لگی......"

"پھر؟......"

"یہ مچھی بھات اوپر سے بڑے معصوم لگتے ہیں لیکن اندر ہی اندر کسی سب میرین (Sub-Marine) کی طرح خطرناک بھی ہوتے ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں......" کیپٹن کی پیشانی پر سلوٹیں ابھرنے لگیں۔ "تم نے سب میرین کا حوالہ کیوں دیا؟"

"تم شاید ایک اہم بات نظرانداز کر رہے ہو۔" میجر پہلے سے زیادہ سرد لہجے میں بولا۔ "ہمارے پتے اور ٹھکانے کا علم مچھی بھات کے سوا کسی اور کو نہیں ہوتا۔ رابطے کی وجہ سے میں اسے مجبوراً بھگت رہا ہوں ورنہ......" میجر جملہ نامکمل چھوڑ کر ہونٹ کاٹنے لگا۔

"آئی۔سی" کیپٹن اس طرح چونکا جیسے اس کے پاؤں اچانک بجلی کے تاروں سے چھو گئے ہوں۔ "کیا وہ ہماری مخبری کی حماقت کرنے کی بھی سوچ سکتا ہے؟"

"اس کا خیال ابھی سے رکھو......" میجر نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ "روحیں اندازہ تو لگا سکتی ہیں لیکن ہمیں بتا نہیں سکتیں۔"

کیپٹن کی رگیں پھڑپھڑانے لگیں۔ اسی وقت دروازے پر کسی نے وقفے وقفے سے تین بار دستک دی۔

"ہش......" میجر نے مدھم آواز میں کیپٹن کو اشارے سے بتانے کی کوشش کی کہ مچھی بھات دروازے پر موجود ہے۔ پھر وہ بغلی ہولسٹر سے اپنا سائلنسر لگا ہوا اعشاریہ تین آٹھ کا پستول نکالتے ہوئے دروازے کے قریب ہوگیا۔ اس نے میجک آئی سے باہر دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ پہلے روز ہی سے خراب تھی۔ میجر نے جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ کسی متوقع خطرے کو محسوس کر کے وہ دیوار سے چپک کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی دیکھا دیکھی کیپٹن نے بھی فرش پر اوندھا لیٹ کر اپنا پستول نکال لیا تھا۔

ایک منٹ بعد پھر کسی نے تین بار وقفے وقفے سے دروازے پر آہستہ سے دستک دی، میجر نے اپنی پوزیشن تبدیل کیے بغیر ہاتھ بڑھا کر بولٹ کھول دیا۔ آنے والا چارلی کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ اندر داخل ہو کر اس نے فوری طور پر دروازہ دوبارہ اندر سے بند کیا پھر کیپٹن سے مخاطب ہوا۔

"کیا بات ہے؟...... تم فرش پر اوندھے کیوں پڑے ہو؟"

"محسوس کر رہا ہوں کہ نیچے کوئی ...... ہے بھی یا نہیں......" کیپٹن نے آنکھ جھپکاتے ہوئے کہا پھر پستول کو دوبارہ قمیص کے اندر ڈال کر پتلون میں اڑستے ہوئے کہا۔ "کیا بات ہے؟ تمہیں دیر کیوں ہوگئی؟"

میجر بھی پستول ہولسٹر میں رکھتے ہوئے سامنے آگیا۔

چارلی نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے دبی آواز میں کہا۔ "آج آرام کرو...... باہر کا موسم زیادہ گرم نہیں ہے لیکن آج رات یا کل دوپہر کسی وقت موسم کے بارے میں کوئی نئی صورتِ حال سامنے آسکتی ہے۔"

"مارکیٹ کا کیا ریٹ چل رہا ہے؟" میجر نے اشاروں کنایوں میں افضل خان کے بارے میں دریافت کیا۔

"ابھی تک مندی کا رجحان ہے۔" چارلی نے دونوں ہاتھ کنپٹی سے لگا کر آنکھیں بند کرتے ہوئے صورتِ حال کی وضاحت کر دی کہ افضل خان ابھی تک ہوش میں نہیں آیا۔

"اوہ......" میجر شانے اچکاتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ "آج تو بالکل فلمی ہیرو کی طرح ایکٹنگ کر رہے ہو۔"

"دوپہر کے کھانے کا کیا پروگرام ہے؟" چارلی نے دریافت کیا۔

"کیا ہم کو آج بھی ادھر ہوٹل کے کمرے میں ہی لنچ کرنا پڑے گا؟" کیپٹن کے لب و لہجے میں تناؤ کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔

"ہاں......" میجر نے کیپٹن کا موڈ دیکھ کر مسکراتے ہوئے بات بنانے کی کوشش کی۔ "رات کا کھانا جو بیرا لایا تھا وہ قابلِ اعتماد ہی لگ رہا تھا...... شاید دوپہر کا بھی وہی لائے گا۔" آخری جملہ ادا کرتے ہوئے اس نے چارلی کی طرف

وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

''ہاں......'' چارلی نے دانت نکالتے ہوئے بنگالی انداز میں اردو بولی۔ ''تم ایک دم ٹھیک بولتا۔''

''ادھر کیا بام مچھلی نہیں ملتا۔'' کیپٹن نے اس کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ ''وہ جو ایک دم ہاتھ میں آتا آتا پھسل کر نکل جاتا ہے۔''

''شوربا والا کھانا ہے یا فرائی۔'' چارلی اس کا مفہوم نہیں بھانپ سکا تھا۔

''تم مچھلی لادو...... شوربا اور فرائی کا فیصلہ ہم بعد میں کرلے گا۔'' کیپٹن نے شوخی سے کہا۔ ''ایک دم شوندر شوندر (سندر۔ سندر) زندہ والا مچھی...... لائف انجوائے کرنے کا ہے...... کیا۔''

''موزاک کرتا......'' چارلی نے دل پر جبر کر کے مسکرانے کی کوشش کی۔

میجر خاموش کھڑا کیپٹن کے رنگ ڈھنگ دیکھ رہا تھا۔ چارلی کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اس نے یہ اندازہ بھی لگایا کہ اسے کیپٹن کا آخری جملہ سن کر اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کا اشارہ کس مچھلی کی طرف ہے......؟ میجر کے سمجھانے کے باوجود کیپٹن چارلی کو حسینہ کے سلسلے میں چھیڑنے سے باز نہیں آرہا تھا۔

''چارلی......'' اس نے چارلی کی توجہ مبذول کرنے کی خاطر کہا۔ ''ہمارے روم کے دروازے کا میجک آئی کام نہیں کررہا...... اس کا فوری طور پر ٹھیک ہونا بہت ضروری ہے۔''

''اوکے......'' چارلی نے اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو پاتے ہوئے میجر کی طرف دیکھا۔ ''میں اسے ٹھیک کراتا ہوں لیکن۔ دوپہر کے کھانے کا کیا پروگرام ہے؟''

''ہم ادھر ہی ہوٹل میں کھانا پسند کریں گے۔'' میجر نے جواب دیا۔ ''ہمارا بار بار باہر جانا ٹھیک نہیں ہے۔ ضروری کام سے نکلیں گے تو پھر ادھر واپس پلٹ کر بھی نہیں آئیں گے۔''

''باس بھی یہی بولتا......'' چارلی نے پھر بنگالی مکس اردو بولی۔ ''ادھر کام فنش۔ ادھر پھر کچھ دنوں کے لیے ایک دم انڈر گراؤنڈ۔''

''تم باس کو کب سے جانتے ہو؟'' میجر نے اسے ٹٹولنا چاہا۔

''بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ مگر باس کو ہم سے کبھی کوئی شکایت کا موقع نہیں ملا۔''

''جبھی زمین سے ساڑھے چار فٹ اوپر نظر آرہے ہو۔'' کیپٹن نے پھر اس کا مضحکہ اڑانے کی کوشش کی۔ ''باس خوش نہ ہوتا تو تم بھی اب تک انڈر گراؤنڈ ہوگیا ہوتا۔ ویسے بائی داوے، کیا باس بھی سی فوڈ (Sea Food) ہے......''

''کیپٹن۔'' میجر نے اسے جھلا کر دیکھا تو کیپٹن مسکرا کر خاموش ہوگیا۔

''میں میجک آئی کا بول کر آتا ہوں۔'' چارلی نے عجیب انداز میں کہا۔ ''ساتھ میں کھانے کا مینو بھی لیتا آؤں گا۔''

''کبھی کبھی تم اوور ہونے لگتے ہو۔'' میجر نے چارلی کی جانے کے بعد دروازہ بند کرتے ہوئے کیپٹن کو مخاطب کیا۔ ''ہمیں بگ باس نے قانون سے جو پروٹیکشن دی ہے وہ کوئی اور نہیں دے گا۔ چارلی اس کا خاص آدمی نہ ہوتا تو اسے ہماری دیکھ بھال کی ذمے داری بھی نہ سونپی جاتی۔''

''مائی فٹ......'' کیپٹن کے اندر کا شیطان مچل گیا۔ ''میں نے کبھی موت کے خوف سے کسی کی غلامی بھی کی، دو دو ٹکے کے آدمیوں کے آگے مصلحتاً بھی سر جھکانا میری سرشت کے خلاف ہے۔ اس بار بھی ہمیں جو مشن سونپا گیا ہے، وہ بھی موت کے منہ میں چھلانگ کے مترادف ہے۔ مقابلہ ہوا تو سینے پر گولی بھی ہم ہی کھائیں گے۔ خاص آدمی اور پروٹیکشن دینے والے دور بیٹھے تماشا دیکھتے رہیں گے۔ ہونہہ......!''

''بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہم چار آدمی اتفاق سے ایک ساتھ ہوئے ہیں۔ کوئی چھوٹا بڑا نہیں لیکن ایک دوسرے کو سمجھانا اور سمجھنا بھی ہمارے لیے بہت ضروری ہے۔''

''کوئی دوسری بات کرو......'' کیپٹن نے بدستور الجھ کر جواب دیا۔ ''میں اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کا عادی ہوں۔ بس بول کر۔''

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' میجر نے موضوع بدل دیا۔ ''کیا بگ باس افضل خان کو...... جو اس کا دست راست رہ چکا ہے، راستے سے ہٹا کر غلطی نہیں کررہا ہے؟''

''یہ سوچنا ہماری ذمے داری نہیں ہے۔'' کیپٹن کے لہجے میں تلخی گھلنے لگی۔ ''کل تک وہی کسی لیڈر کی طرح ہمارے اوپر حکم بھی چلاتا رہا ہے۔ اب ہمارے ہی ہاتھوں اس کی قسمت میں مرنا بھی لکھ دیا گیا...... کیا تم اسے بھی تفریح نہیں کہو گے؟''

میجر نے کیپٹن کو غور سے دیکھا پھر خاموش ہوکر کسی سوچ میں گم ہوگیا۔

☆☆☆

سراج اس وقت اسپتال میں بڑے ڈاکٹر سے گفتگو کررہا تھا جس نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اسے بتایا تھا کہ مریض کو ہوش آنے میں دس بارہ گھنٹے اور بھی لگ سکتے ہیں۔ یہ اطلاع سراج کے لیے تشویش ناک تھی۔ وہ افضل خان کے جلد از جلد ہوش میں آنے اور اس کا بیان قلم بند کرنے کے لیے بے چین تھا۔ اس کے استفسار پر ڈاکٹر نے کہا تھا۔

''موجودہ حالت میں مریض کو جلد ہی ہوش میں لانے کا عمل اس کے لیے خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔''

''لیکن......''

''آئی ایم سوری آفیسر۔'' ڈاکٹر نے سراج کی بات سنے بغیر کہا۔ ''تشدد کے علاوہ مریض کو غالباً برین شاکس بھی پہنچائے گئے ہیں جس کی وجہ سے بے ہوشی کا وقفہ طوالت اختیار کررہا ہے۔ ٹیم کے دوسرے ماہرین کا بھی مشورہ ہے کہ مریض کو ہوش میں لانے کے بجائے اس کے از خود ہوش میں آنے کا انتظار کیا جائے۔ پہلی صورت میں مریض اپنا ذہنی توازن بھی کھو سکتا ہے۔''

ڈاکٹر کی رائے سن کر سراج کو خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ افضل خان جیسے اہم مجرم کے سلسلے میں وہ جلد بازی کرنے کا اصرار بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ شیخ حامد نے تاج محل ہوٹل میں ناکام ہونے کی جو سزا اسے دی تھی وہ درست نہیں تھی۔ لیکن شاید میڈم روبی کے جال میں آکر نکل جانے کے احساس نے اسے افضل خان کے خلاف انتہائی اقدام اٹھانے پر مجبور کردیا تھا۔ اپنی ایک متوقع کامیابی کو اس نے افضل خان کی کسی معمولی حماقت سے تعبیر دینے کے سلسلے میں جلد بازی کا مظاہرہ کرکے دانش مندی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ یہ بات اس کے فرشتوں کی سمجھ میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ میڈم روبی کو رسوائی سے بچانے میں کسی روحانی یا غیبی قوت کا عمل دخل بھی ہوسکتا ہے۔ خود سراج کو اس شیطانی کھیل کی اطلاع لیاقت حسین نے دی تھی۔ بعد میں خود لیاقت حسین کو بھی اس سلسلے میں کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ بہرحال، افضل خان عتاب کا شکار ہوکر بدترین حالت سے دوچار تھا۔ دوسری جانب خود لیاقت حسین بھی ایک ایکسیڈنٹ میں زخمی ہوکر اسپتال میں پڑا تھا۔ ان تمام باتوں کے علاوہ سراج کو صبح بیدار ہوتے ہی نامعلوم مخبر نے جو پیغام دیا تھا، وہ اس کے ذہن میں بگولے کے مانند رہ رہ کر چکرا رہا تھا۔

سراج ذیشان ہوٹل میں موجود دو اہم مجرموں کو گرفتار کرنے کی خاطر ڈی آئی جی کرائمز سے مشورے کے بعد مکمل تیاری کرچکا تھا لیکن مخبر کی نئی اطلاع نے اسے کئی الجھنوں کا شکار کردیا...... اس نے صبح ہی صبح سراج کو فون کرکے کہا تھا۔

''چھاپنگ کے لیے آپ نے جو تیاریاں کر رکھی ہیں اس پر فوراً روانگی میں کچھ تاخیر کردیں۔''

''کوئی خاص وجہ؟''

''میں اس وقت جلدی میں ہوں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد آپ کو اس کی وجہ بھی بتادوں گا۔''

''کیا جس راستے سے ہم جانے والے ہیں وہ......''

''لمبا راستہ ہے۔'' حسب معمول اشاروں میں جواب دیا گیا۔ ''درمیان میں سڑک کا کچھ حصہ اچھی حالت میں نہیں ہے۔''

''تو کیا آج کا پروگرام......''

''کچھ دیر میرے دوسرے فون کا انتظار کرلیں۔'' اس بار بھی سراج کی بات کاٹ کر کہا گیا۔ ''میں اسی طرف جارہا ہوں۔ ہوسکتا ہے کوئی شارٹ کٹ ہمارے لیے زیادہ آسانی پیدا کردے۔ جو لوگ تیار ہیں۔ انہیں تیار ہی رہنے دیں۔'' دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کردیا گیا۔

سراج کے پاس سوائے اس کی ہدایت پر عمل کرنے کے کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ اس نے فوری طور پر ڈی آئی جی کرائمز کو بھی شارٹ کٹ والی بات بتادی۔

''میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر کوئی شارٹ کٹ میسر آجائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔''

''کیا دوسری پارٹی متبادل راستے سے باخبر نہیں ہوگی؟''

''ہو بھی سکتی ہے لیکن ہمیں بہرحال گائڈ کے مشورے پر عمل کرنا ہوگا۔''

''رائٹ سر......''

ڈی آئی جی سے رابطہ ختم کرنے کے بعد اس نے نگرانی پر مامور عملے کے انچارج سب انسپکٹر مکارم کو بلا کر بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔ ''مجھے معتبر ذرائع سے خبر ملی ہے کہ کچھ لوگ، مریض کو اغوا کرنے یا پھر ناکامی کی صورت میں اسے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کرسکتے ہیں۔ آپ سب کو چوکس کردیں۔''

''ڈونٹ وری سر...... میں جانتا ہوں کہ مریض ہمارے لیے کس قدر اہم ہے۔ میرے آدمی جان کی بازی کھیل کر بھی دشمنوں کی چال کو ہر قیمت پر ناکام بنانے کی کوشش کریں گے۔''

''ممکن ہو تو اسپتال کے باہر اور داخلی دروازوں پر بھی مزید نفری تعینات کردیں۔''

''ایز یو وش......'' سب انسپکٹر نے پُرجوش انداز

میں کہا پھر وہ نئی ہدایت پر عمل کرنے کی خاطر تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے راہداری عبور کر کے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

سراج کے ذہن میں مخبر کی نئی اطلاع کے متعلق مختلف خیالات چکرا رہے تھے۔ اس نے ذیشان ہوٹل کے آس پاس صرف دو قابل اعتماد کمانڈو تعینات کر رکھے تھے۔ انہیں صرف ایک اشارہ کرنے کی دیر تھی۔ مطلوبہ آدمیوں کو ہوٹل سے کسی سوچی سمجھی جگہ پر منتقل کرنے کی خاطر اس نے بلٹ پروف گاڑی کا انتظام بھی کر رکھا تھا جس کے رنگین شیشے باہر والوں کو اندر کے حالات سے قطعی لاعلم ہی رکھتے۔ سارا پروگرام ایک فائنل ٹائم ٹیبل کے تحت طے تھا جب مخبر نے کسی شارٹ کٹ کی بات کر کے دوسری کال کا انتظار کرنے کو کہا تھا۔ ممکن ہے اس نے سراج کی اسکیم سے زیادہ آسان کوئی راستہ تلاش کر لیا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے مطلوبہ افراد سے ساز باز کر کے پولیس کو دور رکھنے کی خاطر شارٹ کٹ کی پیشکش کر کے اتنی مہلت حاصل کرنی چاہی ہو کہ وہ اپنے ڈبل گیم میں کامیاب ہو سکے۔ دونوں ہی صورتوں میں سراج کو اس کے دوسرے فون کا انتظار کرنا تھا۔ اور بھی کئی ممکن خدشات، پروگرام کی اچانک تبدیلی کی وجہ سے اس کے ذہن میں سر ابھار رہے تھے جب اس کے خاص موبائل نے وائبریٹ کرنا شروع کیا۔ سراج نے پھرتی سے اسے جیب سے نکال کر روشن اسکرین پر نظر ڈالی جس پر اس کے دو منتخب کمانڈوز میں سے ایک کا نمبر مع کوڈ کے چمک رہا تھا۔

''یس......'' سراج نے موبائل آن کر کے بڑے مدھم لہجے میں پوچھا۔ ''کوئی خاص خبر......؟''

''سر...... پندرہ منٹ پیشتر ایک مریل ٹائپ کا بنگالی اوپر گیا تھا۔ اس وقت وہ نیچے کاؤنٹر پر کھڑا منیجر سے بات کر رہا ہے۔''

''ہمارے مطلوبہ افراد کہاں ہیں؟''

''وہ ابھی تک اپنے دڑبے سے باہر نہیں نکلے۔'' سنجیدگی سے سوال کیا گیا۔ ''ہمارے لیے کیا حکم ہے؟''

''میرے دوسرے فون کا انتظار کرو...... لیکن ایک بات کا خیال رکھنا، وہ دونوں کسی قیمت پر بھی ہاتھ سے نہ نکل سکیں۔''

''سر...... میں نے اس امکان پر غور کر لیا تھا کہ ممکن ہے ان چوہوں کی حفاظت پر کچھ بلیاں بھی کہیں آس پاس موجود ہوں۔ ان کو درمیان میں آنے سے روکنے کی خاطر بھی کچھ ساتھی پوری طرح تیار ہیں۔''

''گڈ......'' سراج نے تعریفی انداز اختیار کیا پھر وہ اور بھی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دوسری کال کا سگنل سنائی دیا۔ ''میں تمہیں دوبارہ فون کرتا ہوں۔'' سراج نے رابطہ ختم کر کے دوسری آنے والی کال اٹینڈ کی۔

''میں نے آپ کو شارٹ کٹ بتانے کے لیے فون کیا ہے۔'' مخبر کی آواز سنائی دی۔ اس نے پورا پلان سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ کے آدمیوں نے میرے کہنے کے مطابق ہوشیاری سے ایکشن لیا تو پھر وہ کسی طاؤن زدہ چوہوں ہی کی طرح جال میں پھنس جائیں گے۔''

''تمہارا پلان شاندار ہے۔'' سراج نے اس کی تجویز سن کر خوشی کا اظہار کیا۔ ''میں دو منٹ کے اندر نئی ہدایت جاری کرتا ہوں۔''

''تیسرے آدمی کو اگر کسی طرح فرار ہو جانے کا موقع دیا جائے تو مناسب ہوگا ورنہ...... مجھے بعد میں آپ کو آپ کا وعدہ یاد دلانا پڑے گا۔ اس کے پھنس جانے کی صورت میں آپ کے اور اس کے...... دونوں کے لیے کچھ دشواریاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔''

''او کے۔ میں کوشش کروں گا کہ میرے آدمی اسے کسی طرح نکل جانے کا موقع فراہم کر سکیں۔''

مخبر نے جو پلان بتایا تھا وہ یقیناً شارٹ کٹ ہی تھا۔ سراج نے فوری طور پر سینئر کمانڈو کو نئے احکامات جاری کیے پھر نگرانی کے عملے کے انچارج کو دوبارہ الرٹ رہنے کی تاکید کرنے کے بعد اس نے اسپتال سے باہر آ کر گاڑی اسٹارٹ کی اور تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مقصد دشمنوں پر یہی ظاہر کرنا تھا کہ وہ کمانڈو ایکشن کے وقت ہوٹل یا اسپتال سے قریب نہیں تھا۔ ڈی آئی جی کرائمز نے بھی اسے یہی مشورہ دیا تھا۔

☆☆☆

''غصہ یا جھنجلاہٹ انسان کے ذہن کو کمزور کر دیتی ہے۔'' میجر نے طویل خاموشی کے بعد اپنے ساتھی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''میں تمہیں صبر و تحمل سے کام لینے کا مشورہ دوں گا۔ یہ بھی یاد رکھو کہ اس وقت ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ یہ معاملہ کامیابی سے طے پا جائے تو پھر آئندہ کے لیے بھی سوچیں گے۔'' میجر کا آخری جملہ معنی خیز تھا۔

''نائن پلس ٹو......'' کیپٹن نے بہت غور سے میجر کے چہرے کے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش کی۔

''موسم ایک نہیں، چار ہوتے ہیں۔'' میجر نے خلا میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔ ''سائبیریا میں خشک سالی کا

موسم آنے سے پہلے ہی وہاں کے پرندے بھی ایشیائی ملکوں کی طرف ڈار کی شکل میں پرواز شروع کر دیتے ہیں۔''

''اور ہمارے شکاری ان کو مارنے کی خاطر پہلے سے تیار رہتے ہیں۔''

''ہاں...... میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔'' میجر بے پروائی سے بولا۔ ''لیکن نقل مکانی ان پرندوں کی اپنی ذاتی پسند اور فیصلہ ہے، اس میں کسی کے حکم کا اطلاق نہیں ہوتا۔''

''میں تمہارا اشارہ سمجھ رہا ہوں لیکن کیا یہ ممکن ہو سکے گا؟'' کیپٹن نے کچھ توقف سے استفسار کیا۔ ''ہمارے سارے ویک پوائنٹس بگ باس کو معلوم ہیں۔ تحفظ دیتے وقت بھی ہم سے یہی کہا گیا تھا کہ......''

''فیصلہ سناتے وقت کوئی جج مجرم سے کبھی یہ نہیں کہتا کہ تمہیں تھانے والوں کی چھترول سے بچنے کی خاطر جیل بھیج رہا ہوں۔ وہاں جا کر فرار ہونے کی کوشش کرنا۔''

''میں سمجھا نہیں......؟''

''ہر غلط کام میں رسک پہلی شرط ہوتی ہے مائی ڈیئر۔'' میجر نے ہونٹ کاٹتے ہوئے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔ ''جیل کی دیواریں توڑنا، لوہے کے زیورات سے گلو خلاصی حاصل کرنا بھی آسان نہیں ہوتا لیکن کھلی ہوا میں آزادی سے سانس لینے کا تصور ہی فرار ہونے والے کے حوصلوں کو ہوا دیتا ہے۔''

کیپٹن نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا، کچھ دیر کسی غور و فکر میں ڈوبا رہا پھر بولا۔

''کیا ہمارے باقی دو ساتھی بھی ہماری رائے سے متفق ہو جائیں گے؟''

''اجتماعی فرار کی کوشش ننانوے فیصد ناکامی سے دوچار ہوتی ہے۔ کوئی ایک، کسی ایک کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر بھانڈا پھوڑ دیتا ہے جس کا نتیجہ سب کو بھگتنا پڑتا ہے۔'' میجر نے ٹھوس آواز میں کہا۔ ''اس وقت ہم دو ہیں۔ تم اگر مجھ سے متفق نہیں ہو تو میں درخواست کروں گا کہ اس وقت میرے اور تمہارے درمیان جو گفتگو ہوئی ہے اسے یکسر فراموش کر دینا۔''

''ڈن......'' کیپٹن نے گہری سنجیدگی سے وعدہ کیا پھر اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''غصے اور جھنجلاہٹ پر کنٹرول کرنے کا مشورہ تم نے غالباً مچھی بھات کے پس منظر میں دیا تھا؟''

''ہاں......''

''ایک سوال میں بھی کروں گا...... اگر بگ باس اس کو حکم دے کہ حسینہ کو ایک رات کے لیے اس کے عشرت کدے میں پہنچا دے تو کیا وہ انکار کر دے گا؟''

''نہیں......'' میجر نے جواب دینے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ''مچھی بھات کے فرشتے بھی خود حسینہ کا بناؤ سنگار کر کے اسے باس کے خاص کمرے تک پہنچانے پر خوشی خوشی آمادہ ہو جائیں گے...... اس کے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں ہوگا۔ ہاں، یہ ممکن ہے کہ وہ حسینہ سے یہ بھی کہہ دے کہ وہ بگ باس کو پوری طرح اپنے جسم کے گداز اور حسین پیچ و خم میں الجھانے کے بعد کوئی زہریلی سوئی چبھو کر اس کا قصہ تمام کر دے لیکن وہ رسک نہیں لے گا۔ اس لیے کہ بگ باس کے دوسرے شکاری جانور بھی پوری طرح محتاط رہتے ہیں۔ وہ حسینہ کی تکا بوٹی کرنے میں ذرا دیر بھی نہیں کریں گے۔''

''ہو سکتا ہے تمہاری سوچ درست ہو لیکن میں مچھی بھات سے حسینہ کے سلسلے میں صرف مذاق نہیں کرتا۔'' کیپٹن نے آنکھ مار کر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں حسینہ کے عشق میں مبتلا نہیں ہوں لیکن ایک بار منہ کا ذائقہ بدلنے کی خاطر اسے کسی ہرنی کی طرح گرا کر تڑپتا اور مچلتا دیکھنے کی خواہش سے دست بردار بھی نہیں ہو سکتا۔''

''یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟'' میجر نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''ہاں......'' کیپٹن حقارت سے مسکرا دیا۔ ''اپنے مقابلے پر میں مچھی بھات اور اس کی جل پری کو زیادہ اہمیت نہیں دے سکتا۔ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد میرا پہلا خوبصورت ٹارگٹ حسینہ ہی ہوگی۔''

میجر ہونٹ چبا کر رہ گیا۔ اسی وقت دروازے پر پھر تین بار وقفے وقفے سے دستک کی آواز سنائی دی۔ میجر نے نگاہوں نگاہوں میں کیپٹن کو اس بات کی تلقین کی وہ فی الحال حسینہ کے سلسلے میں اپنے دلی جذبات کا کوئی مظاہرہ کرنے سے گریز ہی کرے، پھر اس نے دروازے کے قریب جا کر ڈور لاک میں لگی چین کی حد تک جھری کر کے اپنا اطمینان کرنے کی ضرورت کو نظر انداز بھی نہیں کیا۔

''میں ہوں......'' دوسری جانب سے چارلی کی آواز سن کر اس نے چین بھی لاک سے الگ کر دی لیکن دروازہ کھلتے ہی جو کچھ ہوا وہ میجر یا کیپٹن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ چارلی کے ساتھ ہی دو گٹھے ہوئے جسم کے جوان جن کے چہرے بھی مخصوص جالی کے ماسک کے اندر چھپے ہوئے تھے، کمرے میں آ کر آندھی اور طوفان کی طرح ٹوٹ پڑے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

چارلی کو ایک طرف دھکا دے کر انہوں نے کیپٹن اور میجر کو اپنے پستول کی زد میں لے لیا جس پر سائلنسر بھی فٹ تھا۔ یہ عجیب ساخت کا پستول میجر اور کیپٹن نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔

بگ باس کی جانب سے ان دونوں کو اس خاص مشن کے لیے یہی ہدایت ملی تھی کہ وہ کسی قیمت پر بھی اپنی زندہ گرفتاری نہیں دیں گے ورنہ پھر ان کی موت ان کے تصور سے بھی زیادہ بھیانک اور اذیت ناک ہوگی۔ چنانچہ ان دونوں نے پستول کی پروا کیے بغیر زندگی کی بازی لگانے کی ٹھان لی مگر دوبارہ جو کچھ ہوا وہ بھی ان کی مجرمانہ زندگی کے لیے انوکھا تجربہ تھا۔ جالی کے ماسک والوں نے ان کے ارادے بھانپ کر ٹریگر دبا دیے۔ دونوں کے پستول سے زردی مائل دھویں کا ایک گولا سا نکلا پھر اس نے برق رفتاری سے اپنا حجم بڑھا کر اس طرح میجر اور کیپٹن کے چہروں کو اپنے حصار میں لیا کہ وہ کسی جوابی کارروائی سے یکسر محروم ہوگئے۔ دھویں کے گولے کی شکل میں بے ہوش کر دینے والی ایسی گیس کو فائر کیا گیا تھا جس نے دونوں کو پلک جھپکتے میں پانچوں حواس خمسہ سے یکسر محروم کر دیا۔ وہ کٹی ہوئی بے جان شاخوں کی طرح فرش پر گر کر بکھر گئے۔ پھر جتنی دیر میں دونوں کمانڈوز اپنے شکار کی ضروری پیکنگ کرتے، چارلی موقع پا کر فرار ہوگیا جس کو حسب وعدہ اس کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ بہ ظاہر یہی محسوس ہوا تھا کہ اصل مجرموں پر قابو پانے کی جلدی میں دونوں کمانڈوز اس کی موجودگی سے بے نیاز ہوگئے تھے لیکن یہ بھی طے شدہ پلان کا ایک ضروری حصہ تھا۔

پندرہ منٹ کے مختصر عرصے میں دو بستر بند ہوٹل ذیشان کے عقبی راستے سے باہر لائے گئے، ان کے ساتھ دو سوٹڈ بوٹڈ افراد بھی تھے جنہوں نے آنکھوں پر مرکری گلاسز والا چشمہ پہن رکھا تھا۔ ہوٹل کے عملے کے لباس میں ملبوس دو آدمیوں نے ان بستر بندوں کو اس بلٹ پروف گاڑی کی ڈکی میں منتقل کر دیا جو خاصی کشادہ تھی، پچھلی دو نشستوں کو فولڈ کر کے اس میں مزید گنجائش بڑھا دی گئی تھی۔ بستر بند لوڈ ہونے کے بعد بلٹ پروف گاڑی ذیلی سڑکوں کو عبور کر کے تین منٹ بعد کشادہ روڈ پر آگئی جو ہوٹل ذیشان سے تقریباً ڈیڑھ فرلانگ دور تھی پھر اگلی نشستوں پر ڈرائیو کرنے والے کے برابر بیٹھے ہوئے گٹھے ہوئے جسم والے نے موبائل نکال کر سراج کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ قائم ہونے پر اس نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

''آپریشن سکسس فلی کمپلیٹڈ سر...... بستر بند کو کہاں پہنچانا ہے؟''

''ملٹری اسپیس ڈویژن کی ٹنل نمبر تھری میں۔''

''سوری سر...... وہاں جانے کے لیے اسپیشل پرمٹ ہونا ضروری ہے۔''

''ڈونٹ وری...... پرمٹ تمہیں داخلی دروازے پر ہی ہینڈ اوور کر دیا جائے گا۔ بات طے ہوگئی ہے۔''

''اور کوئی خاص بات؟''

''تیسرے کا کیا ہوا؟'' دوسری جانب سے دریافت کیا گیا۔

''طے شدہ پروگرام کے مطابق اسے نظر انداز کر دیا گیا۔''

''تمہارا تعاقب تو نہیں ہو رہا......؟''

''اگر ایسا کیا گیا تو تعاقب کرنے والوں کو راستے سے ہٹا دیا جائے گا۔'' گٹھے ہوئے جسم والے نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ''ہمیں اپنے ملٹری کمانڈو ڈویژن سے بھی کچھ ضروری ہدایات ملی ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔''

''اوکے...... میں بعد میں دوبارہ رابطہ قائم کروں گا۔''

''رائٹ سر......'' کال ختم ہوئی تو موبائل بھی آف کر دیا گیا۔

سراج نے دوسری جانب سے گفتگو ختم کرنے کے فوراً بعد ڈی آئی جی کرائمز کو فون کیا۔ طے شدہ پروگرام کی کامیابی کی اطلاع دینے کے بعد اس نے پُرجوش لہجے میں کہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ اگر ہم فوری طور پر انٹروگیشن کے لیے تیاری کریں تو......''

''نہیں......'' دوسری جانب سے فوری جواب ملا۔ ''میں نے ملٹری کی ہائی کمان سے بات کی تھی۔ ان کا مشورہ ہے کہ کل صبح تک وہاں جانے کی اسپیشل پرمیشن کا انتظار کرنا ہوگا۔''

''رائٹ سر......''

''دوسری جانب سے کوئی مزاحمت تو نہیں کی گئی؟'' ڈی آئی جی کرائمز نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''ابھی تک اس بارے میں کہیں سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔''

''آیم نمبرون کا کیا ہوا......؟''

''اسے کل رات ہی پلیس کر دیا گیا ہے۔''

''گڈ......'' دوسری طرف سے سراہتے ہوئے کہا گیا۔ ''کل صبح تک ہمیں دشمن کے ردعمل کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔''

دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

اس پراسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

آخری امید

تنویر ریاض

غرض میں اندھا ہو کر کوئی تماشا دیکھتا ہے اور کوئی تماشا بنتا ہے، اگرچہ وہ دونوں بھی غرض مند تھے مگر زمین و آسمان کے مانند اپنے اپنے دائروں میں قید... اس کے باوجود وہ درمیان میں حائل فاصلہ مٹا دینا چاہتے تھے... جذبات کی شرانگیزی ایسے ہی خواب دکھاتی ہے... کبھی انسان دور کی کوڑی لے آتا ہے اور کبھی قریب کی چیز نظر نہیں آتی۔

فریب محبت میں مبتلا ایک معصوم انسان کی خوش گمانیاں

فیلپ کو یقین تھا کہ اس کی ساری زندگی یونہی چچا کی غلامی میں محنت و مشقت کرتے گزر جائے گی، کیونکہ اس کے انکل وکٹر کی صحت قابل رشک حد تک اچھی تھی اور اسے دیکھتے ہوئے آئندہ دس بیس برسوں تک اس کے گزر جانے کا کوئی امکان نہ تھا۔ ویسے تو موت کسی وقت بھی آسکتی ہے۔ کوئی حادثہ یا ناگہانی آفت، لیکن وکٹر بہت محتاط زندگی گزار رہا تھا اور اس نے ایک طرح سے اپنے گرد ایک حفاظتی حصار قائم کر رکھا تھا۔ فیلپ اکثر سوچا کرتا کہ یہی دن تو زندگی ہے پوری

طرح لطف اندوز ہونے کے ہیں، اگر زندگی کا یہ سنہری دور وکٹر کی غلامی میں گزر گیا اور اسے تیس چالیس سال کی عمر میں آزادی بھی ملی تو کیا فائدہ ہوگا۔ اس وقت تک تو اس کی تمام امنگیں اور جذبے مردہ ہو چکے ہوں گے۔

اس وقت بھی وہ کچھ ایسی ہی سوچوں میں گم تھا کہ وکٹر کی کرخت آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ سیاحوں کی موجودگی میں انگریزی زبان میں اسے برا بھلا کہہ رہا تھا۔

''احمق لڑکے'' وکٹر چلایا۔ ''ان ٹوٹی ہوئی بوتلوں کے پیسے تمہاری تنخواہ سے کاٹے جائیں گے۔''

فیلپ کا دل چاہا کہ وہ اس بدزبان بوڑھے کا منہ نوچ لے۔ ویسے ہی وہ قیام وطعام کی مد میں اس کی تنخواہ سے اچھے خاصے پیسے کاٹ لیا کرتا تھا، لہٰذا مزید کٹوتی سے اسے کوئی خاص فرق نہ پڑتا۔

وکٹر سیاحوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ تم لوگوں کو زحمت ہوئی۔ دراصل میرا بھتیجا اناڑی ہے اور کوئی کام بھی ڈھنگ سے نہیں کر سکتا۔ اگر خونی رشتہ نہ ہوتا تو اب تک اسے فارغ کر چکا ہوتا۔ خیر تم فکر نہ کرو۔ میرے پاس ٹھنڈی بیئر کی بوتلوں کا کافی ذخیرہ ہے۔''

''جانتا ہوں۔'' سینور آمپسن بولا۔ وہ اور اس کی بیوی کئی سالوں سے یہاں آرہے تھے اور وکٹر سے ان کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔

''اس کے علاوہ میں نے تمہارے لیے ٹھنڈے پانی کی بوتلوں اور کولڈ ڈرنک کا بھی انتظام کیا ہوا ہے۔'' وکٹر نے کہا۔

فیلپ کا خیال تھا کہ سمپسن کی عمر زیادہ سے زیادہ پچپن برس ہوگی۔ وہ دبلا پتلا اور کسرتی جسم کا مالک تھا اور دوسرے سیاحوں کے برعکس دن کے اوقات میں بیئر نہیں پیتا تھا کیونکہ وہ اونچائی چڑھنے، پیراکی اور غوطہ خوری میں مصروف رہتا تھا۔ سینورا سمپسن اپنے شوہر کے عقب میں کھڑی تھی۔ اس کے چہرے سے دکھ جھلک رہا تھا اور ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ اس نے غور سے فیلپ کی جانب دیکھا تو اس کی آنکھوں میں ہمدردی اتر آئی۔ وہ پچاس سال کی ایک پُرکشش عورت تھی مگر اپنی عمر سے کہیں کم نظر آتی تھی، وہ ہمیشہ سے ہی فیلپ پر بہت مہربان تھی اور اس کا اصرار ہوتا تھا کہ وہ اسے بونی کہہ کر بلایا کرے۔

فیلپ اپنے چچا کی ڈانٹ سن کر جھاڑو اور کوڑے کی بالٹی لینے لنگڑاتے ہوئے اندر چلا گیا۔ کار کے حادثے کے نتیجے میں اس کی ایک ٹانگ دوسری کے مقابلے میں چھوٹی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے وہ بہت سے کام ڈھنگ سے نہیں کر پاتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ برا یہ ہوا کہ اسی حادثے میں اس کی خالہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئی جبکہ اس کے والدین پہلے ہی انتقال کر چکے تھے۔ اس طرح فیلپ مکمل طور پر انکل وکٹر کا محتاج ہو گیا تھا۔ جس کا اس کے ساتھ کوئی خونی رشتہ نہیں تھا اور اسی لیے وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتا تھا۔ وہ دونوں اس کاروبار کی وجہ سے ساتھ رہنے پر مجبور تھے جو فیلپ کے دادا نے شروع کیا تھا۔

''اے!'' وکٹر ایک بار پھر اس پر چلایا تو اس کے ہاتھ سے بالٹی اور جھاڑو زمین پر گر گئی۔ وہ وکٹر کی آواز سن کر چونک گیا اور لڑکھڑاتے ہوئے خود بھی زمین پر گر گیا۔ اسے توقع تھی کہ وکٹر اس کی مزید بے عزتی کرے گا لیکن اس نے محض قہقہہ لگانے پر اکتفا کیا۔ فیلپ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے گھٹنوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ اس نے اپنے آپ کو زخمی کر لیا ہے۔ ٹوٹی ہوئی بیئر کی بوتل کی ایک کرچی نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا تھا اور اس کی ہتھیلی سے خون بہتا ہوا کہنی تک آرہا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ پوری طرح کھڑا ہو پاتا۔ سینورا سمپسن اس کے پاس آگئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے رومال سے خون روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ پھر اس نے رومال ہٹایا اور بڑی مہارت سے وہ شیشے کا ٹکڑا نکال دیا جو اس کے انگوٹھے کے نیچے ہتھیلی میں گھس گیا تھا۔

''اے!'' فیلپ زور سے چلایا اور اس نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ سینورا نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

''اپنا ہاتھ اوپر اٹھائے رکھو۔'' وہ اس کے مزید قریب ہوتے ہوئے بولی۔ ''زخم زیادہ گہرا نہیں ہے۔ صرف دو تین ٹانکے کافی ہوں گے۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنا رومال اس کے زخمی ہاتھ پر باندھ دیا اور کہا کہ وہ دوسرے ہاتھ سے اس جگہ کو دبائے رکھے اس کے بعد وہ وکٹر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''فیلپ کو ٹانکے لگیں گے۔ کیا یہاں قریب میں کوئی ڈاکٹر مل سکے گا؟''

وکٹر اور سینور آمپسن کے چہروں پر بے زاری کے آثار نمودار ہوئے۔ وکٹر چند قدم آگے بڑھا جیسے فیلپ کے زخم کا معائنہ کرنا چاہتا ہو لیکن اس سے پہلے ہی سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔ اس لیے ٹانکے لگنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ بینڈیج ہی کافی ہوگی۔''

سینورا نے پُرامید نگاہوں سے گروپ کے دوسرے سیاحوں کی جانب دیکھا مگر ان میں سے بیشتر لاتعلق تھے یا جانے کے لیے تیار تھے۔ انہیں جزیرے کی سیر کے لیے جانا تھا اور وہ اتنا انتظار نہیں کر سکتے تھے کہ ان کا ایک گائیڈ ڈاکٹر کے پاس جائے۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ برہم ہوتے ہوئے بولی۔ ''مجھے پانچ منٹ درکار ہوں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے فیلپ کا بازو پکڑا اور اسے لے کر پیچھے بنے ہوئے چھوٹے سے دفتر میں لے گئی۔ وہاں جا کر اس نے فیلپ کو ایک کرسی پر بٹھایا اور بولی۔ ''اپنا ہاتھ اوپر رکھو اور دوسرے ہاتھ سے اس جگہ کو دبائے رکھو۔''

اس نے اخبار کھول کر میز پر پھیلایا اور خود دوسری کرسی پر بیٹھ کر اپنا پرس کھنگالنے لگی۔ اس نے صاف پانی کی ایک چھوٹی بوتل، ماچس کی ڈبیا اور سوئیوں کا پیکٹ نکالا۔ فیلپ بڑی حیرانی سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا پھر اس سے نہ رہا گیا اور وہ بول پڑا۔ ''کیا تم ٹانکے لگا سکتی ہو؟''

اس نے کندھے اچکائے اور بولی۔ ''میں نرس ہوں اور ڈاکٹرز کے ساتھ رہ کر ٹانکے لگانا سیکھ گئی ہوں تم مجھ پر بھروسا کر سکتے ہو۔''

''او کے!'' فیلپ مطمئن ہوتے ہوئے بولا۔

سینورا نے صاف پانی سے اس کا زخم صاف کیا اور اس پر جھکتے ہوئے بولی۔ ''اب تم منہ دوسری طرف کر لو۔''

پھر اس نے ماچس کی تیلی سے متاثرہ جگہ کو دبایا اور بہت آہستہ سے سوئی وہاں داخل کر دی۔ فیلپ نے ہلکی سی سسکاری بھری لیکن اسے زیادہ درد محسوس نہیں ہوا۔ یہ غالباً سینورا کی قربت کا اثر تھا یا پھر اس سے پہلے وہ کئی مرتبہ اس طرح کی تکلیف برداشت کر چکا تھا۔ کار کے حادثے کے علاوہ ایک مرتبہ اس کا دانت ٹوٹا اور دوسری کلائی میں چوٹ آئی گوکہ وکٹر نے کافی دنوں سے اس کی پٹائی نہیں کی تھی لیکن وہ تکلیف اٹھانے کا عادی تھا۔

سینورا نے بڑی مستعدی سے اس کے ہاتھ میں تین ٹانکے لگائے جبکہ اس دوران میں وہ بالکل خاموش بیٹھا رہا، اس نے صرف اس وقت مڑ کر دیکھا جب وہ اپنا کام ختم کر چکی تھی۔ اب وہ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی بلکہ کافی متاثر بھی ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ فیلپ تکلیف کی وجہ سے شور شرابا کرے گا۔ اس نے داد دینے کے انداز میں کہا۔ ''تم فولادی اعصاب کے مالک ہو۔ حالانکہ میں جانتی ہوں کہ کافی تکلیف ہوئی ہوگی لیکن تم نے بڑے ضبط کا مظاہرہ کیا۔''

''میرے لیے یہ بہت معمولی تکلیف ہے۔'' فیلپ تلخی سے بولا۔

اچانک ہی وکٹر وہاں آگیا اور بولا۔ ''اب ہمیں چلنا چاہیے۔''

سینورا نے اپنے پرس سے پٹی نکالی اور جلدی جلدی اس کے ہاتھ پر باندھنے لگی۔ اس کے بعد وہ سب لوگ وکٹر کی ویگن میں بیٹھ کر ساحل کی طرف آگئے جہاں ایک کشتی انہیں جزیرے پر لے جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

☆☆☆

یہ ان کا خاندانی کاروبار تھا۔ وہ سیاحوں کو سرسبز پہاڑیوں اور سمندر کی سیر کرواتے جس میں مچھلیاں پکڑنا، کشتی کی سیر اور تیراکی شامل تھی۔ کچھ ماہر تیراک پانی کے نیچے جا کر غوطہ خوری کرنے کے شوقین ہوتے تھے اور فیلپ کی شہرت ایک اچھے انسٹرکٹر اور زیرآب گائیڈ کے طور پر بہت اچھی تھی گوکہ سارے کاروبار کا انتظام وکٹر کے ہاتھ میں تھا لیکن غوطہ خوری کے شائقین کے لیے فیلپ کی شخصیت میں بڑی کشش تھی۔

فیلپ گوکہ پوری طرح نوجوانی کی حدود میں داخل نہیں ہوا تھا اور اس میں بچوں جیسی جھجک باقی تھی لیکن جانتا تھا کہ وہاں آنے والے سیاح اسے پسند کرتے ہیں۔ اسی لیے اسے دن کے اختتام تک اچھی خاصی ٹپ مل جاتی تھی۔ جس میں اسے وکٹر کو بھی حصہ دینا پڑتا لیکن سمندر کا رخ کرنے کے بعد یہ سب باتیں اس کے لیے غیر اہم ہو جاتیں اور اس کی ساری پریشانیاں سمندر کے نمکین پانی میں گھل جاتیں گوکہ جسمانی معذوری کی وجہ سے اسے زمین پر چلنے میں دشواری ہوتی تھی لیکن وہ ایک بہترین تیراک تھا اور بڑی مہارت سے سمندر میں غوطہ لگاتا تھا۔

اس دن بھی سب لوگ غوطہ خوری کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اس جگہ سمندری چٹانیں بیس یا تیس فٹ نیچے تھیں جبکہ رنگین مچھلیاں چند فٹ کی گہرائی میں ہی نظر آجاتی تھیں۔ تیراکی سیکھنے اور غوطہ خوری کرنے والوں کے لیے یہ ایک بہترین جگہ تھی۔ فیلپ نے بھی پہلا آدھ گھنٹا کمر تک گہرے پانی میں ایک پُرکشش عورت اور اس کی نوعمر بیٹی کو یہ سکھانے میں گزارا کہ انہیں اسنارکل کی مدد سے کس طرح سانس لینا چاہیے اور بہ وقت ضرورت ماسک کو علیحدہ کرنے کے لیے انہیں کیا کرنا ہوگا۔ شروع شروع میں تو نمکین پانی کی وجہ سے اس کے زخم میں تکلیف ہوئی لیکن تھوڑی دیر بعد ہی وہ سب کچھ بھول گیا۔

سینورا آمپسن اس کے قریب ہی پانی میں کھڑا بے صبری سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ سیزن کے آغاز پر فیلپ نے چٹانوں سے دور ایک جگہ تلاش کی تھی جہاں کوئی خطرہ نہیں تھا اور وہ شارک مچھلیوں کا مسکن تھی۔

وکٹر نے سیاحوں کو اس جگہ کے بارے میں بتا کر ان کا شوق بڑھا دیا تھا اور اب سمپسن انتظار کر رہا تھا کہ فیلپ اسے وہاں کب لے کر جاتا ہے۔

فیلپ ان ماں بیٹیوں کو تیراکی سکھانے میں مصروف تھا۔ اس عورت کی چھوٹی بیٹی کو کچھ مشکل پیش آرہی تھی لیکن وہ مسلسل اس کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ اچانک ہی ایک مضبوط ہاتھ نے اس کے کندھے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

''ہم شارک مچھلیاں دیکھنے کب جائیں گے؟'' سمپسن نے پوچھا۔

فیلپ نے ساحل پر نظر دوڑائی۔ جہاں سبھی سیاح چھتریوں کے نیچے لگی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور وکٹر دوپہر کے کھانے کے انتظامات میں مصروف تھا۔ فیلپ نے کہا۔ ''لنچ ہونے والا ہے۔ اس کے فوراً بعد ہم وہاں جائیں گے۔''

امریکن سیاح نے سر ہلایا لیکن وہ اپنی ناراضی ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکا۔ ''ہم نے آدھا دن ویسے ہی ضائع کر دیا ہے اور تم ابھی تک ان شوقیہ لوگوں کو سکھانے میں لگے ہوئے ہو۔''

''ہم سب لوگوں کو مناسب وقت دیتے ہیں۔'' فیلپ نے اس شخص کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''صبح کا وقت نئے سیکھنے والوں کے لیے مخصوص ہے اور دوپہر میں ہم تجربہ کار لوگوں کے ساتھ سمندر میں جائیں گے۔''

سمپسن کا سینہ فخر سے چوڑا ہوگیا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ ہم لنچ کے فوراً بعد چلیں گے۔''

لنچ کے دوران بھی فیلپ کو ہی سارے کام کرنا پڑے۔ وہ کسی ہوٹل کے بیرے کی طرح سیاحوں کو کھانا پیش کرتا اور خالی پلیٹیں اٹھاتا رہا جبکہ وکٹر نے میزبانی کے فرائض سنبھال لیے تھے۔ وہ ہر میز پر جا کر سیاحوں سے ہلکی پھلکی گفتگو کرتا اور ان کی ضروریات معلوم کرتا۔ سمپسن بھی گردوپیش سے بے نیاز کھانے میں مصروف تھا اور اسے یہ پروا بھی نہیں تھی کہ اس کی بیوی وہاں موجود نہیں ہے۔ وہ اس وقت دو جوان آسٹریلین عورتوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جب فیلپ ان کی میز سے پلیٹیں اٹھانے لگا تو اس نے سمپسن کو غوطہ خوری کے بارے میں گفتگو کرتے سنا۔ وکٹر ایسا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ اس نے فوراً پیشکش کی۔

''سمندر کے اس حصے میں ایک چھوٹا سا چٹانوں کا سلسلہ ہے لیکن فیلپ تمہیں وہاں لے جائے گا۔ اس علاقے میں اس سے اچھا گائڈ کوئی نہیں۔''

آسٹریلین خواتین پر اس کی ترغیب کا کوئی اثر نہ ہوا۔ انہوں نے غوطہ خوری کے لیے مخصوص نقاب کرائے پر لینے سے انکار کر دیا اور سمندر کے کنارے دھوپ سینکنے کو ہی ترجیح دی۔

سمپسن کو وکٹر کی مداخلت اچھی نہ لگی اور وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ فیلپ کتنا اچھا گائڈ ہے۔ اس نے تو سارا دن یہیں ضائع کر دیا۔''

وکٹر کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔ فیلپ سمجھ گیا کہ اسے تنقید اچھی نہیں لگی اور اس سے بری بات یہ تھی کہ کوئی سیاح دوسروں کے سامنے اپنی ناراضی کا اظہار کرے۔ وکٹر تیزی سے چلتا ہوا اس کے پاس آیا اور اس کا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔ ''تم نے سمپسن کو گائڈ کیوں نہیں کیا؟''

فیلپ کو معلوم تھا کہ وہ کوئی وضاحت قبول نہیں کرے گا۔ وہ اپنے ہر گاہک پر نظر رکھتا تھا اور اس نے یقیناً دیکھا ہوگا کہ فیلپ لنچ سے پہلے ان تین خواتین کو تیراکی سکھا رہا تھا۔ اس لیے صرف سوری، کہنے پر اکتفا کیا۔

وکٹر اس کی بے عزتی کرنے کے لیے کوئی سخت لفظ استعمال کرنا چاہ رہا تھا لیکن اس کی انگریزی بہت کمزور تھی لہٰذا اس نے ہسپانوی زبان میں اپنی بھڑاس نکالی۔ فیلپ کو یوں لگا جیسے اس کا دل دھڑکنا بند کر دے گا۔ اسے اتنی شدید بے عزتی کی توقع نہیں تھی گو کہ وہاں موجود دوسرے لوگ نہ سمجھ سکے کہ وکٹر نے اسے کیا کہا تھا لیکن عین اس وقت بونی سمپسن وہاں آگئی اور فیلپ کو یوں لگا جیسے وہ سب سمجھ گئی ہے۔ وہ اپنی جگہ رک گئی اور اس کے چہرے کی رگیں تن گئیں۔

وکٹر نے فیلپ کو دھکا دیا اور بولا۔ ''جاؤ، جلدی سے بقیہ پلیٹیں بھی اٹھاؤ۔''

بونی کے علاوہ سب لوگ کھانے میں مصروف تھے۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے ایک طرف کھڑی ہوئی تھی۔ فیلپ کو لگا جیسے وہ اداس ہونے کے ساتھ ساتھ ناراض بھی ہے۔ سینورا آمپسن نے ابھی تک اسے نظر انداز کیا ہوا تھا اور اس نے اس وقت بھی کوئی نوٹس نہیں لیا جب فیلپ اس سے بات کر رہا تھا۔

''تم کھانا کیوں نہیں کھا رہیں؟'' وہ اس کے قریب جا کر بولا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''کھانے سے تمہاری طبیعت بہتر ہو جائے گی۔''

بونی نے قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''کاش یہ اتنا ہی آسان ہوتا۔''

فیلپ نے سر ہلایا لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔ سینورا آمپسن نے اپنی ٹھوڑی پر انگلی رکھی اور بولی۔ ''میرا شوہر ایک نئی ماڈل کی خاطر مجھے چھوڑنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔''

فیلپ نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ سمپسن ابھی تک ان آسٹریلین عورتوں سے خوش گپیوں میں مشغول تھا۔ اس نے سینورا کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''اسے محض عورتوں سے دوستیاں کرنے کا شوق ہے۔''

سینورا آمپسن مسکراتے ہوئے بولی۔ ''کاش یہ سچ ہوتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کھل کر اپنا ارادہ ظاہر کر چکا ہے اور امریکا واپس پہنچنے کے بعد وہ اس پر عمل کرے گا۔''

''تم یہیں رک جاؤ۔'' فیلپ بولا ''واپس جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔''

سینورا جانتی تھی کہ وہ سنجیدہ نہیں ہے اور صرف اس کا دل رکھنے کے لیے ایسا کہہ رہا ہے۔ وہ بولی۔ ''میں ضرور یہاں رہنا پسند کرتی لیکن مجھے سب کچھ بالکل نئے سرے سے شروع کرنا ہوگا۔''

''علیحدگی کی صورت میں تمہیں کافی پیسے ملیں گے۔'' وہ ایک سال امریکا میں رہ چکا تھا۔ اسی دوران میں اس کے دوست کے والدین کے درمیان طلاق ہوئی تو عدالت نے ان کی تمام دولت دونوں میں برابر برابر تقسیم کر دی تھی۔

بونی افسردگی سے بولی۔ ''اس نے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ میرے حصے میں کچھ نہیں آئے گا۔''

''ممکن ہے کہ اسے دل کا دورہ پڑے یا وہ کار کے حادثے میں ہلاک ہو جائے۔'' فیلپ کو احساس ہوا کہ اسے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی مگر بونی سے ہمدردی کے جوش میں وہ اپنی زبان پر قابو نہ رکھ سکا۔

بونی مسکراتے ہوئے بولی۔ ''وہ بالکل صحت مند ہے اور اس کا دل کسی بیس سالہ نوجوان کی طرح دھڑکتا ہے لیکن مجھے خوشی ہوئی کہ تم میرے بارے میں اس طرح سوچ رہے ہو۔''

''اس لیے کہ میں بھی اپنے انکل سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ خدا جانے اسے کب موت آئے گی۔'' فیلپ کو ایک بار، پھر اپنے آپ پر حیرت ہونے لگی۔ نہ جانے اس میں اتنی ہمت کیسے آگئی کہ وہ اپنے انکل وکٹر کے بارے میں ایسی بات کہہ گیا۔ شاید یہ بونی کی قربت کا اثر تھا۔

''میں بھی فریڈ کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔'' وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''ہم دونوں کا مسئلہ ایک جیسا ہے، لیکن میں وکٹر کو سنبھال سکتی ہوں۔''

فیلپ نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور بولا۔ ''مجھے یقین ہے کہ میرے انکل تمہیں پسند کرتے ہیں لیکن شاید وہ ایک امیر گاہک کی بیوی کی طرف بڑھنا پسند نہ کریں۔''

''امیر آدمی کی بیوہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

فیلپ کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ کیا اس کا مطلب وہی تھا جو وہ سمجھ رہا تھا۔

''تم میری بات سمجھ رہے ہو نا۔'' وہ اس کے قریب ہوتے ہوئے بولی۔

فیلپ نے بے یقینی کے انداز میں سر ہلا دیا لیکن چاہتا تھا کہ وہ اپنی بات کو واضح کرے۔

''جب تم دونوں سمندر کی گہرائی میں اترو گے تو وہاں کوئی بھی حادثہ ہو سکتا ہے۔''

اب فیلپ کی سمجھ میں ساری بات آگئی۔ وہ بری طرح خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس نے وہاں سے کھسک جانے میں ہی عافیت جانی لیکن بونی نے مضبوطی سے اس کی کلائی پکڑ لی اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ''یہ میرا وعدہ ہے کہ

اہم انتباہ

جملہ اشتہارات (جن کے مندرجات سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) نیک نیتی کی بنیاد پر شایع کیے جاتے ہیں۔ مشتہرین کے لیے ادارے کی معرفت آنے والی ڈاک ضایع کر دی جاتی ہے، قارئین رابطے یا معلومات کے لیے براہ راست مشتہرین سے رجوع کریں۔ اس ضمن میں کسی نقصان یا شکایت کی صورت میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی کوئی اخلاقی یا قانونی ذے داری نہیں ہوگی۔

ایک یا دو مہینے بعد واپس آجاؤں گی اور اس کے بعد......"

اس کے بعد کیا ہوگا۔ فیلپ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وکٹر ساٹھ سال کا ہونے کے باوجود پوری طرح صحت مند تھا۔ یہ عورت اسے کیا نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں نیچے کیں اور مایوسی کے انداز میں سر ہلا دیا۔

بونی نے اپنی انگلی سے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی، دونوں کی نظریں ملیں اور وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں جانتی ہوں کہ اسی طرح ہم دونوں اپنا مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔ خاص طور پر تم یہ کام بہ آسانی کر سکتے ہو، کیونکہ اس علاقے میں تم سے بہتر تیراک اور غوطہ خور کوئی اور نہیں۔"

فیلپ اپنی تعریف سن کر خوش ہوگیا لیکن کیا ایسا ممکن ہے؟ شاید اس میں مشکل نہ پیش آئے لیکن اس کے بعد کیا ہوگا۔ اس کے دل کی بات زبان پر آگئی اور وہ آہستہ سے بولا۔ "وکٹر...... اس کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟"

بونی پُراعتماد انداز میں مسکرائی جیسے وکٹر سے نمٹنا اس کے لیے کوئی مسئلہ ہی نہ ہو۔ "تم جانتے ہو کہ میں ایک نرس ہوں اور بقول تمہارے وکٹر مجھے پسند کرتا ہے لہٰذا مجھے اس کے قریب ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ میرے پاس ایسی دوا ہے جس سے اس کے دل کا علاج ہو سکے۔"

"لیکن اسے تو کوئی بیماری نہیں۔" فیلپ بے ساختہ بولا پھر جیسے ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ بونی کا پلان ہر لحاظ سے مکمل تھا۔ پہلے سینورا سمپسن پھر وکٹر، اس کے بعد...... یہ سوچ کر ہی اس کے دل میں گدگدی ہونے لگی۔

بونی اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سے قریب کیا اور سرگوشی میں بولی۔ "تم نے دیکھا یہ سب کچھ کتنی آسانی سے ہو جائے گا۔"

☆☆☆

لنچ کے بعد فیلپ نے تمام سیاحوں کو بتا دیا کہ اب وہ صرف انہی لوگوں کو سمندر میں لے کر جائے گا جو اچھے تیراک اور تجربہ کار غوطہ خور ہیں۔ یہ سن کر سینورا سمپسن کا سینہ چوڑا ہوگیا اور وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے دوسرے سیاحوں کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے انہیں چیلنج دے رہا ہو۔ بونی سمیت کسی بھی سیاح نے اس پُرخطر سفر کے لیے آمادگی ظاہر نہیں کی اور اب صرف فیلپ اور سمپسن ہی تیرتے ہوئے اس جگہ کی جانب بڑھ رہے تھے جہاں شارک مچھلیاں پائی جاتی تھیں۔ سمپسن ایک ماہر تیراک تھا۔ اس کو تیرتا دیکھ کر فیلپ کو یوں لگا کہ کچھ دیر پہلے جب بونی سمپسن سے باتیں کرتے ہوئے یہ امید ہو چلی تھی کہ آنے والے دنوں میں وہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کے قابل ہو سکے گا لیکن یہ خواہش شاید اتنی آسانی سے پوری نہ ہو سکے گی۔ سمپسن اور اس کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا اور وہ کوشش کے باوجود اس فاصلے کو کم نہیں کر سکا تھا۔

کچھ دور جانے کے بعد سمپسن رک گیا اور اس نے پیچھے کی طرف آنا شروع کر دیا۔ جب وہ فیلپ کے قریب پہنچا تو اس نے اپنا سر پانی سے نکالا اور ماسک ہٹاتے ہوئے بولا۔ "اب ہم اس جگہ سے کتنی دور ہیں؟"

فیلپ نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم وہ چٹان دیکھ رہے ہو، بس وہ جگہ اس کے قریب ہے۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو میٹر کا فاصلہ طے کرنا ہوگا۔"

سمپسن نے سر ہلایا اور بولا۔ "بہتر ہوگا کہ اگلی بار تم ایک کشتی کا انتظام کر لو۔ میں غوطہ خوری کرنے آتا ہوں نہ کہ سارا دن تیراکی میں ضائع کرنے۔"

فیلپ اس کی جھلاہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے دوبارہ اپنی اسنارکل منہ پر لگالی اور سمپسن کو بھی ایسا کرتے دیکھا۔ اس نے ایک بار پھر تیرنا شروع کیا لیکن اس مرتبہ اس کی رفتار سست تھی۔ تیراکی یا غوطہ خوری کے درمیان بات نہیں کی جا سکتی۔ ایک لمحہ کے لیے فیلپ نے اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کیا اور یوں لگا جیسے روئے زمین پر وہ آخری شخص ہو لیکن اچانک ہی سمپسن تیرتا ہوا اس کے برابر آگیا۔ فیلپ نے ایک گہرا سانس لیا اور پانی میں ڈبکی لگا دی۔

سورج کی روشنی پانی کی سطح پر پڑ کر منعکس ہو رہی تھی جس کی وجہ سے مونگے کی چٹانیں صاف نظر آرہی تھیں۔ تقریباً بیس فٹ کی گہرائی میں فیلپ کو نیلی جلد والی مچھلیوں کا جوڑا نظر آیا۔ اس نے ان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سمپسن کی طرف دیکھا لیکن اس نے صرف اپنا سر دائیں بائیں گھمایا اور ہاتھ ہلا کر یہ ظاہر کیا کہ وہ ان مچھلیوں کو پہلے بھی دیکھ چکا ہے۔ فیلپ نے ایک بار پھر اپنا سر باہر نکال کر اسنارکل کو صاف کیا اور ایک گہری سانس لے کر آہستہ آہستہ اس چٹان کی جانب بڑھنا شروع کیا جو پانی کی سطح سے باہر نظر آرہی تھی۔ وہ ایک بار پھر ڈبکی لگانے کے لیے جھکا لیکن سمپسن نے اس کا ٹخنہ پکڑ کے اوپر اٹھا لیا پھر اس نے منہ پر سے اسنارکل ہٹائی اور بولا۔ "سمندر کی سیر بہت ہو چکی۔ میں وہ شارک مچھلیاں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

فیلپ نے سر ہلایا لیکن اپنی اسنارکل نہیں ہٹائی تاکہ اسے کوئی جواب نہ دینا پڑے پھر اس نے اپنا سر نیچے کیا اور تیرنا شروع کر دیا۔ سمپسن بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ پچیس فٹ گہرائی میں چلا گیا۔ جہاں اسے ایک چٹان نظر آئی۔ اس نے سیزن کے دوران میں اکثر و بیشتر یہاں شارک مچھلیاں دیکھی تھیں۔ وہ چٹان کے اوپری حصے پر سے تیرتا ہوا دوسری طرف پہنچا لیکن وہاں چھوٹی مچھلیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ آگے چل کر مونگے کا ایک اور ستون نظر آیا جو ایک قوس کی شکل میں چٹان کی بنیاد سے جڑا ہوا تھا۔ فیلپ اس کے درمیانی خلا سے تیرتا ہوا گزر گیا۔ جہاں اسے ایک دو میٹر لمبی شارک نظر آئی۔

سمپسن اس کے عقب میں تھا۔ وہ مچھلی کے قریب ہونے کے لیے آگے بڑھا۔ اس نے اپنی رفتار کم کی اور چٹان کی دیوار کا سہارا لے کر اس نے مچھلی کو چھونے کی کوشش کی۔ شارک نے اپنی آنکھیں گھمائیں اور اپنی جگہ سے تھوڑی سی سرک گئی۔ اس کے ساتھ ہی سمپسن بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور ایک جھٹکے سے اس کے دونوں بازو چٹان سے پھسل گئے۔ فیلپ نے شارک کو حرکت کرتے دیکھا تو چٹان کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ تیرتے ہوئے دور چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ سمپسن کا بریسلیٹ چٹان کے ایک ٹکڑے میں پھنس گیا تھا اور وہ اپنے آپ کو آزاد کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کی نظر فیلپ پر گئی تو اس نے اپنا دوسرا ہاتھ مدد کے لیے ہلایا۔ فیلپ اس کے قریب گیا اور دیکھا کہ سمپسن نے تقریباً اپنا بریسلیٹ چٹان کے اس ٹکڑے سے نکال لیا ہے۔ اس نے سمپسن کی کلائی پکڑی اور بجائے اس کے کہ وہ اسے باہر کی جانب کھینچتا۔ اس نے جھٹکا دے کر بریسلیٹ کو اور نیچے کر دیا پھر اس نے اس کی پشت پر اپنے گھٹنے سے ضرب لگائی۔ اب سمپسن اس پوزیشن میں آگیا تھا کہ وہ کسی بھی طرح اپنا بریسلیٹ چٹان کے ابھرے ہوئے نوکیلے حصے سے نہیں نکال سکتا تھا۔ فیلپ نے ایک جھٹکے سے سمپسن کا ماسک اور اسنارکل اتار کر پھینک دیے اور واپس چلا آیا۔

☆☆☆

فیلپ جانتا تھا کہ وکٹر کے لیے یہ حادثہ کتنا تلخ ہوگا اور وہ خوف سے پریشان ہوتا رہے گا کہ سمپسن کی موت سے اس کا کاروبار متاثر ہو سکتا ہے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دو چار دن تک اس خبر کا چرچا رہا پھر لوگ اسے ایک حادثہ سمجھ کر بھول گئے اور سیاحوں کی آمد و رفت ہمیشہ کی طرح جاری رہی مگر سمپسن کی موت سے وکٹر کو اتنا صدمہ پہنچا کہ وہ فیلپ کو سزا دینا بھی

بھول گیا۔ وہ اتنا اچھا تیراک نہیں تھا اور کبھی سمندر میں نہیں گیا تھا لیکن جب اس نے فیلپ کو سمپسن کی لاش کے ساتھ تیرتے دیکھا تو اس نے بھی سمندر میں چھلانگ لگادی اور اس کی لاش کو ساحل تک لانے میں مدد دی۔

بونی سمپسن کو اس حادثے کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ وقت گزاری کے لیے جزیرے کی سیر میں مصروف تھی۔ وکٹر نے ایک آدمی کو اسے بلانے کے لیے بھیجا۔ وہ اور فیلپ اس کے انتظار میں لاش کے پاس ہی موجود رہے۔

''کیا ہوا تھا؟'' وکٹر نے سمپسن کی زخمی کلائی کی طرف اشارہ کرکے ہسپانوی زبان میں پوچھا۔

''اس کا بریسلیٹ ایک چٹان کے ابھرے ہوئے نوکیلے حصے میں پھنس گیا تھا۔ اس نے اسے نکالنے کے لیے زور آزمائی کی تو اس میں گرہ پڑگئی۔''

وکٹر نے تیوری چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''وہ احمق پانی میں بریسلیٹ پہن کر کیوں گیا۔ شاید اسے اس کے گم ہوجانے کا ڈر ہوگا۔''

بونی سمپسن تقریباً دوڑتے ہوئے وہاں پہنچی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ شاید اسے اس حادثے کی اطلاع مل گئی تھی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی اور وہ شدید غم کی کیفیت میں نظر آرہی تھی۔ کچھ دیر بعد قریبی چوکی سے ایک نوجوان پولیس آفیسر بھی آگیا۔ شاید کسی نے سیل فون پر اسے اطلاع دی تھی۔ اس نے فیلپ، وکٹر اور بونی کے بیانات قلم بند کیے اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے کے انتظامات کرنے لگا۔

☆☆☆

بونی سمپسن کے چلے جانے کے بعد فیلپ کو اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہونے لگا۔ اب تک اس نے جتنے بھی سیاحوں کی خدمت کی تھی ان میں وہ سب سے زیادہ پُرجوش اور مہربان تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اب بھی اس جزیرے پر دوبارہ آئے گی۔ گو کہ اس نے فیلپ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے وکٹر کے شکنجے سے آزاد کرائے گی لیکن فیلپ کچھ زیادہ پُرامید نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ اس نے سمپسن سے جان چھڑانے کے لیے فیلپ کو استعمال کیا ہو۔ اسے اپنے کیے پر کوئی پچھتاوا نہیں تھا اور وہ سمجھ رہا تھا کہ سمپسن کی قسمت میں یہی لکھا تھا۔

وکٹر نے اس کے بعد حادثے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی البتہ اس کے رویے میں خاصی تبدیلی آگئی تھی۔ اس نے فیلپ پر مزید پابندیاں عائد کردی تھیں اور اس سے بہت کم بات کرتا تھا۔ یہاں تک کہ دو ماہ بعد جب بونی سمپسن نے تین دن کے ٹور کے لیے بکنگ کروائی تب بھی اس نے فیلپ کو یہ بات نہیں بتائی۔ فیلپ نے اس کا نام اس فہرست میں دیکھا جو وکٹر ہر ہفتے مرتب کرتا تھا۔ وہ دو دن بعد آرہی تھی۔ فیلپ کے پورے جسم میں حرارت دوڑ گئی۔ اس نے بار بار فہرست پر نظر ڈالی اور اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ وہ واقعی اپنے وعدے کے مطابق آرہی تھی۔ اس سے ضبط نہ ہوسکا اور وہ بول پڑا۔ ''سینورا سمپسن آرہی ہے؟''

وکٹر نے اخبار پڑھتے ہوئے نظریں اوپر اٹھائیں اور بولا۔ ''ہاں، میں نے بھی اس کا نام فہرست میں دیکھا ہے، وہ بڑی مہربان عورت ہے۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ہمیں ہی اس حادثے کا ذمے دار سمجھتا۔''

فلیپ نے تائید میں سر ہلادیا۔ اب وہ بے چینی سے اس کی آمد کا انتظار کررہا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ وہ وکٹر کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہوجائے گی اور اس کی دوا سے وکٹر کا دل بند ہوجائے گا۔ ویسے وہ اتنی پُرکشش اور اسمارٹ تھی کہ دوا کے بغیر بھی وکٹر کے دل کی حرکت بند ہوسکتی تھی۔ اسے اپنے بارے میں شبہ ہونے لگا کہ وکٹر کے بغیر وہ تنہا اس کاروبار کو کیسے چلائے گا، پھر اسے خود ہی اس احمقانہ سوچ پر ہنسی آنے لگی۔ اب بھی تو سارا کام وہی کرتا ہے۔ وکٹر کو حکم چلانے کے سوا کیا آتا ہے۔ اس نے اپنے ذہن سے ان تمام خیالات کو جھٹک دیا۔

پیر کی صبح بونی اپنے پروگرام کے مطابق آگئی۔ وہ پہلے سے زیادہ جوان اور صحت مند نظر آرہی تھی۔ اس نے چست لباس پہن رکھا تھا اور اس کے چہرے کا بڑا حصہ ایک ہیٹ میں چھپا ہوا تھا۔

وکٹر نے خوشامدانہ انداز میں اس کا استقبال کیا اور انگریزی میں بولا۔ ''ایک بار پھر میں تمہارے نقصان پر اظہار افسوس کرتا ہوں۔ امید ہے کہ اس مرتبہ تمہارا قیام خوش گوار رہے گا۔''

بونی نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور بولی۔ ''پلیز وکٹر! اب اس بات کو دہرانے سے کیا فائدہ۔''

پھر وہ فیلپ کی طرف متوجہ ہوئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''اوہ فیلپ'' یہ کہہ کر اس نے اس کے دونوں گالوں پر پیار کیا جیسے وہ کوئی چھوٹا سا بچہ ہو اور بولی۔ ''تم ٹھیک تو ہونا؟''

''ہاں۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔''

بونی نے ایک خاص انداز سے اپنی بھوؤں کو حرکت

دی۔ جس میں فیلپ کے لیے ایک واضح پیغام تھا پھر اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بولی۔ ''تمہارا زخم تو اب بھر گیا ہے۔''

''ہاں، تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' فیلپ نے ایک بار پھر وہی جملہ دہرایا۔

☆☆☆

اس دن سیاحوں کو ڈیابلو پر ڈیڈو، نامی پہاڑی کے دامن میں واقع ایک گاؤں کی سیر کے لیے لے جایا گیا جو اب آثار قدیمہ کی حیثیت اختیار کرچکا تھا۔ فیلپ یہاں بھی گائڈ کے فرائض انجام دے رہا تھا اور سیاحوں کو یہاں کی قدیم تاریخی عمارتوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وکٹر نے قریبی مارکیٹ میں سیاحوں کے لیے لنچ کا انتظام کر رکھا تھا۔ بونی نے کچھ دیر تو فیلپ کا لیکچر سنا اور اس کے بعد گھومنے کے لیے نکل گئی۔ جب فیلپ بقیہ لوگوں کو لنچ کے لیے لے کر آیا تو اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ بونی نے منصوبے کے مطابق وکٹر کے قریب ہونا شروع کردیا تھا۔ وہ وکٹر کے ساتھ بیٹھی کسی خوش رنگ مشروب کی چسکیاں لے رہی تھی اور وہ اس سے بڑی لگاوٹ سے باتیں کررہا تھا۔ بونی نے اس کی کسی بات پر زور سے قہقہہ لگایا اور پھر دونوں دیر تک ہنستے رہے۔

جب سیاحوں کا گروپ واپس آیا تو فیلپ کو یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ بونی بھی سب لوگوں کے ساتھ ہی اپنے ہوٹل چلی گئی تھی جبکہ وہ توقع کررہا تھا کہ وہ مزید کچھ وقت وکٹر کے ساتھ گزارے گی لیکن اسے اس بارے میں زیادہ پریشانی نہیں تھی۔ بونی کے پاس ابھی کافی وقت تھا اور وہ وکٹر کو اچھی طرح اپنے قابو میں کرسکتی تھی۔

گھر آنے کے بعد وکٹر نے فخریہ انداز میں اسے بتایا کہ بونی رات کا کھانا اس کے ساتھ کھائے گی۔ فیلپ کو یقین نہیں آیا کہ معاملات اتنی تیزی سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ وہ حیرت سے بولا۔ ''کیا واقعی؟''

وکٹر نے سر ہلایا اور کہا۔ ''ہاں، وہ بہت ہی نفیس عورت ہے۔''

''بہت عمدہ!'' فیلپ نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔ ''تم کبھی اتنے بہادر نہیں تھے کہ سینورا سمپسن جیسی عورت کو کھانے پر مدعو کرسکو۔''

وکٹر نے شانے اچکائے جیسے اس کے نزدیک یہ معمولی بات ہو اور بولا۔ ''وہ یہاں رہنے میں دلچسپی ظاہر کررہی ہے شاید اس کا ارادہ کوئی کاروبار شروع کرنے کا ہے۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ میں اس سلسلے میں اس کی ہر ممکن مدد کروں گا۔''

فیلپ مسکرا دیا۔ بونی سمپسن اس کی توقع سے کہیں زیادہ تیز ثابت ہورہی تھی۔ شام کو جب وہ ڈنر کے لیے آئی تو اس نے وکٹر کے قتل کا پورا سامان کر رکھا تھا۔ اس نے کشادہ گلے کا سرخ لباس پہن رکھا تھا۔ وکٹر نے بھی اپنے آپ کو سجانے سنوارنے میں خاصا اہتمام کیا تھا۔ جب وہ دونوں جانے لگے تو وکٹر نے فیلپ سے کہا۔ ''میرا انتظار مت کرنا۔''

فیلپ لمبی تان کر سو گیا پھر اس کی آنکھ صبح سویرے ہی کھلی۔ البتہ رات دو بجے کے قریب اس کی آنکھ کسی کار کی آواز سن کر کھلی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ بونی سمپسن ایک ٹیکسی میں سوار ہورہی تھی۔ اس کے انداز سے اطمینان جھلک رہا تھا جیسے وہ اپنے مشن میں کامیاب ہوگئی ہے۔

وہ بستر میں لیٹا آنے والے لمحات کا تصور کررہا تھا۔ یہ اس کی نئی زندگی کا پہلا دن تھا جس کے ایک ایک لمحے کو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کرلینا چاہتا تھا۔ اس نے تصور کی آنکھ سے تھوڑی دیر بعد اپنے آپ کو وکٹر کے دفتر میں سیاحوں کے ہجوم میں گھرا ہوا پایا۔ وہ سب وکٹر کی غیر حاضری پر برہم تھے۔ وہ وکٹر سے سیل فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر ناکامی ہوتی ہے۔ بالآخر وہ اس کے اپارٹمنٹ میں جاتا ہے جہاں وکٹر مردہ حالت میں پڑا ہوتا ہے۔

اس تصور کو ذہن میں سجائے وہ گنگناتے ہوئے دفتر میں داخل ہوا تو وکٹر کو وہاں بیٹھا دیکھ کر اس کے تصور کی کرچیاں بکھر گئیں۔ وہ پہلے سے زیادہ جوان اور خوش نظر آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے اور وہ دوسرے ہاتھ سے رجسٹر کے صفحات پلٹ رہا تھا۔ فیلپ کو دیکھ کر وہ اپنے آپ کو روک نہ سکا اور بولا۔ ''ایک بہت اچھی خبر ہے۔''

''کیا؟''

وکٹر اسے بتانے لگا کہ بونی سمپسن اس کے کاروبار میں شریک ہونا اور سرمایہ لگانا چاہتی ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ ماضی کو بھلا کر اب وہ یہیں قیام کرے۔ وہ توانا اور ذہین ہے اور اس کے ذہن میں کاروبار کو آگے بڑھانے کے کئی طریقے ہیں۔ وکٹر کہہ رہا تھا۔ ''تم نہیں جانتے کہ وہ کتنی زبردست عورت ہے۔ اس کی باتوں سے مجھ میں جینے کا حوصلہ پیدا ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی رفاقت میں زندگی کا سفر بہت اچھا گزرے گا۔''

وکٹر کے الفاظ اس کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتر رہے تھے، وہ اپنی دھن میں بولتا جا رہا تھا اور فیلپ اپنے ذہن میں کسی ایسے گوشے کی تلاش میں تھا جہاں وہ اپنی آخری امید کی لاش کو دفن کرسکے۔

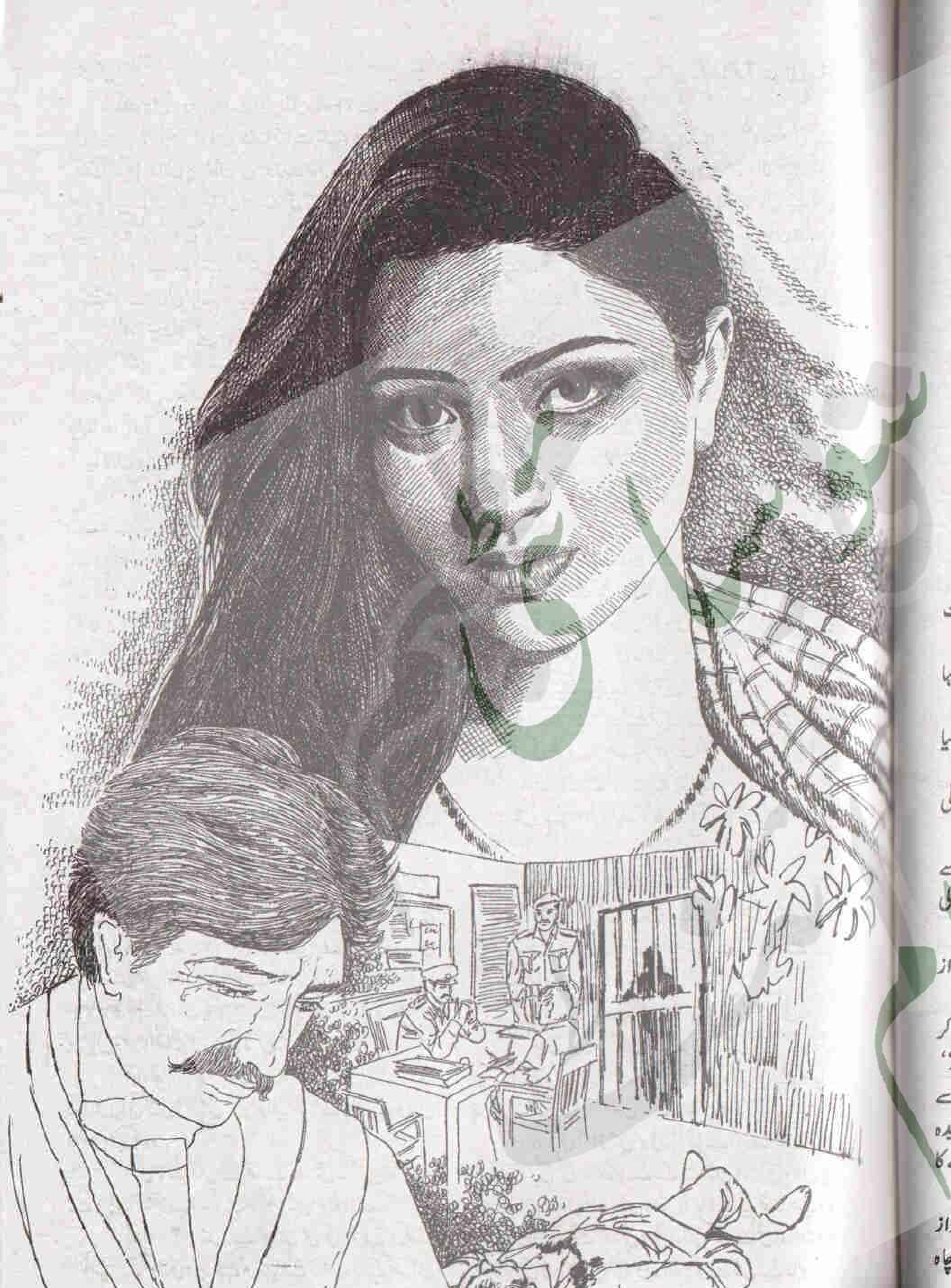

فتنہ گر

ملک صفدر حیات

عشق جوانی کا ہو یا بڑھاپے کا... ہوس سے دور رہے تو کامیاب ورنہ... ہر موڑ پر فتنہ گری برپا کرتا چلا گیا... اور جب کوئی دو کشتیوں میں سوار ہوکر ایک تیر سے دو نشانے لگانے کی کوشش کرے تو خطا ہو ہی جاتی ہے... اور ایسے میں خطاوار کو سزا دلانا ضروری ہوجاتا ہے... ملک صفدر حیات نے بھی اس کھلاڑی کے تمام واروں کو خالی ثابت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ بڑھاپے میں مضبوط لاٹھی سہارا دیتی ہے اور نازک انگلی کا سہارا تمام چالوں کو لڑکھڑا دیتا ہے... بس اسی انتخاب میں اس سے بھی غلطی ہوگئی... گویا مجرم کہیں نہ کہیں غلطی کر ہی جاتا ہے۔

ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کا فرسودہ انداز

ایک روز میں حسبِ معمول تیار ہوکر تھانے پہنچا تو پتا چلا، دو افراد کافی دیر سے میرے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ میں نے انہیں فوراً اپنے کمرے میں بلالیا۔

ان میں سے ایک مرد اور دوسری عورت تھی۔ ان کے حوالے سے میرے ذہن میں پہلا خیال یہی ابھرا کہ وہ دونوں میاں بیوی ہیں۔ مرد کی عمر لگ بھگ پچاس نظر آتی تھی۔ وہ وضع قطع، لباس اور رکھ رکھاؤ سے آسودہ حال لگتا تھا۔ عورت کی عمر کا اندازہ میں نے تیس اور پینتیس کے درمیان قائم کیا۔ وہ تیکھے نقوش کی مالک، ایک خوب صورت اور دلکش عورت تھی تاہم اس وقت وہ کسی گہری پریشانی میں مبتلا دکھائی دیتی تھی۔ مرد بھی خاصا سنجیدہ اور فکرمند تھا۔

میں نے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا پھر باری باری دونوں کے چہروں کا جائزہ لینے کے بعد پوچھا۔ ”جی فرمائیں...... میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟“

”میرا نام نواب علی ہے۔“ مرد نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ فریدہ بی بی ہے......“ اس نے اپنی ساتھی عورت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مزید بتایا۔ ”فریدہ کی جوان بیٹی کو اغوا کرلیا گیا ہے۔ ہم اسی سلسلے میں رپورٹ درج کرانے آپ کے پاس آئے ہیں۔“

نواب علی کی بات سن کر میں چونک اٹھا اور پوچھا۔ اور سمجھ گیا کہ نہ فریدہ کی بیٹی اس کی بیٹی ہے اور نہ فریدہ اس کی بیوی۔

”جی......“ میں نے نواب علی کی بات سن کر اثبات میں سر ہلایا۔ سوالیہ انداز میں دیکھنے لگا وہ مزید بولا۔

”لڑکی کا نام عابدہ ہے لیکن عام طور پر اسے عابو کہا جاتا ہے۔ عمر یہی کوئی تیئس، چوبیس سال رہی ہوگی۔“

”عابدہ عرف عابو کو کب اور کہاں سے اغوا کیا گیا ہے؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”وہ آج صبح سے غائب ہے جناب!“ فریدہ نے پہلی مرتبہ لب کشائی کی۔

”غائب...... کیا مطلب؟“ میں نے سوالیہ نظر سے باری باری انہیں دیکھا اور پوچھا۔ ”آپ تو عابدہ کے اغوا کی رپورٹ درج کرانے آئے ہیں۔“

”ایک ہی بات ہے جی۔“ فریدہ الجھن زدہ انداز میں بولی۔

”ایک بات نہیں ہے بی بی۔“ میں نے زور دے کر کہا۔ ”اغوا الگ معاملہ ہے اور غائب ہوجانا دوسری بات۔“

”تھانے دار صاحب!“ نواب علی نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”فریدہ دراصل، ذہنی طور پر بہت پریشان ہے۔ اس کے کہنے کا مطلب ہے، عابدہ کو آج صبح اغوا کیا گیا ہے۔“

”جی...... جی ہاں۔“ وہ جلدی سے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میں آپ کو یہی بتانا چاہ

رہی تھی!''

مجھے یوں محسوس ہوا ہے دال میں کچھ کالا ہے۔ دونوں کی بات، بیان اور چہروں کے تاثرات میں وہ ربط ضبط نظر نہیں آتا تھا جو اس پریشان کن صورتِ حال کا خاصا اور تقاضا ہونا چاہیے۔ گڑبڑ کا احساس ہوتے ہی میں نے اپنی تسلی کے لیے کرید کا عمل شروع کر دیا۔

''نواب صاحب!'' میں نے مرد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ کا فریدہ سے کیا تعلق ہے؟''

''انسانیت کا تعلق ہے جناب۔'' وہ بڑی سادگی سے بولا۔

''میں نے فلسفہ بیان کرنے کو نہیں کہا نواب صاحب!'' میں نے قدرے سخت انداز میں کہا۔ ''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کس حیثیت سے فریدہ کے ساتھ آئے ہیں۔ آپ کا ان لوگوں سے کیا رشتہ ہے؟''

''سچ پوچھیں تو...... میری ان سے کوئی رشتے داری وغیرہ تو ہے نہیں۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ''آپ میری آمد کو انسانی ہمدردی کہہ سکتے ہیں۔ دراصل، فریدہ کے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔ اس کا شوہر کسی زمانے میں ہماری دکان پر کام کرتا تھا پھر محلے داری بھی ہے لہٰذا میں ایک نیک کام سمجھتے ہوئے فریدہ کے ساتھ آگیا ہوں۔ بس، اتنی سی بات ہے۔''

یہ ''اتنی سی بات'' اس نے جس تفصیل سے بیان کی تھی اس سے پتا چلتا تھا کہ اگر اسے کسی بڑی بات کو بیان کرنے کا موقع دیا جاتا تو پھر آج کا دن پار تھا۔

یہ تفصیل جان کر میں نے پہلے نواب علی کو نمٹانا ضروری سمجھا اور پوچھا۔ ''آپ کی کس چیز کی دکان ہے؟''

''آڑھت کی جناب!'' اس نے جواب دیا۔ ''ادھر سبزی منڈی میں پھل اور سبزی کا میرا خاصا وسیع کاروبار ہے ''خان فروٹ اینڈ ویجی ٹیبل مرچنٹ'' کے نام سے۔ کسی زمانے میں فریدہ کا شوہر یعقوب ہمارے پاس پلے داری کا کام کرتا تھا۔ فروٹ و سبزی کے ٹوکرے اور آلو پیاز کی بوریاں وغیرہ اٹھانا اس کے فرائض میں شامل تھا۔''

''تھا، تھا...... کا مطلب یہ ہوا ناکہ یعقوب اب اس دنیا میں باقی نہیں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے باری باری ان دونوں کو دیکھا۔

''ایسی بات نہیں ہے تھانے دار جی۔'' فریدہ جلدی سے بولی۔ ''یعقوب زندہ ہے اور گھر میں موجود ہے۔''

''پھر......؟'' میں نے نواب علی کی طرف دیکھا۔ ''آپ نے تھوڑی دیر پہلے تو بتایا ہے کہ فریدہ کے گھر میں کوئی مرد نہیں تھا اس لیے آپ اس کے ساتھ آئے ہیں۔ کیا آپ یعقوب کو مرد نہیں سمجھتے؟''

''وہ بات درحقیقت یہ ہے جناب......'' وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''فریدہ کا گھر والا پچھلے تین سال سے معذوری کی زندگی گزار رہا ہے۔ تین سال پہلے اس پر فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ اس کا نچلا دھڑ بالکل بے جان ہو کر رہ گیا ہے اور نظر پر بھی برا اثر پڑا ہے۔ سمجھیں کہ وہ چارپائی سے لگ گیا ہے۔ فریدہ بے چاری پچھلے تین سال سے اس کی خدمت کر رہی ہے۔''

نواب کی وضاحت سے قدرے مطمئن ہونے کے بعد میں نے روئے سخن فریدہ کی جانب موڑا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تو تمہاری بیٹی عابدہ کو آج صبح اغوا کیا گیا ہے......؟''

''جی...... جی ہاں۔'' اس نے فوراً تائیدی انداز میں گردن ہلا دی۔

وہ موسم سرما کے دن تھے اور اس وقت صبح کے نو، ساڑھے نو بجے تھے۔ فریدہ کا بیان تھا کہ عابدہ کو آج ہی صبح اغوا کیا گیا تھا لہٰذا یہ واقعہ بھی تازہ ہی تھا۔ میں نے تصدیق کی خاطر پھر بھی پوچھنا ضروری جانا۔

''صبح کتنے بجے یہ واقعہ پیش آیا ہے؟''

جواب دینے سے پہلے فریدہ نے متذبذب انداز میں نواب علی کی طرف دیکھا پھر ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولی۔ ''کوئی سات ساڑھے سات بجے جناب......''

میں نے سوال کیا۔ ''عابدہ کو کہاں سے اغوا کیا گیا ہے؟''

''محلے کے مین بازار میں سے۔''

''اوہ......!'' میں نے چونکتے ہوئے انداز میں فریدہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، اس واقعے کے کئی لوگ گواہ ہوں گے...... یعنی عینی شاہد؟''

''یہ...... یہ تو مجھے پتا نہیں جناب۔'' وہ گڑبڑا گئی۔

''کیا پتا نہیں؟'' میں نے تیز آواز میں کہا۔ ''تمہاری بیٹی محلے کے بازار میں سے اغوا کی گئی ہے تو اس واقعے کو چار چھ لوگوں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہی ہوگا۔''

وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''تھانے دار صاحب! میں نے تو عابو کو صبح صبح دودھ لانے کے لیے مین بازار کی دکان پر بھیجا تھا۔ اسے دس منٹ میں واپس آجانا چاہیے تھا۔ جب وہ واپس نہیں آئی تو مجھے تشویش ہوئی۔ میں گھر سے نکلی اور اللہ دتا دودھ فروش کی دکان پر پہنچ گئی۔ اللہ دتا سے میں نے عابو کے بارے میں پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا میں اور پریشان ہوگئی۔ محلے کے جس جس گھر میں اس کے جانے کے امکانات تھے، میں نے وہاں جا کر دیکھ لیا لیکن وہ کہیں نہیں ملی......''

اس کی آواز رندھ گئی، چند لمحات کے توقف کے بعد اس نے بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''جب ہر طرف سے ناکامی دیکھنے کو ملی تو میں سیدھی نواب صاحب کے پاس پہنچ گئی۔ انہوں نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور یہی مشورہ دیا کہ اس واقعے کی تھانے میں رپورٹ درج کرانا چاہیے، پھر ہم آپ کے پاس آگئے۔''

''بہت اچھا کیا جو آپ لوگ میرے پاس آگئے۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''لیکن یہ معاملہ مجھے خاصا الجھا ہوا نظر آرہا ہے۔''

''کیوں جی......؟'' فریدہ نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں مجھے دیکھا۔ ''کیا الجھن ہے اس معاملے میں......؟''

''سب سے بڑی الجھن تو یہ ہے فریدہ بی بی کہ تم اس بات پر اصرار کر رہی ہو کہ تمہاری بیٹی عابدہ کو اغوا کر لیا گیا ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''نہ تو تم نے اغوا کنندگان کو دیکھا ہے اور نہ ہی ایسا کوئی اور عینی شاہد موجود ہے، پھر میں کیسے مان لوں کہ عابدہ کو واقعی اغوا کیا گیا ہے...... تمہارے پاس اس دعوے کا کوئی ٹھوس ثبوت بھی ہے یا یونہی ہوا میں لٹھ گھما رہی ہو؟''

''جی، میرا دل گواہی دیتا ہے کہ میری بچی کو اغوا کیا گیا ہے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''بی بی! یہ تھانا ہے اور اس کے بعد کچہری کا نمبر آتا ہے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''ان دونوں جگہوں پر قانون کی کتابوں کے مطابق معاملات نمٹائے جاتے ہیں اور قانون ہر بات کے لیے واضح دلیل اور ٹھوس ثبوت مانگتا ہے۔''

''عابدہ والے معاملے نے تو فریدہ کی مت ماردی ہے جناب!'' نواب علی نے صورتِ حال کو سنبھالتے ہوئے کہا پھر براہ راست وہ اپنی ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''فریدہ! تھانے دار صاحب کو نواز کے بارے میں بتاؤ نا......!''

''نواز...... یہ کون ہے؟'' میں نے چونک کر نواب علی کی طرف دیکھا۔

جواب فریدہ نے دیا۔ ''تھانے دار جی! اسی لفنگے نواجا (نواز) نے تو میری بیٹی کو اغوا کیا ہے۔ میں نواجا کے خلاف رپورٹ درج کرانے آئی تھی لیکن پریشانی میں دماغ نے گڑبڑ کر دی۔''

''اور اب میرے دماغ میں گڑبڑ شروع ہو گئی ہے۔'' میں نے ذومعنی نظر سے یکے بعد دیگرے ان دونوں کو دیکھا پھر نواب علی سے پوچھا۔ ''نواب صاحب! یہ کیا چکر چل رہا ہے؟''

''کوئی چکر نہیں جناب۔'' وہ بات بناتے ہوئے بولا۔ ''فریدہ بہت زیادہ بوکھلائی ہوئی ہے اس لیے اس کی باتوں میں ربط نہیں۔''

''آپ تو بوکھلائے ہوئے نہیں ہیں نا!'' میں نے بڑی گہری نظر سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ ''جو بھی حقیقت ہے، وہ آپ ہی بیان کر دیں۔ قسطوں میں لقمے دے دے کر آپ معاملات کو الجھا رہے ہیں......؟'' میرے آخری جملے میں طنز بھی شامل ہو گیا تھا۔

''جناب! میں تو یہی چاہ رہا تھا کہ فریدہ خود اپنی زبان سے سب کچھ بتائے۔'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ بہت زیادہ گھبرائی ہوئی ہے۔''

''اور میں دیکھ رہا ہوں کہ اس کی گھبراہٹ کا سبب آپ ہیں۔''

''جی...... کیا مطلب؟'' وہ بدکنے والے انداز میں مستفسر ہوا۔

''مطلب یہ کہ......'' میں نے جو محسوس کیا تھا وہ بے دھڑک کہہ دیا۔ ''ہر سوال کا جواب دینے سے پہلے امداد طلب نظر سے آپ کو دیکھتی ہے جیسے بولنے کے لیے آپ سے اجازت طلب کر رہی ہو۔ یوں لگتا ہے، یہ اپنی مرضی سے یہاں نہ آئی ہو بلکہ آپ اسے زبردستی پکڑ کر تھانے لے آئے ہوں۔''

''ایسی...... بات نہیں ہے...... ملک صاحب!'' وہ گڑبڑا گیا۔

''بات کیسی بھی ہے!'' میں نے رکھائی سے کہا۔ ''آپ تھوڑی دیر کے لیے باہر برآمدے میں جا کر بیٹھیں۔ میں تنہائی میں فریدہ کا بیان لینا چاہتا ہوں۔ اگر اس دوران میں آپ کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں بلاتکلف آپ کو اندر بلا لوں گا۔''

میرا انداز اتنا دوٹوک اور واضح تھا کہ وہ اپنے وہاں رکنے کے لیے کوئی توجیہہ پیش نہ کر سکا۔ اس نے میرے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اس سلسلے میں اس کی کوئی بات نہیں سنوں گا۔ وہ اٹھا اور خاموشی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

''ہاں تو فریدہ بی بی!'' میں نے نواب علی کے جانے

کے بعد عابدہ کی ماں سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔
”تمہارے بیان کے مطابق عابدہ آج صبح دودھ لینے کے لیے دکان پر گئی اور پھر واپس نہیں آئی۔ جہاں تک ممکن تھا، تم نے اسے ڈھونڈ لیا لیکن کسی کو اس کی کوئی خبر نہیں اور اب تمہارا دعویٰ ہے کہ نواز نے تمہاری بیٹی کو اغوا کرلیا ہے۔ سب سے پہلے تو تم مجھے یہ بتاؤ کہ نواز ہے کون؟“

”وہ کمینہ ہمارا پڑوسی ہے تھانے دار جی......!“

اس انکشاف نے مجھے چونکا دیا اور میں نے پوچھا۔ ”فریدہ! تمہارا شک اپنے پڑوسی نواز کی طرف ہی کیوں جارہا ہے۔ اس کے لیے تمہارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت ہے؟“

”جناب......“ وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی۔ ”وہ شیطان میری معصوم بچی پر بری نظر ڈالتا تھا۔“

”بری نظر......کیا مطلب؟“

”وہ ہر اس موقعے پر عابدہ کو حریصانہ نگاہ سے دیکھتا تھا جب بھی وہ اسے نظر آجاتی۔“ وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔ ”میں اس کی ان گھٹیا حرکتوں سے سخت پریشان تھی۔“

بلی دھیرے دھیرے تھیلے سے باہر آنے لگی تھی۔ میں نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔ ”وہ عابدہ کو صرف بری نظر سے دیکھتا ہی تھا یا زبان سے بھی کچھ کہتا تھا؟“

”وہ بدبخت کہتا تھا کہ اسے عابدہ سے محبت ہوگئی ہے۔“ وہ ناگواری سے بولی۔ ”خوامخواہ میری بچی کو بدنام کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔“

”تم نے اس کی حرکتوں کے جواب میں کیا کارروائی کی؟“

”میں نے پہلے تو اس مردود کو پیار سے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ میری عابو کا پیچھا چھوڑ دے۔“ وہ ایک آہ بھرتے ہوئے بولی۔ ”جب لاڈ پیار کی زبان اس کی سمجھ میں نہیں آئی تو میں نے ڈانٹ ڈپٹ سے بھی کام لیا لیکن مجال ہے کہ اس ڈھیٹ پر ذرا بھی اثر ہوا ہو۔ تنگ آکر میں نے اس کی ماں کو اس کے کرتوتوں کے بارے میں بتادیا۔“

”پھر تو گھر والوں نے اس کی خوب کھنچائی کی ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”کوئی نہیں......“ وہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ”اس کے گھر میں ہے کون جو اس کو لتاڑے گا۔ آجاکر صرف ایک ماں ہی ہے اور ماں کی نظر میں تو نواجا جیسا شریف اور بھلا مانس لڑکا روئے زمین پر کوئی موجود ہی نہیں۔ آپ کو پتا ہے، اس منحوس نے میری شکایت کے جواب میں کیا کہا تھا؟“

مجھے نہیں پتا تھا لہٰذا میں نے نفی میں گردن ہلادی۔ ”نہیں......!“

”میں آپ کو بتاتی ہوں جی......“ وہ بڑے جوش سے بولی۔

ان لمحات میں لگتا ہی نہیں تھا کہ اس کی نوجوان بیٹی اغوا ہوچکی ہے اور اس کے اس انداز سے میں کھٹک گیا تھا۔ میں نے اسے سمجھنے کی غرض سے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”ہاں، بتاؤ......میں سن رہا ہوں......!“

”اس بے غیرت عورت نے مجھ سے کہا کہ اگر نواجا میری عابو کو پسند کرتا ہے تو اس میں برائی والی کون سی بات ہے۔ مجھے تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ میری بیٹی ٹھکانے لگ رہی ہے...... دیکھا آپ نے، اس کم ظرف نے کتنی ہلکی بات کی تھی۔“

”ہاں، تم ٹھیک کہتی ہو۔“ میں نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے فریدہ کی ہاں میں ہاں ملائی اور کہا۔ ”اسے اس انداز میں بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔ لڑکی والے بڑی نازک پوزیشن میں ہوتے ہیں۔“

”اس بددماغ کے اپنے سامنے کوئی بیٹی ہوتی تو اسے ان نزاکتوں کا احساس ہوتا۔“ وہ چہرے پر ناگواری کے تاثرات سجاتے ہوئے بولی۔ ”میں بیٹی کی ماں ہوں نا...... مجھے لاکھ انداز میں سوچنا پڑتا ہے۔ آپ سمجھ دار ہیں...... آپ کو میں کیا بتاؤں جی......!“

”اس معاملے میں تو میں تمہاری ہی حمایت کروں گا فریدہ!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم نے نواز کی ماں سے جو بھی کہا، ٹھیک ہی کہا لیکن میں اپنی معلومات کے لیے پوچھ رہا ہوں......“ میں نے لمحاتی توقف کرکے سوالیہ نظر سے فریدہ کو دیکھا اور کہا۔

”کیا نواز کے اندر کوئی بہت بڑی خرابی ہے جو تم نے اس کے بارے میں غور کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا......؟“

”کوئی ایک خرابی ہو تو بتاؤں جی......“ وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔ ”جتنی بھی ہیں، سب بتادو۔“

”وہ شکل صورت کا بس ایویں سا ہے اور اوپر سے کالا مسٹنڈا۔“ وہ ناگواری سے بولی۔ ”میری عابو ہزاروں لاکھوں میں ایک ہے۔ گوری چٹی اور حسین و جمیل۔ چودھویں کا چاند بھی اس کے سامنے شرماتا ہے۔ میں اپنی مکھن ملائی جیسی بیٹی اس کالے کوے کے پلے تو باندھ نہیں سکتی اور سب سے بڑی بات یہ کہ......“ وہ تھوڑی دیر کے لیے تھمی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”وہ...... وہ نامراد مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ میں اسے سخت ناپسند کرتی ہوں۔“

”اور تمہاری بیٹی عابو......؟“ میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

”جی......کیا مطلب ہے آپ کا!“ وہ چونک کر بولی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”مطلب یہ کہ کیا عابو بھی اسے اتنا ہی ناپسند کرتی ہے؟“

”جی...... جی ہاں...... بالکل!“ وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”عابو تو اس سے بات کرنا پسند نہیں کرتی لیکن یہ شیطان ہاتھ دھو کر میری پھول جیسی بچی کے پیچھے پڑ گیا تھا اور اسے اغوا کرکے ہی رہا...... تھانے دار جی! آپ اس کافر کو جلدی سے تلاش کرکے میری بیٹی کو بازیاب کرائیں۔ آپ کا یہ احسان میں زندگی بھر یاد رکھوں گی۔ اس نیکی کا اجر آپ کو اللہ دے گا۔“

اس کی تان گھوم پھر کر اسی بات پر ٹوٹتی تھی کہ نواز عرف نواجا نے اس کی بیٹی عابدہ کو اغوا کرلیا تھا۔ یہ اس کا بغض اور نفرت تھی جو وہ اپنے دل میں نواز کے لیے رکھتی تھی ورنہ اب تک کی گفتگو سے میں نے یہی اندازہ قائم کیا تھا کہ نواز، عابدہ کو پسند کرتا تھا اور اس سے شادی کا خواہش مند تھا۔ ممکن ہے، عابدہ کی بھی یہی تمنا ہو یا یہ بھی ہوسکتا ہے، وہ نواز سے شادی کا ارادہ نہ رکھتی ہو لیکن یہ بات طے تھی کہ فریدہ، نواز سے شدید ترین نفرت کرتی تھی اور کسی بھی قیمت پر وہ عابدہ کی شادی نواز سے کرنے کو تیار نہیں تھی۔ اسی تناظر میں، میں نے اس سے ایک اہم سوال کیا۔

”فریدہ بی بی! نواز تمہاری بیٹی پر بری نظر ڈالتا تھا، ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا اور اس سے شادی کی باتیں کرتا تھا۔ کیا صرف انہی وجوہ کی بنا پر تم کہہ رہی ہو کہ اس نے عابدہ کو اغوا کرلیا ہے یا اس کے علاوہ بھی تمہارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت ہے؟“

”یہ باتیں تو اپنی جگہ ایک حقیقت رکھتی ہی ہیں۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”لیکن میں جس وجہ سے زیادہ شک کررہی ہوں، وہ نواز کی خطرناک دھمکی ہے جناب......!“

”خطرناک دھمکی؟“ میں نے چونک کر سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

وہ رازدارانہ انداز میں بولی۔ ”تھانے دار جی! میں نے نواز کی ماں سے نواجا کی حرکتوں کی جو شکایت کی تھی نا، اس سے وہ بہت ناچا تھا جیسے اس کے تن بدن میں مرچیں لگ گئی ہوں۔ وہ کل...... ہاں، کل اتوار کو مجھ سے ملا اور خوفناک، سرخ آنکھیں نکال کر بولا...... چاچی فریدہ! میری ماں سے شکایت کرکے تم نے اچھا نہیں کیا۔ اب تمہیں اس کا نتیجہ بھی خود ہی بھگتنا پڑے گا۔ میں تو عابو کی جان چھوڑنے والا نہیں۔ گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکل رہا تو مجھے مجبوراً انگلی کو ٹیڑھا کرنا پڑے گا......“ یہاں تک بیان کرنے کے بعد وہ رکی پھر فریادی لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

”اب آپ ہی بتائیں تھانے دار جی...... میں نواجا پر شک نہ کروں تو اور کس پر کروں۔ کل دن میں اس نے مجھے خطرناک نتائج کی دھمکی دی اور آج صبح ہی عابو غائب ہوگئی۔ ٹیڑھی انگلی سے گھی نکالنے کا مطلب تو یہی ہے نا کہ اسی بدبخت نے میری عابو کو اغوا کیا ہے۔“

میں بھی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ فریدہ کے موقف میں اب جاکر تھوڑا وزن پیدا ہوا تھا۔ وہ ملتجیانہ اور امداد طلب نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

”کیا تم نے نواز کے گھر سے بھی عابدہ کا پتا کیا؟“

”جہاں میں نے پورے محلے میں عابو کو ڈھونڈا ہے، وہیں نواجا کے گھر کو بھی چیک کیا ہے جناب۔“ وہ دکھی لہجے میں بولی۔ ”وہ وہاں بھی نہیں ملی۔ چاروں طرف سے مایوس ہونے کے بعد ہی آپ کے پاس آئی ہوں جی۔“

”نواز تمہاری بیٹی کی گمشدگی کے بارے میں کیا کہتا ہے؟“

”وہ گھر میں ہوگا تو کچھ کہے گا نا!“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”وہ بھی آج صبح ہی سے غائب ہے......!“

”اوہ......“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”اس کی ماں کیا بتاتی ہے؟“

”آسیہ کا کہنا ہے کہ وہ آج صبح ہی گوجرانوالہ گیا ہے۔“ فریدہ نے بتایا۔ دس سال پہلے نواز کے باپ رفیق عرف فیکا کا انتقال ہوگیا تھا۔

”گوجرانوالہ وہ کیا کرنے گیا ہے؟“ میں نے فریدہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”آسیہ نے اس بارے میں بھی تو کچھ بتایا ہوگا۔“

ایک بات کا میں ذکر کرنا بھول گیا کہ ان دنوں میں ضلع گوجرانوالہ کی ایک معروف تحصیل ”حافظ آباد“ کے ایک تھانے میں تعینات تھا۔ حافظ آباد، گوجرانوالہ سے زیادہ دور نہیں۔ بہ مشکل آدھے، پونے گھنٹے کا راستہ ہوگا۔ یہ بڑا زرخیز اور زرعی علاقہ ہے۔ فریدہ، آسیہ اور نواب علی حافظ آباد کی منظور کالونی میں رہتے تھے۔ یہ محلہ میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا۔ یہ سارا علاقہ نیم دیہاتی یا نیم شہری سمجھ لیں۔

فریدہ نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

"جناب! نواجا گوجرانوالہ کی کسی فیکٹری میں کام کرتا ہے۔" وہ ایک بوجھل سانس خارج کرنے کے بعد انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔ "ایک ہفتہ چھوڑ کر یعنی پندرہ دن کے بعد وہ ایک دن کی چھٹی لے کر گھر آتا ہے۔ یعنی ہفتے کی رات کو وہ یہاں پہنچتا ہے اور سوموار کی صبح واپس گوجرانوالہ چلا جاتا ہے۔ اسی طرح عموماً وہ ایک مہینے میں حافظ آباد کے دو چکر لگاتا ہے۔"

"اور باقی کے دن؟" میں نے سوالیہ انداز میں فریدہ کو دیکھا۔

"باقی کے دن" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ "وہ ادھر ہی کسی کرایے کے کوارٹر میں گزارتا ہے۔"

اس روز بھی سوموار تھا اور جنوری کی پندرہ تاریخ۔ اس کا مطلب تھا کہ نواز ہفتہ کی رات یعنی تیرہ جنوری کو منظور کالونی پہنچا تھا۔ اس نے چودہ جنوری اتوار کا دن اپنے گھر میں گزارا اور آج صبح پندرہ جنوری کو واپس چلا گیا۔ اس حساب کی رو سے وہ اس سے پہلے دسمبر کے آخری دنوں میں چھٹی پر آیا ہوگا اور آیندہ اس کی آمد ستائیس جنوری کو متوقع تھی۔

مگر میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے اس کی آمد کے انتظار میں بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا لہٰذا میں نے تسلی بھرے لہجے میں فریدہ سے کہا۔ "بی بی! تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ میں آج ہی نواز کی ماں سے کڑی پوچھ گچھ کرتا ہوں اور اس کے بعد میں بہ ذات خود گوجرانوالہ جا کر نواز کو بھی چیک کروں گا۔ میری کوشش ہوگی کہ جلد از جلد تمہاری بیٹی کو بازیاب کرا لوں۔"

"جی، آپ کا بہت بہت شکریہ......!" وہ تشکرانہ انداز میں بولی۔

میں نے اپنی معلومات کی غرض سے پوچھ لیا۔ "یہاں منظور کالونی میں تو تم نے عابو کو ہر جگہ تلاش کر لیا ہے۔ کیا اس کے علاوہ بھی وہ کہیں جا سکتی ہے...... میرا مطلب ہے، منظور کالونی سے باہر، کسی عزیز رشتے دار کے گھر؟"

"نہیں جی، اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" وہ قطعیت سے بولی۔ "ہمارا کوئی رشتے دار نہ تو منظور کالونی کے اندر ہے اور نہ ہی باہر کسی اور علاقے میں۔"

"یہ جو نواب صاحب تمہارے ساتھ آئے ہیں۔" میں نے اپنے کمرے سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے یہ خاصے ہمدرد اور خدا ترس لگتے ہیں ورنہ آج کل کون کسی کی خاطر تکلیف اٹھاتا ہے۔"

ایک لحہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ "نواب صاحب واقعی، اللہ کے نیک بندے ہیں۔ قوبا تو تین سال پہلے تک ان کا ملازم رہا ہے۔ اس کی معذوری کے بعد یہ آج تک ہمارا خیال رکھے ہوئے ہیں۔ ہر مشکل پریشانی میں انہوں نے ہمارا ساتھ دیا، ورنہ میرا کمانے والا کون ہے۔ نواب صاحب نے ہمارا مہینا باندھا ہوا ہے۔ ضرورت کا سارا راشن گھر پہنچ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اگر کوئی ضرورت ہوتی ہے تو یہی پوری کرتے ہیں۔ دیکھ لیں کہ اس مصیبت کی گھڑی میں بھی یہ میرے ساتھ کھڑے ہیں۔ دنیا نواب صاحب جیسے نیک دل لوگوں کے دم ہی سے چل رہی ہے جناب!"

"تم ٹھیک کہتی ہو فریدہ......!" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

اس نے پوچھا۔ "تھانے دار جی! اب میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"تم مطمئن ہو کر اپنے گھر جاؤ۔" میں نے تشفی آمیز انداز میں کہا۔ "میں انشاءاللہ! بہت جلد تمہاری بیٹی کو ڈھونڈ نکالوں گا۔"

وہ میرا شکریہ ادا کر کے کمرے سے نکل گئی۔

اگلے ہی لمحے نواب علی میرے پاس آ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے ممنونیت بھرے انداز میں کہا۔

"ملک صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے عابدہ کے معاملے کو بڑی سنجیدگی سے لیا ہے اور فریدہ سے وعدہ کیا ہے کہ آپ نواجا کی تلاش میں گوجرانوالہ بھی جائیں گے۔"

"یہ تو میرا فرض ہے جناب۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تھانا آخر ہوتا کس لیے ہے۔ اگر پولیس اپنے علاقے کے لوگوں کے مسائل حل نہیں کرے گی تو پھر اس محکمے کے وجود کا کوئی جواز سمجھ میں نہیں آتا۔"

"آپ کی سوچ عام پولیس والوں سے بہت مختلف ہے ملک صاحب؟"

"میں تو کہتا ہوں، ہر پولیس والے کی یہی سوچ ہونا چاہیے۔"

"کاش! ایسا ہو جائے......!" وہ بڑے تمنائی انداز میں بولا پھر کہا "بہرحال، اگر گوجرانوالہ میں آپ کو کسی قسم کی مدد یا تعاون کی ضرورت پیش آئے تو میں حاضر ہوں۔ میں آپ کو وہاں کے ایک دو لوگوں کے ایڈریس دے دیتا ہوں۔ آپ میرا نام لیں گے تو وہ اپنا کام چھوڑ چھاڑ کر آپ کے ساتھ لگ جائیں گے اور آپ کے ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔"

میں ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ میری خاطر کوئی اپنا کام کاج چھوڑ دے اور نہ ہی مجھے اپنے حکم کی بلاوجہ تعمیل کرانے کا کبھی شوق رہا ہے تاہم نواب علی کا دل رکھنے کے لیے میں

نے اس کی بات مان لی۔

اس نے مجھے گوجرانوالہ کے دو افراد کے نام اور ایڈریس نوٹ کروا دیے۔ وہ دونوں اسی کے ہم پیشہ تھے۔ ان میں سے ایک کا نام مہر سلیم تھا جو پرانی سبزی منڈی کا ایک معروف آڑھتی تھا جبکہ دوسرے یعنی چودھری اقبال کا تعلق نئی سبزی منڈی سے تھا۔ مذکورہ سبزی منڈی تھانا صدر گوجرانوالہ کے پچھواڑے تھوڑے فاصلے پر واقع تھی، یعنی شیخوپورہ روڈ پر......!

تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

منظور کالونی کا مین بازار فریدہ کے گھر سے ایک گلی کے فاصلے پر تھا اور یہ دونوں گلیاں ایک دوسرے پر عمود بناتی یا گراتی تھیں کیونکہ ایک مقام پر ان کے باہم قطع کرنے سے ایک چوراہا وجود پاتا تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق فریدہ کے گھر سے مین بازار میں واقع دودھ کی دکان تک پہنچنے کے لیے بہ مشکل ایک منٹ کا وقت درکار تھا لہٰذا عابو کو زیادہ سے زیادہ اس دکان سے دودھ لے کر دس منٹ کے اندر اندر واپس گھر آ جانا چاہیے تھا اور...... وہ نہیں آئی تھی۔

میں نے عابدہ کے اغوا کو ذہن میں رکھتے ہوئے سب سے پہلے تو اللہ دتا شیر فروش سے پوچھ گچھ کی۔ میں کانسٹیبل حمید اللہ کے ساتھ جائے وقوعہ پر پہنچا تھا۔ اس وقت دوپہر ہو رہی تھی تاہم اب بھی فضا میں اچھی خاصی خنکی موجود تھی۔ اللہ دتا کی عمر ساٹھ کے قریب رہی ہوگی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ سر اور مونچھ، ڈاڑھی سب سفید ہو چکا تھا اور اس سفیدی کو چھپانے کے لیے وہ باقاعدہ خضاب کا استعمال کرتا تھا۔ میں نے اس کے بالوں کو ایک نظر دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ خود کو جوان دکھانے کے لیے کون سا نسخہ استعمال کر رہا تھا۔

اس نے میرے سوال کے جواب میں حیرت بھرے انداز میں کہا۔ "تھانے دار صاحب! صبح عابو کی ماں بھی مجھ سے ایسی ہی باتیں پوچھ کر گئی ہے لیکن یقین کریں، میں عابو کے بارے میں کچھ نہیں جانتا...... وہ کہاں غائب ہو گئی، مجھے کچھ پتا نہیں۔"

"وہ جہاں بھی غائب ہے اسے میں خود ڈھونڈ نکالوں گا اللہ دتا! تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ عابو نے آج صبح تمہاری دکان سے دودھ لیا تھا یا نہیں؟"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے سرکار۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ "آج تو میں نے عابو کو کہیں بھی نہیں دیکھا۔ وہ صبح میرے پاس دودھ لینے نہیں آئی تھی۔"

"وہ تمہارے پاس دودھ لینے نہیں آئی اور تم نے اسے دیکھا بھی نہیں۔" میں نے خود کلامی والے انداز میں کہا۔ "پھر وہ کہاں گم ہو گئی......؟ فریدہ کے مطابق تو وہ دودھ لینے گھر سے نکلی تھی، ایلومینیم کی چھوٹی بالٹی کے ساتھ۔ پھر نہ تو وہ گھر پہنچی اور نہ ہی ایلومینیم کی بالٹی کا کوئی سراغ ملا ہے۔"

"جناب......!" وہ بڑی رازداری سے بولا۔ "فریدہ نے آپ کو راز والی بات نہیں بتائی......؟"

"راز والی بات!" میرے کان کھڑے ہو گئے۔ "کون سی بات اللہ دتا؟" میں نے چونکتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"یہاں تو ہر طرف وہ کہتی پھر رہی ہے......" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ "کہ آسیہ کے لڑکے نواجا نے اس کی بیٹی کو اغوا کر لیا ہے!"

"ہاں اللہ دتا! یہ بات اس نے مجھ سے بھی کہی ہے لیکن مجھے اس کی بات کا یقین نہیں آیا۔" میں نے اس کے دل کا حال جاننے کی غرض سے کہا پھر گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا۔

"اب تم خود ہی دیکھ لو، یہاں ایسے کوئی آثار نظر آ رہے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہو کہ صبح ہی صبح ایک لڑکے نے ایک لڑکی کو اغوا کیا ہے......؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں تھانے دار صاحب!" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ایسے ویسے آثار تو نہیں ہیں۔"

"اور پھر لڑکی...... لڑکے کے گھر تمہاری دکان سے دور ہی کتنے ہیں۔" میں نے مزید چڑھاتے ہوئے کہا۔ "اگر یہاں اغوا کی کوئی واردات ہوئی ہوتی تو تمہاری نظر سے کیسے چھپ سکتی تھی۔ عابو چپ چاپ تو اغوا نہیں ہو گئی ہوگی نا...... اس نے کچھ تو مزاحمت کی ہوگی، تھوڑی بہت چیخی چلائی بھی ہوگی۔ اس صورت میں بھی عابو کی آواز تمہارے کانوں تک ضرور پہنچتی...... ہیں نا؟"

"اس بات پر تو میں نے غور ہی نہیں کیا سرکار۔" وہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ "اس کا مطلب ہے، فریدہ اغوا والی بات جھوٹ کہہ رہی ہے...... اس کی بیٹی خود ہی کہیں چلی گئی ہوگی......!"

"کہاں چلی گئی ہوگی؟" میں نے قدرے سخت انداز میں سوال کیا۔

"مم...... میرا مطلب ہے......" وہ گڑبڑاتے ہوئے

لہجے میں بولا۔ ”وہ خود ہی نواجا کے ساتھ کہیں چلی گئی ہوگی۔“

ان لمحات میں اللہ دتا کا ذہن بالکل میرے ذہن سے میچ کررہا تھا۔ میں نے فریدہ کی زبان سے اغوا کی کہانی سن کر تفتیش کا آغاز تو کردیا تھا لیکن میرا دل اس حوالے سے مطمئن نہیں تھا۔ مجھے بھی یہی شک تھا کہ اگر عابو، نواجا کے ساتھ گئی ہے تو پھر وہ راضی خوشی اپنی منشا سے گئی ہوگی۔ میں نے کرید کا عمل جاری رکھتے ہوئے اللہ دتا سے مزید استفسار کیا۔ ”تو...... تمہارا مطلب ہے، ان دونوں کے بیچ پہلے سے کوئی چکر چل رہا تھا......؟“

”جناب......!“ وہ متاملانہ انداز میں بولا۔ ”کہتے ہیں کہ کسی کی بہو بیٹی کے بارے میں اس قسم کی باتیں نہیں کرنا چاہیے......“ وہ لمحاتی توقف کے بعد تھوڑی ہمت کرتے ہوئے بولا۔

”مجھے یہ تو پتا نہیں جی کہ ان کے درمیان کوئی چکر وغیرہ چل رہا تھا یا نہیں البتہ، میں نے سنا ہے، وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔“

”نواجا کی پسندیدگی کا تو مجھے بھی پتا چلا ہے۔“ میں نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی میرے علم میں لائی گئی ہے کہ نواجا کا معاملہ یک طرفہ تھا۔ عابو اس سے سخت نفرت کرتی تھی۔“

”یہ بات آپ کو کس نے بتائی ہے؟“ وہ نفی میں گردن جھٹک کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”فریدہ نے!“ میں نے جواب دیا۔

”وہ اپنی بیٹی کو بچانے کی کوشش کررہی ہے۔“ اللہ دتا نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

میری حیرت الجھن میں بدل گئی۔ میں نے پوچھا۔ ”کس سے بچانے کی کوشش کررہی ہے؟“

”بدنامی سے!“ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اسی لیے سارا ملبا وہ نواجا پر ڈال رہی ہے۔“

”ذرا وضاحت کرو اللہ دتا!“ میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

”دیکھیں جی......“ وہ محتاط انداز میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ”میں سمجھتا ہوں، نواجا اور عابو میں پیار محبت کا کھیل چل رہا تھا لیکن فریدہ، نواجا کے سخت خلاف بلکہ اس کی دشمن ہے، جب عابو نے دیکھا ہوگا کہ یہ معاملہ کبھی سیدھا نہیں ہوسکتا تو وہ نواجا کے ساتھ بھاگ گئی......“ تھوڑی دیر کو رک کر اس نے ایک گہری سانس لی پھر اسی پراسرار دھیمے لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”اب فریدہ بدنامی کے خوف سے اغوا کا شور مچا کر بے چارے نواجا کو مجرم ٹھہرا رہی ہے۔ میں تو کہتا ہوں، یہ کام لڑکی لڑکا دونوں کی ملی بھگت سے ہوا ہے۔“

”یہ تمہارا اندازہ ہے یا اس سلسلے میں تمہارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت بھی ہے؟“ میں نے اللہ دتا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”جناب! آپ اسے میرا اندازہ سمجھ لیں۔“ وہ فوراً پسپائی اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ میرے حوالے سے اس بات کا کہیں ذکر نہ کریں تو بڑی مہربانی ہوگی۔“

”تم بالکل بے فکر رہو اللہ دتا!“ میں نے اس کے تحفظات کے پیشِ نظر کہا۔ ”اس معاملے میں تمہارا نام کہیں نہیں آئے گا۔“

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ بھی میری تقلید میں کھڑے ہوتے ہوئے جلدی سے بولا۔

”تھانے دار صاحب! آپ تھوڑی دیر اور بیٹھ جائیں۔ میں آپ کی کچھ خاطر تواضع تو کردوں۔“

”اللہ دتا! تم بھی عجیب آدمی ہو۔“ میں نے حیرت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”لوگ تو آتے وقت خاطرداری کے بارے میں پوچھتے ہیں اور تم رخصت کے وقت مجھ سے ایسی فرمائش کررہے ہو؟“

”وہ جناب...... آپ کو تو دیکھ کر میری مت ہی ماری گئی تھی۔“ وہ بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

”کیوں، میرا چہرہ اتنا ہی خوف ناک ہے کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ بات نہیں جناب۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”دراصل یہ پولیس کی وردی جو ہے نا۔ اس سے بڑی دہشت پیدا ہوتی ہے۔ صبح سے یہاں عابو کے اغوا کی کہانی گردش کررہی ہے اور فریدہ کا دعویٰ ہے کہ اس نے عابو کو دودھ لینے کے لیے میری دکان پر بھیجا تھا۔ جب میں نے آپ کو اپنی دکان کی طرف آتے دیکھا تو گھبرا گیا کہ آپ کہیں عابو کے چکر میں مجھے گرفتار کرکے اپنے ساتھ نہ لے جائیں۔ بس...... اتنی سی بات تھی جناب!“

”اللہ دتا! یہ ٹھیک ہے کہ لوگ پولیس کی وردی دیکھتے ہی خوف زدہ ہوجاتے ہیں لیکن میں ذرا مختلف قسم کا تھانے دار ہوں۔ میں نے آج تک کسی بے قصور کو بلاوجہ ڈرانے دھمکانے کی کوشش نہیں کی۔“

”وہ تو جناب، آپ سے تھوڑی دیر بات چیت کرکے ہی مجھے اندازہ ہوگیا ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اور...... اب تو اور بھی ضروری ہوگیا ہے کہ میں آپ کو کچھ کھلائے پلائے بغیر اپنی دکان سے نیچے قدم نہ رکھنے دوں۔“

میں اس کی پرخلوص پیشکش کو ٹھکرا نہ سکا۔ اللہ دتا نے میرے لیے اور...... میرے ٹوکنے پر کانسٹیبل حمیداللہ کے لیے ایک جیسی تواضع کا بندوبست کردیا۔ اس نے دو پیالوں میں کڑاہی کا نیم گرم دودھ بھرا، اس پر موٹی تہ والی ملائی (بالائی) ڈالی پھر ایک پلیٹ میں برفی کی ڈلیاں سجا کر ہماری طرف بڑھادیا۔ ہم دونوں اللہ کا نام لے کر دودھ اور مٹھائی سے انصاف کرنے لگے۔

اللہ دتا دودھ دہی کے علاوہ اپنی دکان پر برفی بھی فروخت کرتا تھا۔ اس چند منٹ کی گفتگو میں اللہ دتا نے مجھے سوچ کا ایک نیا زاویہ دیا تھا۔ اس کیس میں اس بات کے امکانات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ عابو اپنی مرضی اور خوشی سے نواجا کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہو۔ اللہ دتا کی دکان سے نکلنے کے بعد میں نے کانسٹیبل حمیداللہ کو مبینہ جائے وقوعہ کا جائزہ لینے کے لیے وہیں چھوڑ دیا اور خود نواجا کے گھر کی جانب بڑھ گیا۔ حمیداللہ ایک ست الوجود اور ہڈحرام قسم کا پولیس اہلکار تھا۔ میں چھوٹی موٹی کارروائیوں میں اسے اپنے ساتھ رکھتا تھا اور قدم قدم پر ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے اس میں احساس ذمے داری اجاگر کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

☆☆☆

میری دستک کے جواب میں دروازہ ایک ادھیڑ عمر عورت نے کھولا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ایک لمحے کے لیے چونک گئی تاہم اگلے ہی لمحے اس نے سنبھل کر پوچھا۔ ”جی...... کیا بات ہے......؟“

وہ بھاری بدن کی مالک ایک پستہ قامت اور گوری چٹی عورت تھی۔ آنکھوں پر اس نے نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ پتا نہیں کیوں، مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی میری آمد کا مقصد سمجھ گئی تھی۔ اس کے باوجود میں نے رسمی کارروائی ضروری سمجھی اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔ میں اس علاقے کا تھانا انچارج ہوں۔“

”وہ تو جناب...... آپ اپنی بات چیت اور رعب داب ہی سے لگ رہے ہیں۔“ وہ بے خوف لہجے میں بولی۔ ”مجھے لگ رہا ہے، آپ میرے بیٹے نواجا کو ڈھونڈتے ہوئے ادھر آئے ہیں...... ہیں نا؟“

”واہ بھئی...... لگتا ہے، آپ تو کوئی نجومن ہو۔“ میں نے حیرت سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔ میں نواجا ہی کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔“

”میں کوئی نجومن ہوں اور نہ ہی مجھے غیب کا علم ہے۔“ وہ قدرے بیزاری سے بولی۔ ”میں نواجا کی ماں آسیہ ہوں جناب تھانے دار صاحب...... صبح سے یہاں جو ڈھنڈورا پیٹا جارہا ہے، اسی سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ خبر آپ کے تھانے تک بھی پہنچی ہوگی کہ میرے نواجا نے عابو کو اغوا کرلیا ہے۔“

”تمہارا یہ اندازہ بھی سو فیصد درست ہے آسیہ۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آج صبح تمہارے بیٹے کے خلاف میرے پاس اغوا کی رپورٹ درج کرائی گئی ہے۔ میں اسی سلسلے میں تفتیش کے لیے ادھر آیا ہوں۔“

”رپورٹ عابدہ کی ماں نے درج کرائی ہوگی؟“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور ادھر ادھر دیکھنے کے بعد آسیہ سے پوچھا۔ ”یہاں گلی میں کھڑے ہوکر بات کرنا مناسب نہیں۔ کیا تمہارے گھر کے اندر بیٹھنے کی جگہ ہے؟“

”آپ آجائیں اندر......“ وہ میرے لیے راستہ چھوڑتے ہوئے بولی۔

میں گھر میں داخل ہوگیا۔ آسیہ کی بے خوفی نے مجھے متاثر کیا تھا ورنہ پولیس جس دروازے پر دستک دے، وہاں کے مکینوں میں ایک تھرتھلی سی مچ جاتی ہے۔ کوئی لاکھ بے گناہ اور بے قصور کیوں نہ ہو، وہ پولیس کی آمد سے پریشان ضرور ہوجاتا ہے جبکہ آسیہ پر ایسا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ وہ آہنی اعصاب کی مالک ہے اور یہ کہ...... وہ کسی ایسے ویسے معاملے میں ملوث نہیں جس کی بنا پر انسان کو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہو۔

میں آسیہ کی تقلید میں، گھر کے صحن میں پہنچ گیا۔ وہ زیادہ سے زیادہ تین مرلے (تقریباً ستر گز) پر مشتمل ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ ایک بیٹھک نما کمرا آگے اور ایک اسی سائز کا چھوٹا سا کمرا پیچھے، بیچ میں لگ بھگ کمروں کی پیمائش ہی کا صحن، صحن میں دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔

”آئیں جی بیٹھیں۔“ وہ ایک چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی اور جلدی سے مذکورہ چارپائی پر ایک چادر بھی بچھادی۔ میں چادر بچھی چارپائی پر بیٹھ گیا لیکن آسیہ متذبذب کھڑی رہی۔ میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا۔

”آسیہ! کیا بات ہے، تم کچھ پریشان نظر آرہی ہو؟“

”آں...... ہاں......“ وہ ایک لمحے کے توقف کے بعد مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”تھانے دار جی! آپ

اندر کمرے میں آجائیں۔'' پھر اس نے اندرونی کمرے کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

میں ایک لمحے کے لیے تو تذبذب کا شکار رہا۔ خالی گھر میں آسیہ اکیلی عورت تھی اور مجھے گھر کے پچھلے کمرے میں بیٹھنے کو کہہ رہی تھی۔ مجھے چونکنا تو چاہیے تھا تاہم اگلے ہی لمحے میرے دل نے کہا کہ آسیہ کی نیت صاف اور سوچ صحت مند ہے لہٰذا مجھے ہچکچانے یا ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں آسیہ کے ساتھ کمرے کے اندر پہنچ گیا لیکن یہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''آسیہ! کیا باہر صحن میں بیٹھنے میں کوئی قباحت تھی؟''

''قباحت تو کوئی نہیں جناب۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ سب کچھ میں نے احتیاط کے پیشِ نظر کیا ہے......''

''کیسی احتیاط؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

''فریدہ کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''جب آپ میرے گھر میں داخل ہوئے اور میں دروازہ بند کر رہی تھی تو میں نے اس بلّی عورت کو اپنے دروازے کی جھری سے جھانکتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔'' وہ لمحے بھر کے لیے تھمی۔ ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''اگر ہم صحن میں بیٹھ کر بات کرتے تو اس منحوس کے کان درمیانی دیوار سے لگے رہتے۔ اس کی یہ غیر اخلاقی حرکت مجھے بے چین رکھتی اور میں آپ کے ساتھ تسلی سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ بس، اسی وجہ سے میں آپ کو اندر کمرے میں لے آئی ہوں۔''

''لگتا ہے، آپ لوگوں میں اکثر گرما گرمی ہوتی رہتی ہے۔'' میں نے چارپائی پر پھیل کر بیٹھنے کے بعد کہا۔ ''وہ تمہیں اور تم اسے بالکل پسند نہیں کرتی ہو؟''

''کچھ ایسی ہی بات ہے جناب!'' وہ ناگواری سے بولی پھر جلدی سے کہا۔ ''آپ آرام سے بیٹھیں جی، میں آپ کے لیے......''

''اس تکلف کی بالکل ضرورت نہیں آسیہ بی بی!'' میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''تم یہاں میرے سامنے بیٹھو اور میں جو پوچھوں اس کا سچا اور سیدھا جواب دو۔ تمہاری سب سے بڑی خدمت یہی ہوگی کہ تم قانون کے ساتھ بھرپور تعاون کرو۔''

چند لمحات کی سوچ بچار کے بعد وہ سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

میں نے آئندہ دس منٹ تک مختلف سوالات کر کے آسیہ سے جو معلومات حاصل کیں، اس کا خلاصہ کچھ یہ بنتا ہے۔

نواز عرف نواجا، عابدہ عرف عابو کو پسند کرتا تھا اور اس سے شادی کی خواہش رکھتا تھا لیکن فریدہ ایسا نہیں چاہتی تھی جبکہ عابو کا رجحان بھی نواجا کی طرف تھا۔ نواجا نے اپنی ماں کو دل کا حال سنایا اور اس کا رشتہ چلانے کی بات کی لیکن فریدہ نے یہ بہانہ کر کے صاف منع کر دیا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی اپنی بہن کے بیٹے سے کرے گی جو وزیر آباد میں رہتے ہیں، وغیرہ وغیرہ......!

''لیکن فریدہ نے تو مجھے بتایا ہے کہ اس کا کوئی رشتے دار کہیں نہیں ہے؟'' آسیہ کے خاموش ہونے پر میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''حقیقت تو یہی ہے جناب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''بہن اور بھانجے کا کردار بھی فرضی ہے، صرف مجھے انکار کرنے کے لیے۔ فریدہ اوّل درجے کی مکار اور جھوٹی ہے۔ مجھے مطمئن کرنے کے لیے اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ اس کی بہن زبیدہ وزیر آباد میں رہتی ہے اور زبیدہ کا بیٹا طفیل چھری چاقو بنانے والی ایک فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ کسی سے سن لیا ہوگا کہ وزیر آباد چھریاں چاقو بنانے کی وجہ سے کافی مشہور ہے۔ میں نے تو کبھی اس جھوٹی کی بہن کو یہاں آتے جاتے نہیں دیکھا اور نہ ہی وہ چھریاں چاقو بنانے والا طفیل کبھی نظر آیا ہے......''

وزیر آباد بھی گوجرانوالہ کی ایک تحصیل تھی جو دریائے چناب کے کنارے واقع تھی وزیر آباد کی سب سے معروف صنعت اور پہچان چاقو اور چھری سازی ہی تھی۔ اس زمانے میں ضلع گوجرانوالہ کی تین تحصیلیں ہوا کرتی تھیں۔ نمبر ایک، گوجرانوالہ۔ نمبر دو حافظ آباد۔ نمبر تین وزیر آباد۔ آج کل کا مجھے پتا نہیں کہ اس ضلع میں کون کون سی جغرافیائی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔

''فریدہ نے تو اس بات کا ذکر بھی نہیں کیا کہ تم نے باقاعدہ نواجا کے رشتے کی بات چلائی تھی؟'' میں نے کہا۔

''ایک جھوٹا انسان جتنے بھی جھوٹ بول لے یا کتنے بھی سچ کو چھپانے کی کوشش کرے، کیا کہہ سکتے ہیں۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

میں نے کہا۔ ''آسیہ! یہ ساری باتیں ایک طرف لیکن فریدہ کی لڑکی تو گھر سے غائب ہے اور اس کا دعویٰ ہے، تمہارے بیٹے ہی نے عابو کو اغوا کیا ہے۔ تم اس سلسلے میں کیا کہتی ہو؟''

''تھانے دار جی!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ نواجا نے عابو کو اغوا نہیں کیا اور یہ کہ وہ کہاں غائب ہے، یہ عابو کو پتا ہوگا یا اس کی ماں فریدہ کو......''

''تم نے بڑے وثوق سے کہا ہے کہ نواجا، عابو کے اغوا میں ملوث نہیں۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا تمہارے پاس اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت بھی ہے؟''

''جی ہاں...... ہے ٹھوس ثبوت!'' وہ اپنی آنکھوں کو چھوتے ہوئے بڑے اعتماد سے بولی۔ ''یہ ہے جیتا جاگتا ثبوت تھانے دار صاحب!''

''میں کچھ سمجھا نہیں آسیہ بی بی۔'' میں نے متاملانہ لہجے میں کہا۔ ''تھوڑی وضاحت کرو کہ تمہاری آنکھوں نے ایسا کیا دیکھ لیا ہے جس کی بنا پر تم اپنے بیٹے کو بے قصور سمجھ رہی ہو؟''

''میری آنکھوں نے اپنے بیٹے کو دیکھا ہے۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ''ایک دن کی چھٹی گزارنے کے بعد جب وہ سوموار کی صبح گوجرانوالہ کے لیے گھر سے نکلتا ہے تو میں دروازے میں کھڑے ہو کر اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہتی ہوں۔'' وہ تھوڑی دیر کے لیے رکی، ایک بھرپور سانس کھینچی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''آپ مین بازار سے ہوتے ہوئے میرے گھر آئے ہیں۔ آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ میں اپنے دروازے میں کھڑی ہو کر دور دور تک کا منظر دیکھ سکتی ہوں۔ یہاں سے مین بازار کا بھی ایک حصہ نظر آتا ہے۔ جب تک نواجا مین بازار سے نکل کر میری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو جاتا، میں دروازے میں کھڑی ہو کر اسی پر آنکھیں لگائے رہتی ہوں۔ آج صبح بھی یہی ہوا اور سارے وقت میں مجھے عابو کہیں نظر نہیں آئی۔ اگر نواجا نے عابو کو اغوا کیا ہوتا تو یہ واقعہ میری نگاہ سے چھپ نہیں سکتا تھا...... میں اپنے بیٹے کی بے گناہی کے سلسلے میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

''تو تمہارے خیال میں نواجا آج بھی حسبِ معمول گوجرانوالہ ہی گیا ہے۔'' میں نے سلسلۂ سوالات کو سمیٹتے ہوئے پوچھا۔ ''اپنی نوکری پر؟''

''جی ہاں، مجھے اس بات کا یقین ہے۔'' اس نے بااعتماد لہجے میں جواب دیا۔

''گوجرانوالہ میں وہ کہاں اور کیا کام کرتا ہے؟''

''وہاں جی ٹی روڈ پر کپڑے کی ایک فیکٹری ہے...... راسکو ٹیکسٹائل ملز!'' اس نے بتایا۔ ''نواجا اس فیکٹری میں تانا

ایک شخص لیڈیز سوٹ خریدنے دکان پر گیا اور سیلز مین سے کہا۔

''ایک سوٹ دکھانا۔''

سیلز مین بولا۔ ''صاحب، کوئی اچھا سا دکھاؤں یا بیوی کے لیے لینا ہے؟''

(جعفر حسین، بھوآنہ چنیوٹ)

''ماضی نامے''

مامون الرشید عباسی اگرچہ بڑی عظمت و شان کا بادشاہ تھا اور نامورں کے دفتر میں عام مورخین نے اس کے جاہ و جلال کی داستانیں جلی حروف میں لکھی ہیں، مگر ہمارے خیال میں جو چیز اس کی تاریخی زندگی کو نہایت مزین اور پراثر بنا دیتی ہے وہ اس کی سادہ مزاجی اور بے تکلفی ہے۔ ایک ایسا شہنشاہ جو تختِ حکومت پر بیٹھ کر کل اسلامی دنیا کا ذمے دار بن جاتا ہے، کس قدر عجیب بات ہے کہ عام دوستوں سے ملنے جلنے میں شانِ سلطنت کا لحاظ رکھنا پسند نہیں کرتا۔ اکثر اہلِ علم و اربابِ کمال راتوں کو اس کے مہمان ہوتے تھے اور اس کے بستر سے بستر لگا کر سوتے تھے مگر اس کا عام برتاؤ ایسا ہی ہوتا تھا جیسا کہ ایک سادہ مخلص دوست کا، دوست کے ساتھ ہوتا ہے۔ قاضی یحییٰ ایک رات اس کے مہمان تھے۔ اتفاقاً آدھی رات کے بعد ان کی آنکھ کھل گئی اور پیاس معلوم ہوئی۔ مامون نے پوچھا۔

''خیر ہے؟''

قاضی صاحب نے پیاس کا اظہار کیا، مامون خود چلا گیا اور دوسرے کمرے سے پانی کی صراحی اٹھا لایا۔ قاضی صاحب نے گھبرا کر کہا۔

''حضور نے خدام کو ارشاد کیا ہوتا۔'' مامون نے کہا۔

''نہیں، آنحضرت ﷺ...... نے ارشاد فرمایا ہے کہ سید القوم خادمہم۔'' راتوں کو خدام سو جاتے تھے تو مامون خود اٹھ کر چراغ اور شمعیں درست کر دیا کرتا تھا۔

(''المامون''...... علامہ شبلی نعمانی)

ماسٹر ہے جناب۔"

میں نے پوچھا۔ "وہ دو ہفتے کے بعد ایک دن کے لیے تمہارے پاس آتا ہے۔ میں نے سنا ہے، اس نے فیکٹری کے قریب ہی کرایے کا ایک کوارٹر لے رکھا ہے جہاں باقی کے تیرہ دن وہ گزارتا ہے۔ اس کوارٹر کے بارے میں تمہیں کیا معلوم ہے؟"

میں گوجرانوالہ روانہ ہونے سے پہلے نواجا کے حوالے سے مکمل معلومات حاصل کر لینا چاہتا تھا تاکہ وہاں پہنچ کر کسی کمی کا احساس اور دشواری کا سامنا نہ ہو۔ آسیہ نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

"فیکٹری سے تھوڑے فاصلے پر محلہ کنگنی والا ہے۔ کنگنی والا میں ایک بیوہ نے اپنے مکان کے سامنے والا حصہ انہیں کرایے پر دے رکھا ہے اور وہ......"

"انہیں؟" میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی سوال کر دیا۔ "کیا اس بیوہ کے کوارٹر میں نواجا کے ساتھ کوئی اور بھی کرایے پر رہتا ہے؟"

"جی ایک اور لڑکا بھی اس کوارٹر میں رہتا ہے۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "اس کا نام حنیف ہے اور وہ وزیرآباد کا رہنے والا ہے۔"

"کیا حنیف بھی نواجا کے ساتھ "راسکو" ٹیکسٹائل ملز ہی میں کام کرتا ہے؟"

"جی نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "وہ کسی دوسری فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ مجھے اس فیکٹری کا نام یاد نہیں لیکن وہ بھی کپڑے ہی کی فیکٹری ہے اور راسکو سے زیادہ دور نہیں۔"

"آسیہ! قانون کی مدد کرنے کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میری دعا ہے اور تم بھی یہی دعا کرو کہ تمہارا بیٹا، عابو کی گمشدگی یا اغوا میں کسی بھی حوالے سے ملوث نہ پایا جائے ورنہ تمہارے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔"

"مجھے تو اپنے بیٹے کی بے گناہی کا پکا یقین ہے تھانے دار صاحب!" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "آپ بھی تحقیق کر کے میرے یقین کو آزما لیں......!"

"آسیہ بی بی! جہاں تم نے اتنا تعاون کیا ہے وہاں تھوڑی اور تکلیف دوں گا۔"

وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "خانہ تلاشی ضابطے کی کارروائی کا ایک حصہ ہے۔ میں یہ ناخوش گوار فرض نبھانے پر مجبور ہوں......"

وہ میری بات کی تہ تک پہنچنے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "تھانے دار صاحب! آپ میرے چھوٹے سے گھر کے صحن میں سے گزر کر اس کمرے تک پہنچے ہیں۔ آپ نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ ان دونوں جگہوں پر میں نے عابو کو کہیں نہیں چھپا رکھا۔ اب ایک بیٹھک باقی بچتی ہے......" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے رکی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"آئیں...... میں آپ کو بیٹھک بھی کھول کر دکھا دیتی ہوں۔"

میں چپ چاپ اس کے پیچھے ہو لیا......!

☆☆☆

آیندہ روز میں کانسٹیبل حسین شاہ کے ساتھ گوجرانوالہ جاتے ہوئے عابو کی گمشدگی کے بارے ہی میں سوچ رہا تھا۔ گمشدگی کے الفاظ میں نے اس لیے استعمال کیے ہیں کہ اب تک کی تفتیش اور تحقیق کی روشنی میں اس کے اغوا کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ اس کے بعد کیا ہونے والا تھا یہ خدا بہتر جانتا تھا۔ گوجرانوالہ پہنچ کر نواجا سے ملنے کے بعد کیا حالات کھل کر سامنے آتے ہیں، اس کے بارے میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میرا ذہن ان لمحات میں بہ یک وقت دو تین زاویوں پر سوچ رہا تھا۔ آسیہ کے گھر کی تلاشی تو بے سود ہی ثابت ہوئی تھی لیکن یہ بات بھی طے تھی کہ عابو کہیں غائب ہو چکی تھی۔ بالفرض محال، اگر نواجا نے اسے اغوا نہیں کیا تھا یا وہ اپنی مرضی سے نواجا کے ساتھ کہیں نہیں گئی تھی تو پھر سوچا جا سکتا تھا کہ یا تو وہ کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی ہے یا پھر فریدہ نے خود ہی اسے کہیں چھپا دیا ہے تاکہ اس کے اغوا کا الزام نواجا پر ڈال کر وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال سکے۔ ویسے فریدہ بھی مجھے کوئی کم تیز طرار عورت نہیں لگی تھی۔ اس آخری امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں درحقیقت نواجا سے ملاقات کے بعد ہی کسی حتمی نتیجے پر پہنچ سکتا تھا۔

ہم صبح ناشتے کے فوراً بعد حافظ آباد سے نکل پڑے تھے۔ لہٰذا ٹھیک دس بجے ہم تھانا صدر گوجرانوالہ میں بیٹھے تھے۔ مذکورہ تھانا، شیخوپورہ موڑ پر گورنمنٹ ہائی اسکول کے ساتھ واقع تھا اور اسی شیخوپورہ موڑ کو گوجرانوالہ کا چھوٹا لاری اڈا بھی کہا جاتا ہے۔ یہ مین جی ٹی روڈ تھا جس پر لاہور سے راولپنڈی کے درمیان لاریاں اور بسیں و ٹرک وغیرہ شب و روز دوڑتے رہتے تھے۔ تھانا سے جنوبی سمت میں چالیس

میل کے فاصلے پر لاہور واقع تھا اور شمالی جانب ایک سو پینتیس میل کی دوری پر راولپنڈی تھا۔ اس جی ٹی روڈ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ پانچ میں سے تین دریاؤں کے اوپر سے گزرتی ہے۔ لاہور سے راولپنڈی کی طرف جائیں تو شہر کی حدود سے باہر نکلتے ہی دریائے راوی سے واسطہ پڑتا ہے پھر وزیرآباد اور گجرات کے درمیان دریائے چناب رواں دواں ہے اور لالہ موسیٰ وکھاریاں چھاؤنی کے بعد دریائے جہلم آتا ہے۔

اس زمانے میں تھانا صدر کے انچارج امتیاز گوندل صاحب ہوا کرتے تھے۔ کنگنی والا اور جی ٹی روڈ کا دوسرا علاقہ تھانا صدر کی حدود میں آتا تھا۔ میں نے گوندل صاحب کو اپنے مسئلے کے بارے میں تفصیل سے بتایا تو انہوں نے کہا۔

"یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہے ملک صاحب۔ آپ میرے تھانے کی حدود میں جس بھی قسم کی کارروائی کرنا چاہتے ہیں، آپ کو میری طرف سے مکمل اجازت ہے۔"

"آپ نے میرے ذہن کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے گوندل صاحب......" میں نے تشکرانہ لہجے میں کہا۔

"کیوں شرمندہ کرتے ہیں جناب۔" وہ جلدی سے بولا۔ "آپ کو اس کام کے لیے میرے تھانے سے کسی نفری شفری کی ضرورت ہو تو وہ بھی بے دھڑک لے جا سکتے ہیں۔"

"جناب! یہ خطرناک ڈاکوؤں اور ڈکیتوں کی گرفتاری کا معاملہ تو ہے نہیں جو درجنوں ملازموں کی ضرورت ہو۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ اس تفتیشی کام کے لیے میرے ساتھ آنے والا کانسٹیبل ہی کافی ثابت ہوگا۔"

"جیسے آپ کی مرضی ملک صاحب!" وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔

گوندل صاحب نے تھوڑی ہی دیر میں ہمارے لیے ایک تانگے کا بندوبست کر دیا اور احتیاطاً اپنے تھانے کا ایک سپاہی بھی ہمارے ساتھ کر دیا تاکہ کسی مرحلے پر ہمیں کوئی دشواری محسوس نہ ہو۔ اس کانسٹیبل کا نام آفتاب تھا جو رانا کالونی کا رہنے والا تھا۔ رانا کالونی اور کنگنی والا ایک دوسرے سے واکنگ ڈسٹینس پر تھے۔

دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے ہم تانگے میں بیٹھ کر تھانا صدر سے راسکو ٹیکسٹائل ملز کی جانب روانہ ہو گئے۔ کانسٹیبل آفتاب ایک صحت مند اور ہٹا کٹا پولیس اہلکار تھا۔ دراز قامتی پر گھونگریالے بال اس کی شخصیت میں بڑا حسن اور کشش پیدا کرتے تھے۔ اس نے مجھے بتایا کہ راسکو ملز رانا کالونی اور کنگنی والا کے وسط میں واقع ہے۔ اس وقت ہم جی ٹی روڈ پر سفر کر رہے تھے اور ہمارا رخ لاہور کی سمت تھا۔

جی ٹی روڈ کی دونوں طرف مختلف فیکٹریاں اور ملز واقع تھیں اور یہ سلسلہ کافی دور تک چلتا تھا۔ اسی سفر کے دوران میں دائیں ہاتھ پر ایک دو سینما ہاؤس بھی نظر آئے۔ جب ہم دوسرے سینما کے پاس سے گزر رہے تھے تو آفتاب نے بائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

"ملک صاحب! یہ جو آپ کو بہت بڑی انڈسٹری نظر آ رہی ہے نا، اس کے عقب میں رانا کالونی ہے جہاں میرا گھر ہے۔"

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ "تم نے جس انڈسٹریز کا نام لیا ہے اس میں کیا چیز تیار ہوتی ہے؟"

"چیز نہیں...... چیزیں کہیں جناب!" وہ دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا۔ "سینیٹری کا اعلیٰ درجے کا سامان، باتھ روم فٹنگز کے علاوہ پنکھوں کا ایک بہت معروف برانڈ بھی یہاں تیار ہوتا ہے جو زیادہ تر ایکسپورٹ کر دیا جاتا ہے۔"

گوجرانوالہ کی انڈسٹری میں دو تین چیزیں بہت مشہور ہیں۔ نمبر ایک، ریشمی اور سوتی ہر قسم کا کپڑا...... نمبر دو، بجلی کی چھوٹی بڑی ہر نوعیت کی موٹریں...... نمبر تین، پنکھے یعنی یہاں کی ٹیکسٹائل انڈسٹری اور الیکٹریکل و مکینیکل انڈسٹری سرِفہرست ہے۔

ہم پاٹری کی انڈسٹری کے پاس سے گزر رہے تھے کہ آفتاب نے کوچوان سے کہا۔ "چاچا، مولوی کے کھوکھے کے پاس سے تانگا اندر لے لو......"

"مولوی کا کھوکھا" اس علاقے کا ایک معروف ہوٹل تھا۔ کسی زمانے میں وہ واقعی سگریٹ اور چائے کا ایک معمولی سا کھوکھا ہوا کرتا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ مولوی صاحب اور ان کے کھوکھے نے بڑی ترقی کی تھی۔

تانگے نے جی ٹی روڈ کو چھوڑا اور دائیں جانب مولوی کے کھوکھے کے پاس سے گزرتے ہوئے سیدھا راسکو ملز پہنچ گیا۔ اس ملز کے سامنے ایک چھوٹا سا باغ بھی بنا ہوا تھا جہاں امرود اور جامن وغیرہ کے درخت کثرت سے نظر آ رہے ہیں۔

ہم "راسکو" کے دفتری حصے میں پہنچے تو ایک دبلے پتلے اور دراز قامت شخص سے ملاقات ہوئی۔ اس کا نام برکت علی معلوم ہوا۔ جس کی عمر پچپن اور ساٹھ سال کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ راسکو میں منشی (اکاؤنٹنٹ) کی

حیثیت سے کام کررہا تھا۔ راسکو کا مالک یعنی بابو صاحب شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔

میں اور کانسٹیبل حسین شاہ اس وقت عوامی لباس میں تھے جبکہ کانسٹیبل آفتاب پولیس یونیفارم میں ملبوس تھا۔ ایک پولیس والے کے ساتھ دو سادہ لباس افراد کو اپنے سامنے دیکھ کر منشی برکت علی فوراً اٹینشن ہوگیا۔

آج کی بہ نسبت ہمارے زمانے میں، عوام میں پولیس کی عزت وتوقیر کافی زیادہ تھی۔ ایک عام سپاہی کا بھی خاصا رعب ودبدبہ ہوا کرتا تھا۔ آج کل کی عوام یا تو بہت زیادہ طاقت ور ہوگئی ہے اور یا پھر پولیس بہت زیادہ کمزور ہوگئی ہے کہ مشکل سے گھر کا خرچا پورا کرنے والا عام آدمی بھی اے ایس آئی، ایس آئی اور انسپکٹر رینک کے افسران کو اپنے تعلقات کا حوالہ دے کر آنکھیں دکھاتا ہے۔

واضح رہے کہ میں نے یہاں عوام کے ایک مخصوص گروہ کا ذکر کیا ہے جو سیاسی وابستگیوں اور تعلقات کے حامل ہوتے ہیں۔

منشی اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”آئیں جی......بسم اللہ!“ پھر اس نے میز کے سامنے بچھی کرسیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تشریف رکھیں جناب......!“

ہم نے تشریف رکھ دی۔

”میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔“ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”میں حافظ آباد کے ایک تھانے کا انچارج ہوں اور یہاں نواز نامی ایک بندے کے سلسلے میں آیا ہوں۔ یہ نواز عرف نواجا حافظ آباد کی منظور کالونی کا رہنے والا ہے اور آپ کی فیکٹری میں تانا ماسٹر کی حیثیت سے کام کرتا ہے......!“

”جی ہاں...... بالکل کام کرتا ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”نواز کی بات بھی کرتے ہیں، پہلے ذرا میں آپ کی خدمت......“

”اس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے برکت علی۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے کسی بھی قسم کے تکلف سے صاف منع کردیا۔ ”میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں۔ آپ آرام سے بیٹھیں اور مجھے نواز کے بارے میں بتائیں......“ میں نے لحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بتائیں کیا...... بلکہ اسے یہاں بلائیں۔ میں اس سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”خیریت تو ہے نا جناب......!“ وہ تشویش ناک نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ حافظ آباد سے یہاں آئے ہیں۔ ادھر اس کے گھر میں سب ٹھیک تو ہے......؟“

”سب ٹھیک نہیں ہے برکت علی!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”بس، اب آپ فوراً اسے میرے پاس بلالیں۔“

کسی کو آواز دینے کے بجائے وہ خود اپنی کرسی سے اٹھا اور دفتر سے نکل کر فیکٹری کے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا۔ پانچ سات منٹ کے بعد اس کی واپسی ہوئی۔ اس کی صورت کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوگیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ کرسی پر بیٹھ چکا تو میں نے پوچھا۔

”کیا ہوا...... کیا نواز آرہا ہے......؟“

”نہیں جناب......“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”وہ تو فیکٹری میں موجود ہی نہیں!“

”فیکٹری میں موجود نہیں...... کیا مطلب؟“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”کل صبح وہ گھر سے تو سیدھا گوجرانوالہ ہی آیا تھا۔ اسے یہیں ہونا چاہیے......“ میں نے تھوڑا توقف کیا پھر ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔ ”کیا وہ کہیں باہر نکلا ہوا ہے؟“

وہ کھانے کا وقت تھا۔ میرے ذہن میں یہی خیال آیا تھا کہ ممکن ہے، نواجا آس پاس کے کسی چھپر ہوٹل میں لنچ کرنے نکل گیا ہو۔ برکت علی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ”وہ کہیں باہر نہیں نکلا ملک صاحب بلکہ وہ تو کل صبح سے ڈیوٹی پر آیا ہی نہیں!“

اس انکشاف نے مجھے چونکا دیا۔ ”کیا مطلب، وہ ڈیوٹی پر نہیں آیا؟“ میں نے الجھن زدہ انداز میں استفسار کیا۔ ”گھر سے تو وہ حسب معمول سوموار کی صبح فیکٹری آنے کے لیے روانہ ہوا تھا۔ اگر یہاں نہیں پہنچا تو پھر کہاں چلا گیا؟“

”یہی حیرت تو مجھے بھی ہورہی ہے۔“ برکت علی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

”برکت علی!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ اس فیکٹری کے منشی ہیں۔ مالک کے بعد کسی بھی کارخانے میں منشی سب سے زیادہ اہم، بااختیار اور باخبر ہوتا ہے۔ آپ میری فرمائش پر اپنی کرسی سے اٹھ کر نواجا کو دیکھنے کے لیے فیکٹری کے اندر گئے تھے، کیا آپ کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ وہ کل صبح سے ڈیوٹی پر نہیں آیا؟“

”آپ کا سوال بڑا اہم ہے ملک صاحب!“ وہ تعریفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اور اس سوال کا جواب ہے

کہ واقعی، مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ نواز اس سوموار کو اپنی ڈیوٹی پر نہیں آیا اور...... اس کا بھی ایک سبب ہے جناب......!“

اتنا بتانے کے بعد وہ رکا لیکن میں نے مداخلت نہیں کی تاہم خاموش سوالیہ نظر سے اسے دیکھتا چلا گیا۔ ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد اس نے بتایا۔

”اور وہ سبب یہ ہے کہ میں کل خود بھی فیکٹری نہیں آیا تھا اسی لیے مجھے نواز کی غیر حاضری کی خبر نہ ہوسکی۔ ابھی میں نے اس کے جوڑی دار سے پوچھا ہے تو پتا چلا ہے کہ وہ ہفتے کو چھٹی کے بعد جو فیکٹری سے نکلا ہے تو ابھی تک اس کی کوئی خیر خبر نہیں......!“

”نواز کے جوڑی دار کا نام کیا ہے؟“ میں نے پوچھا اور کہا۔ ”آپ اسے یہاں بلالیں۔ میں اس سے بھی چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔“

اس نے مذکورہ جوڑی دار کا نام اشتیاق بتایا۔ ایک آدمی کو اسے دفتر میں بلانے کے لیے بھیجا پھر میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے خاصے فکر مند لہجے میں مستفسر ہوا۔ ”ملک صاحب! آپ کی تفتیش کے انداز سے لگتا ہے کہ ادھر حافظ آباد میں کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ ذرا مجھے بھی تو بتائیں کہ آخر معاملہ کیا ہے؟“

”معاملہ یہ ہے برکت علی کہ......“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں منشی کو حالات حاضرہ سے آگاہ کیا۔ ”کل یعنی سوموار کی صبح حسبِ معمول نواجا فیکٹری آنے کے لیے اپنے گھر سے روانہ ہوا اور اسی وقت ایک خوب صورت لڑکی عابدہ عرف عابو بھی غائب ہوگئی۔ نواجا اور عابو ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں اور یہ بھی پتا چلا ہے کہ ان دونوں میں عاشقی معشوقی کا بھی چکر چل رہا تھا۔ اب عابو کی ماں نے میرے پاس نواجا کے خلاف رپورٹ درج کرائی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ نواجا نے عابو کو اغوا کرلیا ہے۔ میں اسی سلسلے میں تفتیش کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا ہوں۔ یہ ہے سارا قصہ!“

”اغوا......!“ برکت علی نے بےیقینی سے میری طرف دیکھا۔ ”مجھے یقین نہیں آرہا۔ نواز ایسا کام نہیں کرسکتا۔“

”اس بات کا یقین تو نواجا کی ماں کو بھی نہیں ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن عابو گھر سے غائب ہے اور عابو کی ماں کا اصرار ہے کہ نواجا ہی نے اسے اغوا کیا ہے۔“

”جناب! وہ کافی عرصے سے اس فیکٹری میں کام کررہا ہے۔“ منشی برکت علی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ہم نے اسے بہت ہی امن پسند اور شریف النفس انسان پایا ہے۔ وہ اس قسم کی حرکت نہیں کرسکتا۔“ بات ختم کرکے وہ نفی میں گردن جھٹکنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”نواجا کے کردار کے بارے میں اس کے محلے والوں کے بھی اسی قسم کے خیالات ہیں جیسے خیالات کا آپ نے اظہار کیا ہے لیکن اس حقیقت کو کہاں چھپائیں کہ ادھر حافظ آباد میں عابو غائب ہے اور ادھر گوجرانوالہ میں نواجا نہیں مل رہا۔ اس نوعیت کی صورتِ حال میں انسانی ذہن یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ کیا نواجا، عابو کو اغوا کرکے کہیں اور تو نہیں نکل گیا......؟“

”ہوں......!“ منشی برکت علی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

اسی اثنا میں نواجا کا جوڑی دار اشتیاق وہاں پہنچ گیا۔ جوڑی دار کا مطلب یہ ہے کہ اشتیاق، نواجا کے ساتھ تانا مشین پر ڈیوٹی دیتا تھا۔ اشتیاق کی عمر بیس کے آس پاس تھی۔ وہ پستہ قامت اور سانولے رنگ کا مالک تھا۔ اس کی آنکھوں میں بڑی شاطرانہ چمک پائی جاتی تھی۔ میں نے انہی چمکیلی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”اشتیاق! تمہارا جوڑی دار کہاں غائب ہے؟“

”پتا نہیں جناب!“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں خود اس کی وجہ سے کافی پریشان ہوں۔ نواجا کے نہ آنے سے میرا کام بڑھ گیا ہے۔ پتا نہیں، وہ کہاں چلا گیا ہے؟“

”ہفتہ کے روز جب وہ چھٹی کرکے فیکٹری سے جارہا تھا تو تمہاری اس سے بات ہوئی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں، بات ہوئی تھی۔“ اشتیاق نے جواب دیا۔ ”وہ مجھ سے مل کر گیا تھا بلکہ جس روز اسے حافظ آباد جانا ہوتا تھا، وہ چھٹی سے ایک گھنٹا پہلے ہی فیکٹری سے نکل جاتا تھا۔ ہفتے کے دن بھی یہی ہوا تھا۔“

”رخصت کے وقت کیا اس نے ایسی کوئی بات کی تھی کہ سوموار کو وہ ڈیوٹی پر نہیں آئے گا؟“ میں نے دریافت کیا۔

”نہیں جناب!“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس نے ایسا تو کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کے نہ آنے کی وجہ سے میں خود بہت پریشان ہوں۔“

”اس نے کبھی اپنے دل کی بات بھی تم سے کی تھی؟“

”میں سمجھا نہیں جناب؟“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”مطلب یہ کہ...... نواجا نے کبھی تمہیں اپنی محبت کے بارے میں بتایا

تھا؟''

اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بے یقینی سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''نہیں جناب، اس نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی۔ میرے خیال میں تو وہ اس لائن کا آدمی نہیں ہے......!''

''خود میرا بھی یہی اندازہ ہے جناب!'' منشی برکت علی نے اشتیاق کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ تو چپ چاپ، اپنے کام سے کام رکھنے والا ایک سیدھا سادا بندہ ہے۔ اس کے انداز سے ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ عشق محبت کے معاملے میں بھی پڑسکتا ہے۔''

''ویسے نواجا کا ہانڈی وال آپ کو اس کے بارے میں زیادہ تفصیل سے بتا سکتا ہے۔'' اشتیاق نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

''ہانڈی وال......؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی، میرا اشارہ حنیف کی طرف ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نواجا اور حنیف کنگنی والا کے ایک گھر میں ایک ساتھ رہتے ہیں۔ ان کا کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا اور سونا جاگنا ایک ساتھ ہے، بس یہ دونوں دو الگ الگ فیکٹریوں میں کام کرتے ہیں۔''

''اشتیاق بالکل صحیح کہہ رہا ہے ملک صاحب!'' منشی برکت علی نے ایک مرتبہ پھر تائیدی انداز میں کہا۔ ''نواجا کے بارے میں حنیفو سے کافی مفید معلومات مل سکتی ہیں۔ وہ زیبائش ملز میں نلکیاں بھرنے کا کام کرتا ہے۔ میں بندہ بھیج کر اسے ادھر ہی بلا لیتا ہوں۔''

بات ختم کرنے کے بعد منشی برکت علی نے اشتیاق ہی کو زیبائش ملز کی جانب بھیج دیا۔ ''زیبائش'' بھی ایک ٹیکسٹائل ملز ہی تھی جہاں ریشمی کپڑا تیار ہوتا تھا۔ یہ خوشی ملز کے برابر میں واقع تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد اشتیاق واپس آگیا اور اس نے بتایا کہ حنیفو آج فیکٹری سے غیر حاضر ہے۔ یہ ایک غیر متوقع اور واہیات اطلاع تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اب مجھے کنگنی والا کے اس کوارٹر کی طرف جانا تھا جہاں حنیفو اور نواجا کرایے کے کسی کوارٹر میں رہائش پذیر تھے۔

میں نے اپنے خیالات کا اظہار جب منشی برکت علی کے سامنے کیا تو وہ خاصے جوشیلے انداز میں بولا۔ ''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ملک صاحب!''

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا آپ مجھے حنیفو کے گھر کی طرف جانے سے روک رہے ہیں؟''

''ہاں......!'' اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے زیر لب مسکرا کر کہا۔ ''فی الحال......''

اس کی خفیف مسکراہٹ نے مجھے یہ تو سمجھا دیا کہ اس کے ذہن میں کوئی خاص زاویہ ترتیب پا چکا ہے۔ اس منصوبے کو منشی کی زبان تک لانے کے لیے میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھ لیا۔

''فی الحال...... میں سمجھا نہیں برکت علی؟''

''جناب! یہ کھانے کا وقت ہے۔'' وہ بہ دستور زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''آپ کھانا کھائے بغیر یہاں سے بالکل نہیں جا سکتے۔''

''اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں......''

''جناب! میں نے کھانا لینے کے لیے ایک بندے کو روانہ کر دیا ہے۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

''کب؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''آپ تو پچھلے آدھے گھنٹے سے مسلسل میرے ساتھ ہیں۔''

''میں جب اندر فیکٹری میں نواز کو دیکھنے گیا تھا تو اسی وقت دفتر کا کھانا لانے والے لڑکے سے کہہ دیا تھا کہ آج تین افراد کا کھانا زیادہ لانا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اب تو وہ واپس بھی آنے والا ہے۔ ہم روزانہ اسی وقت کھانا کھاتے ہیں۔ آج آپ ہمارا ساتھ دیں گے تو اس سے میری عزت افزائی ہوگی۔''

منشی برکت علی کے خلوص اور اپنایت کو دیکھتے ہوئے میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ وہ کھانے کا وقت بھی تھا اور مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ ایسے میں منشی کی نیک خواہش کے سامنے مزاحمت جاری رکھنا کفران نعمت ہوتا۔

میرا یہ ذاتی تجربہ ہے اور اپنے بڑے بزرگوں سے بھی سنتا آیا ہوں کہ جب آپ کی ضرورت کے وقت کوئی خلوص نیت سے آپ کی مدد کرنے کا ارادہ ظاہر کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے لیے رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ ایسے موقعے پر انکار اللہ تعالیٰ کی اس رحمت کی ناراضی کا باعث بن جاتا ہے۔ یہ کفران رحمت کے زمرے میں آتا ہے۔

اس روز میں نے زندگی میں پہلی بار مولوی کے کھوکے (ہوٹل) کا کھانا کھایا اور مان گیا کہ وہ کھوکھا اپنے کھانوں کی لذت کی وجہ سے اگر دور دور تک مشہور ہے تو یہ کوئی غلط بات نہیں۔ منشی نے سالن کی تین ڈشیں منگوائی تھیں۔ بکرے کی

چانپ، بھنی ہوئی دیسی مرغی اور دو پلیٹ چنے کی دال۔ اس کے ساتھ ہی ایک پلیٹ میں موٹی ملائی والا ٹھنڈا ٹھار دہی بھی تھا اور سلاد کے طور پر ایک بڑی طشتری کٹی ہوئی مولی، گاجر اور ٹماٹر و پیاز سے بھی بھری ہوئی تھی۔ میں نے گرما گرم روٹیوں کے ساتھ خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ ہر ڈش اپنی لذت اور ذائقے کے اعتبار سے ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ دیسی مرغی کا میں نے خاص طور پر اس لیے ذکر کیا ہے کہ اس زمانے میں فارمی (فارم کی) مرغی اور فارمی انڈے کا کوئی تصور نہیں تھا۔

☆☆☆

رحمت بی بی کا گھر ڈھونڈنے میں ہمیں ذرا دقت نہ ہوئی۔

رحمت بی بی ایک بیوہ عورت تھی اور اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ گھر چونکہ اس کا ذاتی تھا اور اس کی ضرورت سے زیادہ بڑا تھا لہٰذا اس نے اپنے گھر کی بیٹھک کو کرایے پر دے رکھا تھا۔ وہ اس کمرے کے کرایے سے اپنی گزر بسر کرتی تھی یا پھر کنگنی والا کی ایک صاحب حیثیت شخصیت رانا صاحب اپنی جیب خاص سے اس کی کچھ مالی مدد کر دیا کرتے تھے۔ میرا مطلوبہ بندہ یعنی نواز عرف نواجا اور اس کا ہانڈی وال حنیف عرف حنیفو اسی رحمت بی بی کے کرایے دار تھے۔ میری دستک کے جواب میں ایک ادھیڑ عمر، گوری چٹی عورت نے دروازہ کھولا۔

میں نے سرتاپا گہری نظر سے اس کا جائزہ لیا اور پوچھا۔ ”رحمت بی بی آپ ہی ہو؟“

”جی...... میں ہی رحمت بی بی ہوں۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ”آپ کون ہیں؟ اور میرے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟ آپ کو مجھ سے کیا کام ہے......؟“

اس نے ایک ہی سانس میں جواب دینے کے علاوہ تین سوال بھی کر ڈالے تھے اور اس کا سبب یہ تھا کہ رحمت بی بی کو پتا نہیں تھا کہ پولیس اس کے دروازے پر کھڑی ہے۔ میں نے وردی پوش کانسٹیبل آفتاب کو کانسٹیبل [illegible] شاہ کے ساتھ تھوڑے فاصلے پر کھڑا کر دیا تھا اور رحمت بی بی کی ان پر نظر نہیں پڑی تھی۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ”رحمت بی بی! میرا نام ملک صفدر حیات ہے اور میں حافظ آباد سے آیا ہوں۔ مجھے تم سے نہیں بلکہ تمہارے کرایے داروں سے ملنا ہے۔“

”مطلب یہ کہ نواجا اور حنیفو سے؟“ وہ قدرے اطمینان سے بولی۔ ”نواجا تو حافظ آباد سے ابھی واپس ہی نہیں آیا۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اور حنیفو......“

”چاچی...... کون ہے دروازے پر؟“ رحمت بی بی کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اندر سے کسی مرد نے استفسار کیا۔

”یہ حنیفو ہی آپ کے بارے میں پوچھ رہا ہے......!“ رحمت بی بی نے بتایا۔ ”بے چارہ صبح سے بخار میں پڑا تپ رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ”تو پھر میں حنیفو سے ہی مل لیتا ہوں۔“

”آئیں جی...... بیٹھک میں آجائیں۔“ وہ تعاون آمیز لہجے میں بولی پھر بہ آواز بلند کہا۔ ”کوئی ملک صاحب حافظ آباد سے آئے ہیں۔“ اس کا مخاطب یقیناً حنیفو تھا۔ یہ اس نے حنیفو کے سوال کا جواب دیا تھا۔ ”وہ تم سے اور نواجا سے ملنا چاہتے ہیں۔“

چند سیکنڈ کے بعد رحمت بی بی نے مجھے اپنے گھر کی بیٹھک میں پہنچا دیا جو خالصتاً چھڑوں کے کمرے کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ دیواروں پر فلمی پوسٹر جابہ جا چپکے دکھائی دیتے تھے۔ اس بیٹھک میں دو چارپائیاں بچھی تھیں جن میں سے ایک خالی اور دوسری پر بخار زدہ حنیفو لیٹا ہوا تھا۔ ایک دیوار پر کپڑے ٹانگنے والی کھونٹیاں نصب تھیں جن پر میلے اور دھلے ہوئے ہر دو اقسام کے کپڑے ٹنگے نظر آرہے تھے۔

مجھ پر نگاہ پڑتے ہی حنیفو نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا اور اس کے سامنے دوسری چارپائی پر بیٹھنے کے بعد پوچھا۔

”تم نے بخار کے لیے کوئی دوائی شوائی نہیں لی؟“

”میں نے ڈاکٹر جی سے اسے دوائی لاکر دی ہے جناب!“ حنیفو کے بجائے رحمت بی بی نے جواب دیا۔ ”ڈاکٹر نے کہا ہے کہ شام تک اس کا بخار اتر جائے گا۔“

میں نے حنیفو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہارا ہانڈی وال کہاں غائب ہے؟“

رحمت بی بی کی زبانی مجھے پتا چل گیا تھا کہ نواجا حافظ آباد سے گوجرانوالہ پہنچا ہی نہیں لیکن حنیفو کی زبان سے بھی تصدیق ضروری تھی۔ اس نے جواب دینے کے بجائے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

”جناب! آپ حافظ آباد سے آئے ہیں لیکن میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ کیا آپ نواجا کے کوئی رشتے دار ہیں؟“

”میں حافظ آباد سے ضرور آیا ہوں لیکن نواجا کا رشتے دار نہیں ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اور تم نے مجھے پہچانا اس لیے نہیں کہ...... آج ہم پہلی مرتبہ مل رہے ہیں۔“

”بھائی جی!“ رحمت بی بی مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”آپ نے باہر مجھے بتایا تھا کہ آپ خاص طور پر نواجا سے ملنے آئے ہیں۔ وہاں حافظ آباد میں سب خیریت تو ہے ناجی؟“

اس کے لہجے میں خالص فکرمندی پائی جاتی تھی۔ حنیفو نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔

”یہ تو بتائیں جناب...... کہ آخر آپ ہیں کون......؟“

”میں حافظ آباد کے اس علاقے کا تھانے دار ہوں جہاں نواجا کا گھر ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اور نواجا ہی کی تلاش میں حافظ آباد سے گوجرانوالہ آیا ہوں۔“

”سوہنا رب خیر کرے......“ رحمت بی بی دعائیہ انداز میں بیٹھک کی چھت کو دیکھنے لگی۔

حنیفو نے پوچھا۔ ”تھانے دار صاحب! آپ نواجا کو کس سلسلے میں ڈھونڈ رہے ہیں؟“

اس کے استفسار میں گہری تشویش پائی جاتی تھی۔ یہ انکشاف ہونے کے بعد کہ میرا تعلق محکمۂ پولیس سے ہے، وہ دونوں خاصے گھبرا گئے تھے تاہم ایک بات میں نے واضح طور پر نوٹ کی کہ ان کی گھبراہٹ میں مجرموں والا مخصوص ڈر خوف نہیں تھا۔ میں نے حنیفو کے سوال کے جواب میں بتایا۔

”وہاں حافظ آباد، میرے تھانے میں نواجا کی پڑوسن نے رپورٹ درج کرائی ہے کہ سوموار کی صبح نواجا اس کی بیٹی کو اغوا کر کے لے گیا ہے۔“

”آپ عابو کی بات تو نہیں کر رہے......؟“ حنیفو نے بے ساختہ پوچھا۔

”کیا تم عابدہ عرف عابو کو جانتے ہو؟“ میں نے تیز لہجے میں سوال کیا۔

”جی...... جی ہاں......!“ وہ جلدی سے بولا۔ ”نواجا اکثر اس کا ذکر کرتا رہتا تھا۔“

”کیا ذکر کرتا رہتا تھا؟“ میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ نواجا نے اپنی محبت کے معاملات کو اس سے چھپا کر نہیں رکھا ہوا تھا۔ وہ اکثر اپنی محبوبہ کے بارے میں اس سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ حنیفو کے مطابق وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے لیکن عابو کی ماں کو نواجا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ وہ اسے سخت ناپسند کرتی تھی اور عابو کی شادی اپنے کسی بھانجے طفیل سے کرنا چاہتی تھی۔ نواجا کو اس بات کا بڑا دکھ تھا۔ اس نے اپنی ماں کے توسط سے عابو کے گھر میں رشتہ بھی بھجوایا تھا جو عابو کی ماں فریدہ نے یکسر مسترد کر دیا تھا۔ اس مایوس کن صورتِ حال کے بعد نواجا نے اپنا معاملہ خدا پر چھوڑ دیا تھا۔

”میں کسی بھی قیمت پر یہ ماننے کو تیار نہیں کہ نواجا نے عابو کو اغوا کیا ہوگا۔“ اپنی بات کے اختتام پر حنیفو نے بڑے یقین سے کہا۔ ”اس میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں کئی بار اسے اکسانے کی کوشش بھی کی تھی کہ جب...... لڑکا لڑکی راضی تو کیا کرے گی اماں جی!“

”تم محاورہ غلط بول رہے ہو حنیفو!“ میں نے فوراً اسے ٹوک دیا۔ ”یہ کچھ یوں ہے کہ...... جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی!“

”جانتا ہوں تھانے دار صاحب......!“ وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ ”میں نلکیاں بھرنے کی مشین پر کھڑا ہوتا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں کوئی جاہل گنوار ہوں۔ پوری چار جماعتیں پاس ہوں جناب...... قسمت نے زیبائش طرز کی مشین پر لا کھڑا کیا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے......؟“ وہ جذبات کے اس اظہار میں لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”میں نے محاورے میں ضرورت کے مطابق تبدیلی کی ہے۔ عابو اور نواجا ابھی میاں بیوی نہیں بنے اور فریدہ بھی اماں جی ہے، قاضی نہیں۔“

”میں تمہاری وضاحت سے اتفاق کرتا ہوں۔“ میں نے اس کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا دعویٰ ہے کہ نواجا نے عابو کو اغوا نہیں کیا۔ یہ تم صرف اس کی دوستی میں کہہ رہے ہو یا تمہارے پاس اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت بھی ہے؟“

”میرے پاس سب سے بڑا ثبوت تو میرا دل ہے تھانے دار صاحب۔“ وہ بڑی معصومیت سے بولا۔ ”اور اس دل کی آواز یہ ہے کہ نواجا ایسا نہیں کر سکتا۔“

میں نے بخار میں تپتے ہوئے ایک شخص سے زیادہ جرح مناسب نہ سمجھی اور ٹھہرے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”وہاں کل صبح سے عابو غائب ہے اور یہاں نواجا کہیں نظر نہیں آرہا۔ تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو حنیفو؟“

”جناب! میں کیا کہوں......“ وہ بے چارگی سے بولا۔ ”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔“

”جب سوموار کی صبح نواجا یہاں نہیں پہنچا تو تمہیں اس کے بارے میں تشویش نہیں ہوئی تھی؟“ میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

”جناب! بات دراصل یہ ہے کہ سوموار کی صبح نواجا یہاں گھر پر نہیں بلکہ سیدھا اپنی فیکٹری پہنچتا تھا۔ ہماری ملاقات رات ہی کو ہوا کرتی تھی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”کل رات کو جب وہ فیکٹری سے گھر نہیں آیا تو مجھے اس کی فکر تو ہوئی تھی لیکن پھر یہ سوچ کر میں سو گیا کہ آج صبح راسکو جا کر اس کے بارے میں پوچھوں گا مگر آج صبح جب میں سو کر اٹھا تو تیز بخار نے میری مت مار رکھی تھی۔ میں نہ تو راسکو طرز جاسکا اور نہ ہی اپنے کام پر......“

”اس کا مطلب ہے، تمہیں کچھ اندازہ نہیں کہ نواجا کہاں غائب ہے؟“

”بالکل نہیں تھانے دار صاحب......!“ وہ افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

ایک فوری خیال کے تحت میں نے اس سے پوچھا۔ ”حنیفو! تمہارا تعلق بھی تو وزیر آباد سے ہے نا؟“

”جی ہاں!“ اس نے اثبات میں جواب دیا اور سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اس کی نظر کی تسکین کی خاطر کہا۔ ”حنیفو! عابو کی ماں فریدہ، نواجا کو پسند نہیں کرتی تھی اور عابو کی شادی وہ اپنے بھانجے طفیل سے کرنا چاہتی تھی جو وزیر آباد کی چاقو، چھریاں بنانے والی کسی فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ کیا تم طفیل یا اس کے گھر والوں کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟“

”نہیں جناب!“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے یقین ہے کہ فریدہ نے اس سلسلے میں جھوٹ بولا ہے۔ اس کی کوئی بہن یا بھانجا وزیر آباد میں نہیں رہتا۔“

”اچھا!“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ بات تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ رہے ہو؟“

”جناب! میں نے کئی بار نواجا سے کہا کہ وہ فریدہ سے اپنی بہن کا ایڈریس پوچھ کر آئے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس نے ایک دو مرتبہ فریدہ سے اس سلسلے میں بات بھی کی لیکن اس نے اپنی بہن یا بھانجے کے بارے میں معلومات فراہم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔“

میں نے اپنی دلچسپی کو برقرار رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تم ان لوگوں کا ایڈریس منگوا کر کیا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے؟“

”ایک تو میں وزیر آباد جا کر یہ تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ فریدہ اپنے رشتے داروں کے حوالے سے سچ بول رہی ہے یا جھوٹ۔ یہ کام میں بہت آسانی سے کر سکتا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اور دوسرے......!“

”دوسرے کیا؟“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے فوراً پوچھ لیا۔

”جناب! میں دراصل طفیل سے مل کر اسے یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ عابو کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔ عابو، نواجا سے محبت کرتی ہے اور وہ عابو کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکے گا۔ اگر اس کام کے لیے مجھے طفیل کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگانا پڑتا یا اس کے پاؤں بھی چھونا پڑتے تو میں ضرور کرتا۔“

حنیفو کی باتوں سے سچی دوستی کی خوشبو پھوٹتی تھی۔ میں نے اس کی طبیعت کو مدنظر رکھتے ہوئے دو چار سوالات کے بعد فارغ کر دیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گا۔ اگلے ہی لمحے ایک سنسنی خیز انکشاف ہوا۔

میں جیسے ہی اٹھ کر کھڑا ہوا، سامنے کی دیوار پر لگے فلم کے ایک پوسٹر پر نظر پڑی تو میں چونک اٹھا۔ اس پوسٹر میں یوسف خان، نغمہ اور ادیب کے چہرے نظر آرہے تھے لیکن ہر چہرے کے نیچے پین کی مدد سے ایک نام لکھا ہوا تھا۔ اس ترتیب کے ساتھ کہ یوسف خان کے نیچے نواز، نغمہ کے نیچے عابدہ اور ادیب کے نیچے نواب......!

”یہ کیا ہے حنیفو؟“ میں نے پوسٹر کی طرف اشارہ کرکے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”جناب! یہ نام نواجا نے لکھے ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”کیوں......اس کا مطلب کیا ہے؟“

”تھانے دار صاحب! یہ فلم میں نے اور نواجا نے ایک ساتھ دیکھی تھی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس فلم میں یوسف خان اور نغمہ ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں لیکن ادیب ولن کا کردار ادا کرتے ہوئے نغمہ کی ماں کو اپنی مٹھی میں لے لیتا ہے لہٰذا نغمہ کی ماں یوسف خان سے نفرت کرنے لگتی ہے۔“

”لیکن......“ میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی لقمہ دے دیا۔ ”نواجا نے ادیب کی تصویر کے نیچے نواب کیوں لکھا ہے؟“

”جناب! نواجا کی زندگی میں یہ نواب بھی ادیب والا کردار ادا کر رہا ہے۔“ وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”عابو نے نواجا کو بتایا تھا کہ فریدہ پوری طرح نواب کی مٹھی میں ہے اسی لیے وہ نواجا سے نفرت کرتی ہے۔“

میرے پورے وجود میں جیسے ایک کرنٹ سا دوڑ گیا۔ میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔ ”کہیں...... یہ وہی

نواب تو نہیں......جس کی حافظ آباد کی سبزی منڈی میں فروٹ اور سبزی کی آڑھت کی دکان ہے......؟“

”جی ہاں......بالکل......!“

☆☆☆

میں ایک مرتبہ پھر آسیہ بی بی کے گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔

وہ رات کا وقت تھا اور میں گوجرانوالہ سے تھوڑی دیر پہلے ہی واپس آیا تھا۔ کانسٹیبل حسین شاہ کو تھانے میں چھوڑ کر میں چپکے سے آسیہ کے گھر آ گیا تھا۔ فریدہ کو قطعاً اس بات کی خبر نہیں تھی کہ میں اس وقت اس کے پڑوس میں موجود ہوں۔ حنیفو کے انکشاف نے میرے رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑا دی تھی۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا اور پوچھا۔

”یہ سب کیا ہے آسیہ بی بی؟“

”یہ تو جناب آپ فریدہ سے پوچھیں۔“ وہ جلے کٹے انداز میں بولی۔ ”جو نواب کو اپنے گھر میں گھسائے رکھتی ہے۔“

”تو اس کا مطلب ہے، نواب علی کا فریدہ کے گھر میں اکثر آنا جانا رہتا ہے؟“ میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

”وہ تو جناب اس وقت بھی فریدہ کے گھر میں موجود ہے۔“

میں آسیہ کے انکشاف پر چونک اٹھا اور پوچھا۔ ”کیا واقعی؟“

”اگر میری بات کا یقین نہ آرہا ہو تو خود جا کر دیکھ لیں۔“ وہ سادگی سے بولی۔

میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ”نواجا نے ولن کے نیچے اگر نواب کا نام لکھا تھا تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے وہ نواب کو اپنا رقیب سمجھتا تھا۔“

”جناب! آپ کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی۔“ وہ الجھن زدہ انداز میں بولی۔ ”میرے خیال میں تو نواب، فریدہ کے لیے یہاں آتا ہے۔ ان دونوں میں کافی عرصے سے چکر چل رہا ہے جب سے فریدہ کا گھر والا احتاج ہوا ہے، نواب نے اس گھر کی راہ دیکھ لی ہے۔ وہ کسی نہ کسی بہانے دوسرے تیسرے دن یہاں ضرور آتا ہے اور کئی گھنٹے گھر کے اندر گزار کر جاتا ہے۔ آپ نے فریدہ کو تو دیکھا ہی ہے۔ جوان بیٹی کی ماں ہے لیکن خود بھی جوان ہی نظر آتی ہے۔ اوپر سے اللہ نے شکل صورت بھی اچھی دے دی ہے۔ کم بخت اڑتالیس سال کی ہو گئی ہے مگر پینتیس سے زیادہ کی نہیں لگتی۔“

وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئی پھر ایک تھکی ہوئی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

”جن عورتوں کے خصم ناکارہ ہو جائیں اور نک سک سے بھی اچھی ہوں تو ان پر زمانے بھر کے مردوں کی نظریں لگ جاتی ہیں۔ نواب کے پاس تو بڑا مضبوط بہانہ بھی ہے کہ تین سال پہلے تک فریدہ کا شوہر اس کی دکان پر ملازم تھا۔ وہ مالی امداد کی آڑ میں بڑی آسانی سے اس کے گھر میں آتا جاتا ہے۔“

”فریدہ اور نواب کے حوالے سے تو بات سمجھ میں آتی ہے۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن حنیفو کے مطابق عابو نے نواجا کو بتایا تھا کہ اس کی ماں، نواب کی وجہ سے اس کی شادی کہیں ہونے نہیں دیتی۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ نواب یہاں عابو کے چکر میں آتا ہے۔ وہ فریدہ کے ساتھ رپورٹ درج کرانے تھانے بھی آیا تھا اور عابو کی گمشدگی سے خاصا پریشان نظر آتا تھا۔“

”یہ ایک نئی بات سامنے آرہی ہے تھانے دار صاحب!“ وہ بوجھل لہجے میں بولی۔ ”فریدہ اور عابو تو جائیں جہنم میں۔ آپ کسی طرح فوراً میرے بیٹے کو تلاش کر دیں۔ پتا نہیں، وہ جھلا کہاں چلا گیا ہے......؟“

”یہ جھلا جہاں بھی گیا ہے، میں بہت جلد اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔“ میں نے بڑے مضبوط الفاظ میں اسے تسلی دی اور کہا۔ ”عابو اور نواجا جس پراسرار انداز میں اچانک غائب ہوئے ہیں اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ تمہارے بیٹے نے شاید ہمت کر ہی لی ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے، نواجا نے عابو کو اغوا کیا ہے؟“ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔ ”نواجا نے عابو کو اغوا کیا ہے یا وہ اپنی مرضی سے اس کے ساتھ گئی ہے لیکن اس حوالے سے سوچا جاسکتا ہے کہ وہ دونوں ایک ساتھ کہیں غائب ہوئے ہیں، بہرحال......“

میں نے تھوڑا توقف کیا پھر ایک سانس خارج کرنے کے بعد اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کل صبح ہی دو تین تحقیقاتی ٹیمیں ترتیب دے کر آس پاس کے علاقوں میں دوڑاتا ہوں۔ انشاء اللہ! ایک دو دن میں نواجا کا سراغ مل جائے گا۔ کیا تمہارے پاس نواجا کی کوئی تصویر رکھی ہوئی ہے؟“

”جی ہاں......اس کا ایک فوٹو ہے میرے پاس۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”آپ کو دکھاؤں جی؟“

”ضرور......فوراً!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ گھر کے اندرونی حصے سے مذکورہ

فوٹو نکال لائی اور یہ دیکھ کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا کہ اس فوٹو میں نواجا کے ساتھ ایک لڑکی بھی موجود تھی۔ وہ دونوں کا پورٹریٹ تھا۔ میں نے آسیہ سے پوچھا۔

”یہ لڑکی کون ہے؟“

”عابو......!“ اس نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔

”اس کا مطلب ہے، نواجا اپنے کسی بھی معاملے کو تم سے چھپاتا نہیں تھا۔“ میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اور اس فوٹو سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں جبھی عابو اس کے ساتھ تصویر بنوانے فوٹو گرافر کے پاس گئی ہوگی۔“

”جی حقیقت تو یہی ہے۔“ وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔ ”اگر یہ بات فریدہ کی سمجھ میں نہیں آتی تو میں کیا کرسکتی ہوں۔“

”تمہیں کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں آسیہ بی بی!“ میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔ ”اب جو بھی کرنا ہے، میں خود ہی کرلوں گا۔“

وہ بڑی فکرمندی سے بولی۔ ”تھانے دار صاحب! میرا دل بہت ڈر رہا ہے۔“

”تمہیں کس بات سے ڈر لگ رہا ہے؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”کہیں اس بدبخت نواب نے تو...... میرے نواجا کو...... غائب نہیں کردیا۔“ وہ سراسیمہ لہجے میں بولی۔

”اس بات کے امکانات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر یہ بات سچ ہے کہ نواب، عابو کے لیے گھر کے چکر لگاتا ہے تو وہ نواجا کو اپنے راستے کا کانٹا سمجھتے ہوئے کہیں غائب کرواسکتا ہے لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ نواجا کے ساتھ ہی عابو بھی غائب ہے اور فریدہ کے علاوہ نواب علی بھی اس کی گمشدگی کے لیے بے حد پریشان ہے...... آسیہ! یہ معاملہ خاصا الجھا ہوا ہے۔“

”اور یہ بھی تو ہوسکتا ہے جی......“ آسیہ نے بڑے پتے کی بات کی۔ ”کہ یہ دونوں کی ملی بھگت ہو۔“

”کن دونوں کی......!“ میں نے اضطراری انداز میں پوچھا۔ ”اور...... کیا ملی بھگت؟“

”میں فریدہ اور نواب کی بات کررہی ہوں جی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ بھی تو ممکن ہے کہ فریدہ نے چپ چاپ عابو کو نواب کے حوالے کردیا ہو اور نواب نے نواجا کو غائب کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہو کہ نواجا نے عابو کو اغوا کرلیا ہے۔“

”میں تمہارے خیال کو یکسر نظرانداز تو نہیں کرسکتا آسیہ بی بی۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن میری یہ ذاتی رائے ہے کہ فریدہ، عابو کی گمشدگی کے کھیل میں شامل نہیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں وہ بے چینی اور پریشانی دیکھی ہے جو اس ماں کا خاصا ہے جس کی جوان بیٹی اچانک گم ہوگئی ہو۔“

”جو بھی ہے جی۔“ وہ دکھی لہجے میں بولی۔ ”مجھے کسی سے کچھ لینا دینا نہیں۔ آپ میرے نواجا کو ڈھونڈ کر مجھ تک پہنچادیں تو آپ کا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔“

”تم فکر نہیں کرو۔“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”میں بہت جلد تمہارے بیٹے کو تلاش کرلوں گا۔“

”بہت بہت شکریہ جی۔“ وہ دعائیہ انداز میں بولی۔ ”اللہ پاک آپ کو صحت دے اور عمر دراز کرے۔“

”آمین......!“ میں نے بے ساختہ کہا اور پھر پوچھا۔ ”آسیہ بی بی! یہ تو بتاؤ، کیا نواب علی شادی شدہ ہے؟“

”ہاں جی!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”اس کے تین بچے بھی ہیں اور تینوں ہی جوان جہان ہیں۔ بڑی لڑکی نازیہ اٹھارہ سال کی ہے، اس سے چھوٹی فوزیہ کی عمر سترہ سال ہے اور سب سے چھوٹے بیٹے عمران کی عمر پندرہ سال ہے۔ نواب کی لگ بھگ بیس سال پہلے شادی ہوئی تھی، وہ اپنی بیوی دلشاد بانو سے دس بارہ سال چھوٹا ہے۔ دلشاد اس وقت ساٹھ کے پیٹے میں ہوگی۔“

”واہ بھئی، آسیہ بی بی!“ میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تمہیں تو نواب کے بارے میں بڑی معلومات ہیں۔“

”یہ کوئی خاص بات نہیں جی۔“ وہ سادگی سے بولی۔ ”معلومات تو رکھنا پڑتی ہے۔ آخر کو محلے داری ہے۔“

”کیا نواب کی بیوی کو اس بات کی خبر ہے کہ وہ فریدہ کے گھر میں کوئی چکر چلا رہا ہے؟“ میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”نواب کے یہاں آنے جانے کا تو شاید اسے پتا ہے۔“ وہ معتدل انداز میں بولی۔ ”مگر مجھے یقین ہے، نواب کی چکربازیوں کی کہانی ابھی تک دلشاد بانو تک نہیں پہنچی۔“

”تمہیں یہ یقین کس بنا پر ہے؟“

”جناب! نواب اس وقت جو کچھ بھی ہے وہ دلشاد بانو کی وجہ سے ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ جو سبزی منڈی میں آڑھت کا کاروبار ہے نا، یہ پہلے دلشاد کے باپ حکمت خان کا ہوا کرتا تھا اسی لیے دکان کا نام ”خان

فروٹ“ سے شروع ہوتا ہے۔ حکمت خان کی ایک ہی بیٹی تھی دلشاد بانو۔ نواب نے دولت کے لالچ میں خود سے بارہ سال بڑی عمر کی دلشاد بانو سے شادی کی تھی پھر اس کے منصوبے کے عین مطابق حکمت خان کے انتقال کے بعد سب کچھ نواب کے ہاتھ میں آگیا۔ دلشاد نے نواب کو سیاہ و سفید کا مالک بنا رکھا ہے اور اس پر اندھا اعتماد کرتی ہے۔ اگر اس کو پتا ہوتا کہ نواب کے کرتوت کیا ہیں تو وہ پہلی فرصت میں نواب کو اپنے گھر اور کاروبار سے بے دخل کردیتی، میرے یقین کی یہی وجہ ہے تھانے دار صاحب!“

”ٹھیک ہے، میں دیکھتا ہوں کہ اس سلسلے میں کیا ہوسکتا ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ”آسیہ بی بی! اب میں چلوں گا۔ تم کسی سے اس ملاقات کا ذکر نہیں کرنا۔ یہ اطمینان رکھو کہ میں بہت جلد نواجا کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔“

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور میں اس کے گھر سے نکل آیا۔

اصولی اور منطقی طور پر مجھے فریدہ کے گھر میں جھانک کر یہ دیکھنا چاہیے تھا کہ نواب اس وقت وہاں کیا کررہا تھا لیکن میں نے دانستہ ادھر کا رخ نہیں کیا۔ نواب کو گھیرنے اور چیک کرنے کے لیے میرے ذہن میں ایک اور منصوبہ ترتیب پارہا تھا۔

☆☆☆

آسیہ بی بی نے مجھے جو فوٹو فراہم کیا تھا اس کے پیچھے حافظ آباد کے مین بازار کے ایک فوٹو گرافر کی مہر لگی ہوئی تھی۔ میں نے اگلے روز مذکورہ فوٹو گرافر سے اس فوٹو کی تین چار کاپیاں مزید تیار کروالیں اور دو، دو افراد پر مشتمل چار متلاشی ٹیمیں تشکیل دے کر انہیں عابو اور نواجا کو ڈھونڈنے کے لیے حافظ آباد اور گوجرانوالہ کے مختلف علاقوں کی جانب روانہ کردیا۔ وہ لوگ بس اسٹینڈ، تانگا اسٹینڈ اور مختلف کھانے پینے کے مقامات پر جاکر عابو اور نواجا کے بارے میں استفسار کرتے۔ گوجرانوالہ کی سمت جانے والی ٹیم کو میں نے ایک دستی رقعہ بھی تھما دیا تھا جو تھانا صدر کے انچارج کے نام تھا۔ اس رقعے میں، میں نے امتیاز گوندل سے اپیل کی تھی کہ وہ میری بھیجی ہوئی ٹیم کے ساتھ مکمل تعاون کرے۔

ویسے ایک بات ہے کہ میں نے اس تمام تر صورت حال میں اس امکان کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنے ذہن سے محو نہیں ہونے دیا تھا کہ عین ممکن ہے، نواجا اپنے ساتھ عابو کو کہیں بھگا لے گیا ہو۔

کوئی بارہ بجے کے قریب میں نے اے ایس آئی فاضل کو اپنے کمرے میں بلایا اور اسے ضروری ہدایات دینے لگا۔ فاضل میرے لیے انتہائی بھروسے کا آدمی تھا اور میں اس سے ”عابو نواجا“ کیس پر کھل کر بات بھی کررہا تھا۔ وہ میری کارگزاری سے پوری طرح آگاہ تھا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ چکا تو میں نے کہا۔

”فاضل! تم ابھی میرے ساتھ فریدہ کے گھر کی طرف چلو گے۔ میں تھوڑا پیچھے ہی رک جاؤں گا اور تم فریدہ سے جاکر کہو گے کہ میں نے ایک ضروری بات کرنے کے لیے اسے تھانے بلایا ہے۔ تم اسے اپنے ساتھ تھانے لے آؤ گے۔ ٹھیک ہے؟“

”جی، ٹھیک ہے!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ ”ملک صاحب! اگر اس وقت نواب علی بھی فریدہ کے گھر پر ہوا تو اس کا کیا کرنا ہے؟“

”تم اسے بھی ساتھ لے آنا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”جب تم انہیں یہ بتاؤ گے کہ میں نے عابو کا ایک سراغ پالیا ہے تو وہ دونوں پہلی فرصت میں تمہارے ساتھ یہاں دوڑے چلے آئیں گے۔“

”سمجھ لیں کہ وہ تھانے پہنچ گئے ملک صاحب!“ فاضل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”لیکن آپ تو تھانے میں موجود نہیں ہوں گے۔ اس صورت میں انہیں کس سے بہلانا ہوگا؟“

”تم ان سے کہہ سکتے ہو کہ مجھے ایک ضروری کام سے بس اڈے تک جانا پڑ گیا ہے۔ میں پندرہ بیس منٹ میں واپس آرہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بس انہیں کوئی آدھے گھنٹے تک تھانے میں روک کر رکھنا ہے۔ اتنی دیر میں تو میں واپس آہی جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے جناب! میں یہ کرلوں گا۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ”لیکن آپ تو میرے ساتھ فریدہ کے گھر کی طرف جارہے ہیں۔ اس آدھے گھنٹے میں آپ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ملک صاحب؟“

”تم جیسے ہی فریدہ...... یا فریدہ اور نواب کے ساتھ وہاں سے تھانے کی جانب روانہ ہوگے، میں فریدہ کے گھر میں گھس جاؤں گا۔“ میں نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔

”کیا آپ کے خیال میں......“ وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”فریدہ نے اپنی بیٹی کو گھر میں کہیں چھپا رکھا ہے؟“

”اس امکان کو نظرانداز تو نہیں کیا جاسکتا۔“ میں نے ذومعنی لہجے میں کہا۔ ”اس دوران میں مجھے فریدہ کے گھر کی

مکمل تلاشی کا موقع مل جائے گا اور لگے ہاتھوں میں اس کے اپاہج شوہر کا بھی انٹرویو کرلوں گا۔‘‘

’’انٹرویو والا آئیڈیا شان دار ہے۔‘‘ وہ زیرِلب مسکراتے ہوئے بولا۔ ’’آخر کو قوبا بھی اس کہانی کا ایک کردار ہے۔ اس کے خیالات اور تاثرات کو بھی منظرِ عام پر آنا چاہیے۔‘‘

’’تو پھر چلیں؟‘‘ میں نے سوالیہ نظر سے اے ایس آئی کی طرف دیکھا۔

’’جو حکم آپ کا ملک صاحب!‘‘

☆☆☆

عابو تو اپنے گھر میں کہیں نہیں تھی تاہم یعقوب عرف قوبا سے وہ مختصر سی ملاقات بڑی سود مند رہی۔ وہ معذور شخص اپنے سینے میں کرب اور اذیت کا ایک طوفان چھپائے بیٹھا تھا۔ میری محبت بھری کرید نے اس کے ضبط کے بند کھول دیے اور اس نے اپنا دل وا کر دیا۔ اس ملاقات میں قوبا سے جو سنسنی خیز معلومات مجھ تک پہنچیں، میں ان کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

اوّل تو یہ کہ اس پر فالج کا اٹیک نہیں ہوا تھا۔ اس سلسلے میں فریدہ اور نواب نے مجھ سے غلط بیانی کی تھی۔ درحقیقت سبزی منڈی میں نواب کی دکان پر کام کرتے ہوئے تین سال پہلے پیاز کی بھری ہوئی ایک بوری پیٹھ پر اٹھاتے ہوئے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں بڑی خطرناک گڑبڑ ہوگئی تھی جو بعدازاں اس کی مستقل معذوری کی شکل اختیار کر گئی۔ دوم اس کی نظر یقیناً کمزور تھی لیکن اتنی بھی نہیں جتنی وہ ظاہر کرتا تھا۔ وہ جانتے بوجھتے ہوئے اندھا بنا ہوا تھا اور اسی اندھے پن کے طفیل گھر میں ہونے والی ہر سرگرمی کی اسے خبر رہتی تھی۔ اس بات میں بھی کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ فریدہ اور نواب کے معاملات سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ اس نے اپنی معذوری اور مجبوری کے ہاتھوں یہ زہریلا گھونٹ پینے کا تو فیصلہ کرلیا تھا لیکن اندر ہی اندر وہ روز مرتا، روز جیتا تھا۔ اس کی غیرت تو بڑا جوش مارتی تھی لیکن عملی طور پر وہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں تھا لہٰذا اس کی بے بسی کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

یہ معاملہ تو جیسے تیسے چل رہا تھا لیکن جب نواب نے فریدہ سے آگے بڑھ کر اس کی بیٹی پر بری نگاہ ڈالنا شروع کی تو اس کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ اپنی داستان کے اس حصے پر پہنچ کر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہوگیا۔

میں نے اس کے کندھوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ’’قوبا! کیا تمہیں یقین ہے کہ نواب، عابو کو میلی نظر سے دیکھ رہا ہے؟‘‘

’’میں اندھا نہیں ہوں جناب۔‘‘ وہ زخمی لہجے میں بولا۔ ’’اس گھر میں جو ہو رہا ہے اور جو آگے ہونے والا ہے، سب میری آنکھوں کے سامنے ہے لیکن میں اپنے حالات کے ہاتھوں اس قدر بے بس اور لاچار ہوکر رہ گیا ہوں کہ کسی شے پر میرا اختیار نہیں رہا۔ مجھے تو یہاں تک بھی شک ہے کہ......‘‘ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر پُروثوق انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

’’کہ...... عابو کی پُراسرار گمشدگی میں بھی اسی بدذات نواب ہی کا ہاتھ ہے۔ اس کا سسر حکمت خان بہت نیک اور خداترس انسان تھا۔ یہ اس کی ضد ثابت ہو رہا ہے۔‘‘

موجودہ صورتِ حال میں وہ ایسا سوچنے میں حق بہ جانب تھا۔ میں نے اس کی بات کے اختتام پر ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

’’قوبا جی! تمہارا کیا خیال ہے۔ ان حالات کے ذمے دار شخص کو کوئی سزا تو ملنا ہی چاہیے نا......؟‘‘

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ’’آپ کا اشارہ نواب کی طرف ہے نا؟‘‘

’’بالکل...... میں اسی مجرم شخص کی بات کر رہا ہوں۔‘‘

’’یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے جناب۔‘‘ وہ جوش بھرے انداز میں بولا۔ ’’اگر آپ اس شیطان کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کریں گے تو مجھے بڑی خوشی ہوگی اور آپ کا یہ احسان میں زندگی بھر یاد رکھوں گا۔‘‘

’’میں ضرور یہ کارروائی کروں گا۔‘‘ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ’’لیکن اس سلسلے میں تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔‘‘

’’میں ساتھ دوں گا۔‘‘ وہ بڑے عزم سے بولا۔ ’’بتائیں کیا حکم ہے تھانے دار صاحب...... میں جو کرسکتا ہوں، جس قابل رہ گیا ہوں، وہ ضرور کروں گا۔‘‘

’’تمہیں صرف دیانت داری سے زبان چلانا ہوگی۔‘‘ میں نے بہ دستور سنجیدہ انداز میں کہا۔ ’’اور مجھے یقین ہے، تم ایسا کرلوگے۔‘‘

’’میں زبان چلانے کا مطلب نہیں سمجھا۔‘‘ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ’’میں کسی طرح گھیر گھار کر نواب کی بیوی کو تمہارے پاس لاؤں گا اور تمہیں دلشاد بانو کو بتانا ہوگا کہ اس کا شوہر تمہارے گھر میں کون سا گھناؤنا کھیل، کھیل رہا ہے۔‘‘

’’سمجھ گیا جناب!‘‘ وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ’’میں اس کام کے لیے تیار ہوں۔‘‘

’’تو پھر سمجھ لو کہ تمہاری اذیت کے دن ختم ہوگئے۔‘‘ میں نے مضبوط لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ’’نواب عموماً کس وقت تمہارے گھر میں آتا ہے؟‘‘

’’وہ سورج غروب ہونے کے بعد ہی ادھر آتا ہے۔‘‘ اس نے جواب دیا۔ ’’اور گھنٹا، دو گھنٹا گزارنے کے بعد رات کے اندھیرے ہی میں واپس چلا جاتا ہے۔ پہلے تو وہ ہفتے میں ایک آدھ بار ہی آیا کرتا تھا لیکن جب سے عابو گم ہوئی ہے، اس منحوس نے ہمدردی جتانے کے بہانے روز ہی آنا شروع کردیا ہے اور کافی دیر کے بعد واپس جاتا ہے۔‘‘

’’بس، تو پھر آج رات کو تم ذہنی طور پر تیار رہنا۔‘‘ میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ’’جب نواب اور فریدہ اپنے معاملات میں مصروف ہوں گے تو میں دلشاد بانو کے ساتھ یہاں پہنچ جاؤں گا۔ تم میری آواز سنتے ہی اپنی بیوی کو برا بھلا کہنا شروع کردینا۔ اس موقعے پر تمہیں بہ آوازِ بلند اپنے دل کا غبار نکالنا ہے۔ تمہیں نہیں معلوم ہوگا کہ دلشاد بانو سب سن رہی ہے لہٰذا تم کوئی کسر اٹھا نہیں رکھنا۔ باقی کے معاملات میں سنبھال لوں گا۔‘‘

’’آپ بے فکر ہوجائیں تھانے دار صاحب!‘‘ وہ مستحکم لہجے میں بولا۔ ’’آپ مجھے غبار نکالنے کا موقع فراہم کر رہے ہیں تو میں ان شاءاللہ! آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔‘‘

میں بے فکر ہوکر اس کے گھر سے اٹھ آیا۔

☆☆☆

فریدہ تھانے میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔

اے ایس آئی فاضل نے اسے باتوں میں لگا رکھا تھا۔ یہ میں نے دیکھ لیا تھا کہ گھر سے وہ اکیلی ہی فاضل کے ساتھ نکلی تھی۔ نواب اس وقت فریدہ کے گھر میں موجود نہیں تھا۔ قوبا کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ آج کل وہ رات میں ادھر کا چکر لگا رہا تھا اور اس بات کی تصدیق فریدہ کی پڑوسن آسیہ کے انکشاف سے بھی ہوتی تھی۔ رات جب گوجرانوالہ سے واپسی پر میں آسیہ سے ملنے گیا تھا تو اس نے مجھے بتایا تھا، نواب اس وقت فریدہ کے گھر میں موجود تھا۔

مجھ پر نظر پڑی تو وہ بے تابی سے مستفسر ہوئی۔ ’’تھانے دار جی! آپ کہاں چلے گئے تھے۔ میں کتنی دیر سے یہاں بیٹھی آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔‘‘

میں نے اے ایس آئی کو اشارہ کیا کہ وہ کمرے سے باہر چلا جائے۔ یہ سب اس سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھا جو میں نے فاضل کے ساتھ مل کر تیار کیا تھا۔ جب میں اور فریدہ

کمرے میں باقی رہ گئے تو میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''میں تمہاری بیٹی ہی کے سلسلے میں مارا مارا پھر رہا ہوں فریدہ بی بی!''

''مجھے آپ کا بندہ بتا رہا تھا کہ آپ نے عابو کا سراغ لگالیا ہے؟''

میرا بندہ سے اس کی مراد اے ایس آئی فاضل تھا۔

میں نے بہ دستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''صرف عابو ہی کا نہیں بلکہ میں نے دونوں کا سراغ لگالیا ہے۔''

اس کی آنکھوں میں حقیقی چمک پیدا ہوئی پھر وہ نفرت بھرے لہجے میں پوچھ بیٹھی۔ ''وہ بدذات میری بچی کو کہاں لے گیا ہے؟''

''گجرات!'' میں نے آواز دھیمی رکھتے ہوئے پُراسرار لہجے میں کہا۔ ''رات تک مجھے یہ بھی پتا چل جائے گا کہ وہ دونوں گجرات کے کس علاقے میں موجود ہیں لیکن فریدہ بی بی! تمہیں ایک کام کرنا ہے؟''

میں نے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے بولی۔ ''جی، حکم کریں۔''

میں نے بہ دستور دھیمے لہجے میں کہا۔ ''اس کامیابی کا کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے...... ورنہ کھیل بگڑ بھی سکتا ہے۔ میں نے ابھی تھانے میں بھی کسی کو نہیں بتایا......''

''اور یہ آپ کا بندہ......!'' اس کا اشارہ فاضل کی جانب تھا۔

''یہ میرے بھروسے کا بندہ ہے۔'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

''نواب صاحب بھی تو میرے لیے بھروسے کے آدمی ہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''کیا میں انہیں اس راز میں شریک کرسکتی ہوں؟''

اس نے میرے بچھائے ہوئے جال میں خود ہی قدم رکھ دیا تو میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ضرور...... کیوں نہیں۔ نواب صاحب تو تمہارے سچے خیرخواہ ہیں لیکن انہیں تاکید کردینا کہ اس بات کو ابھی آگے نہ بڑھائیں...... میں آج رات کو تمہارے گھر آرہا ہوں ٹھیک سات بجے......!''

''کیوں......!'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ''خیریت تو ہے ناجی؟''

''چھ، ساڑھے چھ بجے تک مجھے گجرات کی طرف سے پکی اطلاعات مل جائیں گی۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''میں اس حساس معاملے پر یہاں تھانے میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا اس لیے گھر پر آرہا ہوں۔ تم نواب صاحب کو بھی اپنے گھر پر بلالو۔ میں ان کی مشاورت سے گجرات کے چھاپے کا پروگرام ترتیب دینا چاہتا ہوں۔'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تم نواب صاحب کو ٹھیک سات بجے اپنے گھر بلا سکتی ہو؟''

''کیوں نہیں جناب۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''یہ کون سی مشکل بات ہے۔ شام کو تو وہ ویسے ہی میرے گھر آئیں گے۔ جب سے عابو گم ہوئی ہے، وہ روزانہ شام کو میرے گھر آتے ہیں اور کافی دیر تک میری دلجوئی کرتے رہتے ہیں۔ وہ مجھے تسلیاں دیتے ہیں کہ میں عابو کے بارے میں زیادہ پریشان نہ ہوں۔ وہ جلد ہی مل جائے گی۔''

''اس وقت نواب صاحب کہاں ہوں گے؟'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔

''وہ منڈی میں ہوں گے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''سبزی منڈی میں زیادہ تر کام تو صبح میں ہوتا ہے لیکن نواب صاحب شام تک ادھر ہی رکتے ہیں۔ دوسرے شہروں کے آڑھتیوں کا آنا جانا دوپہر کے بعد ہی ہوتا ہے۔ کاروباری لین دین اور دیگر معاملات کے لیے انہیں شام تک منڈی میں رکنا پڑتا ہے۔''

''بس، تو پھر ٹھیک ہے۔ ہماری ملاقات، تمہارے گھر پر سات بجے ہوگی۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

وہ اٹھی اور خوشی خوشی رخصت ہوگئی۔

میرے پاس وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ شام چھ سے پہلے مجھے تمام معاملات نمٹانا تھے۔ یہ اچھی بات تھی کہ فوری طور پر نواب علی کو اپنے گھر کی طرف نہیں جانا تھا لہٰذا میرے لیے یہ سنہری موقع تھا کہ میں اس کے گھر پہنچ کر دلشاد بیگم پر اپنا کام مکمل کرلوں۔ میں نے فریدہ کے شوہر یعقوب عرف قوبا سے وعدہ کیا تھا کہ دلشاد بانو کو گھیر گھار کر اس کے گھر پہنچاؤں گا اور یہ ''گھیرنا گھارنا'' اتنا آسان کام نہیں تھا۔

اس وقت دوپہر ڈھلنے کا عمل شروع ہوچکا تھا۔ میں نے اے ایس آئی فاضل کو اپنے پاس بلا کر چند ضروری ہدایات دیں اور نواب علی کے گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔

میں نے لگ بھگ ایک گھنٹے تک دلشاد بانو پر کڑی محنت کی اور خوشی کی بات یہ ہے کہ میری محنت رائگاں نہیں گئی۔ اسے اپنے شوہر کے حوالے سے پہلے سے بن گن تو مل گئی تھی لیکن چونکہ اس کے ہاتھ میں کوئی ثبوت نہیں تھا اس لیے وہ کسی سخت ایکشن سے باز رہی تھی اس نے جب بھی نواب کے سامنے فریدہ کا ذکر ایک خاص زاویے سے کیا تو وہ انجان بن گیا۔ جیسے اس کا کبھی فریدہ سے واسطہ ہی نہ رہا ہو۔ اس نے اپنے اور فریدہ کے تعلقات کو بڑی چالاکی سے چھپا رکھا تھا جبکہ میں نے پلک جھپکتے میں، اس کے دونوں ہاتھ ثبوتوں سے بھر دینے کی امید دلائی تھی لہٰذا وہ فوراً میرے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔ وہ اس نادر موقعے کو بھلا کیسے ہاتھ سے جانے دیتی۔

اس منصوبے کے مطابق مجھے ٹھیک سات بجے فریدہ کے گھر پہنچنا تھا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد دلشاد بانو اپنے شوہر کو ڈھونڈتے ہوئے فریدہ کے دروازے تک پہنچ جاتی۔ میں اس کے لیے دروازہ کھولنے جاتا تو قوبا ایکشن میں آجاتا اور جیسے ہی دلشاد بانو گھر کے اندر قدم رکھتی، قوبا اپنی تمام تر تیاریوں کا رخ اس طرف پھیر دیتا۔ میں چونکہ (بہ ظاہر) دلشاد بیگم سے واقف نہیں تھا لہٰذا اس دھواں دھار سچویشن میں مجھے ہکا بکا رہ جانے کی اداکاری کرنا تھی۔

دوسری جانب میں نے آسیہ بی بی کو یہ ہدایت کردی تھی کہ وہ جیسے ہی فریدہ کے گھر میں شور کی آواز سنے، وہ اپنے گھر سے باہر نکل کر واویلا شروع کردے اور دیگر محلے دار عورتوں کو بھی جمع کرلے۔ اس کے احتجاج کا موقف یہ ہونا چاہیے کہ فریدہ کو محلہ بدر کرکے وہاں کے ماحول کو صاف ستھرا بنایا جائے۔ فریدہ نے اپنے گھر میں جو گندخانہ کھول رکھا ہے اسے فوراً ختم ہونا چاہیے۔ میں نے آسیہ کو خاص طور پر تاکید کردی تھی کہ یہ احتجاجی مکالمے دلشاد بانو کی سماعت تک ضرور پہنچنا چاہئیں۔

اس رات فریدہ کے گھر میں اور گھر کے باہر گلی میں، سب کچھ عین میرے ترتیب دیے ہوئے منصوبے کے مطابق عمل میں آیا۔ ایک طرف قوبا گالم گلوچ کی شمولیت کے ساتھ چیخ چیخ کر اپنے دل و دماغ کا غبار دھو رہا تھا تو دوسری جانب آسیہ نے گلی میں مشتعل عورتوں کا باقاعدہ ایک مجمع لگا لیا تھا جبکہ تیسری سمت دلشاد بانو بھی اپنے شوہر نامدار کو کھری کھری سنا کر بری طرح ذلیل کر رہی تھی۔ اس سنسنی خیز صورت حال میں فریدہ اور نواب کو حد درجہ کوفت اٹھانا پڑی۔ میں لاتعلق سا، ایک طرف کھڑا یہ تماشا حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا جبکہ اس ڈرامے کا رائٹر، ڈائریکٹر اور پروڈیوسر میں ہی تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد یہ ہنگامہ قدرے سرد ہوا تو دلشاد بانو بڑے خفیف انداز میں، اپنے بھیگی بلی بنے شوہر کو ساتھ لے کر موقعے سے فرار ہوگئی۔ نواب علی کی وہ کیفیت تھی کہ بہ

قول شاعر......

بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے!

☆☆☆

اگلے روز دو پہر کے بعد ایک خوش خبری سننے کو ملی۔

جو ٹیم گمشدہ افراد کی تلاش میں گوجرانوالہ گئی تھی انہوں نے نواز عرف نواجا کا سراغ لگا لیا تھا لیکن افسوس کہ وہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا تھا۔

واقعات کے مطابق میری بھیجی ہوئی ٹیم نے بس اسٹینڈ کے قریب ایک ٹھیلے والے سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ وقوعہ کے روز اس نے نواجا کو دو افراد کے ساتھ شیخوپورہ روڈ کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ وہ ٹھیلے والا چونکہ ان دونوں افراد کو جانتا تھا لہٰذا ٹیم کو وہاں تک رسائی حاصل کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا...... اور اس رسائی کے بعد یہ انکشاف ہوا کہ مذکورہ افراد کا تعلق نئی سبزی منڈی کے ایک آڑھتی چودھری اقبال سے تھا۔

چودھری اقبال کے نام نے میرے ذہن میں ایک جھماکا کیا اور مجھے فوراً یاد آ گیا کہ وہ تو نواب علی کا ایک گہرا دوست تھا۔ جب چند روز پہلے میں گوجرانوالہ آ رہا تھا تو نواب علی نے مجھے چودھری اقبال کا نام پتا بھی دیا تھا کہ میں اس تلاش کے سلسلے میں اس سے مدد لے سکتا ہوں لیکن میں نے اس چودھری کو ٹچ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔

جب میں نے اور امتیاز گوندل تھانا انچارج صدر نے چودھری اقبال کے ان دونوں بندوں کو تفتیش کی چکی میں ڈالا تو پسنے سے پہلے ہی انہوں نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔ انہوں نے اپنے ولی نعمت چودھری اقبال کے ایما پر نواجا کو قتل کر کے کھیتوں کی نم زمین میں دبا دیا تھا۔ نواجا بہ خیریت گوجرانوالہ تو پہنچا تھا لیکن اسے راسکوطلز میں قدم رکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔

اس انکشاف کے بعد جب چودھری اقبال کو زیر تفتیش لایا گیا تو اس نے چھینٹی شینٹی کھانے کے بعد اعتراف کر لیا کہ اس کام کے لیے اسے نواب علی نے کہا تھا اور وہ اپنے دوست کا کہنا ٹال نہ سکا۔

کڑی سے کڑی ملی تو میں نے نواب علی کو گرفتار کر کے خوف ناک صورت اور خطرناک کرتوت کے مالک حوالدار صفدر علی کے حوالے کر دیا۔ صفدر علی ظالم اور سفاک ہونے کے ساتھ ساتھ ہٹا کٹا اور موٹا تازہ بھی تھا۔ صفدر علی پوری رات نواب علی پر مختلف تفتیشی تجربات کرتا رہا اور صبح تک اس کیس کا مکمل حل سامنے آ گیا۔

نواب علی نے نواجا کو اپنی راہ کا کانٹا سمجھتے ہوئے ایک طرف تو چودھری اقبال کے توسط سے اسے ٹھکانے لگانے کا بندوبست کر دیا تھا اور دوسری جانب بڑی صفائی سے عابو کو اغوا کرا کے اپنے ایک دوست کے پاس پنڈی بھٹیاں پہنچا دیا تھا۔ عابو، اغوا کنندگان کو نہیں جانتی تھی۔ اسے صرف اتنا پتا تھا کہ وہ اغوا کر لی گئی ہے۔ پنڈی بھٹیاں میں چودھری حشمت سے نواب علی کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ عابو کو چودھری حشمت کی تحویل میں پہنچایا گیا تھا۔

اور...... یہ سارا کھٹ راگ نواب علی نے اس لیے پھیلایا تھا کہ دو تین ماہ کی کوشش کے بعد اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ فریدہ اپنی ذات کی حد تک تو اس کے ساتھ ہر زاویے سے منسلک رہنے کو تیار تھی لیکن ایسی ہی آزادی وہ عابو کو ہرگز دینے کو تیار نہیں تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ نواب، عابو سے باقاعدہ شادی کرے...... اور یہ ہو نہیں سکتا تھا۔

چنانچہ نواب نے اپنے آدمیوں کے ذریعے عابو کو اغوا کر کے پنڈی بھٹیاں پہنچا دیا اور نواجا کو ٹھکانے لگوا کر اس امر کی فضا قائم کر دی کہ عابو، نواجا کے ساتھ کہیں بھاگ گئی ہے یا یہ کہ نواجا نے عابو کو اغوا کر لیا ہے۔ فریدہ کے ذہن میں بھی یہ فلسفہ اسی نے ڈالا تھا۔

اس کا منصوبہ یہ تھا کہ جب اس معاملے کو چند دن گزر جاتے تو پھر وہ عابو سے مستفید ہونے کے لیے پنڈی بھٹیاں پہنچ جاتا۔ اس ہوس کاری کے بعد وہ عابو کا کیا کرتا، اس بارے میں اس نے پہلے سے نہیں سوچ رکھا تھا۔

نواب علی کی بدقسمتی کہ میں نے اس کے شیطانی منصوبے کی ایسی تیسی کر کے رکھ دی۔ اسی روز میں نے ایک چھاپا مار ٹیم کو پنڈی بھٹیاں بھیج کر عابدہ عرف عابو کو بھی بازیاب کرا لیا۔ جب عابو کو پتا چلا کہ نواجا کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یہ ناقابل تلافی نقصان کے آنسو تھے۔

دوسری طرف آسیہ بی بی اپنے لخت جگر کی ابدی جدائی میں خون کے آنسو بہا رہی تھی تو تیسری جانب فریدہ کی آنکھوں سے اشک ندامت جاری تھے لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ......اب پچھتائے کیا ہووت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت!

نواب علی جیسے فتنہ گر کردار ہر دور میں ہمارے آس پاس موجود ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر گہری نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ اپنے کالے کرتوتوں سے آپ کے پڑوس میں کوئی فتنہ جگانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

(تحریر: حسام بٹ)

میدان لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ سامنے بڑے سے چبوترے پر جھلملاتا ہوا شامیانہ تنا ہوا تھا۔ چبوترے کی کچی زمین پر صاف ستھری دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ اگلی قطار میں آرام دہ صوفوں پر علاقے کے اے سی صاحب براجمان تھے جبکہ دوسرے متعلقہ افسران اور تھانیدار صاحب درجہ بدرجہ باقی صوفوں اور پلاسٹک کی سرخ کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ اے سی صاحب کے سامنے میز پر گلدان میں خوبصورت پھول سجے ہوئے تھے۔ ایک سائڈ پر بڑی سی میز پر چھوٹے بڑے سنہرے کپ چمک رہے تھے۔

یہ تقریب علاقائی ''ہارس اینڈ کیٹل شو'' کے سلسلے میں منعقد ہو رہی تھی، آج میلے کا تیسرا اور آخری دن تھا۔ ابھی تھوڑی دیر میں فرید نگر خیر پور اور آس پاس کے دیہاتوں سے اچھی نسل کے اور صحت مند مویشیوں کی نمائش ہوئی تھی۔ اچھے جانوروں کو انعامات ملنے والے تھے۔ اس میلے کا مقصد ہی اچھی نسل کے صحت مند جانوروں کی افزائش اور پرورش پر لوگوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور تعلیم دینا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے مل کر اپنی معلومات میں اضافہ کرتے اور نئے تجربات سے فائدہ اٹھاتے۔

مائیک پر ایک صحت مند جوان جو شاید کچھ تعلیم یافتہ بھی تھا بڑے پرجوش انداز میں ہاتھ ہلا ہلا کر اے سی صاحب کی شان میں قصیدے پڑھ رہا تھا۔

''ہم جی بڑے نصیبوں والے ہیں کہ جناب اے سی صاحب نے بنفس نفیس ہمارے پروگرام میں تشریف لا کر تقریب کو چار چاند لگائے۔ ہمارا مان بڑھایا، ہمیں عزت بخشی۔ جناب نادر شاہ صاحب جیسے خوش اخلاق اور غریب پرور افسران پاکستان کی شان ہیں...... تالیاں!''

حرص و طمع کے ہاتھوں تماشا بننے والے چند بیوپاریوں کا احوال

اکثر حرص زدہ انسان بلی کی فطرت کی پیروی کرتا نظر آتا ہے، جو کھا نہ پائے تو گرا ضرور دیتی ہے... کاروبار ایمانداری کا ہو یا بے ایمانی کا... کچھ نہ کچھ تو اصول ہوتے ہی ہیں مگر... جب اوقات سے بڑھ کر دولت مل جائے تو دامن تنگ پڑ جاتا ہے... کچھ یہی حال ان کا بھی ہوا کیونکہ جب وہ آدھی چھوڑ کے پوری کے پیچھے بھاگے تو آدھی بھی ان کے ہاتھ سے چلی گئی۔

چور کو پڑ گئے مور

شمع خانم

تالیاں کا لفظ سنتے ہی مجمع نے زور شور سے تالیاں پیٹنی شروع کر دیں اور اتنی بجائیں کہ مقرر کو ہاتھ ہلا کر انہیں روکنے کا اشارہ کرنا پڑا۔ اے سی صاحب واقعی خوش اخلاق تھے، وہ مسکرا مسکرا کر مجمع کو دیکھ رہے تھے اور ہاتھ کے ساتھ ساتھ گردن ہلا کر ان کے جوش و خروش کا جواب دے رہے تھے۔

''میں سب سے پہلے موضع فرید نگر کے بھائیوں کو اپنا خوبصورت آئٹم پیش کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔''

نوجوان کے منہ سے الفاظ پوری طرح ادا نہیں ہوئے تھے کہ میدان کے چاروں کونوں سے ایک ایک ڈھولچی جھالروں اور ڈوریوں سے سجے بڑے بڑے ڈھول بجاتے ہوئے میدان میں داخل ہوئے۔ ڈھولچیوں نے سیاہ زرتار لاچے اور پیلی فراکیں پہنی ہوئی تھیں۔ سر پر سرخ رنگ کی پگڑیاں تھیں۔ ڈھولچیوں نے اسٹیج کے سامنے آکر مہمانوں کو سلام کیا اور ایسا ڈھول بجایا کہ سماں بندھ گیا۔ بہت سے دیہاتی اپنی جگہوں پر دیوانہ وار رقص کرنے لگے۔ تقریباً پانچ منٹ بعد لوگوں نے ایک اور خوبصورت منظر دیکھا۔ چاروں کونوں سے دو دو براق جیسے سفید اور دو دو سیاہ مشکی گھوڑے اسی میدان میں داخل ہوئے۔ گھوڑوں کے تندرست جسم چمک رہے تھے۔ اگلے پاؤں میں ڈھیر سارے گھنگرو اور ماتھے پر سنہرے ٹیکے۔ گلے کے گرد سنہری مالائیں۔ ہر گھوڑے کے ساتھ اس کے سائیس نے بھی ایک جیسے خوبصورت لباس پہنے ہوئے تھے۔

گھوڑوں کے آتے ہی ڈھولچیوں نے دھن بدلی اور گھوڑوں کا ایسا رقص شروع ہوا کہ لوگ سانس لینا بھول گئے۔ اے سی صاحب سیٹ سے اٹھ کر تالیاں بجانے لگے۔ وہ بار بار فرید نگر کے ملک صاحب کو تحسین بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ملک صاحب کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو رہا تھا۔

مخالف پارٹی والے بہ ظاہر شاباشیاں دے رہے تھے مگر اندر ہی اندر کڑھ رہے تھے کہ انہیں اس پروگرام کی تیاری کا پتا ہی نہیں چلا۔ فرید نگر والے ہر سال کوئی نہ کوئی نیا تماشا دکھا کر میلہ لوٹ لیتے تھے۔ گھوڑوں کے اس خوبصورت رقص کے بعد مخالف پارٹی نے ''جھومر'' پیش کیا۔ دس بارہ سال کے بیس پچیس لڑکے خوبصورت لاچے اور گھیر دار فراک پہن کر میدان میں اترے اور ڈھول کے ساتھ بہت اچھا جھومر پیش کیا۔ مگر گھوڑوں کے رقص والی بات کہاں تھی۔

پھر جانوروں کی نمائش شروع ہوئی۔ ایک ایک کر کے تمام مویشی پالنے والے اپنے اپنے خاص ڈنگ، میدان میں لاتے، اسٹیج کے سامنے رکتے اور چکر لگا کر میدان سے باہر نکل جاتے۔ مائیک والا جوان ان جانوروں کے نام مالکوں کے نام اور خاص خاص خوبیاں بتاتا جا رہا تھا۔ اے سی صاحب کے سامنے ایک لسٹ اور مارکر رکھا تھا۔ ان کی مدد کے لیے ایک منشی ٹائپ بندہ ان کے صوفے کے پیچھے کھڑا تھا۔ فرسٹ سیکنڈ یا تھرڈ آنے والے مویشیوں کے سامنے ان کی پوزیشن لکھی جا رہی تھی۔ یہ کام بڑے اچھے طریقے سے ہو رہا تھا کہ سب کی نظریں خیر پور والوں کی طرف سے پیش کی جانے والی بھینس بھوری پر جم گئیں۔ بھینس کا رنگ ہلکا براؤن اور سینگ مڑے ہوئے تھے، اس کی کھال سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ پاؤں میں جھانجھریں اور گلے میں چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں کی مالا۔ وہ ہولے ہولے چلتے ہوئے چبوترے کے سامنے رک گئی۔ اے سی صاحب سیٹ سے اٹھ کر چبوترے کے کنارے پر آ گئے۔ بھینس کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر اس کے مالک کا شانہ تھپتھپایا۔

''واہ بھوری واہ...... بہت شاندار...... زبردست......''

مالک جس کا نام حمیدا تھا، خوش ہو گیا اور اے سی صاحب کو سلام کر کے میدان سے باہر نکل کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ مجمع سے دو بھلے مانس بھوری کو دیکھنے کے لیے حمیدے کے پاس جا کھڑے ہوئے اور ستائشی نظروں سے بھوری کو دیکھنے لگے۔

''بلے بھئی بلے...... ماشاءاللہ بڑی سوہنی ہے تیری بھوری......'' ان میں سے ایک بولا۔

حمیدا شرما کر بولا۔ ''بس جی اللہ کا مال ہے...... پر خدمت میں نے بھی بڑی کی ہے بھوری کی۔'' ہاتھ سے اشارہ کر کے بولا۔ ''اتنی سی لایا تھا میں خانیوال کی مال منڈی سے۔ فیڈر سے دودھ پلاتا تھا میں اسے......''

''بھائی حمیدے...... مولا نے تیری خدمت کا صلہ بھی اچھا دیا۔ نظر نہیں ٹھہرتی مجھ پر۔''

''کتنا دودھ دے دیتی ہے روز کا؟''

''یہی کوئی سترہ اٹھارہ کلو......''

''دعشکے بھئی عشکے۔ پھر تو، تو دودھ بیچتا ہووے گا۔''

''ہاں تھوڑا سا۔ باقی بچے پی لیوے ہیں۔ کچھ لسی پانی بن جاتا ہے، تھوڑا گھی مکھن بھی نکل آوے ہے۔''

حمیدے نے دودھ کا سارا مصرف گنوا دیا۔

''کتنے پسو ہیں تیرے پاس بھائی حمیدے؟'' جیرا سوال پہ سوال کیے جا رہا تھا۔

''ایک اس کی جھوٹی، دو بیل اور ایک گدھا۔'' حمیدا فخر سے بولا۔

''شاوا بھائی شاوا...... بڑا ویڑاہ ہووے گا تیرا بھائی حمید؟'' شرفو نے پوچھا۔

''نہیں ویڑاہ تو چھوٹا ہی ہے، زیادہ بڑا نہیں۔''

''تو پھر اتنے پسو کہاں باندھے ہے تو؟''

''لے بھئی، تو تو بڑا بھولا ہے، پسو کوئی ویڑوں میں بندھتے ہیں ہمارے سید جی کا حکم ہے کہ سب پسو ویڑوں کے بجائے احاطوں میں باندھو، تاکہ ویڑے گندے نہ ہوں، نہیں تو بیماریاں پھیلنے کا خدشہ ہووے گا۔'' حمیدے نے دانائی کی بات کی۔

''یہ تو بہت اچھی بات بتائی تو نے حمیدے۔ پر گاؤں کے اتنے سارے پسو ایک احاطے میں کس طریوں آویں گے؟''

حمید زور زور سے ہنسنے لگا۔ ''او کملیا۔ ہمارے خیر پور میں کئی احاطے ہیں۔ یہ احاطے ہمیں سید جی نے بنا کر دیے ہیں۔ تھوڑا سا کرایہ دے کے ہم اپنے اپنے پسو احاطوں میں باندھتے ہیں۔ دینو کا احاطہ میرے نزدیک پڑتا ہے، میرے سارے پسو دینو کے احاطے میں بندھتے ہیں۔''

''اچھا آ...... آ......'' شرفو آنکھیں پھیلا کر بولا۔

''تمہارے سید جی تو بڑے دیالو ہیں۔''

''اور سمجھ دار بھی۔'' جیرے نے لقمہ دیا۔

''اچھا بھائی حمیدے۔ تیرے سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ کبھی آئیو ہمارے فرید نگر...... تیری خدمت شدمت کریں گے۔''

''رب راکھا!''

''رب راکھا!''

شرفو اور جیرے کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ انہیں بھوری کے ٹھکانے کے بارے میں پتا چل گیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے کئی ہفتے بھوری کی عادات وغیرہ جاننے میں لگائے۔ ان کی یہی احتیاط اور صبر و سکون انہیں محفوظ رکھتی تھی۔ یہ دونوں نامی گرامی ''مال چور'' بے شمار وارداتیں کر چکے تھے اور آج تک پکڑے نہیں گئے۔ کبھی پکڑے بھی جاتے تو آرام سے چھوٹ جاتے۔

چوری کا مال منڈی پہنچانے کا ان کا انتظام بھی انوکھا تھا۔ جس رات واردات کرنی ہوتی وہ اپنے مخصوص ڈرائیور ممدو کو سڑک پر ایک خاص مقام پر کھڑا کر دیتے اور جیسے ہی مال ہاتھ آتا وہ اسے ممدو تک پہنچانے میں زیادہ دیر نہ لگاتے جہاں سے ممدو برق رفتاری سے جانور کو پنجاب کی حدود سے باہر لے جاتا اور دوسرے علاقوں کی دور دراز منڈیوں میں فروخت کر دیتا۔ ممدو کی فیس دس ہزار علاوہ سفر خرچ کے تھی۔ رقم کی تقسیم بھی وہ آبادی سے دور کسی جگہ بیٹھ کر کرتے۔ ممدو کبھی فرید نگر کے اندر نہیں آیا اس لیے کبھی مشتبہ لوگوں میں اس کا نام نہیں آیا۔ سارا پروگرام موبائل کے ذریعے طے پا جاتا۔

شرفو اور جیرا واردات کے لیے مناسب وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ بھوری کی عادات و اطوار کا جائزہ لینے کے لیے وقتاً فوقتاً اپنے مطلوبہ مقام پر آتے جاتے رہے اور دن کے وقت چرانے والے علاقوں میں گھوم پھر کر بھوری کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ احاطے کا چوکیدار بہت ہوشیار بندہ تھا۔ وہ رات بھر احاطے کا دروازہ اندر سے بند رکھتا۔ حفاظت کے لیے اس نے احاطے کے اندر ایک کتا بھی پالا ہوا تھا۔ احاطے کی دیواریں بھی خاصی اونچی تھیں جن پر بغیر کسی مدد کے چڑھنا مشکل تھا، مگر شرفو اور جیرا کے سامنے یہ دیواریں کچھ معنی نہیں رکھتی تھیں۔ ''مال چوری'' میں شرفو اور جیرا مشہور تھے۔ تھانہ اور پولیس تو جیسے ان کے سسرال اور سسرالی عزیز بن چکے تھے۔

جیرا اور شرفو لنگوٹیا یار اور پڑوسی بھی تھے۔ شرفو کے

افسانہ نگار، ناول نگار، مزاح نگار اور ڈراما نگار

انجم انصار

کا نیا ناول

محبت ہم سفر میری

شائع ہو گیا ہے

اس ضخیم ناول کی قیمت صرف -/500 روپے

ملنے کا پتا

القریش پبلی کیشنز، سرکلر روڈ اردو بازار لاہور

فون: 042-37668958,37652546

مقابلے میں جیرا ذرا ڈرپوک اور سست تھا مگر منصوبہ سازی میں اس کا دماغ خوب چلتا تھا۔ ہر واردات سے پہلے اس کا منصوبہ جیرا ہی بناتا، پھر کئی دن تک دونوں سر جوڑے بڑی باریک بینی سے اس پر غور کرتے رہتے۔ چھوٹی سے چھوٹی بات پر بحث کرتے اور پھر ایسا منصوبہ بنتا کہ ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

جیرا بال بچے دار تھا۔ کم عمری کی شادی کی وجہ سے بچوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں مگر اس کی بیوی صغراں ابھی جوان تھی جسے وہ صرف پندرہ سال کی عمر میں شرفو کی مدد سے ایک میلے سے بھگا لایا تھا۔ صغراں بھی بڑی جی دار عورت تھی، اسے جیرے کے کام پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بہ ظاہر اس کی چھوٹی سی کریانے کی دکان تھی، واردات سے حاصل ہونے والی رقم وہ برابر تقسیم کرتے تھے، مگر کہاں اکیلا شرفو اور کہاں جیرے کے گیارہ ''جی''۔ صغراں کا ہاتھ ہمیشہ تنگ رہتا تھا۔ اوپر سے جیرے نے ایک اور شوق پال رکھا تھا۔ سگریٹ سے سگریٹ سلگاتا اور دھواں اڑائے جاتا۔ صغراں جلتی کڑھتی، خوب بکواس کرتی مگر جیرے کے کان پر کبھی جوں نہیں رینگتی۔

شرفو ہمیشہ سے ہی تیز مزاج اور جھگڑالو تھا۔ شادی ہوئی تھی مگر پتا نہیں کس بات پر میاں بیوی میں جھگڑا ہوا اور بات بڑھتی گئی۔ آخر زرینہ روٹھ کر میکے جا بیٹھی اور وہیں سے خلع لے کر دوسرا نکاح کرلیا۔ شرفو کی بھی جیسے جان چھوٹ گئی۔ اس نے دوبارہ یہ جھنجٹ پالا ہی نہیں۔ رہنے کے لیے گھر ماں باپ چھوڑ گئے تھے۔ اس سے آگے کی اس نے سوچا ہی نہیں۔ گھر کی صفائی ستھرائی یا کوئی سامان خریدنا یا اپنی روٹی پانی کی فکر اس کے معمولات میں شامل ہی نہ تھا۔ یہ سب کام جیرے اور صغراں نے اپنے ذمے لے رکھے تھے۔ دن بھر ملک صاحب کے ڈیرے پر چاکری کرنا اور شام کو جوئے کے اڈے پر شراب پی کر غل غپاڑہ کرنا۔ کسی نہ کسی سے جھگڑا کرکے ملک صاحب سے فیصلہ کروانا اس کے معمولات تھے جبکہ روٹی وہ ڈیرے سے کھا لیتا یا پھر اللہ دتہ کے ہوٹل سے کھا لیتا۔ البتہ چائے کا وہ رسیا تھا۔ رات کو وہ جس وقت بھی گھر آتا جیرا اس کے لیے اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر لاتا پھر دونوں صحن میں پڑی چارپائیوں پر بیٹھ جاتے اور کسی نئی واردات کی منصوبہ بندی کرتے۔ جیرے کے بچے شرفو کو تاؤ، کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ ان کے لیے واقعی تاؤ تھا، کوئی دن خالی جاتا ہوگا ورنہ جیرے کے بچوں کے لیے کھانے پینے کا سامان، پھل اور اسکول کے لیے اسٹیشنری باقاعدگی سے مہیا

کرتا، جیرا منع کرتا تو شرفو افسردہ ہوکر کہتا۔

''یار ایک ہی تو بیلی ہے تو میرا...... تو بھی غیروں والی باتیں کرنے لگا۔''

جیرے کو پتا تھا کہ بچے شرفو کی کمزوری تھے مگر اپنا اجڑا گھر بسانے کے بارے میں اس نے کبھی کسی کی بات نہ مانی۔

اس وقت بھی دونوں سر جوڑے شرفو کے آنگن میں بان کی چارپائیوں پر آمنے سامنے بیٹھے دھیمی آواز سے باتیں کررہے تھے۔ دروازہ انہوں نے اندر سے بند کرلیا تھا۔

''دیکھ جیرے...... بھوری کا معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے، ایک تو یہ دور سے پہچانی جاتی ہے، دوسرے اسے ہی بھی نیا ہے اور پھر سارے افسروں نے بھوری کو اچھی طرح دیکھ بھی لیا ہے۔'' شرفو جیرے کے کئی منصوبے رد کرچکا تھا۔

''ذرا اچھی طرح سوچ لے، پچھلی بار تھانیدار نے ملک صاحب کو بھی کورا جواب دے دیا تھا جو ایس پی صاحب کا فون نہ آتا تو اپنا حوالات سے نکلنا اوکھا ہی تھا۔'' شرفو نے جیرے کو یاد دلایا۔

دراصل پچھلی واردات میں جیرے کے پیے ہوئے سگریٹ کا ٹوٹا پولیس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ ڈور کا سرا پکڑتے پکڑتے پولیس جیرے اور شرفو تک پہنچ گئی۔ جرم ثابت ہوگیا تھا مگر موقعے کا گواہ نہ ہونے کے سبب دونوں حوالات سے چھوٹ گئے لیکن اس بار چہروں اور پیٹھوں پر تھپڑوں اور چھتروں سے نیل پڑ گئے تھے اور بات صرف ایک ''بچھیا'' کی تھی جسے جیرے اور شرفو نے پار کیا تھا۔ کافی دیر سوچنے کے بعد جیرے نے شرفو سے کہا۔

''ادھر کان لا۔''

شرفو سر جھکا کر جیرے کی بات غور سے سننے لگا، اس کا ہلتا ہوا سر ظاہر کررہا تھا کہ منصوبہ اس کے دل کو لگ گیا ہے۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے آخر میں کہا۔

آخر واردات کی رات آن پہنچی۔ یہ اماوس کی رات تھی۔ چونکہ چاند نہیں تھا مگر تاروں سے آسمان روشن تھا۔ شرفو موٹی موٹی جرابیں پہنے ہوئے بے آواز چلتے ہوئے دینو کے احاطے کے گرد دو تین چکر لگا چکا تھا۔ جیرا کافی فاصلے پر ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے اس طرح کھڑا تھا کہ درخت کا حصہ ہی لگ رہا تھا۔

آخر شرفو نے ''شلوکے'' کی جیب سے شاپر میں لپٹا ہوا گوشت کا ٹکڑا نکالا جس پر نیند کی گولیوں کا سفوف ملا ہوا تھا۔ اس نے یہ ٹکڑا احتیاط سے احاطے کی پچھلی دیوار سے اندر

اچھال دیا۔ دوسرے ہی لمحے کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی تو شرفو بھاگ کر دیوار سے پرے ہوگیا۔

''کیڑا ہے بھئی۔'' چوکیدار کی کرخت آواز گونجی۔ شرفو نے ہلکی سی ''میاؤں'' کی آواز نکالی جیسے کوئی بلی دور بھاگ رہی ہو۔ شرفو آہستہ آہستہ پھر دیوار کے نیچے آگیا۔ کتے کی غراہٹیں سنائی دے رہی تھیں شاید وہ گوشت کھا رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ غراہٹیں معدوم ہوتی گئیں اور دوبارہ سناٹا چھا گیا۔

شرفو نے ہاتھوں پر زور ڈال کر جسم اوپر اٹھایا اور اندر کا منظر دیکھنے کی کوشش کی، اندر مکمل اندھیرا تھا، چوکیدار دوبارہ بیٹھ چکا تھا۔ اس کی چارپائی کے قریب بالکل مدھم روشنی والی ایک لالٹین روشن تھی جس کی روشنی میں چوکیدار کا ہیولہ نظر آرہا تھا جو بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ شرفو بغیر آہٹ کے دیوار پر چڑھا اور ہاتھوں پر لٹک کر زمین پر آگیا۔ شرفو دیوار کے ساتھ لگے لگے چوکیدار کے پیچھے آگیا اور اس سے پہلے کہ وہ چوکنا ہوتا ایک ہاتھ اس کی گردن میں اور دوسرا اس کے منہ پر جما دیا تاکہ آواز نہ نکلے۔ منہ پر جما ہوا ہاتھ خالی نہیں تھا۔ کلوروفارم سے بھیگا ہوا رومال اس نے چوکیدار کی ناک پر رکھ دیا تھا۔ چوکیدار بھی بڑا جی دار تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے شرفو کی گردن پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ ایسا نہ کرسکا۔ کیونکہ کلوروفارم اپنا اثر دکھا رہا تھا اور اس کا جسم ڈھیلا ہوکر شرفو کے ہاتھوں میں جھول گیا۔ شرفو نے اطمینان کرکے اسے چارپائی پر ڈال دیا اور جیب سے پتلی ڈوری نکال کر اس کے ہاتھ اور پاؤں چارپائی سے باندھ دیے۔ منہ پر چوڑی ٹیپ چپکا کر وہ پھرتی سے دروازے تک آیا۔ ''ٹک، ٹک، ٹک'' کسی نے انگلی کے ناخن سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ یہ جیرا تھا، شرفو نے بغیر آواز کے زنجیر اتاری۔ جیرا جھکا جھکا اندر آیا اور جلدی سے دروازہ بند کردیا۔ دونوں تیزی سے بھوری کی طرف آئے، جو مزے سے بیٹھی جگالی کررہی تھی۔ جیرا بڑے پیار سے بھوری کی کمر پر ہاتھ پھیرنے لگا، کبھی پیار سے اس کا سر سہلانے لگتا۔ اتنی دیر میں شرفو نے موٹے موٹے فوم کے چار ٹکڑے تھیلے سے جو جیرا لایا تھا، نکالے اور ایک ایک کرکے بھوری کے چاروں سموں کے ساتھ مضبوط ڈوری سے باندھ دیے، پھر سہارا دے کر بھوری کو کھڑا کیا۔ زمین پر پاؤں جمانے میں بھوری کو ذرا وقت ہوئی مگر جب اس کے پاؤں زمین پر جم گئے تو وہ آسانی سے کھڑی ہوگئی۔ جیرا تیز چھری سے اس کی گھنٹیوں والی پٹی پہلے ہی کاٹ چکا تھا اور رسی کھول کر چلنے کو تیار کھڑا تھا۔ شرفو نے دروازہ کھول کر چوکنی نظروں سے ادھر ادھر

دیکھا۔ مگر باہر مکمل سناٹا اور تاریکی تھی، وہ بھوری کو لے کر تیز تیز قدموں سے درختوں کے جھنڈ کی طرف جارہے تھے، دور کہیں گاؤں کے چوکیدار کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''جاگدے رہنا بھئی...... جاگدے رہنا۔''

درختوں کے نیچے آکر انہوں نے بھوری کو درخت سے باندھ دیا۔ جیرے نے اپنے تھیلے سے پلاسٹک کا ایک ڈبا نکالا، اس میں تختی لکھنے والی سیاہ روشنائی کا گاڑھا محلول تھا۔ پھر اس نے تھیلے سے ایک چوڑا نرم برش برآمد کیا۔ بھوری کچھ بے چین ہورہی تھی۔ جیرے نے بڑے پیار سے اس کا ماتھا سہلایا۔ گردن پر ہاتھ پھیرا، دو تین دفعہ کے اس عمل سے وہ پرسکون ہوگئی۔ وہ بھوری کی اس عادت سے واقف تھے۔ پھر جیرے نے ایک چھوٹی سی ٹارچ روشن کردی اور شرفو نے اپنا کام شروع کردیا۔ وہ برش کی مدد سے سیاہ روشنائی بھوری کے جسم پر پھیر کر اسے بھوری سے سیاہ بنا رہا تھا۔ اس دوران جیرا اپنے ہاتھوں کے لمس سے بھوری کو پرسکون رکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ تقریباً دس منٹ میں ان کا کام پورا ہوگیا۔ انہوں نے جلدی جلدی خالی ڈبا اور برش ایک شاپر میں ڈال کر تھیلے میں ڈالا۔ کپڑے سے زمین پر پڑے چھینٹے مٹائے اور کچی سڑک کی طرف چل پڑے۔ دونوں الگ الگ راستوں پر چل رہے تھے۔ راستے میں ہی جیرے نے تھیلے میں اینٹ رکھی اور تھیلے کا منہ کھول کر کھال میں پھینک دیا ہلکی سی ''تھپ'' کے ساتھ تھیلا کچی مٹی میں دھنس گیا۔

سڑک تک پہنچتے پہنچتے انہیں آدھا گھنٹا لگ گیا۔ ایک سنسان سی جگہ پر ممدو اپنا ڈالا لیے کھڑا تھا جس کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر ممدو پھرتی سے نیچے اترا۔ لکڑی کا تختہ ڈالے کے ساتھ لگا کر انہوں نے بھوری کو ڈالے پر چڑھایا۔ اس کے پاؤں سے فوم وہ پہلے ہی کھول چکے تھے۔ ڈالے پر ترپال ڈال کر شرفو نے ہاتھ جھاڑے۔

''لے بھئی جیرے۔ اپنا کام ختم ہوا۔ اب آگے تیرا اور بھائی ممدو کا کام ہے۔''

''آج جیرا کیوں ساتھ جارہا ہے، بھائی شرفو؟ دس سال سے میں تیرے پسو منڈی پہنچا رہا ہوں...... کوئی بے اعتباری ہوگئی ہے کیا؟'' ممدو نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''اوہ نہیں یار، تم دونوں مل کر اس کی حفاظت کرنا۔ یہ کوئی عام مجھ نہیں ہے، ہاں۔ منڈی پہنچنے سے پہلے اسے کسی رجواہے میں اتار دینا پھر تماشا دیکھنا۔'' شرفو نے بڑے فخر سے کہا۔

''ہالا...... ! بھائی شرفو کوئی خاص بات ہے کیا؟'' ممدو

If you want to download Urdu novels,Imran series, Monthly Digests,Shuaa,Kiran,Khwateen Digest,Suspense digest, Vist www.paksociety.com if site is not opening send complaint at admin@paksociety.com

or at 0336-5557121

نے اشتیاق سے پوچھا۔

''بڑی خاص...... بلکہ خاص الخاص...... یہ بھوری ہے بھوری...... لکھ ڈیڑھ لکھ کی مجھ ہے بھائی ممدو...... اسے بڑی احتیاط سے بیچنا اور آسے پاسے کا پورا دھیان رکھنا......''

''اچھا......! پھر میرا حصہ کتنا بنے گا؟'' ممدو مطلب کی بات پر آگیا۔

''دس ہزار تھوڑے ہیں یار؟ محنت اور خطرہ تو سارا ہمارے ذمے۔ تم نے تو صرف منڈی ہی لے جانی ہے۔''

''نہیں بھئی۔ لکھ ڈیڑھ لکھ میں سے صرف دس ہزار...... نہ...... مجھے یہ سودا منظور نہیں۔''

ممدو اڑ گیا۔ شرفو نے جیرے کو آنکھ ماری۔ ''چل ٹھیک ہے۔ جیرے پندرہ ہزار بھائی ممدو کو دینا اور دیکھ واپسی میں جلدی نہ کرنا۔ ہم نے تیرے سالے کو بیمار بتانا ہے۔ تو فارغ ہو کر فیصل آباد آجانا اور دیکھ پیسے ساتھ نہ لیے پھرنا۔ جلدی بینک میں ڈال دینا۔'' شرفو ہدایتیں دے رہا تھا۔

''رب راکھا۔'' اس نے کہا۔

''رب راکھا۔''

جیرا ڈالے پر سوار ہو گیا اور ممدو کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈالا چل پڑا، شرفو محتاط انداز سے بچتا بچاتا دبے پاؤں چلتا گھر پہنچ گیا۔ دروازے کی کنڈی کھول کر اندر آیا۔ صحن میں پڑی چارپائی پر لیٹا اور لیٹتے ہی سو گیا اور پھر دن چڑھے تک سوتا رہا۔ اس کی آنکھ دروازے پر ہونے والی زبردست دستک سے کھلی۔ اس نے ہڑبڑا کر دروازہ کھولا تو سامنے علاقے کا ایس ایچ او اور دو سپاہی کھڑے تھے۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر گھس آئے اور ادھر ادھر پھر کر تلاشی لینے لگے۔

''جی سرکار......؟'' شرفو نے ہاتھ جوڑ کر ایس ایچ او سے پوچھا۔

ایس ایچ او کے چہرے سے تھکن ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ کئی گھنٹے سے خوار ہو رہا تھا۔

''سرکار کے بچے، بھوری کہاں ہے؟'' اس نے شرفو کی کمر پر ڈنڈا رسید کرتے ہوئے پوچھا۔

''سرکار کون بھوری؟'' شرفو معصومیت سے بولا۔

''وہ تیری ماں بھوری۔ حمیدے کی بھوری بھینس اور کون بھوری......'' ایس ایچ او نے ایک تگڑی سی گالی دے کر کہا۔

''حضور مائی باپ۔ مجھے بھوری کا کیا پتا، میں تو کل سارا دن ملک صاحب کے ڈیرے پر رہا، شام سے گھر میں ہوں۔'' شرفو نے سراپا التجا بن کر کہا۔

''وہ تیرا یار جیرا کدھر ہے؟'' ایس ایچ او کڑک کر بولا۔

''وہ تو دو دن سے فیصل آباد گیا ہوا ہے جی۔ اس کا سالا بیمار ہے، اس کی گھر والی سے پوچھ لیں۔''

ایس ایچ او ''ہوں'' کر کے خاموش ہو گیا کیونکہ وہ یہ ساری معلومات پہلے ہی حاصل کر چکا تھا۔ ایس ایچ او کو نرم پڑتے دیکھ کر شرفو جلدی سے اندر سے دھلا ہوا کھیس نکال لایا اور چارپائی پر بچھا کر لجاجت سے بولا۔

''حضور تشریف رکھو۔ میں چائے پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔'' اس نے پیڈسٹل فین کا رخ ایس ایچ او کی طرف کیا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔ سپاہی پہلے ہی ایس ایچ او کے حکم پر جیپ میں جا بیٹھے تھے۔

ایس ایچ او صبح سے دو سپاہیوں کے ساتھ علاقے میں مجرمانہ ریکارڈ رکھنے والے افراد کے گھروں میں چھاپے مار رہا تھا کیونکہ بھوری کی گمشدگی پر خود اے سی صاحب نے ایکشن لیا تھا۔ انہوں نے تھانے پہنچ کر پورے عملے کی کھنچائی کر دی تھی۔

شرفو اور جیرے کی اپنے اپنے علاقوں میں موجودگی ثابت ہو چکی تھی۔ گرمی اور پیاس سے برا حال تھا۔ اس لیے شرفو کے اس دور افتادہ مکان میں ایس ایچ او کو بھی پیٹی ڈھیلی کرنے کا موقع ملا۔ شرفو نے باہر نکل کر تماشا دیکھنے والوں کو منتشر کیا اور لپک کر ''چھینا بٹ'' کے ہوٹل سے آملیٹ، پراٹھے اور کھوئے والی لسی کا تگڑا سا ناشتا لا کر ایس ایچ او اور سپاہیوں کو کرایا۔

''دیکھ شرفو اگر بھوری کی چوری میں تیرا یا جیرے کا ہاتھ ثابت ہو گیا تو اس دفعہ میں کوئی لحاظ نہیں کروں گا۔''

ایس ایچ او نے دھمکی دی اور بقیہ کام نمٹانے کے لیے جیپ میں جا بیٹھا۔ شرفو نے سم بدل کر جیرے سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر رابطہ نہ ہو سکا۔

☆☆☆

ممدو نے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ سفر جاری رکھا۔ سورج نکلنے تک وہ اپنے علاقے کی حدود سے نکل کر دوسرے کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ پورے سفر میں جیرا سیٹ سے ٹیک لگائے سوتا رہا اور ہلکے ہلکے خراٹے لیتا رہا۔

ڈالا رکا تو جیرے کی آنکھ کھل گئی۔

''اٹھ جا بھائی جیرے، نہر آگئی ہے، بھوری کو پانی میں اتار دے۔''

”بڑا پینڈا کھینچا ہے بھائی ممدو۔ آپاں تو بڑی دور نکل آئے۔“ جیرا ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔ پھر دونوں نے تختہ رکھ کر بھوری کو نیچے اتارا۔ نہر کناروں تک بھری ہوئی تھی اور پانی کی رفتار بھی تیز تھی۔ جیرا کنارے پر ہی رک گیا۔

”رک کیوں گیا جیرے۔ جلدی کر۔ ابھی منڈی تک بڑا لمبا پینڈا ہے۔“ ممدو نے کہا۔

”پانی گہرا ہے۔ بھوری کے پاؤں نہ اکھڑ جائیں۔“ جیرا فکرمندی سے بولا۔ اصل بات یہ تھی کہ جیرا اچھا تیراک نہیں تھا اور وہ پانی سے ہمیشہ ڈرتا تھا۔

”نہیں اکھڑتے پاؤں، تو جلدی کر۔“ ممدو تیزی سے بولا۔

جیرا سنبھل سنبھل کر کنارے کے ساتھ ساتھ پانی میں اترا۔ بھوری کی رسی کھینچ کر اسے پانی میں اتارا اور پاؤں جما کر اس کے جسم پر پانی ڈالنے لگا۔ روشنائی پانی کے ساتھ بہتی جا رہی تھی۔ بھوری کی چمکدار سنہری جلد جگہ جگہ سے نظر آنے لگی۔ بھینسیں پانی کی شوقین ہوتی ہیں۔ بھوری نے آگے قدم بڑھایا اور گہرے پانی میں اترتی گئی۔ جیرے نے رسی کھینچ کر بھوری کو روکنے کی کوشش کی مگر بے سود، اس نے گھبرا کر ممدو کو آوازیں دیں۔ ممدو بہت اچھا تیراک تھا اور جسمانی لحاظ سے جیرے سے کہیں زیادہ طاقتور بھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے بھوری کو رسی تھام کر آگے جانے سے روکا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے جیرے کی گردن پکڑ کر اس کا منہ پانی میں ڈبو دیا۔ جیرا حیران ہو کر ممدو کی اس حرکت کا مطلب پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر ممدو نے اسے موقع ہی نہیں دیا۔ اس نے جیرے کے اٹھتے ہوئے سر کو پھر پانی میں ڈبو دیا۔ جیرا خود کو چھڑانے کے لیے مچلنے اور ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ پانی ناک اور منہ کے ذریعے اس کے اندر جانے لگا، اس نے سانس روک کر ممدو کے ہاتھ پر گھونسے مارنے شروع کیے مگر ممدو کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ جیرے کے حواس ساتھ چھوڑنے لگے۔ اس کا سانس ٹوٹنے لگا۔ پانی میں بلبلے سے اٹھنے لگے اور وہ بے ہوش ہو گیا مگر ممدو نے اسے اس وقت تک پانی میں ڈبوئے رکھا جب تک اسے یقین نہ ہو گیا کہ اب جیرا اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ جیرے کا بدن آہستہ آہستہ نہر کی تہ میں بیٹھتا گیا۔

ممدو نے بھوری کو کھینچ کر پانی سے نکالا۔ اس کی جلد پوری طرح صاف ہو چکی تھی۔ ممدو نے تھوڑی دیر اسے کھڑا رکھا۔ پھر تختہ لگا کر اسے ڈالے پر چڑھایا اور تختہ بند کر دیا۔

اس مشقت سے ممدو پسینے پسینے ہو گیا تھا۔ اس نے منہ سے پسینا پونچھا پھر نہر کے قریب آیا۔ جیرے کا بے جان بدن کنارے کے قریب ہی تھا۔ شاید کسی پتھر سے اٹک گیا تھا جو نہر میں کپڑے دھونے کے لیے جگہ جگہ گڑے ہوئے تھے۔

ممدو نے زور لگا کر ایک پتھر کو الگ کیا اور نہر میں اتر کر یہ پتھر جیرے کے بے حرکت سینے پر رکھ دیا۔ اب لاش کے ابھرنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ پھر اس نے اپنے کپڑے نچوڑ کر خشک کیے۔ اس ساری کارروائی کے لیے اس نے سڑک سے ہٹ کر بالکل سنسان علاقہ چنا تھا اور اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس دوران سڑک پر سے بھی کوئی سواری نہیں گزری۔ ویسے بھی یہ ایک ذیلی سڑک تھی جس پر ٹریفک برائے نام ہوتی ہے، جیرا اگر جاگ رہا ہوتا تو وہ راستے کی اس تبدیلی کا مقصد ضرور پوچھتا اور شاید یوں بے بسی کی موت نہ مرتا۔

ممدو نے ڈالا اسٹارٹ کیا۔ اسے سڑک پر لایا اور تیز رفتاری سے سفر کرنے لگا۔ اس کامیابی پر وہ بڑا خوش تھا۔ دس بارہ سال سے وہ اپنا ڈالا اسی طرح چوری کے جانور منڈیوں تک پہنچانے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ چور موبائل کے ذریعے اس سے رابطہ کرتے اور مطلوبہ سڑک پر بلاتے اور جانور سوار کرا دیتے۔ چھوٹے موٹے جانور تو وہ خود ہی بیچ آتا تھا اور اپنی مقررہ فیس جو دس ہزار سے کم نہیں ہوتی، وصول کر کے بقیہ رقم پوری ایمان داری سے مالک کے حوالے کرتا۔ بڑی قیمت کے مویشیوں کے معاملے میں اکثر چور اس کے ساتھ جاتے۔ ایک دوسرے پر بھروسا اور اعتماد ہی اس سارے کاروبار کی بنیاد تھے۔ وہ کبھی کسی شہر کے اندر نہیں گیا، اس طرح کبھی پولیس کو مطلوب نہیں ہوا۔

بس بھوری کو دیکھ کر ممدو کا ایمان ڈول گیا۔ غریب آدمی کے لیے لاکھ ڈیڑھ لاکھ بڑی رقم ہوتی ہے۔ ممدو بھی پھسل گیا اور جیرے کے قتل کا مرتکب ہو گیا۔ ویسے بھی اس کا یہ کوئی پہلا قتل نہیں تھا۔ وہ پکا واردتیا تھا۔ بس ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرتا تھا، جھنگ اور کچے کے علاقے کے درمیان بڑا فاصلہ تھا۔ مگر ممدو کا کہنا تھا کہ منڈی جتنی دور ہو گی خطرہ اتنا ہی کم ہو گا۔

دوپہر ڈھلنے لگی تھی۔ ممدو کا بھوک، تھکن اور نیند سے برا حال تھا۔ اس نے بے آباد علاقے میں ڈالا روکا۔ بھوری بھی بھوک سے بے چین ہو رہی تھی۔ شرفو نے تھوڑا سا چارا سیٹ کے نیچے رکھ دیا تھا۔ ممدو نے سیٹ ہٹا کر چارا نکالا۔ پلاسٹک کے ڈبے میں کولر سے پانی ڈالا اور بھوری کو کھلا پلا کر وہ خود ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر روٹیوں کی پوٹلی کھولنے لگا۔ وہ ہمیشہ ایسے وقت کے لیے کچھ نہ کچھ انتظام رکھتا تھا۔ یہ گڑ والی روٹیاں تھیں جو تقریباً سوکھ چکی تھیں۔ ممدو نے کولر سے پانی نکال کر ڈھکنے میں ڈالا اور روٹی کو بھگو دیا۔ دو چار منٹ میں روٹی نرم ہو کر کھانے کے قابل ہو گئی۔ ممدو نے پیٹ کی آگ بجھائی، پانی پیا اور چادر بچھا کر درخت کے نیچے لیٹ گیا۔

پتا نہیں کتنی دیر سویا، مگر جب ممدو جاگا تو اسے اپنی آنکھیں مل مل کر دوبارہ دیکھنا پڑا۔ جھاڑ جھنکاڑ داڑھی اور بل کھاتی مونچھوں والا ایک وحشی کلاشنکوف کی نال ممدو کے سینے کی طرف جھکائے کھڑا تھا۔ شاید اس نے ٹھوکر مار کر ممدو کو جگایا تھا۔ ممدو سمجھ گیا کہ کچے کے کسی ڈکیت سے پالا پڑ گیا ہے۔

”یہ ڈالا تیرا ہے؟“ ڈاکو غرایا۔

”ہاں جی۔“ ممدو عاجزی سے بولا۔

”اور یہ مجھ؟“

”یہ جی میری ہے۔“

”کہاں جا رہا ہے؟“

”جی منڈی جا رہا ہوں۔“

”مجھ بیچنے؟“

”ہاں جی۔“

”چوری کی ہے؟“

”نہیں...... نہیں جی۔“ ممدو گڑبڑا گیا۔

”چوری کی نہیں تو اتنی سوہنی مجھ کیوں بیچ رہا ہے؟“

ممدو چپ رہا۔

”چل اٹھ...... ڈالا اسٹارٹ کر۔“ ڈاکو نے حکم دیا۔

”کہاں جانا ہے جی؟“ ممدو کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

”میری جیپ کے پیچھے پیچھے ڈالا لگا لے۔ مجھ کو ہمارے ڈیرے پر اتار کر تو پھٹ جا۔“

ڈاکو نے ممدو کی جیب سے نقدی اور موبائل نکال لیا۔

”اور دیکھ کوئی ہشیاری دکھائی تو تیرے وجود میں سیکڑوں سوراخ بنا دوں گا۔“ ڈکیت نے ممدو کو وارننگ دی۔

ممدو کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اتنی کامیاب واردات کے بعد وہ اس غیر متوقع صورت حال کے لیے ذہنی طور پر بالکل تیار نہیں تھا۔ اس کا ذہن مسلسل چل رہا تھا۔

ڈاکو پلٹ کر جیپ کی طرف بڑھنے لگا جو چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی کہ ایک دم اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کی کمر میں آگ بھر دی ہو۔ وہ حیران ہو کر پلٹا تو ممدو ہاتھ میں چھوٹا سا پستول لیے ڈاکو پر دوسرا فائر کر رہا تھا۔ ڈاکو نے یہاں غلطی کی تھی، اس نے ممدو کی تلاشی لیتے وقت اس کے پاؤں کی طرف توجہ نہیں دی تھی جہاں پنڈلی کے ساتھ ایک چھوٹا سا پستول ہمیشہ بندھا رہتا تھا۔ یہی غلطی اس کی جان لے گئی۔ اس نے ہاتھ اوپر اٹھایا اور کلاشنکوف کا پورا برسٹ ممدو پر برسا دیا۔ پھر آہستہ آہستہ زمین کی طرف جھکتا چلا گیا، کیونکہ ممدو کے پستول کی گولی بڑی ٹھیک نشانے پر بیٹھی تھی۔ ادھر ممدو کے جسم میں واقعی بیسیوں سوراخ بن گئے تھے۔ وہ بھی لہرا کر گرا اور اپنے ہی خون کے تالاب میں ڈوب گیا۔

گولیوں کے دھماکوں نے بھوری کو بری طرح ڈرا دیا۔ ویسے بھی ممدو نے ابھی ڈالا بند نہیں کیا تھا۔ بھوری خوفزدہ ہو کر اچھلی اور ڈالے سے باہر کود پڑی۔ پھر سڑک پر دوڑنے لگی۔ سامنے سے آنے والے ٹرک ڈرائیور نے بڑی کوشش کی کہ بھاگتی ہوئی بھینس کو بچا لے مگر بھوری کو تو جیسے نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا نہ سنائی دے رہا تھا۔ ٹکر اتنی شدید تھی کہ بھوری کا بھاری جسم زمین سے کئی فٹ اونچا اچھلا اور پھر وہیں آ گرا، ٹرک کے بھاری پہیے اسے روندتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ پکڑے جانے کے خوف سے ڈرائیور نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا اور ٹرک بھگا لے گیا۔

ڈیرا قریب ہونے کی وجہ سے ڈاکوؤں کو فوراً ہی سارے واقعے کی خبر مل گئی۔ پولیس کے متوجہ ہونے کے ڈر سے انہوں نے ڈرائیور اور اپنے ساتھی کی لاشیں جائے واردات سے ہٹا کر سڑک کو بالکل صاف کر دیا جبکہ بھوری کا جسم زخموں سے بری طرح چور تھا۔ وہ تکلیف میں گھسٹتے ہوئے جیسے تیسے قریب کے جنگل کے جانب بڑھ گئی۔ ڈالا کام کی چیز تھی جسے وہ ساتھ ہی لے گئے۔

☆☆☆

شرفو کئی سمیں بدل بدل کر جیرے سے بات کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ مختلف منڈیوں سے پوچھ تاچھ کرتا رہا مگر جیرے کا کہیں پتا نہ چلا۔ اس بے چارے کو کیا خبر تھی کہ حقیقت میں کیا ہوا۔ جب کئی دن کے بعد جیرے کی مسخ شدہ لاش بہتی بہتی دور نکل گئی تو دیکھنے والوں نے پولیس کو اطلاع دی اور ناقابل شناخت ہونے کی وجہ سے لاوارث کی حیثیت سے دفنا دی گئی۔ ادھر پولیس نے دو چار مہینے کی تفتیش کے بعد بھوری کی چوری کی فائل بند کر دی۔

شرفو آج بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر باہر والی سڑک پر بیٹھ جاتا ہے کہ کبھی نہ کبھی تو ممدو وہاں سے گزرے گا تو اپنے یار کا پتا پوچھے گا کیونکہ صغراں اور بچے اس سے بار بار جیرے کے بارے میں پوچھتے ہیں مگر وہ کیا جواب دے۔ اسے خود پتا نہیں کہ جیرا، ممدو اور بھوری آخر گئے کہاں!

محفلِ شعروسخن

❄ عون عباس بابر......اوکاڑہ
گھوڑے تو دوڑے لاشۂ شبیر پہ مگر
تاریخ نے یزید کو پامال کر دیا

❄ ادریس احمد خان......ناظم آباد، کراچی
ان بدلتے موسموں پر وار ہونا چاہیے
شاخ گل کا نام اب تلوار ہونا چاہیے
وہ فقیروں کی گلی ہو یا امیروں کے محل
روشنی کو غیر جانبدار ہونا چاہیے

❄ محمد قاسم......نور پور تھل، خوشاب
زندگی تم یہیں کہیں رہنا
میں زمانہ بدل کے آتا ہوں

❄ ایم ڈبل اے......شنکیاری، مانسہرہ
عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

❄ چودھری مناظر علی گوندل......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
عیادت رسم دنیا تھی چلے آتے تو کیا ہوتا
تمہارے پوچھ لینے سے نہ جی جاتے نہ مر جاتے

❄ رانا آفتاب احمد......ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا
ہمارے پاؤں ہواؤں کی زد میں تھے ورنہ
گزرتی عمر کو رک رک کے ہم صدا دیتے
اب اس کی یاد سے اس کا بدن تراشتے ہیں
وہ خواب بھی تو نہیں تھا کہ ہم بھلا دیتے

❄ طاہرہ یاسمین......سرگودھا
مت اڑا شاخ سے ہم نہیں ہیں پرواز کے قابل
ہوئے بیزار اڑنے سے تو تیرے گلشن میں آبیٹھے

❄ عمران حیدر بلوچ......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
تو ہوا کے ہاتھ پر چاہتوں کا دیا جلانے کی ضد نہ کر
یہ اداس لوگوں کا شہر ہے یہاں مسکرانے کی ضد نہ کر
میں ہوں دوستوں کا ڈسا ہوا میرا غم ہے حد سے بڑھا ہوا
میں شکستہ گھر کی مثال ہوں مرے پاس آنے کی ضد نہ کر

❄ راجہ افتخار علی افتی......چوآسدن شاہ
آنکھ نم کر گیا بچھڑے ہوئے لوگوں کا خیال
درد دل دے کر ہمیں ڈوب گیا عید کا چاند

❄ سید عنبر عباس نقوی......تورنگہ، میانوالی
یاد آتے ہو تو ہوجاتی ہیں نم آنکھیں
کیا تصور میں ستانے کی قسم کھائی ہے

❄ رانا مختار احمد......ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا
ہم نے گہرے دریاؤں سے سیکھا ہے
آپ ہی اپنی موج میں بہنا چپ رہنا
اس نے کہا تھا جشن کی رات کو جنگل میں
ناچیں گے سب لوگ برہنہ چپ رہنا

❄ حکیم سید محمد رضا شاہ......تورنگہ، میانوالی
مرہم نہ سہی اک زخم ہی دے دو
محسوس تو ہو کہ ہمیں بھولے نہیں ہو

❄ شہباز احمد منا......سینٹرل جیل لاہور
پاؤں پھیلائے تو پھر دیکھی نہیں چادر ہم نے
تجھ کو چاہا تو پھر اوقات سے بڑھ کر چاہا
زیست آسان ہو بھی سکتی تھی لیکن ہم نے
تیری چاہت کو ہر اک بات سے بڑھ کر چاہا

❄ ذیشان افتخار ڈھلوں......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
جیسے مہتاب کو بے انت سمندر چاہے
میں نے اس طور سے چاہا تجھے اکثر جاناں

❄ شکیل الرحمٰن، سائرہ......کھاتاں
مناؤ جشن مے نوشی بکھرو زلف مے خانہ
عبادت سے تو ساغر دیر کے شیطان جلتے ہیں

❄ صوبیدار (ر) انوار بنگش......ملیر کینٹ، کراچی
جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے
اے وطن! ہم نے قدم قدم، تجھے یادگار بنا دیا

❄ غلام عباس، عذرا ہاشمی......گلشن ٹاؤن، گڑھ موڑ
محسن تمہاری یاد بھی کسی مفلس کی پونجی ہے
جسے ہم پاس رکھتے ہیں جسے ہم روز گنتے ہیں

❄ محمد بشارت......کنگر دوورہ
الٰہی کیا قیامت ہے وہ جب لیتے ہیں انگڑائی
میرے سینے میں سب زخموں کے ٹانکے ٹوٹ جاتے ہیں

❄ مرزا طاہر الدین بیگ......میرپور خاص
یہ سانحہ بھی محبت میں بارہا گزرا
کسی نے حال بھی پوچھا تو آنکھ بھر آئی

❄ حسنین عباس بلوچ......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
تیرے قریب رہ کر تجھے تلاش کروں
محبتوں میں میری بدحواسیاں نہ گئیں

❄ تفسیر عباس بابر......اوکاڑہ
بتا دیا حسینؑ کے عزم مصمم نے ہمیں
کہ سر قلم ہوں تو انقلاب آتے ہیں

❄ وزیر محمد خان......بٹل ہزارہ
سر بام تجھی پکارا لب دار بھی صدا دی
میں کہاں کہاں نہ پہنچا تیری دید کی لگن میں

❄ احسان سحر......میانوالی
جانے کب تک تری تصویر نگاہوں میں رہی
ہوگئی رات ترے عکس کو تکتے تکتے

❄ راشد حبیب تابش، اشفاق احمد......ضلع اٹک
اپنا بدن چراغ بناتا ہوں رات بھر
لکھتا ہوں پھر ہوا پہ ترا نام دیکھ لے
شیشے کے خواب دیکھے تو آنکھیں لہو ہوئیں
پتھر سے راہ و رسم کا انجام دیکھ لے

❄ رائے نعیم بھٹی......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
ٹانکے نہ ٹوٹ جائیں رکھنا ذرا خیال
زخم جگر کو پیار سے تم نے سیا تو ہے

❄ خواجہ مدنی......چوک ظاہر پیر
ملا نہ ہاتھ تجھے بھی اداس کر دیں گے
ہمارے ہاتھ پہ لکھا ہوا اداسی ہے

❄ محمد عبداللہ دانش......میانوالی
اٹھی نہیں آنکھ کسی اور کی طرف
پابندی کر گئی ہے کسی کی نظر مجھے

❄ سدھار تھ......جودھپور، ضلع خانیوال
ذرا گستاخ تھا اے شمع تو نے جان ہی لے لی
پروانہ تھا کہاں سے سیکھتا آداب محفل کے

❄ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر......نئی منڈی سکھیکی
کرتے نہیں ہیں ذکرِ محبت کسی سے ہم
رہتے ہیں تیرے شہر میں اک اجنبی سے ہم
بستی کے سارے لوگ ہیں دشمن بنے ہوئے
تنگ آگئے ہیں آج تیری دوستی سے ہم

❄ محسن علی موم......بالاکوٹ
آنکھوں کو اشک آہ کو تاثیر دے گیا
اک شخص ہم کو درد کی جاگیر دے گیا

❄ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
اس کے نزدیک غم ترکِ وفا کچھ بھی نہیں
مطمئن ایسا ہے وہ جیسے ہوا کچھ بھی نہیں

❄ انیلہ رشید سیال......خیر پور (میرس)
دیکھے ہی نہیں جاتے تری آنکھ میں آنسو
ہم تجھ سے گلہ کرکے پشیمان بہت ہیں

❄ ریاض بٹ......حسن ابدال
میں خود کو ڈھونڈتا ہوں سر شہر آرزو
مجھ کو بھی دل کے ساتھ چرا لے گیا کوئی

❄ محمد جاوید بلوچ......علی پور
رونے سے تو بچھڑے ہوئے ساتھی نہیں ملتے
مانا کہ یہی شیوۂ یعقوبؑ رہا ہے

❄ ڈاکٹر عامر مقبول واگھرہ......نور پور تھل، خوشاب
میری اجرت میری محنت سے زیادہ کیوں ہے؟
میرے محسن تیرے احسان سے ڈر لگتا ہے

❄ بلیک کیٹ......رشید آباد
ہم بھرے شہر میں تنہا تو نہیں تھے لیکن
کوئی رشتہ نہ ملا پھر تیری چاہت جیسا

❄ محمد اشفاق سیال......شور کوٹ
سکھ کی اگی نہ دھوپ، نہ دکھ کی مٹی لکیر
یوں ہے مرا نصیب کہ پتھر ہو جس طرح

❄ محمد آصف ساجد......قصور
گھر موم کا پہلے تو بنایا نہیں جاتا
بن جائے تو سورج سے بچایا نہیں جاتا

❄ محمد اقبال......کورنگی
الزام محبت کے ڈر سے چھوڑ دیا شہر اپنا
ورنہ چھوٹی سی عمر پردیس کے قابل تو نہ تھی

❄ ملک آصی تلوکر عمیر منہاس......لیہ
اک جنونِ بے معنی، اک یقینِ لاحاصل
اور کیا ملا ظالم تیری آرزو کرکے

❄ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن خانیوال
مانگیں وضاحتیں نہ مانگی کوئی دلیل
دل نے تو حد ہی کر دی اس پر اعتبار کی

❄ مولا بخش......میر پور، ساکرو
ایک محبت کا مشغلہ لے کر
زندگی کی خوب تباہ ہم نے

❄ اطہر حسین......کراچی
کب سے کھڑے ہیں آپ کے در پر ہم اہلِ غم
دامن میں گل نہیں ہیں تو پتھر ہی ماریے

❄ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
ہنستی آنکھیں ہنستا چہرہ اک مجبور بہانہ ہے
سچ ہے چاند میں نور کہاں ہے چاند تو ایک ویرانہ ہے

❄ محمد عزیر......عظیم پورہ
آئی نہ رات بھر کوئی پنگھٹ پہ سانولی
پانی میں چھپ کے بیٹھا رہا بے قرار چاند

❄ ارسلا فضل......روہڑی
پڑا فلک کو کبھی دل جلوں سے کام نہیں
جلا کے راکھ نہ کر دوں تو داغ نام نہیں

❄ عدنان صدیقی......ملتان
ہاں، جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجیے
ہر رہ جو ادھر کو جاتی ہے، مقتل سے گزر کر جاتی ہے

❄ محمد عزیز......ملیر، کراچی
ہم اور اس کو بھولیں ناصر باتیں کیسی کرتے ہو
صورت تو پھر صورت ہے یہ نام بھی پیارا لگتا ہے

❄ رضوان امجد......لاہور
خود کو سیراب کیا اور نہ پیاسا رکھا
ہم نے دریا سے عجب جبر کا رشتہ رکھا

❄ نہال ہاشمی......فیصل آباد
پوچھا جو ان سے چاند نکلتا ہے کس طرح
زلفوں کو رخ پہ ڈال کر جھٹکا دیا کہ یوں

❄ احمر علی......گوجرانوالہ
تو کبھی وقت کے صحرا میں میرے ساتھ چل
پھول بن کر تیری راہوں میں بکھر جاؤں گا

❄ ذیشان منہاس......گلشن اقبال، کراچی
اک دل کو فتح کرکے گزر جا کہ خیر ہو
آباد اس زمیں پہ کوئی سلطنت نہ کر

❄ سدرہ منیر......شیخوپورہ
سورج کو جاگنے میں ذرا دیر کیا ہوئی
چڑیوں نے آسمان کو سر پہ اٹھا لیا

❄ نعیم خان......مہمند ایجنسی
آئی نہ ہاتھ پیار کی خیرات کہیں سے
ہم کاسۂ خلوص لیے ڈھونڈتے رہے

❄ نوروز خاں......چارسدہ
ہر وقت اک حسین تصور میں گم ہوں میں
جلوے کسی کے کیا میری آنکھوں میں بس گئے

کوپن برائے شمارہ جنوری 2012

محفلِ شعر و سخن

نام : ....

پتا : ....

رہنمائی

منظر امام

یہ وقت بھی ایک عجیب طاقت کا نام ہے... کبھی اتنا بھاری کہ انسان خود کو پہاڑ تلے دبتا محسوس کرے اور کبھی اتنے دبے پاؤں گزرتا ہے کہ ذرا سی آہٹ تک محسوس نہیں ہوتی... ان کا دل بھی جب بوجھل ہوا تو وہ جو بہت دانا نظر آتے تھے، دو چار ملاقاتوں میں ہی دانے دانے کو محتاج نظر آنے لگے... ایمان کی عمارت ان کے فریب کے آگے ڈھیر ہونے لگی تھی کہ اچانک... ڈوبنے والوں کو تنکے کا سہارا مل گیا۔

بے روزگاری کے اندھیروں میں امید کی کرن تلاشنے والوں کا قصہ

میں نہیں جانتا کہ دوسرے شہروں میں اس قسم کے مناظر دکھائی دیتے ہیں یا نہیں لیکن کراچی میں یہ سب بہت عام ہے۔ مثال کے طور پر آپ اپنی گاڑی میں کہیں جا رہے ہیں، اچانک آپ کو ایک پریشان صورت اور مفلوک الحال قسم کے مرد اور عورت جاتے ہوئے دکھائی دے جائیں گے۔

مرد نے عورت کو سہارا دے رکھا ہوگا۔ عورت اس کے ساتھ گھسٹتی ہوئی چل رہی ہوگی۔ آپ یقیناً ان بے چاروں پر ترس کھا کر کچھ نہ کچھ دیتے ہوئے نکل جائیں گے۔ یا پھر آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ کسی فٹ پاتھ کے پاس سڑک پر چنے یا مونگ پھلیاں وغیرہ بکھری ہوئی ہیں۔ تھال ایک طرف پڑی ہوئی ہے اور ایک بچہ قریب بیٹھا رو رہا ہے۔

آپ کو فوراً خیال آئے گا کہ اس بے چارے کے ساتھ یہ المیہ ہوا ہے کہ کسی گاڑی والے نے ٹکر مار کر بے چارے کا سارا سامان گرا دیا ہے اور خود فرار ہو گیا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ اس وقت آپ کی آنکھوں میں آنسو بھی آجائیں بہرحال آپ اسے بھی کچھ نہ کچھ دیتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ ان کے پاس آپ کی جیب سے پیسے نکلوانے کے اور بھی ہزار طریقے ہوتے ہیں۔

یہ ایک سدا بہار قسم کا موضوع ہے۔ ایک صاحب ایک بھکاری کو روزانہ سو روپے دیتے تھے پھر پچاس کر دیے اس کے بعد پچیس دینے لگے پھر دس روپے پر آگئے۔ بھکاری نے پوچھا۔ ''جناب، یہ کیا سلسلہ ہے پہلے سو، پھر پچاس پھر پچیس اور اب صرف دس۔''

وہ صاحب کہنے لگے۔ ''کیا کروں پہلے میں اکیلا تھا اس لیے سو روپے دیتا تھا پھر شادی ہوگئی تو پچاس کر دیے پھر بیٹا ہوا تو پچیس کر دیے اب ایک اور اولاد ہوگئی ہے اس لیے دس دے رہا ہوں۔''

فقیر کہنے لگا۔ ''واہ بھائی صاحب، آپ کو شرم نہیں آتی کہ میرا پیٹ کاٹ کر اپنے گھر کا خرچ چلا رہے ہیں۔'' تو یہ بھیک مانگنے والے بھی کچھ اسی قسم کے ہوتے ہیں۔

لیکن مجھے جو فقیر ملا وہ شاید ان سب سے انوکھا تھا۔ وہ مجھے پہلی بار ایک بس اسٹاپ پر ملا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے میرے پاس آیا اور اپنا ہاتھ پھیلا کر بولا۔ ''دیکھ بھائی صرف دو سو روپے مانگتا ہوں اگر تو نے دے دیے تو ٹھیک ورنہ آج کا دن تجھ پر بہت بھاری گزرے گا۔''

میں اس کی بات سن کر حیران رہ گیا۔

کسی فقیر نے آج تک ایسی کوئی بات نہیں کی ہوگی۔ وہ دیکھنے میں اچھا خاصا تھا۔ ہلکی ہلکی ڈاڑھی اور ایک جبے میں اس کی شخصیت مرعوب کن دکھائی دے رہی تھی۔

اس کی آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں۔ ان میں جلالی کیفیت تھی۔

پھر اس نے جس انداز میں مجھ سے بھیک مانگی تھی، وہ انداز بھی حیران کر دینے والا تھا۔ دو سو روپے کا مطالبہ کر رہا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ اگر نہ دیا تو آج کا دن بھاری گزرے گا۔ میں جانتا تھا کہ بہت سے توہم پرستوں نے شاید اس کا مطالبہ پورا بھی کر دیا ہو۔ اس قسم کے لوگ انسانی نفسیات سے کھیلنا بہ خوبی جانتے ہیں۔ وہ خود کو مجذوب یا کوئی پیر وغیرہ ظاہر کر کے اس قسم کی بشارتیں دیا کرتے ہیں۔

''لا نکال دو سو روپے۔'' اس نے اس بار کڑک دار آواز میں کہا۔ ''کیا سوچ رہا ہے؟''

''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آج کا دن چاہے لاکھ بھاری گزر جائے میں تجھے ایک پیسا نہیں دوں گا۔''

میرے اس کھرے جواب پر وہ تلملا کر رہ گیا تھا۔ پھر مجھ پر قہر آلود نگاہ ڈالتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اس کو بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ بندہ اس کے قابو میں آنے والا نہیں ہے۔

پھر اسی شام دفتر سے واپسی پر میرے ساتھ ایک حادثہ ہوگیا۔

یہ ایک عجیب حادثہ تھا۔ میں دفتر کی سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ نیچے سے آنے والے ایک تیز رفتار شخص سے میری ٹکر ہو گئی۔ اس کی ٹکر سے میں بوکھلا کر رہ گیا تھا، میرا چشمہ گر گیا اور میں نے خود کو گرنے سے بچانے کے لیے دیوار کا سہارا لیا لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ میرے قدم اکھڑ گئے تھے اور میں گرتا چلا گیا۔

دو تین سیڑھیوں تک میں لڑھکتا رہا پھر کسی نے مجھے تھام لیا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ پورے بدن پر اچھی خاصی چوٹ آئی تھی۔

مجھے سہارا دینے والا شخص وہی تھا۔ جس سے میری ٹکر ہوئی تھی، وہ سخت شرمندہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے میرا گرا ہوا چشمہ اٹھا کر میرے حوالے کیا۔ شکر ہے کہ چشمہ ٹوٹنے سے محفوظ رہ گیا تھا۔

اس نے خود میرے کپڑے جھاڑے اور بڑی لجاجت سے کہنے لگا۔ ''معاف کیجیے گا، میں بہت شرمندہ ہوں۔ میں بہت جلدی میں تھا اسی لیے آپ کو دیکھ نہیں سکا۔''

اب میں اس سے کیا کہتا۔ یہ ایک اتفاق تھا اور اس قسم کے اتفاقات ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے اس سے صرف اتنا کہا۔ ''تم میرے لیے ایک رکشا یا ٹیکسی کر دو اور مجھے سہارا دے کر اس میں بٹھا دینا کیونکہ میں خود سے چل نہیں سکوں گا۔''

''چلیں میں آپ کو گھر تک پہنچا دوں، میرے پاس گاڑی ہے۔'' اس نے کہا۔

''نہیں بھائی بس اتنا ہی بہت ہے۔''

وہ مجھے ایک طرف بٹھا کر جلدی سے رکشا یا ٹیکسی لینے چلا گیا۔ بہرحال میں تین دن تک دفتر جانے کے قابل نہیں ہو سکا تھا۔ ڈاکٹر چونکہ پڑوس میں تھے اس لیے انہیں گھر پر ہی بلا لیا تھا۔ انہوں نے دوائیں وغیرہ لکھ کر دے دی تھیں۔

بستر پر پڑے ہوئے میں سوچتا رہا کہ یہ محض ایک اتفاق تھا یا اس فقیر کا کہا پورا ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ آج کا دن بھاری گزرے گا تو واقعی وہ دن مجھ پر بھاری پڑ گیا تھا۔

میرا ایک دوست عیادت کے لیے میرے پاس آیا۔ میں نے جب اسے یہ واقعہ سنایا تو وہ بھی ہنس پڑا۔ ''یار کس قسم کے وہم میں پڑے ہوئے ہو۔ یہ ایک اتفاق تھا اور چونکہ اس

فقیر نے ایسی بے تکی بات کہہ دی تھی اسی لیے تمہارا دھیان اس کی طرف جا رہا ہے ورنہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

بہرحال تین دن کے بعد جب میں دفتر جانے کے قابل ہوگیا تو میں نے بس اسٹاپ پر اس فقیر کو تلاش کیا لیکن وہ مجھے نہیں مل سکا۔

دوسرے دن بھی وہ دکھائی نہیں دیا۔ شاید اس نے وہ اڈا چھوڑ دیا تھا یا کہیں اور چلا گیا تھا۔ لیکن ایک دن پھر وہ اچانک میرے سامنے آ کر کھڑا ہوگیا۔ اس بار وہ مجھے مارکیٹ میں ملا تھا اور اس کا وہی انداز تھا یعنی میرے سامنے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہوگیا تھا۔ ''لا دو سو روپے دے دے ورنہ آج کا دن بہت بھاری گزرے گا۔''

''تم پھر اپنی منحوس شکل لے کر میرے سامنے آگئے ہو۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''جاؤ یہاں سے، میں تمہیں ایک پیسا نہیں دوں گا۔''

''اپنی زبان سنبھال کر رکھ۔'' وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''اگر دو سو نہیں دیے تو آج کا دن تیرے لیے بہت بھاری ہوگا۔''

''ہونے دے بھاری تو اپنے آپ کو سنبھال۔ خود تو بھیک مانگتا پھر رہا ہے اور دوسروں کو بھاری کیے جا رہا ہے۔''

وہ غصے سے بڑبڑاتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

میں نے آج بھی اس کی کوئی پروا نہیں کی۔ پچھلی بار اتفاق ہوگیا تھا، کوئی ضروری نہیں کہ ہر بار کچھ ایسا ہی ہو۔ ہاں اس دن بھی ایک حادثہ ہوا لیکن اس کی نوعیت بہت مختلف تھی بلکہ وہ ایک خوشگوار حادثہ تھا۔

میں کسی بک شاپ میں اپنی پسند کی کتاب تلاش کر رہا تھا کہ ایک خوبصورت سی لڑکی میرے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ بھی کتاب ہی تلاش کر رہی تھی۔ مجھے ڈکنز کا ایک ناول پسند آیا تھا۔ میں نے وہ ناول شیلف سے نکال لیا اور جب قیمت کی ادائیگی کے لیے کاؤنٹر پر پہنچا تو وہ لڑکی جلدی سے میرے پاس آگئی۔ ''پلیز آپ یہ ناول مجھے دے دیں۔ مجھے بہت دنوں سے اس کی تلاش تھی۔'' اس نے کہا۔

وہ ایک اسمارٹ سی لڑکی تھی۔ ''محترمہ یہ ناول میری بھی تلاش تھا۔''

''اب کیا کروں؟'' وہ کچھ مایوس ہو چلی تھی۔

''آپ ایسا کریں آپ یہ ناول لے جائیں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ پڑھ کر واپس کر دیجیے گا۔ میں آپ کو اپنا سیل نمبر دے دیتا ہوں۔''

میں نے ناول اس کی طرف بڑھایا اور اس کم بخت نے واویلا شروع کر دیا۔ ''شرم نہیں آتی، بدتمیز بہانے بہانے بات کرتے ہو پھر ہاتھ تھامنے کی کوشش کرتے ہو۔ لعنت ہو تم جیسے لوگوں پر۔''

میں تو بری طرح بوکھلا کر رہ گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایسے موقعے پر کسی مرد کی ایک نہیں سنی جاتی۔ چاہے وہ کتنا ہی معقول کیوں نہ ہو۔

وہاں اور بھی لوگ تھے۔ میری بھی ایک نہیں سنی گئی۔ اس لڑکی نے اتنا شور مچایا کہ اس کی ہمدردی میں لوگوں نے مجھے مارنا شروع کر دیا۔ میں لاکھ اپنی صفائیاں دیتا رہا لیکن کون سنتا ہے فغانِ درویش؟

مختصر یہ کہ اس رات جب میں بستر پر لیٹا تو میرا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ مارنے والے خاصے معقول لوگ تھے اور انہوں نے میری معقول قسم کی ٹھکائی کر ڈالی تھی۔

پھر مجھے اس درویش کی بات یاد آگئی جس نے یہ کہا تھا کہ آج کا دن مجھ پر بھاری گزرے گا اور واقعی حد سے زیادہ بھاری گزرا تھا۔

اس درویش نے دو بار مجھ سے یہ بات کی تھی اور دونوں بار میرے ساتھ کچھ نہ کچھ ہوگیا تھا۔ میرے ذہن میں ایسے سچے درویشوں کی کہانیاں گردش کرنے لگیں جن کی ہر بات سچ ثابت ہوا کرتی تھی۔

میں دو دنوں تک دفتر نہیں جا سکا تھا۔

اس بار بھی میرا علاج اسی ڈاکٹر نے کیا تھا جو پہلے

بیلنس

بیوی: ''بعض اوقات میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہاری زندگی کا ہر لمحہ اپنے نام ڈیبٹ کرا لوں مگر پھر خیال آتا ہے کہ کہیں تمہاری زندگی دوالیا نہ ہو جائے۔''

شوہر: ''دیکھو بیگم! جس دن سے میں نے آپ کو اپنی زندگی کا شیئر دیا ہے، تمہاری ماں کے مارک اپ سے تنگ آگیا ہوں، اوپر سے تمہارے ابا کی آمد سے جو ایکسائز ڈیوٹی لگتی ہے، اس کو ادا کر کے جی چاہتا ہے کہ اپنی خوشیاں فکس ڈپازٹ کرا دوں۔''

بیوی: ''ایسا نہ کہیں جانِ من، محبت کے اعتراف کا پہلا واؤچر بھی تو آپ نے ہی بھرا تھا۔ میری خواہشوں کے کرنٹ اکاؤنٹ سے اگر کٹوتی ہوئی تو میں سمجھوں گی کہ میرے حسن کی بیلنس شیٹ میں کوئی کمی محسوس ہوئی ہے؟''

مرسلہ: عقیل الرحمٰن...... سعودی عرب

چوٹ لگنے کے بعد کر چکا تھا۔ اس نے مجھ سے حیرت سے کہا تھا۔ ''صفدر صاحب یہ آپ کے ساتھ دس دنوں میں دوسرا واقعہ ہے۔''

''جی ڈاکٹر صاحب۔'' میں کراہتے ہوئے بولا۔ ''بس قسمت خراب ہے۔''

''آئندہ سے خود کو ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ رکھیے گا ورنہ لمبے ہو جائیں گے۔''

''کوشش کروں گا ڈاکٹر صاحب۔''

خیر، دو دنوں کے بعد آرام آ گیا تھا اور میں نے پھر دفتر جانا شروع کر دیا۔ چار پانچ دنوں کے بعد وہ مرد درویش مجھے پھر دکھائی دے گیا تھا۔

اس بار وہ میرے پاس نہیں آیا تھا بلکہ میں خود دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ ''بابا، مجھے معاف کر دیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے آپ کا دل دکھایا ہے۔ آپ مجھ سے دو سو روپے مانگتے رہے میں نے آپ کو نہیں دیے، اس وقت لے لیں مجھ سے۔''

''کیوں فقیروں سے مذاق کرتا ہے۔'' وہ غصے سے بولا۔ ''اب ریٹ بڑھ گیا ہے دو سو سے کام نہیں چلے گا۔ دو ہزار روپے دینے ہوں گے۔''

''ارے بابا رحم کریں، میں دو ہزار کہاں سے لاؤں؟''

''میں کچھ نہیں جانتا۔ اگر نہیں دیے تو آج کا دن تجھ پر بھاری گزرے گا۔''

''خدا کے لیے یہ مت کہو۔'' میں نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''بہت بھاری دن دیکھ لیے ہیں۔ اب برداشت نہیں ہوگا۔''

''تو پھر دو ہزار دے، جلدی۔'' اس نے اپنا ہاتھ میری طرف پھیلا دیا۔

''ارے کہاں سے دوں دو ہزار۔'' میں جھلا گیا تھا۔ ''بھیک مانگ رہے ہو یا ڈاکے ڈال رہے ہو۔''

''اچھا یہ تیور ہیں تیرے۔'' اس نے گھور کر دیکھا۔ ''جا، تو پھر آج کا دن بھی تیرے لیے بھاری ہے۔''

''کیا ہوگا۔ اب کیا ڈرون حملہ ہوگا مجھ پر یا پہاڑ آ گرے گا؟''

لیکن وہ کوئی جواب دیے بغیر آگے بڑھ گیا۔ پتا نہیں کس قسم کا درویش تھا...... لیکن وہ جو بھی تھا، جیسا بھی تھا اس نے پھر آج کے دن کے بھاری ہونے کی بات کی تھی۔

اب احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ میں اپنے گھر جا کر بند ہو جاؤں۔ نہ میں گھر سے باہر نکلوں گا، نہ میرے ساتھ کوئی حادثہ ہوگا۔

میں نے ایک رکشے والے کو آواز دی جو مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا تھا، حالانکہ وہ کرایہ زیادہ مانگ رہا تھا لیکن میں پھر بھی اس کے رکشے میں بیٹھ گیا، جلد سے جلد گھر پہنچنے کے لیے۔

راستے میں ایک جگہ کچھ لوگوں نے اچانک سامنے آ کر رکشے کو گھیر لیا۔ یہ ایک تقریباً سنسان سا علاقہ تھا۔ مکانات بنے ہوئے تو تھے لیکن ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر تھے۔ رکشے والے نے ان لوگوں سے کترا کر رکشا نکال لے جانا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ ان لوگوں نے رکشا رکتے ہی ڈرائیور کو گریبان سے پکڑ کر اتار لیا اور اسے گالیاں دینے لگے۔

اس وقت پتا چلا کہ پرانی دشمنی کا چکر تھا اور رکشے والے کو انہوں نے اتفاقاً گھیر لیا تھا۔

یہ میری بدقسمتی تھی کہ میں رکشا والے کو بچانے کے لیے درمیان میں آ گیا تھا اور وہ غصے سے بھرے ہوئے لوگ رکشے والے کو چھوڑ کر مجھ سے بھڑ گئے۔

نتیجہ وہی ہوا جو ایسے مواقع پر ہوا کرتا ہے۔ ان لوگوں نے میری خاصی ٹھکائی کر ڈالی۔ میں نے خود کو بچانے کی بھی کوشش کی تھی لیکن ظاہر ہے کہ ان لوگوں سے خود کو بچانا ممکن نہیں تھا۔

اس بار میں پورے ایک ہفتے بستر پر رہا تھا اور میرے علاج کے لیے وہی ڈاکٹر آیا تھا جو پہلے بھی دو بار میری مرہم پٹی کر گیا تھا۔ اس بار اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔ ''صفدر صاحب، ایک بات بتائیں کیا آپ کو مار کھانے کا اتنا شوق ہے؟''

''لعنت بھیجیں۔ یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں کس کو مار کھانے کا شوق ہو سکتا ہے؟''

''تو پھر ایسے واقعات آپ ہی کے ساتھ کیوں پیش آ رہے ہیں؟''

''اب میں کیا بتاؤں میری بدقسمتی، میں جب بھی اس درویش کی بات ماننے سے انکار کرتا ہوں میرے ساتھ یہی ہوتا ہے۔''

''کون سا درویش؟''

میں نے ڈاکٹر کو اس درویش کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ ''او خدا! تو یہ ماجرا ہے۔ صفدر صاحب، آپ اسے ناراض نہ کیا کریں، کسی بھی قیمت پر نہیں ورنہ آپ کے لیے عذاب ہو جائے گا۔ اس کے پیر پکڑ لیں۔ معافی مانگ لیں اس سے۔''

''ہاں بھائی یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔''

خیر اس بار تو اس حالیہ ٹھکائی نے میرے ہوش کچھ اس طرح بھی اڑا دیے کہ دفتر سے مجھے جواب دے دیا گیا تھا۔ باس نے کہا تھا۔ ''بھائی یا تو تم زخمی ہونے کا شوق پورا کر لو یا پھر ملازمت کر لو۔''

''جناب مجھے ملازمت ہی کرنی ہے۔''

''افسوس ہے کہ اب ہم تمہارا یہ شوق پورا نہیں کر سکتے۔'' اس نے کہا۔ ''تم اپنا حساب لے کر جا سکتے ہو۔''

بہر حال اس دفتر سے میری چھٹی ہو گئی۔ اب مجھے پھر اس درویش کی تلاش تھی جس کی بد دعاؤں نے مجھے اس حال کو پہنچا دیا۔ وہ ایک بار اسٹاپ پر پھر دکھائی دے گیا۔ ایک آدمی اسے ہزار کا ایک نوٹ دے رہا تھا۔ اس آدمی کے ہٹتے ہی میں اس درویش کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ''بابا۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کے مرتبے کو نہیں پہچانا تھا۔ میں مار کھاتے کھاتے تنگ آ چکا ہوں۔ آپ جب بھی فرماتے ہیں کہ آج کا دن بھاری گزرے گا تو وہ دن واقعی بہت بھاری گزرتا ہے۔''

''اچھا تو پھر نکال تین ہزار روپے۔''

''بابا! میری جیب میں صرف تین ہزار روپے ہیں۔'' میں نے بتایا۔ ''وہ بھی اس لیے کہ دفتر والوں نے میری چھٹی کر دی ہے۔''

''اچھا تو تیرے ساتھ یہ ہوا ہے۔''

''جی بابا۔'' میری آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے۔ ''میں تو اب کہیں کا بھی نہیں رہا۔''

''کیا تو اپنا مستقبل سنوارنا چاہتا ہے؟''

''کون نہیں چاہے گا بابا۔''

''تو پھر آ میرے ساتھ، میں تیرا مستقبل بنا دیتا ہوں۔'' اس نے ایک شان بے نیازی سے کہا ''کیونکہ مجھے تجھ پر ترس آ گیا ہے۔''

''بڑی مہربانی۔''

وہ مجھے اپنے ساتھ ایک مکان میں لے آیا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا لیکن صاف ستھرا مکان تھا۔ ڈرائنگ روم بہت بڑا تھا، سلیقے کے ساتھ صوفے رکھے ہوئے تھے۔

''بیٹھ جاؤ۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن ایک شرط پر تمہارا مستقبل بنے گا کہ تمہیں ہمارے ساتھ شامل ہونا ہوگا۔''

''آپ کے ساتھ شامل ہونا، یہ بات سمجھ میں نہیں آئی؟''

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

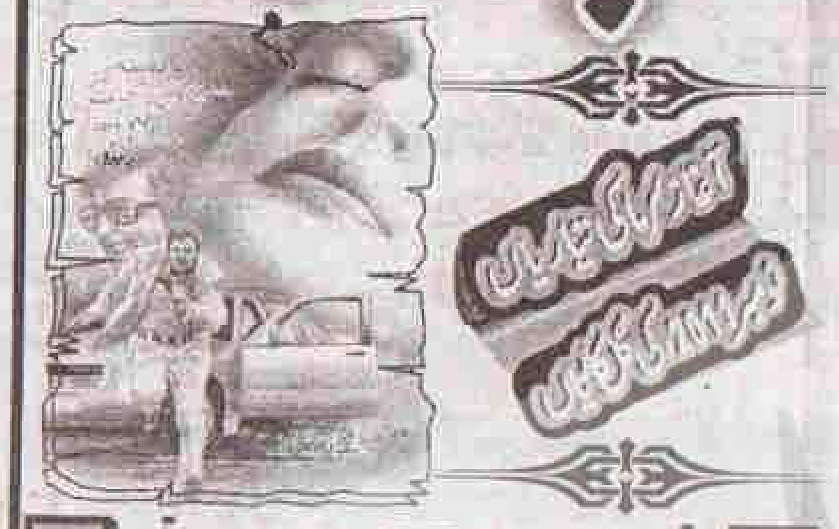

گھر کا چراغ / ایچ اقبال
چراغ کی لو چلتی ہے تو ہر سو روشنی بکھر جاتی ہے
اور جب بھڑکتی ہے تو ہر شے کو خاکستر کر دیتی ہے

للکار / طاہر جاوید مغل
کٹھن اور اعصاب شکن ماحول میں لمحہ بہ لمحہ
آگے بڑھتی داستان کی دل فریب سحر انگیزیاں

گرداب / اسما قادری
پیچیدہ و خاردار راستوں پر
گامزن دوشیزہ کی دشواریاں

سرورق
محبت، انتقام اور نفرت کی مثلث کا پہلا شگفتہ رنگ
گم گشتہ اوراق سے ایک قصہ — دوسرا سنگین رنگ

جرم کتھائیں
ہر جرم کے پیچھے کوئی نہ کوئی واقعہ مضمر ہوتا ہے... انھی سے جنم لینے والی... ناقابل فراموش کہانیاں

چینی نکتہ چینی
آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... آپ کے قلم سے

”تم پوری بات سن لو۔“ اس نے کہا۔ ”اگر تم شامل نہیں ہونا چاہتے تو انکار کر دینا لیکن یہاں سے باہر جا کر تم ہمارے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گے۔ اگر یہ شرط منظور ہے تو پھر میں بات کو آگے بڑھاتا ہوں ورنہ یہیں ختم سمجھو۔“

”نہیں نہیں آپ بتائیں۔ میرے پاس تو کوئی آپشن بھی نہیں ہے۔“

”دیکھو، ہمارا ایک ادارہ ہے جس کا نام ہے ٹیکنیکل سوسائٹی آف بیگرز، یعنی بھیک مانگنے والوں کی سائنسی سوسائٹی۔ ہماری سوسائٹی کے بے شمار رکن ہیں اور سب کو معقول تنخواہ ملتی ہے۔ سب خوش ہیں۔ ہماری آمدنی بھی اچھی خاصی ہے۔“

”پلیز ذرا تفصیل سے بتائیں، یہ سب کیا ہے؟“

”یہ ہماری نئی تکنیک ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”تکنیک یہ ہے کہ ہم کسی ایک بندے کو منتخب کر لیتے ہیں۔ اس کی نگرانی کی جاتی ہے۔ وہ کہاں رہتا ہے۔ کہاں جاتا ہے یہ سب ہمارے علم میں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم نے تمہیں دیکھا۔ میں بس اسٹاپ پر تمہارے پاس پہنچ گیا اور تم سے دو سو روپے مانگ لیے۔ ظاہر ہے کہ تم نہیں دے سکتے تھے۔ میں نے تمہیں دن بھاری ہونے کی خبر سنائی اور ہمارا ایک آدمی سیڑھیوں پر تم سے ٹکرا گیا۔“

”کیا کہہ رہے ہو، وہ تمہارا آدمی تھا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں ہمارا ایک کارکن تھا پھر دوسری بار بھی ایسا ہی ہوا۔ ایک لڑکی تمہیں ملی اور اس نے تمہاری ٹھکائی کروا دی۔“

”ہاں ...... تو وہ لڑکی ......؟“

”ہاں وہ بھی ہماری ورکر ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اب سمجھا تو وہ رکشے والا۔ اس کے دشمن ...... وہ سب ڈراما تھا؟“

”ہاں سب ڈرامے۔ اب خود سوچو جب میں اس طرح پھر کسی کے سامنے جا کر کہوں کہ لا مجھے دو ہزار روپے دے تو وہ دے گا یا نہیں دے گا؟“

”کیوں نہیں دے گا۔ وہ تو تمہیں خدا کا خاص بندہ سمجھنے لگے گا۔“

”بس یہی ہے وہ تکنیک جس کی مدد سے ہم ہر مہینے لاکھوں روپے کما لیتے ہیں اور اپنے کارکنان کو معقول تنخواہ بھی دیتے ہیں۔“

”اوہ خدا!“ میں نے اپنا سر تھام لیا۔

اسی دوران کچھ لوگ کمرے میں آ گئے اور میں سب کو پہچانتا چلا گیا۔ وہ مجھے گرانے والا، وہ لڑکی، وہ رکشے والا اور اس کے دشمن، سب کے سب ہنستے بولتے ہوئے کمرے میں چلے آئے تھے۔

اس آدمی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ان لوگوں کو بتایا۔ ”ان سے ملو، یہ ہماری ٹیم کے نئے ممبر ہیں مسٹر صفدر۔“ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ”کیوں صفدر صاحب، آپ کو ہماری جاب منظور ہے۔ شروع میں آپ کو پچیس ہزار ملیں گے۔“

”منظور ہے۔“ میں نے فوراً جواب دے دیا۔

وہ سب مجھ سے باری باری ہاتھ ملاتے رہے۔ اس شخص نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”صفدر، تمہاری ڈیوٹی کچھ اور ہوگی۔ تم آؤٹ ڈور نہیں جاؤ گے بلکہ یہاں بیٹھ کر کام کرو گے۔“

”یہاں کیا کام کرنا ہوگا؟“

”ایک تو ہر رکن کا حساب کتاب رکھنا۔ ان کو ڈیوٹی پر بھیجنا۔ اس کے علاوہ سب سے اہم بات نئی نئی پلاننگ کرنا کہ کسی شخص کے دن کو بھاری کس کس طرح کیا جا سکتا ہے۔“

”میں سمجھ گیا۔ میں تیار ہوں۔“

سب نے مجھے مبارکباد دی اور اس دن سے میں اس انوکھی سوسائٹی کا ایک اہم کارکن ہوں۔ اسی لیے آپ کو یہ سمجھا رہا ہوں کہ اگر کوئی درویش قسم کا آدمی آپ کے سامنے آ کر کہے کہ لا پانچ سو روپے نکال تو فوراً دے دیں ورنہ وہ دن آپ پر واقعی بھاری ہو جائے گا اور آپ ہفتے تک اپنی چوٹوں کو سہلاتے رہیں گے۔

ہاں ایک بات اور...... اگر کوئی ایسا شخص آپ کے سامنے آ جائے اور وہ آپ سے اس انداز سے رقم کا مطالبہ کرے تو یہ مت سمجھ لیجیے گا کہ وہ ہماری سوسائٹی کا بندہ ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ واقعی درویش ہی ہو۔

اس کی آسان پہچان یہ ہے کہ جو شخص آپ کو دن کے بھاری ہونے کی بددعا دے رہا ہے، وہ ہماری سوسائٹی کا رکن ہے اور جو بددعا نہیں دے رہا وہ واقعی کچھ اور ہے کیونکہ خدا کے نیک بندے کسی کو بددعائیں نہیں دیتے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دوں کہ آپ چاہے خدا کے نیک بندے کو کچھ دیں یا نہ دیں لیکن ہمارے بندے کو ضرور کچھ دے دیں ورنہ آپ کا دن واقعی بہت بھاری ہو جائے گا۔

جلاد مسیحا

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مسیحائی کرتے کرتے جب اس کے اپنے دل پر زخموں کے نشان ثبت ہوئے تو وہ انتہائی بے خبری کے عالم میں جلاد بن بیٹھا... ”اے عشق ترا تو نام برا... آغاز برا انجام برا“ کے مترادف دل کی لگن جب ناامیدی کا شکار ہوئی تو ناگن کا روپ دھار بیٹھی... اور پھر دھیرے دھیرے اس کی رگوں میں شیطانیت کا زہر پھیلتا چلا گیا۔

رستوں کے انتخاب میں منزل کا پتا کھو دینے والوں کی روداد

نوراں کو جب یہ پتا چلا کہ زمیندار عارب خان مر گیا تو وہ خوشی سے نہال ہو گئی، اس کا باپ سوڈھل بھی عارب خان کی موت پر خوش تھا، مگر جانے کیوں نوراں کو باپ کی خوشی سے نفرت محسوس ہوئی تھی، شاید اس لیے کہ وہ جانتی تھی اس کا باپ زمیندار عارب خان کی موت سے زیادہ کسی اور ہی تصور سے خوش ہو رہا تھا، البتہ نوراں کی بوڑھی ماں نے خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے اپنی بیٹی نوراں کو گلے سے لگا لیا تھا۔

نوراں جانتی تھی کہ اس کا باپ سوڈھل اب اسے

پھر کسی اور اپنے جیسے بڈھے کے پلے باندھنے کی فکر میں لگ جائے گا، کیونکہ ان بوڑھے گدھوں سے ایک خطیر رقم ملنے کی امید زیادہ ہوتی تھی۔ لالچ اور حرص وطمع نے نوراں کے باپ کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ نوراں کے لیے وہ اذیت ناک دن تھا جب اس کے لالچی باپ سوڈھل نے اس کا رشتہ بڈھے زمیندار عارب خان سے بہ عوض نقد رقم دو لاکھ میں طے کر دیا تھا۔ وہ جیسے زندہ درگور ہوگئی، اس کی ماں کو بھی بیٹی کے دکھ کا احساس تھا۔

نوراں کڑھتے دل کے ساتھ سوچا کرتی تھی کہ کیا غربت اور مفلسی انسان کو اتنا بے حس اور بے غیرت بنا دیتی ہے کہ باپ اپنی بیٹی کی خوشیوں کو بھی لائق اعتنا نہیں سمجھتا اور لالچ میں اندھا ہو کر ایک بڈھے سے اپنی جوان بیٹی کو محض اس لیے نتھی کر دینا چاہتا ہے کہ اس سے ''عوضانہ'' بھاری یا زیادہ ملنے کی توقع ہوتی ہے۔

زمیندار عارب خان سے ابھی نوراں کی شادی نہیں ہوئی تھی، البتہ بات ضرور طے ہو چکی تھی اور چند روز میں وہ اس کی دلہن بن کر اس کے حویلی نما مکان میں رخصت ہونے والی تھی کہ اس سے قبل ہی اچانک عارب خان کا انتقال ہو گیا۔

زمیندار عارب خان کس طرح مرا تھا، یہ ایک گمبھیر راز تھا جو صرف نوراں جانتی تھی یا پھر...... ڈاکٹر رحیم داد۔

رحیم داد ایک نوجوان اور غیر شادی شدہ ڈاکٹر تھا، وہ اس گوٹھ نور خان کی ایک سرکاری ڈسپنسری میں جسے ''بنیادی صحت مرکز'' بھی کہا جاتا ہے، انچارج میڈیکل آفیسر تھا اور صبح سے دوپہر دو بجے تک مریض دیکھا کرتا تھا۔

ایک لمحے کو نوراں کے دل میں خیال آیا کہ وہ ابھی جا کر ''ڈاکدر بابو'' ...... کو یہ خوش خبری سنا ڈالے مگر پھر اچانک ایک خیال کے تحت وہ چونک گئی، دل کے کسی تاریک گوشے میں ایک خیال سوجھا تھا، تب اس نے پھر ڈاکدر بابو یعنی...... رحیم داد سے نہ ملنے...... بلکہ ہمیشہ کے لیے اس سے رابطہ نہ رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ البتہ اس نے جلدی سے سر پر اینڈوا دھرا اور مٹکا سنبھالے پانی بھرنے کنویں پر جا پہنچی۔ وہ یہ خوشخبری اب صرف اور صرف سائیں داد کو سنانا چاہتی تھی، اسے یقین تھا کہ وہ چاولوں کے کھیت میں اس کا ہی بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا ہوگا۔

☆☆☆

یہ ایک ماہ پہلے کی بات تھی۔

سفید رنگ کی سوزوکی مہران کار شہر سے بائیس کلومیٹر کا سفر طے کرنے کے بعد پختہ سڑک چھوڑ کے دائیں جانب کے قدرے نشیبی کچے راستے پر اتر گئی، یہاں سے بہ مشکل نصف کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ بائیں جانب وسیع وعریض احاطے پر ایک زنگ آلود لوہے کا محرابی گیٹ نظر آ گیا جس کی پیشانی پر اڑے اڑے لفظوں میں ''بنیادی صحت مرکز، گوٹھ نور خان'' تحریر تھا۔ کار گیٹ سے اندر داخل ہو گئی اور ایک مستطیل نما پیلی رنگت کی سالخوردہ عمارت کے سامنے رک گئی، کار کے رکنے کی دیر تھی، عمارت جو ایک سرکاری ڈسپنسری یعنی Basic Health Unit (B.H.U.) تھی، کے اندر سے دو افراد معمولی سی شلوار قمیص میں ملبوس تیزی سے باہر دوڑے، تب تک کار کی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کے ایک پینتیس چھتیس سالہ شخص برآمد ہو چکا تھا، وہ دراز قامت تھا، شانے چوڑے اور آنکھوں میں خاص چمک تھی، چہرے پر گھنی مونچھیں اور رنگ سانولا تھا، یہ ڈاکٹر رحیم داد تھا۔

ڈاکٹر رحیم داد نے سات آٹھ سال پہلے چانڈکا میڈیکل کالج (اب یونیورسٹی) لاڑکانہ سے ایم بی بی ایس کیا تھا، جبکہ ایک سال ہاؤس جاب اس نے ڈاؤ میڈیکل کالج اینڈ اسپتال (اب یونیورسٹی) میں کیا تھا، ایک سال بعد مزید ایک سال آنریری اس نے مختلف بیماریوں کے وارڈز میں تین تین ماہ کام کیا تھا تاکہ اسے مختلف بیماریوں کے بارے میں معلومات حاصل ہو جائے اور واپس اپنے شہر جا کے کسی قریبی گوٹھ وغیرہ میں ذاتی پریکٹس کامیابی سے چلا سکے۔

یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ آنریری طور پر مزید ایک سال ہاؤس جاب کے مکمل ہوتے ہی سندھ پبلک سروس کمیشن کی جانب سے میرٹ پر ڈاکٹروں کی بہ طور میڈیکل آفیسرز کی اسامیوں کا اخبار میں اعلان کیا گیا تو ڈاکٹر رحیم داد نے بھی گورنمنٹ جاب کے لیے درخواست جمع کرا دی۔

یہ ایک بڑا تکلیف دہ المیہ ہے کہ ہر سال ملک میں لاکھوں کی تعداد میں مختلف بلکہ بھانت بھانت کے میڈیکل کالجز سے نوجوان ڈاکٹر بن کے نکلتے ہیں، مگر سرکاری جاب کے لیے کمیشن میں اسامیوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے۔ اصولاً تو اسے ہر سال اناؤنس ہونا چاہیے مگر وہ چار، پانچ سال بعد اور کبھی تو اس سے بھی زیادہ عرصے بعد اناؤنس ہوتی بھی ہیں تو ان میں خالی اسامیوں کی تعداد پانچ چھ سو ہوتی ہے جبکہ اتنی قلیل اسامیوں کے لیے لاکھوں کی تعداد میں درخواستیں پبلک سروس کمیشن کو موصول ہوتی ہیں۔

بہرطور...... ڈاکٹر رحیم داد نے شروع ہی سے بڑا ''شارپ'' ذہن پایا تھا، تھوڑے سمجھانے پر وہ بہت زیادہ

سمجھ لیتا تھا، لہٰذا اس نے پہلے ہی سال میں کمیشن کا امتحان پاس کر لیا اور یوں اس کی تعیناتی اپنے ہی شہر جو اندرون سندھ میں واقع تھا، کے ایک قریبی گوٹھ نور خان کی سرکاری ڈسپنسری میں بہ طور انچارج میڈیکل آفیسر کے ہو گئی۔

ڈاکٹر رحیم داد کا باپ ایک چھوٹی سطح کا زمیندار تھا، تاہم گھرانا خوش حال اور تعلیم یافتہ تھا۔ رحیم داد کی ایک بہن بھی تھی جس کی شادی ہو چکی تھی اور وہ دوسرے شہر میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ خوش تھی۔

ڈاکٹر رحیم داد کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔

بہرطور...... مذکورہ دو آدمی ڈسپنسری کے عملے سے ہی تعلق رکھتے تھے، ایک نے ڈاکٹر سے گاڑی کی چابی لی تاکہ گاڑی کو دوسری جانب پارک کر سکے، جبکہ دوسرے نے عقبی سیٹ سے ڈاکٹر کا مختصر سامان اٹھا لیا۔

ڈاکٹر رحیم داد کھڑکھڑاتے ہوئے رائونسلک کی بیش قیمت کاٹن شلوار قمیص میں بارعب انداز میں چلتے ہوئے اندر اپنے کمرے میں آ کر بڑی سی ریوالونگ چیئر پر براجمان ہو گیا۔

باہر برآمدے میں مریضوں کا بے تحاشا رش تھا۔ ڈاکٹر سمیت عملے کے چار افراد تھے۔ ایک ڈسپنسر تھا، جس نے آ کر ڈاکٹر سے ہاتھ ملایا تھا۔ سامان کا بیگ لانے والا آدمی اب دروازے پر رکھے اسٹول پر بیٹھا تھا اور ایک ایک مریض اندر بھیجنے لگا۔

اللہ نے ڈاکٹر رحیم داد کے ہاتھ میں بڑی شفا دی تھی۔ اردگرد قریب کے گوٹھوں سے بھی کئی لوگ بہ غرض علاج یہاں آتے تھے، اس طرح بڑے بڑے زمیندار اور وڈیرے بھی اس سے علاج کرواتے تھے، بلکہ اسے اپنی حویلی بلاتے تھے یا اوطاق میں، یوں اس کے بااثر وڈیروں سے بھی تعلقات استوار ہو گئے تھے، جو اس کی بہت عزت کرتے تھے، مگر یہ ان سے دور ہی رہنے کی کوشش کرتا تھا، سمجھتا تھا ان کی نہ دوستی اچھی نہ دشمنی، تاہم ان سے بنا کر رکھنا اس کی مجبوری تھی۔

ڈاکٹر رحیم داد ایک انسان تھا، مگر انسان ہونے کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ انسانیت کے مروجہ اصولوں کو اپنی رنگین مزاجی پر تیاگ دیتا۔ وہ فطرتاً رنگین مزاج تھا۔ مگر یہ غلط ہے کہ ہم ہر شے فطرت کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں، انسانی نفسیات بھی کوئی چیز ہوتی ہے، اس کے اندر بھی ایک نفسانی ''کجی'' تھی۔ صنفِ مخالف کو دیکھتے ہی اس کے دل کی دھڑکنیں یکلخت تیز ہونے لگتی تھیں۔ شاید یہ بھی کوئی خاص بات نہ ہو، کیونکہ ایسا ہر مرد کے ساتھ ہوتا ہے، یہاں انسان کی داخلی فطرت حرکت میں آتی ہے۔ فطرت کا اچھا انسان اپنے ضمیر کو کھونے نہیں دیتا، بدفطرت اپنے ضمیر کو کھلونا بنا کر کھیلتا ہے، اس سے حظ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ یہ اس کی نفسیاتی کمزوری بن جاتی ہے۔

خیر...... وہ مریض دیکھتا رہا، ان کا تفصیلی معائنہ بھی کرتا رہا، مگر یہ تفصیلی ''معائنہ'' وہ عموماً جوان عورتوں اور لڑکیوں کا کرتا تھا۔ گوٹھ کی بے چاری سیدھی سادی عورتیں اس معائنے کا مطلب سمجھتی ہوں یا نہیں مگر وہ اس کے علاج سے بھلی چنگی ضرور ہو جاتی تھیں، یہی علاج اگر وہ شہر جا کے مہنگے ڈاکٹروں سے کرواتیں تو دس دن ان کے گھر کا چولہا نہیں جلتا تھا مگر جب یہی سہولت مفت میں اور وہ بھی ان کے گھر سے دو قدم کے فاصلے پر موجود تھی تو بھلا ان بے چاریوں کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟

ایسے ہی ایک تفصیلی معائنے کے دوران نوراں سے اس کا واسطہ پڑ گیا تھا۔

نوراں شاید وہ واحد لڑکی تھی جسے ایک نگاہ دیکھتے ہی ڈاکٹر رحیم داد کا دل پہلی بار بجائے تیزی سے دھڑکنے کے یکدم جیسے رک گیا تھا۔ ایسا تب ہوتا ہے جب کوئی اپنی دل پسند شے دیکھ لے، نوراں اس کے لیے ایک ایسے ہی جامع اور مکمل حسن کی حامل لڑکی تھی، وہ جوان تو تھی ہی مگر حسن وشباب کا بھی مرقع تھی۔ صورت خوب تھی، رنگ ایسا صاف اور گورا تھا جیسے دودھ میں گلاب رنگ ملا دیا ہو، سرو قد تھی۔ بھرے بھرے ادھ کھلے ہونٹ اور بھی غضب ڈھا رہے تھے، سینے پر ناگن کی طرح جھولتی ہوئی گھنے بالوں کی دو چوٹی گویا خزانے کی حفاظت پر مامور محسوس ہوتی تھیں۔ اس کے غیر معمولی وجود پر بہت معمولی لباس تھا۔

وہ اس وقت اپنی بوڑھی ماں کے ہمراہ آئی تھی۔

پل کے پل...... ڈاکٹر رحیم داد نے اپنے پروفیشن کو دیکھتے ہوئے خود کو سنبھالا اور پھر اپنی نظروں کے اشتیاق کے تاثر کو یکلخت گہری اور بے نیاز ظاہر کرنے والی متانت میں بدلتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''ہاں بابا! کیا تکلیف ہے تیرے کو؟''

نوراں جب بولی تو رحیم داد کو یوں لگا جیسے تھر کے صحرا میں کوئی کوئل کوک رہی ہو۔

''مجھے دو دن سے کھانسی اور بخار ہے۔''

ڈاکٹر کی میز کے دائیں جانب ایگزامنیشن کوچ رکھا تھا، ڈاکٹر رحیم نے اسے وہاں لیٹ جانے کو کہا۔ مریضوں کے لیے یہ بات طمانیت کا باعث ہوتی تھی کہ ڈاکٹر واقعی توجہ

If you want to download Urdu novels,Imran series, Monthly Digests,Shuaa,Kiran,Khwateen Digest,Suspense digest, Vist
www.paksociety.com
if site is not opening send complaint at
admin@paksociety.com
or at
0336-5557121

سے انہیں دیکھ رہا ہے۔ نوراں کے اسٹول سے کھڑے ہونے سے لے کر کوچ پر لیٹنے تک کے عمل کا ڈاکٹر رحیم داد کی نظروں نے ایکسرے لیا تھا اور جب اس نے معائنہ شروع کیا تو فوراً ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ نوراں ان عورتوں میں سے نہیں تھی جو سپر ڈال دیتی ہیں۔ رحیم داد نے بھی اپنی دست درازی روک دی اور نوراں کو اترنے کا کہا۔ نوراں بڑی شاکی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی

ڈاکٹر رحیم داد نے اسے نسخہ لکھ دیا اور کہا ڈسپنسری کے اسٹور سے دوا لے لے اور ساتھ ہی نوراں کے بجائے اس کی بوڑھی ماں کو اسے پانچ روز تک بلاناغہ لانے کی بھی تاکید کر دی، ساتھ ہی نوراں کی معمولی بیماری کو خطرناکی میں بدل جانے کے سلسلے میں بھی ڈرایا، تاکہ اگر نوراں نہ بھی آنا چاہے تو اس کے گھر والے اسے زبردستی علاج کے لیے بھیجتے رہیں۔

دوسرے روز بھی یہی کچھ ہوا۔ تیسرے روز رحیم داد نے نوراں سے موقع پاتے ہی مقصد کی بات کہہ ڈالی۔ اتفاق سے اس روز وہ کسی چھوٹے بچے کے ساتھ آئی تھی۔

''نوراں! تو مجھے اچھی لگتی ہے۔''

عورت چاہے پڑھی لکھی ہو یا ان پڑھ جاہل لیکن خدا نے اسے نظر شناس حس سے یکساں نوازا ہوتا ہے، نوراں بھی ان پڑھ تھی مگر وہ پہلے ہی روز سے ڈاکٹر رحیم داد کی فطرت سے آگاہ ہوگئی تھی تاہم بولی۔ ''میں آپ کو اچھی لگتی ہوں، مگر مجھے کوئی اور اچھا لگتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں، مگر ہم دوست تو بن سکتے ہیں ناں؟''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے ڈاکدر سائیں!'' نوراں نے اس کی طرف دیکھا۔

ڈاکٹر رحیم داد کی نظریں اسے بہ دستور اپنے جسم کا ایکسرے کرتی محسوس ہوئی تھیں۔ رحیم داد نے ایک گہری سانس لی پھر کسی خیال کے تحت پوچھا۔ ''کیا تم اس سے محبت کرتی ہو؟ اس سے شادی کرنا چاہتی ہو؟''

''ہاں۔'' نوراں کے لبوں سے بے اختیار نکلا اور وہ شرما سی گئی، مگر پھر رخصت ہونے کے لیے اسٹول سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ رحیم داد نے اس کا نرم و گداز ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے گدرائے ہوئے ہاتھ کے لمس سے رحیم داد کے پورے وجود میں یکلخت بجلی کی سنسنی دوڑ گئی تھی، اس نے مغلوب الہوس ہو کے نوراں سے تھوڑی جسارت کرنا چاہی۔ اس کا خیال تھا، اتنا تو یہ گوٹھ کی معمولی جاہل لڑکی کرنے دے گی ہی مگر نوراں یکدم پیچھے ہٹ گئی اور بڑی نفرت بھری نظروں سے ڈاکٹر رحیم داد کو گھورنے لگی۔ اس کے بعد غصے سے لال سرخ ہو کے کمرے سے نکل گئی۔ ڈاکٹر رحیم داد تھوڑا گھبرا گیا۔ اسے بالکل توقع نہ تھی کہ نوراں اسے اس طرح نفرت خیز انداز میں دھتکار دے گی، اب وہ ڈر سا رہا تھا کہ کہیں وہ اس کی کسی سے شکایت نہ کردے۔

تھوڑے دن بیت گئے، مگر ایسا کچھ نہ ہوا، البتہ نوراں بھی دوبارہ نہ لوٹی۔

کچھ دن اور بیت گئے۔

دن کا ایک بج رہا تھا، اس وقت مریض کم ہی ہوتے تھے، ڈاکٹر رحیم داد...... نوراں کی طرف سے مایوس ہوگیا تھا، اس نے نوراں کو اپنے نفسانی جذبات کی تسکین کا ذریعہ بنانا چاہا تھا مگر اس نے بری طرح رحیم داد کو دھتکار دیا تھا، البتہ اس وقت رحیم داد کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے نوراں کو اور وہ بھی اکیلے اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ ڈاکٹر رحیم داد یہی سمجھا کہ وہ پھر بیمار ہوگئی تھی، مگر تنہا آنا...... یہ بات اسے ہضم نہ ہوسکی تھی۔

''اب کیا تکلیف ہوگئی ہے تمہیں؟'' ڈاکٹر رحیم داد نے اس بار دانستہ کسی اشتیاق کا مظاہرہ کیے بنا اس سے پوچھا۔ نوراں کا سر تھوڑا جھکا ہوا تھا، جیسے وہ کسی کشش و پنج کا شکار ہو۔ رحیم داد کی نظریں اب اور طرح سے بہ غور نوراں کے چہرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ کسی خیال کے تحت اس کا دل یکبارگی دھڑکا بھی تھا۔ ''شاید کوئی ضرورت نوراں کو اس کے پاس کھینچ لائی ہو؟'' اس نے سوچا۔

''ڈاگدر بابو! آ...... آپ سے ایک بات کہنی تھی۔'' نوراں اس کے قریبی اسٹول پر براجمان ہوتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

''ہاں بولو! کیا بات ہے؟''

''میرا...... بیاہ ایک بڈھے زمیندار عارب خان سے ہونے والا ہے۔'' اس نے بتایا۔ اس کی بات پر رحیم داد الجھ کر بولا۔

''کیا کہا؟ تیرا بیاہ اس بڈھے عارب خان سے ہو رہا ہے؟ مگر...... تو نے تو کہا تھا کہ تو کسی اور کو پسند......''

''جھوٹ بولا تھا میں نے۔'' نوراں جلدی سے بولی۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ اس وقت کوئی اور مریض نہ تھا، اردلی ڈاکٹر سے اجازت لے کر تھوڑی دیر کے لیے اپنے قریب واقع گھر گیا ہوا تھا۔ دوسرا چپڑاسی، ڈسپنسری روم میں کمپاؤنڈر کے ساتھ گپ شپ میں مصروف تھا۔

''دو لاکھ کے عوضانے پر میرے لالچی باپ نے میرا

رشتہ...... اس بڈھے زمیندار عارب خان سے کر دیا ہے، بہت جلد وہ اس سے میری شادی بھی کرنے والا ہے۔''

''یہ تو واقعی بہت برا ہوا۔'' ڈاکٹر رحیم داد کو جیسے ہی اس کی مجبوری کا پتا چلا وہ اس کا ہمدرد بننے کی کوشش کرنے لگا۔

''ڈاگدر سائیں! میں آپ کو اچھی لگتی ہوں ناں، تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے ناں؟......'' وہ نگاہوں کی گھنیری چلمنیں اٹھا کر اس کی طرف تکتے ہوئے استفساریہ بولی۔

''ہاں!'' ڈاکٹر رحیم داد نے مختصراً کہا۔

''تو پھر......؟'' نوراں سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگی۔

''زمیندار عارب خان سے تیری پہلے جان چھڑانی ہوگی۔'' ڈاکٹر رحیم داد پرسوچ انداز میں بڑبڑایا۔

''ہاں!...... ہاں! ڈاگدر سائیں! مگر کیسے؟'' نوراں نے پرامید نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ کام میرے لیے بہت آسان ہے۔'' ڈاکٹر رحیم داد نے کسی غیر مرئی نقطے پر اپنی پرسوچ نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں بڑی سفاکانہ معنی خیزی تھی۔ تاہم پھر وہ پس منظر سے پیش منظر میں ابھرتے ہوئے نوراں سے بولا۔

''پر اس سے پہلے تجھے مجھ سے وعدہ کرنا ہوگا کہ......''

''مجھے سب منظور ہے ڈاگدر سائیں!'' نوراں جلدی سے بولی۔ ''بس تو میری کسی طرح اس بڈھے زمیندار عارب خان سے جان چھڑا دے پھر تو جیسا چاہے گا میں ویسے ہی کروں گی۔'' نوراں کی بات پر ڈاکٹر رحیم داد ریشہ خطمی ہونے لگا، اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر نوراں سے تھوڑی جسارت کرنا چاہی مگر نوراں نے اسے چھونے تک نہ دیا۔ پرے ہو کے بولی۔ ''پہلے میرا کام پھر تمہارا۔''

''میں تمہارا کام کردوں گا، فکر نہ کرو۔''

''مگر کیسے؟''

''سنو۔'' نوراں ذرا قریب ہوئی، وہ بتانے لگا۔

''سن! بہت آسان حل ہے میرے پاس تیرے اس مسئلے کا، لیکن اب چونکہ ہمارا مفاد مشترکہ ہے اس لیے میں تجھے اپنے منصوبے سے آگاہ کیے دیتا ہوں تاکہ تجھے بھی اس بات کا یقین ہو جائے کہ میں تجھے کتنا چاہتا ہوں۔'' اس کی بات پر نوراں دانستہ دلچسپ اور پراشتیاق نگاہوں سے اس کا چہرہ تکنے لگی۔ ''زمیندار عارب خان میرے ہی زیر علاج رہتا ہے اور اکثر علاج معالجے کے لیے مجھے اپنی اوطاق میں بھی بلاتا ہے، وہ شوگر کا مریض ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ بلا کا بدپرہیزی شخص بھی ہے اور میٹھا کھانے سے بالکل باز نہیں آتا حالانکہ میں نے اسے اس بیماری سے متعلق خوف زدہ بھی کیا تھا، بہرحال...... اس کا علاج میں ہی کر رہا ہوں۔ اسے بلڈ پریشر بھی رہتا ہے، وہ پھیکے اور بدمزہ پرہیزی کھانوں سے تنگ آیا ہوا ہے، فطرتاً وہ ایک پیٹو اور ندیدہ شخص ہے، اس کے گھر والوں کو بھی اس کا علم ہے کہ وہ اپنے علاج کے سلسلے میں کتنا بے پروا ہے۔ اس کی پہلے سے دو بیویاں ہیں اور ان سے اس کے جوان بچے بھی ہیں۔'' وہ ذرا رکا تو نوراں نے پوچھا۔

''مگر تم اسے ہلاک کیسے کرو گے؟'' کیا پستول یا خنجر کا استعمال کرو گے؟ پھر پکڑے نہیں جاؤ گے تم؟''

اس کی بات پر ڈاکٹر رحیم داد کے ہونٹوں پر بڑی اسرار بھری اور سفاک مسکراہٹ رقصاں ہوگئی، پھر جب اس نے نوراں کو اپنے منصوبے کے آخری حصے سے آگاہ کیا تو بے اختیار وہ سرتاپا لرز اٹھی۔ بے شک زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے مگر اس دن کے بعد نوراں کو احساس ہوا کہ ایک ڈاکٹر بھی اپنے مریض کی زندگی سے اس طرح کھیل سکتا ہے۔

''وہ اسی طرح بدپرہیزی کرتا رہے گا اور میں اس کی شوگر کم کرنے والی گولیوں کی ڈوز کم کرتے کرتے بالکل ختم کردوں گا، بس صرف اتنا ہی تو مجھے کرنا پڑے گا جو بالآخر اس کے لیے سم قاتل ثابت ہوگا۔''

''مگر ڈاگدر بابو! اس طرح کہیں دیر نہ ہو جائے...... نجانے وہ کب مرے اور میرا اس سے بیاہ بھی ہو جائے گا۔''

نوراں مطمئن نہ ہوئی تو ڈاکٹر رحیم داد بولا۔ ''تو پگلی ہے، یہ بات میں بھی سمجھتا ہوں، سن غور سے میری بات...... شوگر کم کرنے والی گولیاں اب اس پر اثر نہیں کرتی ہیں، اس لیے مجھے خود اسے شوگر کم رکھنے والے ٹیکے لگانے پڑتے ہیں جسے انسولین کا ٹیکا کہا جاتا ہے، مگر اب میں اسے انسولین کا ٹیکا لگانے کے بجائے کونین کا ٹیکا لگایا کروں گا، بڑھی ہوئی شوگر کے مریضوں میں کونین کا ٹیکا جو عام طور پر ملیریا کی بیماری میں لگایا جاتا ہے۔ دو ایک روز میں ہی اچانک موت کی نیند سلا دیا کرتا ہے۔'' نوراں اب مطمئن ہوگئی۔

ڈاکٹر رحیم داد کی یوں بھی پورے گوٹھ میں علاج معالجے کے سلسلے میں اچھی شہرت تھی، اس کے ہاتھ میں بہت شفا تھی۔ مریضوں کا اس پر اتنا اعتماد قائم ہو چکا تھا کہ اگر وہ زہر بھی دیتا تو مریض اسے دوا سمجھ کر پی جاتے۔

بہرحال...... ڈاکٹر رحیم داد نے ایک مسیحا کے روپ

میں جلاد بن کر عارب خان کے ساتھ سفاکی اور خاموش موت کا کھیل کھیلنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ ایک روز عارب خان کا اچانک انتقال ہو گیا۔ لہٰذا اب زمیندار عارب خان کی اچانک موت کا راز صرف ڈاکٹر رحیم داد کو معلوم تھا یا پھر نوراں کو......

☆☆☆

نوراں کا مقصد پورا ہو چکا تھا، اس لیے اس نے اب دوبارہ ڈاکٹر رحیم داد کی صورت تک نہ دیکھی، نہ ہی کبھی اس سے ملنے کا ارادہ کیا، وہ تو محض اپنے مطلب کی خاطر اسے بے وقوف بنا کے استعمال کر رہی تھی، پھر بھلا دوبارہ اس سے رابطہ کیوں کرتی۔

ادھر ایک روز سائیں داد کا باپ اور ماسی زلیخا سائیں داد کے لیے نوراں کا ہاتھ (رشتہ) مانگنے کے لیے اس کے گھر آ گئے مگر حسب توقع نوراں کے لالچی باپ سوڈھل کی لالچی فطرت آڑے آ گئی اور اس نے انہیں نوراں کے سنگ (رشتہ) کے عوض اتنی بھاری رقم بتائی کہ وہ دونوں بے چارے اپنا سا منہ لے کر واپس لوٹ گئے۔

نامساعد حالات انسان کی فطرت پر اپنے اثرات ضرور مرتب کرتے ہیں۔ ایسے ہی نوراں کے اندر بھی سرکشی جاگ اٹھی تھی اور تب ایک دن نوراں نے ماں کے ذریعے باپ سے صاف صاف یہ بات کہلوادی کہ وہ شادی کرے گی تو صرف سائیں داد سے ورنہ زہر کھا کر مر جائے گی۔ پھر لے لینا عوضہ میری لاش کا......

باپ سوڈھل نے یہ سنا تو چراغ پا ہو گیا مگر نوراں کی ماں نے اسے اس کی لالچی فطرت کو سامنے رکھتے ہوئے چالاکی سے سمجھایا۔

''نوراں کے پیو! جوش سے نہیں ہوش سے کام لے۔ ایک بیٹی کے حال دل سے ماں کے سوا اور کوئی واقف نہیں ہوتا۔ ایسا نہ ہو کہ نوراں واقعی خودکشی کر لے۔ ایسے میں تیرے پاس سوائے رسوائی کے کچھ نہیں رہے گا۔ سائیں داد کا پیو نوراں کے سنگ کا اچھا خاصا عوضانہ دے تو بے شک وہ عارب خان کے مقابلے میں کم ہے، مگر یہ بھی تو سوچ اگر خدانخواستہ نوراں نے خودکشی کر لی تو یہ بھی تیرے ہاتھ سے چلا جائے گا۔'' بیوی کی بات پر سوڈھل پہلی بار کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا اور بالآخر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد سائیں داد اور نوراں کا رشتہ طے ہو گیا۔

☆☆☆

نوراں اور سائیں داد ایک دوسرے کو پا کر نہال ہو گئے تھے، کبھی سوچا بھی نہ تھا انہوں نے کہ تقدیر اس طرح بھی ان پر مہربان ہوگی اور دو پیاسے دلوں کو ان کی منزل پر پہنچا دے گی۔

یہ نوراں کی سائیں داد سے شادی کے کوئی دو مہینے بھر بعد کا ذکر تھا کہ سائیں داد اچانک بیمار پڑ گیا۔ اس کی بیماری پر پہلے تو گھریلو قسم کے دیسی ٹوٹکے آزمائے جاتے رہے مگر افاقہ نہ ہوا، بیماری بڑھی تو ڈاکٹر یاد آنے لگا۔ مگر...... نوراں نہیں چاہتی تھی کہ اس کے محبوب شوہر سائیں داد کو گوٹھ کے واحد ڈاکٹر رحیم داد کے پاس لے جایا جائے لیکن جب سائیں داد کی حالت مزید بگڑنے لگی تو نوراں سمیت سب پریشان ہو گئے۔ سائیں داد کا باپ بالآخر اسے ایک دن صبح ڈاکٹر رحیم داد کے پاس لے جانے کے لیے تیار ہونے لگا تو نوراں لرز گئی اور سامنے آ کے بولی۔

''بابا! اسے ڈاکٹر رحیم داد کے پاس نہ لے جا...... ایسا کرتے ہیں، سائیں داد کو شہر کے کسی وڈے ڈاکٹر کو دکھا دیتے ہیں۔'' سائیں داد کا باب مٹھل بہو کی بات پر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے یقیناً نوراں کی بات کچھ عجیب لگی تھی، تاہم وہ بولا۔

''نہیں دھیے! یہ اپڑاں ڈاگدر رحیم داد بھی وڈا چنگا ڈاگدر ہے، شہر جانے کی ابھی ضرورت نہیں۔'' یہ کہہ کر مٹھل، سائیں داد کو سہارا دے کر باہر بیل گاڑی میں سوار کرانے لگا۔

اس دوران کئی رشتے دار بھی جمع ہو گئے تھے، نوراں کا دل انجانے خدشات اور تفکر آمیز الجھن میں جکڑا ہوا تھا۔ نوراں انہیں بھلا کیا بتاتی...... کہ سائیں داد کو ڈاکٹر رحیم داد

انتباہ
سسپنس ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع ونقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ادارہ کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

If you want to download Urdu novels,Imran series, Monthly Digests,Shuaa,Kiran,Khwateen Digest,Suspense digest, Vist www.paksociety.com
if site is not opening send complaint at admin@paksociety.com
or at
0336-5557121

کے پاس مت لے جاؤ، وہ...... وہ...... ایک مسیحا کے روپ میں جلاد ہے...... لیکن پھر...... نوراں کو یہ بھی بتانا پڑتا کہ اسے ایک مسیحا سے جلاد بننے کی ترغیب کس نے دی تھی۔

نوراں بے بس اور مجبور تھی، سائیں داد کو ڈاکٹر رحیم داد کے پاس بہ غرض علاج نہ لے جانے کا نوراں کے پاس کوئی معقول جواز ہی نہ تھا۔

جانے کیوں نوراں کو اسی بات کا خدشہ تھا کہ ڈاکٹر رحیم داد، سائیں داد کے ساتھ بھی وہی سلوک کرسکتا تھا جو اس نے زمیندار عارب خان کے ساتھ کیا تھا یعنی علاج کی آڑ میں مریض کو دھیرے دھیرے موت سے ہمکنار کرتا۔ لہٰذا جب وہ بہ دستور جنونیوں کے سے انداز میں اپنے محبوب شوہر سائیں داد کو ڈاکٹر رحیم داد کے پاس نہ لے جانے پر بضد رہی تو سب کو اس کی عجیب سی دیوانگی پر بے تحاشا غصہ آ گیا۔ ایک رشتے دار عورت نے نوراں کو سختی سے سرزنش بھی کر ڈالی۔

''اڑی چھوکری چری ہوگئی ہے کیا؟ اسے ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں لے جانے دے رہی ہے؟ کیا تو اپنے شوہر کی جان کی دشمن ہوگئی ہے؟'' اس نے ایک ایسا چبھتا ہوا سوال کیا تھا جس کا جواب بڑا روح فرسا تھا۔ کم از کم نوراں کے لیے تو ضرور خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ بہرطور سائیں داد کو بیل گاڑی میں ڈال کر ڈسپنسری لے جایا گیا۔ نوراں بھی سائے کی طرح سائیں داد کے ساتھ تھی۔ اس کا دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ ڈاکٹر رحیم داد کا نوراں سے سامنا ہوا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ اور سپاٹ تھا مگر اس نے ایک بھرپور، گہری اور اسرار بھری نگاہ متوحش کھڑی نوراں کے چہرے پر ڈالی تھی، جبکہ نوراں کو صرف ایک ثانیے کے لیے یہ محسوس ہوا تھا کہ ڈاکٹر رحیم داد کے ہونٹوں پر استہزائیہ سی سنگین مسکراہٹ ابھر کے غائب ہوگئی تھی۔ نوراں کی ہراساں نظریں اس کے بھیدوں بھرے خاموش چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ سمجھ سکتی تھی کہ ڈاکٹر رحیم داد کے بہ ظاہر خاموش چہرے کے پیچھے کیسا خوفناک طوفان چھپا ہوسکتا تھا۔

ڈاکٹر رحیم داد...... خاموشی اور انہماک کے ساتھ سائیں داد کا معائنہ کرتا رہا پھر ذرا دیر بعد اس نے بیمار سائیں داد کو ایک کمرے میں لے جا کر لٹانے کا کہا۔ نوراں یک دم بے چین سی ہوگئی، مگر سردست وہ کچھ کہنے کی ہمت نہ کر پائی کیونکہ شاید اسے بہ خوبی اس بات کا اندازہ تھا کہ اگر اس نے پھر وہی حرکت کی تو اس کا سسر مشغل اور اس کے رشتے دار اس بار آپے سے باہر ہوجائیں گے اور پھر کوئی بعید نہیں کہ وہ لوگ نوراں کو پاگل گردان کر نکال باہر کرتے۔

جبکہ نوراں اس وقت کسی قیمت پر بھی اپنے محبوب شوہر سائیں داد سے دور نہیں ہونا چاہتی تھی۔

ادھر سائیں داد کو دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔

چونکہ یہ چھوٹا سا سرکاری اسپتال تھا۔ سالخوردہ سی محدود عمارت میں تین کمرے تھے، ایک ڈاکٹر کے کمرے کو ملا کر ڈسپنسری روم اور وارڈ نام کا تیسرا کمرا تھا۔

اسپتال میں صرف ایک کمپاؤنڈر اور دوسرا چپراسی تھا۔ یہ لوگ وارڈ نما کمرے میں سائیں داد کو لے کر آ گئے۔ سائیں داد کو بستر پر لٹا دیا گیا۔ اتنے میں ڈاکٹر رحیم داد بذات خود انجکشن بھر کے کمرے میں آیا اور صاحب فراش سائیں داد کی طرف بڑھا۔

''یہ...... یہ...... کون سا انجکشن لگا رہے ہو تم سائیں داد کو...... ڈاگدر بابو......؟'' نوراں نے یکدم گھبرا کے پوچھا۔ انجانا خوف اس کی آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔ ڈاکٹر رحیم داد نے ایک عجیب سرد مہری سے نوراں کی جانب دیکھا مگر بولا کچھ نہیں، اس کی خاموشی اور اسرار بھری نظروں میں نوراں کو عجیب سی سنگین چمک محسوس ہوئی تھی۔

''اڑی نوراں! تو چری تو نہیں ہوگئی ہے۔ جا یہاں سے۔'' مشغل نے اسے ڈپٹا۔ ڈاکٹر رحیم داد، سائیں داد کو انجکشن لگانے کے لیے جھکا۔ نوراں ہسٹریائی انداز میں ڈاکٹر پر جھپٹی مگر اسے لوگوں نے پکڑ لیا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ شوہر کی بیماری نے اسے پاگل کر دیا ہے، اسے زبردستی کھینچ کر باہر لے جایا گیا۔ نوراں چیختی چلاتی رہ گئی، بالآخر اس نے یہ بکنا شروع کر دیا۔

''یہ...... یہ...... ڈاکٹر نہیں ہے...... جلاد ہے...... یہ...... یہ...... قسائی ہے...... اس نے...... عارب خان کو مارا ہے...... اب...... اب یہ میرے شوہر کو بھی غلط ٹیکا لگا کے مارنا چاہتا ہے۔''

مگر لوگوں کو نوراں کی بات پر کیا اعتبار آنا تھا، وہ اسے پاگل ہی سمجھنے لگے۔

☆☆☆

پھر ایک روز عجیب واقعہ ہوگیا۔

سائیں داد تیزی سے بھلا چنگا ہوگیا۔ نوراں خوش بھی تھی اور حیران بھی۔ وہ اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ ڈاکٹر رحیم داد اس سے دھوکے اور وعدہ خلافی کا انتقام لے گا اور کسی طرح سے سائیں داد کو جانی نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا، مگر ایسا نہیں ہوا تھا مگر جانے کیوں نوراں کا دل پھر بھی

مطمئن نہیں ہوا تھا۔

ایک دن نوراں دوائی لینے کے بہانے اکیلی ڈاکٹر رحیم داد کے پاس جا پہنچی۔

باہر چمکیلی دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور اس وقت ڈسپنسری میں مریضوں کا رش بھی خلاف معمول کم ہی تھا۔ نوراں دانستہ آخری اوقات میں ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

وہ اسے دیکھ کر ذرا چونکا پھر خاموش مگر بھوکی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا جیسے وہ خود پہلے نوراں کے کچھ کہنے کا منتظر ہو۔

''ڈ......ڈاگدر بابو...... م...... میں...... تیرے سے معافی مانگنے آئی ہوں۔'' نوراں نے لرزاں آواز میں کہا۔ اس نے ڈاکٹر کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

''کس بات کی معافی......؟'' ڈاکٹر رحیم داد نے کہا۔

''م...... میں نے...... تجھے دھوکا جو دیا تھا۔'' نوراں نے ہولے سے کپکپاتی آواز میں اس سے کہا۔ اس کی بات پر ڈاکٹر نے ایک طویل ہنکاری لی اور بولا۔

''ہاں......! یہ تو ہے...... تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تو جانتی ہے اچھی طرح کہ میں نے محض تیری خاطر ایک خون کیا۔''

نوراں اس کی بات پر چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں انجانے خوف کی جھلک مزید گہری ہوگئی تھی۔ اس نے بہ غور ڈاکٹر رحیم داد کا چہرہ دیکھا تو اندر سے بری طرح دہل گئی۔ اس کا چہرہ اندرونی جوش اور منتقمانہ جذبات سے سرخ ہورہا تھا۔ نوراں کو یہ اندازہ لگانے میں مطلق دیر نہ لگی کہ وہ اس کی دھوکا دہی اور وعدہ خلافی کو بھولا نہیں تھا۔

''تو...... تو...... میرے سائیں داد کو تو کچھ نہیں کہے گا ناں؟ اسے کسی طرح نقصان پہنچانے کی کوشش تو نہیں کرے گا ناں......'' نوراں نے اپنے خوف کے زیرِاثر اس سے ایک معصومانہ اور بے وقوفانہ سوال کیا۔

''ہاں! نوراں......! تجھے بھی تو آخر وعدہ خلافی کی سزا دینی ہے میں نے......''

دفعتاً ڈاکٹر رحیم داد نے شعلہ بار نظروں سے نوراں کی طرف دیکھ کر سفاکی سے کہا اور وہ سرتاپا لرز گئی۔ وہ پھر لرزا دینے والے لہجے میں نوراں سے مخاطب ہو کے بولا۔

''نوراں! تو جانتی ہے اچھی طرح کہ گوٹھ کے سب لوگ میرے علاج سے کتنے مطمئن ہیں، اگر کوئی مریض دوران علاج مر بھی جاتا ہے تو اسے میری غفلت کے بجائے قسمت کے کھاتے میں ڈال کر چپ سادھ لیتے ہیں، دیکھنا ایک دن تو...... میں تیرے سائیں داد کا بھی ایک دن اس بڈھے زمیندار عارب خان جیسا حشر کروں گا۔''

وہ زہریلی نظروں سے سامنے کھڑی لرزاں نوراں کو گھورتا رہا۔ وہ بے اختیار دہشت زدہ ہوکر سسک پڑی۔ کمرے کا ماحول ایکا ایکی سنگین ہوگیا تھا۔

''ن...... نہیں...... ڈاگدر بابو! میرے سائیں داد کو بخش دو...... میرے کیے کی سزا اس گریب کو مت دو۔ میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔'' نوراں نے گڑگڑا کر اس سے کہا۔

''ہاں! یہ تو نے ٹھیک کہا، تیری وعدہ خلافی کی سزا بھلا بے چارہ سائیں داد کیوں بھگتے...... یہ سزا تجھے بھگتنا پڑے گی اب۔'' ڈاکٹر رحیم داد نے سرسراتے لہجے میں کہا اور بہ دستور شیطانی مسکراہٹ سے اس کی طرف تکتے ہوئے مزید بولا۔ ''اگر تو نے میری بات مان لی تو میں نہ صرف تیرے سائیں داد کا پیچھا چھوڑ دوں گا...... بلکہ اس گوٹھ کے اسپتال سے میں اپنا تبادلہ کرا کے ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔''

وہ بات کیا تھی جو وہ نوراں کو ماننے کے لیے کہہ رہا تھا، یہ نوراں اچھی طرح جانتی تھی۔ نوراں یک ٹک ڈاکٹر رحیم داد کا چہرہ تکتی رہی، اس کی آنکھوں میں اس کے لیے بلا کی نفرت جھلک رہی تھی جبکہ ڈاکٹر رحیم داد بھی بدستور نوراں کو بھوکی نظروں سے گھورتا رہا۔

''کبھی نہیں، ایسا کبھی نہیں ہوسکتا......'' نوراں نے جیسے بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کہا اور واپس مڑ گئی۔

ڈاکٹر رحیم داد کے چہرے پر بڑی گہری مسکراہٹ رقصاں تھی۔

☆☆☆

ابھی چند ہی روز ہوئے تھے کہ گوٹھ میں گیسٹرو کا مرض پھیل گیا، جو دیکھتے ہی دیکھتے وبا کی صورت اختیار کر گیا۔ گیسٹرو کو وبا، تب کہا جاتا ہے جب وہ بچوں کے علاوہ بڑوں کو بھی متاثر کرنے لگتی جس میں دست الٹی کے بعد فوری موت واقع ہوجاتی ہے، اس کی شدت اس قدر ہوتی ہے کہ متاثرہ مریض کو ''ری ہائیڈریٹ'' کرنے کا موقع ہی نہیں مل پاتا۔

یہ مرض جب وبا کی صورت اختیار کر گیا تو پورا ڈسٹرکٹ متاثر ہوگیا۔ شہر تک کے اسپتالوں میں متاثرہ مریضوں کو رکھنے کی گنجائش نہ رہی، اسپتالوں کے احاطے اور برآمدے تک مریضوں سے بھر گئے۔

گوٹھ کے لوگ قریبی ڈسپنسریوں کا رخ کرنے لگے، شہر بھی جاتے مگر وہاں ان کا کوئی پرسان حال نہ ہوتا۔ گوٹھ نور خان بھی متاثر ہوا تھا۔ سب کو اپنے ڈاکٹر رحیم داد پر بھروسا تھا، یوں بھی اس خطرناک مرض میں مریض کو شہر لے جانے کی مہلت ہی نہ ملتی، دست الٹیوں کی وجہ سے جسم میں پانی کی کمی اس قدر ہوجاتی تھی کہ وہ بے چارا راستے میں ہی دم توڑ جاتا۔

سائیں داد کو بھی گیسٹرو ہوگیا تھا۔ گھر والے اسے ڈاکٹر رحیم داد کے پاس لے جانے لگے۔

''ن...... نہیں...... م...... میرے سائیں داد کی حالت زیادہ خراب ہے، اسے شہر کے وڈے ڈاکٹر کو دکھانا ہوگا۔'' نوراں ڈاکٹر رحیم داد کے نام پر دہل گئی۔

''پاگل ہے تو۔'' بوڑھے مشعل نے بہو کو ڈپٹا۔ ''شہر جانے کا وقت کہاں ہے؟ پھر آپڑاں ڈاگدر رحیم داد کم ہے کسی وڈے ڈاگدر سے، ہٹ پرے۔''

سائیں داد کی حالت واقعی خراب ہورہی تھی، دست الٹیوں کے باعث وہ بالکل پھیکا اور نڈھال پڑ گیا تھا۔ اس کے جسم میں پانی کی اس قدر کمی واقع ہوگئی تھی کہ اس کی کھال تک چپچپی ہورہی تھی، وہ خطرناک حد تک ''ڈی ہائیڈریشن'' کا شکار تھا۔

نوراں کو ڈاکٹر رحیم داد کی بے رحم گفتگو یاد آنے لگی۔

''اب کے چھوڑ رہا ہوں، آیندہ... نہیں چھوڑوں گا تیرے سائیں داد کو۔'' وہ لرز گئی۔ گھر والے سائیں داد کو بیل گاڑی میں ڈال کر لے جانے کی تیاری کررہے تھے، نوراں نے واویلا شروع کردیا۔ لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ اسے پھر دورہ پڑ رہا ہے۔

سائیں داد کو ڈاکٹر رحیم داد کے پاس لے جایا گیا۔ لرزاں نوراں بھی ہمراہ تھی، وہاں سائیں داد کو ڈرپ وغیرہ لگادی گئی تھی، انجکشن بھی دے دیے گئے تھے۔

''ڈاگدر سائیں! آپڑاں سائیں داد ٹھیک تو ہوجائے گا ناں؟'' مشعل نے ڈاکٹر رحیم داد سے پوچھا۔ نوراں بھی قریب کھڑی تھی اور بڑی شاکی نظروں سے ڈاکٹر رحیم داد کی طرف تکے جارہی تھی۔ جواباً رحیم داد نے لحہ بھر کو نوراں کی طرف دیکھا۔ نوراں کو ڈاکٹر رحیم داد کی اس لحاتی نظر میں پوشیدہ دھمکی کا تاثر صاف محسوس ہوا تھا۔

''چاچا مشعل! یہ بیماری بڑی خطرناک ہے، میں اپنی سی کوشش کررہا ہوں، آگے اللہ مالک ہے، اگر تم میرے علاج سے مطمئن نہیں ہو تو مریض کو شہر لے جاسکتے ہو۔''

ڈاکٹر رحیم داد نے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔ تو مشعل بولا۔ ''سائیں! اللہ نے آپ کے ہاتھ میں بہت شفا دی ہے، گوٹھ کے اور مریض بھی آپ کے ہاتھوں اس مرض سے شفا پاچکے ہیں، اب شہر کہاں لے جائیں؟ گریب کی حالت تو دیکھو۔''

''ٹھیک ہے، میں کوشش کررہا ہوں۔'' اس نے مختصراً کہا اور دوسرے مریض کی طرف متوجہ ہوگیا۔

نوراں کے اندر ہلچل مچی ہوئی تھی۔ خیالات کا ایک کا ایک جوار بھاٹا تھا جو اسے اتھل پتھل کیے دے رہا تھا۔ اس لیے گویا وہ ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے بھی گزر رہی تھی، اس کا تباہ حال ذہن ابتری کا شکار تھا، وہ سوچ رہی تھی، اس صورت حال میں ڈاکٹر رحیم داد کے پاس ہر قسم کا اختیار ہے، ایک مقدس پیشے کی آڑ میں وہ اس وقت اپنی دھمکی، اپنے انتقام کو عملی جامہ پہنانے کا پورا پورا اختیار رکھتا ہے، بہرطور...... نوراں اپنے صاحب فراش محبوب شوہر سائیں داد کے پاس موجود تھی، عزیز رشتے دار ایک ایک کر کے جانے لگے تھے، آخر میں بوڑھا مشعل نوراں سے بولا۔

''وچھیے! اب فکر کی بات نہیں، علاج ہورہا ہے اپڑیں سائیں داد کا، اللہ سائیں کرے گا یہ بھلا چنگا ہوجائے گا، پہلے بھی اس ڈاگدر کی دوائی سے شفا ہوئی تھی اسے، اس کی دوائی ہم کو لگتی ہے۔ خبردار! تو کوئی شور مت کرنا، میں ذرا دیر کے لیے کھیت کا چکر لگا کے آتا ہوں۔ دھیان سے کوئی شور شرابا نہ کرنا۔'' نوراں کو یہ تاکید کر کے وہ چلا گیا۔

''تمہارے بابا نے بالکل ٹھیک کہا، خبردار! شور مت کرنا۔''

دفعتاً وارڈ نما اس مختصر سے کمرے میں ڈاکٹر رحیم داد کی سرسراتی ہوئی آواز ابھری۔ نوراں زندہ لاش کی شکل کھڑی تھی، مریض سب جاچکے تھے، وارڈ سے متصل ڈاکٹر کا کمرا خالی تھا، سائیں داد نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا، ڈاکٹر رحیم داد نے نوراں کا ہاتھ پکڑلیا۔ ''میرا کمرا خالی ہے، صرف تھوڑی دیر کی بات ہے، اس تھوڑی سی دیر میں سائیں داد کو غلط انجکشن بھی لگ سکتا ہے، مگر غلط صحیح کی یہاں کسے تمیز ہے۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر رحیم داد نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

نوراں اس کے عقب میں سر جھکائے چل پڑی، اس کے ذہن میں الفاظ گونج رہے تھے۔ ''خبردار! کوئی شور شرابا مت کرنا۔''

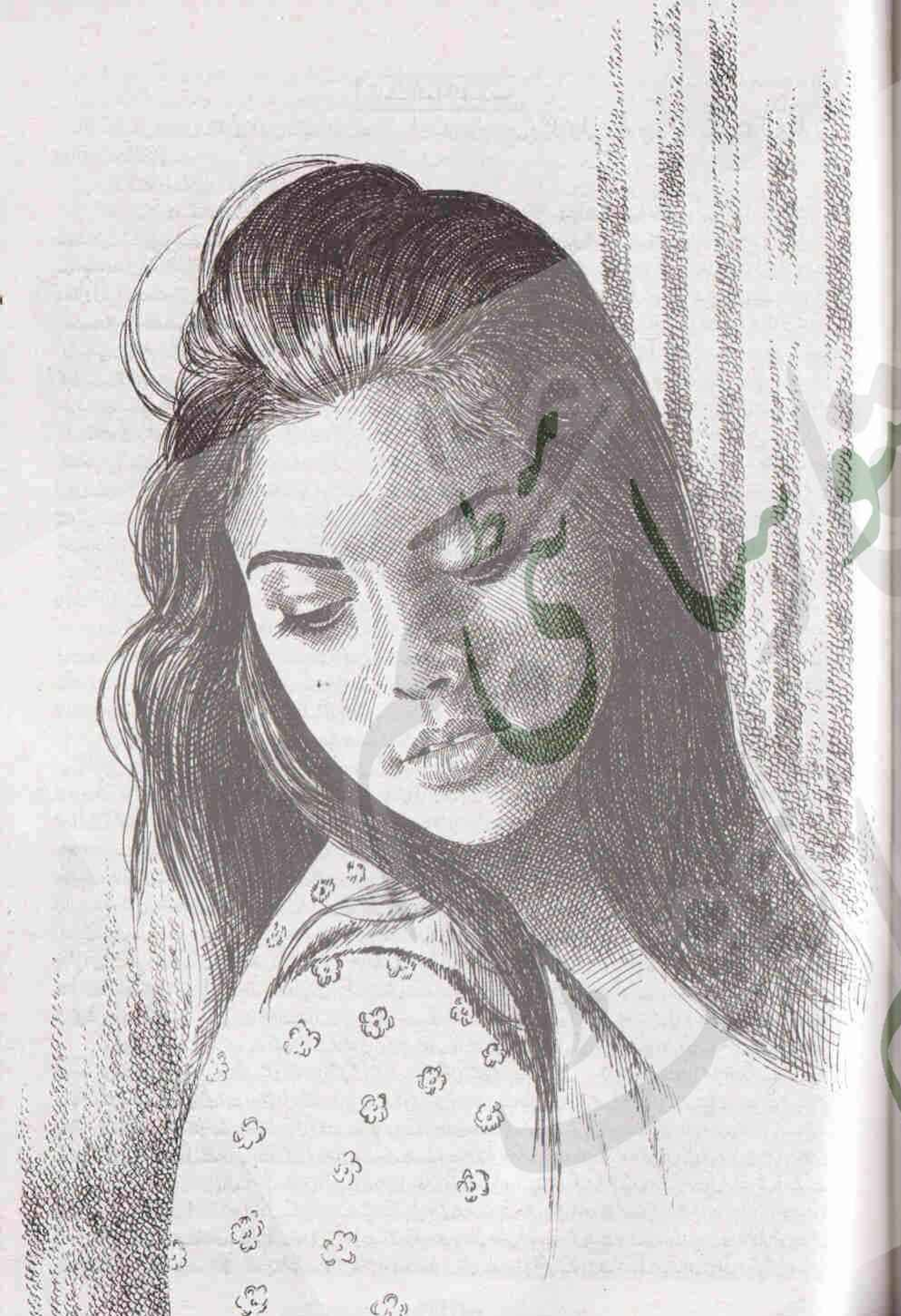

انا ڑی

خوب صورت وگل رنگ جذبوں سے گندھی ایک تیز رفتار کہانی

قسمت کے پھیر میں الجھے ایک نوجوان کی کتھا، حالات اور واقعات کا بہاؤ اسے دیار غیر لے گیا جہاں وہ اناڑی تھا مگر خود کو کسی کھلاڑی سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ ایسا کھلاڑی جسے کسی بساط پر شکست نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس کا اناڑی پن اسے کھلاڑیوں کے مقابل کامیابیاں دلاتا رہا۔ اسے پردیس راس آگیا تھا جہاں کی ہنگامہ خیزیاں اس کا دل لبھاتی تھیں مگر دوسری طرف دیس میں اس کی لاٹری کھل گئی، ایسی لاٹری کہ جس کے بعد اسے لوٹنا تھا۔ اناڑی سے کھلاڑی بننے کے بعد... وہ لوٹا... تو ہنگامے اور شرارتیں اس کے ساتھ تھیں۔ قدم قدم پر آنسو اور لمحہ لمحہ قہقہوں سے لبریز اس اناڑی کی کہانی جس کا دل دو حصوں میں منقسم تھا۔

دورِ حاضر کے فتنوں اور حالات کی عکاس ایک داستان رنگ بہ رنگ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

گرد و پیش کا احوال۔ منظر کشی کا کمال۔ ایک داستان لازوال، آج کے زندہ کرداروں کی حقیقی کہانی جسے احمد اقبال کی زمانہ شناس نگاہ اور سحر آفریں انداز تحریر نے تخلیق کیا۔

نئے پڑھنے والے یہاں سے شروع کریں۔

اٹھارویں صدی کے آغاز میں انگریز فوج کو شاہ افغانستان کے لشکر نے ایک عبرت ناک شکست دی۔ بچ جانے والا واحد شخص ایک ڈاکٹر تھا جسے زخمی حالت میں میرے پردادا کے پردادا نے اپنی بیل گاڑی میں ڈال کر بہ حفاظت رہتاس کے قلعے میں انگریزی چھاؤنی تک پہنچا دیا۔ انعام کے طور پر انگریز حاکم نے اجازت دی کہ وہ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک جتنی زمین کا چکر اپنی بیل گاڑی دوڑا کے لگائیں گے وہ ان کے نام کردی جائے گی۔ یوں ست بدھائی کی ریاست وجود میں آئی۔ میرے آبا و اجداد نواب کہلائے۔ ریاست کے چوتھے حکمران کو ایک فقیر کی بددعا لگی اور اس کے چھ جوان بیٹے باری باری مختلف حادثات کا شکار ہو کے مر گئے۔ آخری بیٹے کو باپ نے جان بچانے کے لیے سات سمندر پار لندن بھیج دیا لیکن کسی خرابی کے باعث جہاز بحر الکاہل میں گر گیا۔ باپ نے عالم دیوانگی میں اپنی تین بیویوں کو مارا اور پھر خودکشی کرلی...... حویلی نصف صدی سے زیادہ عرصہ غیر آباد پڑی رہی۔ میرے والد لاہور کے ایک کالج سے ریٹائر ہوئے...... میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں میرا تعلق ایک سیاسی تنظیم کے دہشت گردوں سے ہوگیا۔ میری زندگی بچانے کے لیے والد صاحب نے مجھے اعلیٰ تعلیم کے بہانے امریکا بھیج دیا۔ ہاورڈ سے ایم بی اے کرنے کے بعد مجھے لندن میں لارڈ ارنسٹ کی بزنس فرم میں اعلیٰ عہدے پر کام کرنے کا موقع ملا لیکن فرم کے مالک کی اکلوتی بیٹی ایلیشا مجھ پر فریفتہ ہوگئی اور اپنا نام تک بدل کر عائشہ بن گئی...... مگر میں نے اسے ٹھکرا دیا کیونکہ میں فریال کو چاہتا تھا۔ فریال پہلے ماڈل اور ایکٹریس تھی اور اپنی بے وقوفی کے باعث ایک عیاش... شخص اور فلمساز چودھری سلطان سے منگنی بھی کر بیٹھی تھی...... میں نے اور فریال نے چھ سال تک اس کی عداوت کا مقابلہ کیا۔ اچانک لندن میں مجھے ایک وکیل کے ذریعے اپنے کسی رشتے کے پردادا نے طلب کیا۔ وہ عمر کے آخری حصے میں تھے اور دماغ کے سوا ان کا سارا جسم مفلوج تھا...... ان کی معلومات کے مطابق میں ان کا رشتے دار تھا۔ چنانچہ اپنی وصیت کی رو سے انہوں نے مجھے ست بدھائی کا وارث بنا دیا۔ یہ وہی ساتویں بیٹے تھے جن کا جہاز لندن جاتے ہوئے سمندر میں گر گیا تھا...... وہ بچ جانے والے واحد مسافر تھے جو بیہوشی میں کسی تختے پر تیرتے ہوئے برطانیہ کے ساحل تک پہنچ گئے تھے۔ کسی سراغرساں ادارے کی مدد سے انہیں لندن میں میری موجودگی کا علم ہوا۔ لہٰذا وہ مجھے اپنا وارث مقرر کر کے مر گئے۔

اب مجھے لوٹ کے پاکستان جانا پڑا۔ ست بدھائی کی عالی شان مگر منحوس سمجھی جانے والی حویلی اور جاگیر ساٹھ ستر سال سے غیر آباد پڑی تھی۔ ریاست جی ٹی روڈ پر لاہور اور جہلم کے درمیان دینہ جانے والی سڑک پر رہتاس کے تاریخی قلعے کے کھنڈر سے پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی...... حویلی کے تہ خانوں، بند تجوریوں اور مقفل الماریوں سے مجھے قیمتی ہیرے جواہرات، سونے چاندی کے زیور، برتن اور بیش بہا نوادرات کا، جن میں گاڑیاں بھی شامل تھیں اتنا بڑا خزانہ ملا جس کی مالیت کروڑوں سے بڑھ کر اربوں تک پہنچ چکی تھی۔

اپنے چند دوستوں کی عملی حمایت سے میں نے اپنے علاقے کی ترقی کے لیے ایک پروگرام بنایا جس میں اسکول اور اسپتال قائم کرنے کے علاوہ جنگلات کا فروغ، فرنیچر بنانا اور ایکسپورٹ کرنا اور دریائے کہان سے پن بجلی پیدا کرنے کا منصوبہ شامل تھا۔ مجھے دوستوں سے مدد اور لوگوں سے پذیرائی ملی لیکن علاقے کا جدی پشتی جاگیردار میرا دشمن ہوگیا۔ میری انسان دوستی اور غریب پروری کی شہرت پھیلی تو رانا کو اپنی صوبائی اسمبلی کی سیٹ خطرے میں نظر آنے لگی جسے وہ اپنا موروثی حق سمجھتا تھا۔ ابتدا میں شہر چھوڑ کر میرے ساتھ آنے والوں میں میرا نامور صحافی دوست راجا اور اس کی منگیتر ڈاکٹر شہناز کے علاوہ میری چچازاد بہن رابعہ اور میرے والدین شامل تھے۔ پھر علاقے کا نامی گرامی ڈاکو میر احمد میرا حامی اور دوست بن گیا۔ شاہی بادشاہ نے میرے کہنے سے فیصلہ کیا کہ معافی ملنے کے بعد ست بدھائی میں باعزت زندگی گزارے گا لیکن اس خفیہ پروگرام کی خبر دشمنوں کو مل گئی اور انہوں نے پولیس مقابلے کا ڈراما رچا کے سب کو راستے میں مار ڈالا...... زخمی شاہی بادشاہ کو اس کی بیوی گولی نکال کرلے گئی۔ شرعی قانون وراثت کے مطابق مجھ سے پہلے ریاست کے وارث میرے والد اور چچا ہی ہوتے لیکن مجھے وصیت کی رو سے مالک و مختار بنانے والا برطانوی شہری تھا اور خود میں نے برطانیہ میں قیام اور ملازمت کے دوران برطانوی شہریت حاصل کرلی تھی چنانچہ اس فیصلے کو پاکستان کی کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چچا اور چچی کی خواہش کے مطابق اگر میں ان کی اکلوتی بیٹی رابعہ سے شادی کرلیتا تو حق تلفی کا ازالہ ہوسکتا تھا لیکن میں فریال کے سوا کسی کو قبول نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے رابعہ کو بہن کا درجہ دیا اور وہ ست بدھائی میں میرے ساتھ رہی۔ اس نے محبت کی شادی میں دوبارہ دھوکا کھایا۔ بدقسمتی سے دھوکا دینے والے میرے دوست تھے رفتہ رفتہ رابعہ بھی مجھے حق تلفی اور اپنے والدین کی موت کا ذمے دار سمجھنے لگی۔

حویلی میں آنے کے بعد میں نے ایک پرانے محافظ کی بیوی نور جہاں کو دیکھا جو درحقیقت اس کی داشتہ تھی۔ بردہ فروشی سے منشیات فروشی تک ہر کاروبار میں نور جہاں کو استعمال کرتا تھا۔ میں نے دنیا دیکھی تھی لیکن نور جہاں جیسی حسین عورت نہیں دیکھی...... اس نے مجھ سے مراسم استوار کرنے میں جائز و ناجائز کو نہیں دیکھا۔ فریال سے محبت اور شادی کے عہد و پیمان کے باوجود میں نور جہاں کے جال میں بری طرح پھنس گیا۔ اس نے میرے لیے اپنے نام نہاد شوہر کو بھی قتل کردیا اور میں نے اسے قانون کی گرفت سے بچانے کے لیے دن رات ایک کردیے۔ فریال میرے ساتھ لندن، پیرس اور نیویارک جیسے شہروں کی چکاچوند والی زندگی کے خواب دیکھتی تھی۔ نور جہاں کے معاملے نے اسے جواز فراہم کردیا اور وہ لوٹ کر شو بزنس میں چلی گئی جہاں چودھری سلطان کے ذریعے اسے زبردست کامیابی ملی۔ موقع ملتے ہی اس نے چودھری سلطان کو قتل کرا دیا اور اپنے اعلیٰ سطحی مراسم کے باعث قانون کی گرفت میں آنے سے بھی محفوظ رہی۔ نور جہاں نام نہاد شوہر کے قتل کے الزام سے بچنے کے لیے طویل عرصہ روپوش رہی۔ پھر ماہ نور بن گئی۔ ایک نئے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کا حصول مشکل نہ تھا۔ میں اسے لندن لے گیا تاکہ وہ اپنی نئی شخصیت کے ساتھ ست بدھائی واپس آجائے۔ میں اسے لارڈ ارنسٹ کی مدد سے برطانوی شہریت بھی دلوانا چاہتا تھا۔ دو سال بعد لندن پہنچ کر مجھ پر انکشاف ہوا کہ عائشہ دوبارہ ایلیشا بن چکی ہے اور ڈپریشن کے باعث نشہ کرتی ہے۔ اس کی ماں مر چکی تھی اور باپ

سیاسی اور کاروباری معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ عائشہ کا عشق مجھے دیکھتے ہی پھر ایک جنون کی شکل میں لوٹ آیا، اس نے نور کو اغوا کرا کے مجھے مجبور کیا کہ میں اس سے شادی کرلوں۔ نور کی جان بچانے کے لیے مجھے یہ ڈراما بھی کرنا پڑا۔ چند دن بعد اس کے عیاش باپ کو دل کا دورہ پڑا اس کی وارث صرف عائشہ تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ عائشہ اس کی بزنس ایمپائر کو چلا نہیں سکتی، اس نے مرنے سے پہلے اپنی ایک سو بیس ملین پاؤنڈز کی جائداد اور وسیع کاروبار کا مالک مجھے بنا دیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مجھ سے شادی کے بعد عائشہ بھی ٹھیک ہوجائے گی۔ میرے انکار اور ماں باپ کی موت نے عائشہ کے احساس جرم کو شدید تر کردیا اور وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے ترک دنیا کر کے چرچ میں نن ہوگئی۔ قدرت کی طرف سے خوش نصیبی کی یہ دوسری لاٹری میرے لیے ایک آزمائش بن گئی، نور یہاں اکیلی رہنے پر راضی نہ تھی اور نہ میں یہاں رہتا یا واپس جاتا...... پھر کچھ اور غیر معمولی واقعات پیش آئے۔ اچانک مجھے وہ شخص مل گیا جو چیف کہلاتا تھا۔ اس نے دس سال پہلے لاہور میں مجھے اپنی سیاسی تنظیم میں دہشت گردی کے لیے استعمال کیا تھا۔ اب وہ لندن میں جلاوطنی اور روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اگر میں اسے اپنا سیاسی مشیر بنالوں تو آئندہ انتخابات میں اپنے حریف رانا کو شکست دے کر صوبائی اسمبلی میں پہنچ سکتا ہوں۔ میں نے بظاہر اس کی پیشکش قبول کرلی۔ ست بدھائی کے اسپتال کو وسعت دینے میں میرے ساتھ ایک ڈاکٹر باپ بیٹا شامل تھے، اس فیملی کی تیسری رکن ثمینا بھی ڈاکٹر تھی لیکن محبت میں ناکامی اور پھر شوہر کے قتل نے اسے نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے مجھے اپنا سابق محبوب وحید مان لیا اور کسی حد تک نارمل بھی ہوگئی۔ وحید ایک لاابالی مصور تھا جو لندن میں عریاں تصاویر بنا کے اپنا فن اونے پونے بیچ رہا تھا اور استحصال کا شکار تھا...... ثمینا سے اپنی جان چھڑانے کے لیے وحید کو پاکستان لے جانا ضروری تھا۔ وہ ہو بہو میری کاربن کاپی تھا۔ میں نے اس کے تمام قرضے بے باق کیے اور اسے اپنے ہمراہ پاکستان لے جانے پر آمادہ کرلیا۔ چیف نے مجھے پہلی ٹپ دی کہ میں وحید کو اپنے ڈپلی کیٹ کے طور پر بھی استعمال کرسکتا ہوں۔ چیف کا اصل نام غلام علی تھا۔

اگرچہ میں یہ کرسکتا تھا کہ ست بدھائی کو رابعہ کے سپرد کردوں تاکہ اس کا حق تلفی کا احساس ختم ہو اور خود نور کے ساتھ لندن میں رہ کر کاروبار کو مزید پھیلاؤں۔ مگر نور کے سمجھانے سے میں نے لندن اور ست بدھائی دونوں جگہ رہنے کا فیصلہ کیا۔ لارڈ ارنسٹ کے تمام ملازم مجھے ساری خرابی کا ذمے دار سمجھتے تھے۔ وہ سب احتجاجاً ملازمت چھوڑ گئے...... لارڈ کے سابق شوفر اور باڈی گارڈ نے میری راستوں سے ناواقفیت کے باعث مجھے ایک ویران احاطے میں لے جاکر قتل کرنے کی کوشش کی انہیں ناک آؤٹ کر کے میں نے غلام علی کو طلب کیا اور خود ایلیشا سے ملنے چرچ چلا گیا۔ غلام علی نے احاطے میں کھڑا ٹریکٹر چلا کر ریت کے ڈھیر میں لاشوں کو دبا دیا جو وہاں پہلے سے موجود تھا۔ چوبیس گھنٹے گزرنے سے پہلے وہ گرفتار ہوگیا...... میں نے اپنے بیان میں وہ سب بتا دیا جو غلام نے اعتماد میں مجھے بتایا تھا۔ چارلی کے مددگار اپنی جان بچانے کے لیے وعدہ معاف گواہ بن گئے۔ حالات نے پلٹا کھایا اور مجھے اغوا کرلیا گیا۔ مگر سرغنہ کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ جس کا مقصد تھا کہ میں سارے الزامات اپنے سر لے لوں۔ چیف کی شکل دیکھ کر میں چونک گیا۔ اسی دوران چیف کی ایک نفسیاتی کمزوری کی بدولت میں نے یہ جان لیا کہ سرغنہ اصل چیف نہیں بلکہ اس کا ڈپلی کیٹ ہے۔ ادھر لندن پولیس کی مہارت اور جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے چیف اور اس کے گرگے گرفتار کرلیے گئے۔ میں قید خانے سے نکل کر ایک معمر انگریز جوڑے کی مدد سے اپنے گھر پہنچا۔ پھر میں نور کے ساتھ مل کر اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں مصروف ہوگیا۔ میں اور نور تمام امور سے نمٹ کر مستقبل کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ اچانک ایلیشا برقعے میں ملبوس پہنچ گئی۔ اب وہ اپنی جائداد کی واپسی کا مطالبہ کررہی تھی مگر مجھے اس کی ذہنی حالت پر شبہ تھا لہٰذا میں نے اس کا مطالبہ پورا کرنے سے انکار کردیا جس پر مشتعل ہوکر اس نے پستول نکال لیا اور دیوانگی کی حالت میں مجھ پر فائر کردیا۔ پولیس اسے لے گئی۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو ایلیشا نے جواباً مجھ پر الزامات کی بوچھار کردی لیکن وہ اب کچھ نہیں کرسکتی تھی لارڈ ارنسٹ کے وکیل نے مجھے جذباتی بلیک میل کرتے ہوئے ایلیشا کی حالت کے پیش نظر اس سے شادی کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے یہ تجویز سختی سے مسترد کردی۔ دوسری جانب نور مجھے قائل کرنے کی کوشش کررہی تھی کہ میں ست بدھائی رابعہ کے نام کردوں اور لندن میں اس کے ساتھ رہوں میں نے ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ بہرحال حالات کے پیش نظر میں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا نور بڑی مشکل سے تنہا لندن میں رہنے پر راضی ہوئی۔ ایئرپورٹ پر میرا بریف کیس چوری ہوگیا جس کے باعث فلائٹ سے میری روانگی خطرے میں پڑ گئی۔ اسی کشمکش میں غیر معمولی مہارت سے مجھے بے ہوش کردیا گیا اور ایمبولینس میں ڈال کر نہ معلوم مقام پر منتقل کردیا گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے اغوا کار کون ہیں پھر جب رابعہ میرے سامنے آئی تو میں بھونچکا رہ گیا اور مزید یہ کہ اسی نے میرے حریف زوہیب کے ساتھ مل کر یہ ڈراما رچایا تھا۔ اس کا دیرینہ مطالبہ تھا کہ جاگیر اس کے نام کی جائے۔ مجھے اس پر مجبور کرنے کے دوران ایک بات پر مشتعل ہوکر اس نے ریوالور سے مجھ پر فائر کردیا۔ اس کا نشانہ خطا گیا۔ اسی اثنا میں اس کے کارندے داخل ہوئے اور اسے لے کر چلے گئے۔ ایک دن میرے کمرے میں ٹی وی رکھ دیا گیا جس کے ذریعے رابعہ نے مجھ سے رابطہ کیا اور اپنا مطالبہ دہرایا۔ مسلسل قید اور ذہنی اذیت کے باعث میں اتنا بے زار تھا کہ میں نے اس کا مطالبہ منظور کرلیا۔ معاملہ یہ طے پایا کہ میں جاگیر رابعہ کو گفٹ کردوں گا۔ بعدازاں رابعہ نے مجھ سے رابطہ کر کے اپنی محبت کا اظہار کیا اور شادی کی درخواست کی میں نے انکار کیا تو وہ اپنی ناکامی پر دوبارہ مخالفت پر کمربستہ ہوگئی۔ یہاں مجھے یہ اطمینان ضرور ہوگیا تھا کہ اب میری زندگی محفوظ ہے کیونکہ وکیل اور راجا کے درمیان میں آجانے سے جان کا خطرہ ٹل گیا تھا۔

قید کے دوران ایک دن میری نگرانی پر مامور افراد میں سے ایک کے دل میں آخر دم نیکی کا جذبہ بیدار ہوا اور اس نے قید خانے کی دیوار میں رخنہ ڈال کر مجھے رہائی دلا دی۔ میں باہر نکلا تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی متروک گیسٹ ہاؤس تھا۔ ویرانے میں مجھے ایک دیہاتی جوڑا نظر آیا جو مجھے ایک سابق فوجی خلیل صاحب کے گھر تک لے گیا جہاں خلیل صاحب اور ان کی اہلیہ نے میری بہت مدد کی اور میں راجا سے رابطہ کرنے اور وہ مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ رابعہ کی پراسرار گمشدگی پریشان کن تھی۔ راجا مجھے ایک اسپتال لے گیا تاکہ میری صحت پر سے منفی اثرات زائل ہوں۔ پھر مجھے ریشم کے ہاں ولادت اور ثمینا کے ساتھ وحید کی شادی کی خوشخبری ملی۔ اچانک رابعہ نے بھی فون پر مجھ سے بات کرنا چاہی مگر راجا نے اسے جھڑک دیا۔ کچھ وقت گزرا تھا کہ پولیس انسپکٹر نے اطلاع دی کہ کسی عورت کی لاش پاس کے علاقے میں ملی ہے۔ میں نے اسپتال جاکر دیکھا تو لاکٹ اور دیگر نشانیوں سے وہ رابعہ ثابت ہوئی جس کا چہرہ مسخ تھا۔ میں افسردہ واپس آرہا تھا کہ میرے عقب میں آتی گارڈز کی گاڑی دھماکے سے تباہ ہوگئی اور ایک خونی معرکہ کے بعد میں حویلی واپس پہنچا تو نور نے فون پر بتایا کہ وہ پاکستان آرہی ہے لہٰذا میں اسے لینے کے لیے روانہ ہوا لیکن راستے میں مولاداد نامی ڈاکو نے مجھے اغوا کرلیا۔ مولاداد کے ڈیرے پر نیلم نامی لڑکی نے مجھے اس کے عزائم سے آگاہ کیا اور میری مدد کی۔ یہاں میں

ڈاکوؤں سے نمٹ کر جب ائرپورٹ پہنچا تو دیکھا نور نہیں آئی بلکہ فون پر مجھے الزام دیا کہ میں نے رابعہ کے بارے میں اس سے غلط بیانی کی ہے۔ میں نے وضاحت کی تو اس نے فون پر رابعہ کی موجودگی کا انکشاف کیا اور اس کی آواز سن کر میں چکرا کر رہ گیا۔ رابعہ میرے لیے دردِ سر بن چکی تھی جبکہ اس نے نور کو بھی میرے خلاف بھڑکا دیا تھا۔ لیکن نور نے عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے رابعہ کی نگرانی کی جس کے ذریعے انکشاف ہوا کہ رابعہ کا حویلی میں کسی سے رابطہ قائم ہے۔ لہٰذا نتیجے میں ایک گارڈ سردار خان مجرم ثابت ہوا اور ایک مختصر لڑائی کے بعد میں نے اس پر قابو پالیا۔ دوسری جانب وحید کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایک مقابلے کے بعد اغوا کار بھی قیدی بنا لیے گئے۔ میں نے نور کو محل میں منتقل ہونے اور رابعہ کی نگرانی سخت کرنے کی ہدایت کی اور لندن جانا چاہا لیکن راجا نے مجھے مصلحتاً روکا اور خود لندن جانے کا فیصلہ کیا جبکہ قیدیوں سے حاصل کی گئی معلومات کے مطابق ان ساری کارروائیوں کے پیچھے دلاور کا ہاتھ تھا۔ یہ نام میرے لیے نیا تھا جو اسلحے اور منشیات کا ایک بین الاقوامی اسمگلر تھا۔ وہ الیکشن میں اپنے حق میں میری دستبرداری کا خواہش مند تھا مگر میں نے اسے چیلنج کر دیا۔ رات کی تاریکی میں مجھے ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ میں نے اپنے کمرے سے نکل کر جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ چیخ ثمینا کی تھی جسے کسی نقاب پوش نے دبوچ رکھا تھا۔ میری مداخلت پر وہ فرار ہوگیا۔ حملہ آور کی حویلی میں موجودگی باعث تشویش تھی۔ اسی دوران ڈاکٹر شہباز کی کزن شہلا جو ڈاکٹر تھی، بھی ہماری ٹیم کا ایک رکن بن گئی۔ سخت تفتیش کے بعد سجاد نامی حملہ آور کو ڈھونڈ نکالا گیا جو دلاور خان کا آدمی تھا۔ بعدازاں سجاد نے اپنی ایک جھوٹی کہانی سنائی کہ کس طرح وہ دلاور کے شکنجے میں پھنسا۔ مگر اب وہ حقیقت جان کر دلاور کا دشمن بن گیا ہے۔ میں اس کے جھانسے میں آگیا میں نے یقین کر کے اسے اپنے دوست کی حیثیت سے حویلی میں رکھ لیا جبکہ ڈاکٹر شہباز نے حقیقت محسوس کرلی۔ راجا کا فون آیا اور اس نے اطلاع دی کہ رابعہ فرار ہوگئی ہے۔ ہم نے سجاد کے بارے میں معلومات کے لیے ایک شخص کو روانہ کیا۔ جس کی روانگی کے بعد ایک نامعلوم کال کے ذریعے اطلاع دی گئی کہ وہ اسپتال میں زخمی حالت میں ہے۔ ہم حیران تھے کہ اتفاقیہ صوبے دار میجر صاحب نے میرے پستول کی صفائی کے دوران ٹرانسمیٹر ٹائپ ایک ڈیوائس دریافت کی اور سجاد جس پر جو شک تھا وہ یقین میں بدل گیا لہٰذا اس سے تہ خانے میں تشدد کے ذریعے معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں وہ شدید زخمی ہوگیا اور اسی حالت میں فوت ہوگیا۔ اس امر کی تصدیق ہوگئی کہ اسے بھیجنے والا زوہیب تھا۔ راجا نے اطلاع دی تھی کہ وہ اور نور پاکستان آرہے ہیں لہٰذا اسے لینے میں اپنے گارڈ کے ساتھ ائرپورٹ پہنچا جہاں ایک گارڈ نے مجھے گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ اسی دوران ایک فائر ہوا اور میں نے ایک گارڈ کو گرتے دیکھا۔ ایئرپورٹ پر اس صورت حال پر پولیس بروقت پہنچ کر پوچھ تاچھ کا سلسلہ شروع کرتی ہے۔ راجا اور نور ایئرپورٹ سے برآمد ہوتے ہیں۔ نور بڑی فکرمند ہے معاملہ کچہری کا ہے لہٰذا انہیں وہیں رکنا پڑتا ہے۔ اسی دوران راجا کا ایک کرائم رپورٹر دوست اثر و رسوخ کا حامل ہے ان کی مدد کرتا ہے۔ فراغت کے بعد یہ لوگ ست بدھائی پہنچ جاتے ہیں جہاں ڈاکٹر شہلا کو اپنے گھر سے بلاوے پر لاہور سرور کے ذریعے روانہ کیا جاتا ہے لیکن سرور زخمی حالت میں آکر اطلاع دیتا ہے کہ شہلا کو اغوا کرلیا گیا ہے۔ یہاں بھی راجا کا دوست ناصر کام آتا ہے اور شہلا کو بازیاب کرالیا جاتا ہے۔ اس کے بعد رفیق سکون کا سانس لیتا ہی ہے کہ ایک فون کال اس کا سکون غارت کردیتی ہے۔

کال رابعہ کی تھی اور اس نے اپنی مظلومیت کا ایسا نقشہ کھینچا کہ کئی بار جھڑکنے کے بعد بالآخر میں اس کی مدد پر آمادہ ہوگیا اور اس کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گیا جہاں مجھے قید کر کے ذہنی ٹارچر کیا جاتا ہے لیکن ایک بار پھر غنی کی بروقت مداخلت سے اسے رہائی ملتی ہے اور ساتھ ہی رابعہ کو بھی آزاد کرالیا جاتا ہے اس کے ساتھ ہی ایک شخص مجھو کو بھی یرغمال بنا کر قید کر دیا جاتا ہے۔ رابعہ اپنی رام کہانی سناتی ہے۔ لاہور میں ہم غنی کے ایک دوست کی کوٹھی میں قیام کرتے ہیں۔ جہاں مجھ پر ایک حملہ کیا جاتا ہے۔ گولی لگنے سے زخمی ہو جاتا ہوں۔ یرغمالی کے منہ سے ایک نیا نام شاکر سامنے آتا ہے جو لاہور کا غنڈا ہے۔ اس حملے کے سلسلے میں بیان لینے پولیس افسر آتا ہے اور شاکر کے متعلق بتاتا ہے لیکن رفیق لاعلمی کا اظہار کرتا ہے۔ اسی دوران دروازے کے باہر غنی کی کسی سے بحث کی آواز آتی ہے۔ حویلی میں ایک پگلی عورت گھس آئی تھی جس سے گارڈز الجھے ہوئے تھے۔ میں نے گارڈز کو ان کی بے پروائی پر سرزنش کی اور پگلی کو روانہ کر دیا۔ راولپنڈی سے ناصر کا فون آیا، اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ ہم نے اس کی مزاج پرسی کے لیے اسپتال جانے کا فیصلہ کیا جبکہ نیلم نے بھی اپنے والد سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا لہٰذا وہ بھی ساتھ تھی۔ راستے میں نہ معلوم افراد نے ہم پر حملہ کیا۔ نیلم نے بھرپور انداز میں مدد کی اور گجرات کے ڈپٹی کمشنر کی مدد کی بدولت میں اسپتال تک پہنچ سکا جہاں سے راجا کو فون پر اطلاع دی اور وہ آکر ست بدھائی لے گیا۔ اس معرکے کے دوران میرا موبائل وہیں گر گیا تھا۔ اسی دوران خبر ملی کہ فریال کو قتل کر دیا گیا ہے اور اس کی لاش کے پاس ہی میرا موبائل ملا ہے۔ یہ انتہائی تشویشناک صورت حال تھی لیکن راجا کے تعلقات اور ڈپٹی کمشنر کی مدد سے اس صورت حال پر قابو پالیا گیا۔ ایک دن مجھے شاکر کا فون موصول ہوا جو مجھ سے فوراً ملنا چاہتا تھا۔ غنی نے پریشانی کے عالم میں مجھے رابعہ کے متعلق خبر دی۔ رابعہ نے ڈراما کر کے بیمار بننے کی کوشش کی لیکن اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ پگلی نے ایک بار پھر حویلی میں داخل ہونے کی جرات کی جس پر اسے حویلی بلا لیا گیا جس نے انکشاف کیا کہ وہ پاگل پن کا ڈھونگ رچا رہی تھی رانا کے ظلم کی وجہ سے۔ لیکن بعدازاں وہ جھوٹی ثابت ہوئی اور حویلی سے فرار ہوگئی۔ اسی دوران لندن سے سوشی کا فون آیا اور ایک بڑے معاہدے کے سلسلے میں نور کو لندن واپس بلایا۔ رابعہ اسپتال لے جایا گیا جہاں سے وہ بیماری کی حالت میں فرار ہوگئی۔ لندن روانگی سے پہلے نور کی شاپنگ کے سلسلے میں لاہور جاتے ہوئے راستے میں ایک ہوٹل میں شاکر سے حادثاتی ملاقات ہوئی اور اس نے اپنے اور دلاور کے درمیان جاری تنازعات کے بارے میں بتایا۔ واپسی میں کچھ لوگوں نے نواب رفیق اور نور کو اغوا کر کے قید کرلیا۔ جہاں رفیق نے مشتعل کر کے ایک ڈاکو کو قابو کرلیا۔

قید خانے سے فرار کے بعد کئی سنسنی خیز واقعات پیش آئے جن کی پشت پر رفیق کے دشمن دیرینہ دلاور کا ہاتھ تھا، قید خانے کے بعد دوبارہ ان پر حملہ کیا گیا لیکن انجام کار رفیق محفوظ رہا لیکن حملہ آور نور کو لے جانے میں کامیاب رہے۔ قید خانے میں نواب رفیق کی قابل اعتراض ویڈیوز ڈپٹی سیکریٹری کی بیٹی ثمرہ کے ساتھ اتاری گئی تھیں، لہٰذا رفیق اینڈ کمپنی نے نور کے بازیابی اور مسکین شاہ تک رسائی اور اسے بے نقاب کرنے کے لیے اس کے آلہ کاروں کو قابو کر کے ان سے معلومات کی حکمت عملی اختیار کی۔ رفیق نے بھی مسکین شاہ کے خاص آدمی آفتاب کو اغوا کر کے اس سے پوچھ گچھ کی بعدازاں اس پر دباؤ ڈالنے کے لیے اس کی بیٹی کو بھی اغوا کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ فیصلے پر کامیابی سے عمل درآمد کیا گیا اور آفتاب کی بیٹی ارم کو اغوا کرلیا گیا۔ اس دوران چند اہم واقعات ہوئے۔ شاکر دلاور کے ہاتھوں مارا گیا اور شامی بادشاہ سے اتفاقیہ ملاقات ہوئی۔ آفتاب کی بیٹی کی رہائی کے سلسلے میں سنگین نتائج کی دھمکیاں دی گئیں۔ جس پر رفیق نے ست بدھائی میں سیکیورٹی سخت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی دوران رفیق کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

درپیش صورتِ حال کے پیشِ نظر میں نے سرور کو ہدایت کی کہ میجر صاحب کو مسئلے سے آگاہ کرے۔ لہٰذا کچھ ہی دیر بعد میرے موبائل پر میجر صاحب کا نمبر نمودار ہوا۔ بیل بجنے پر میں نے کال ریسیو کی۔ ''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام!'' انہوں نے جواب دیا۔ ''رفیق میاں، یہاں اچھی خاصی گڑبڑ ہوگئی ہے لیکن تم پریشان مت ہونا، میں نے پولیس کو فون کر دیا ہے اور وہ لوگ پہنچ رہے ہوں گے۔''

''پولیس اگر کوئی گڑبڑ کرے تو آپ فوراً مجھے فون کیجیے گا۔''

''تم فکر مت کرو۔'' انہوں نے کہا۔ ''کسی گڑبڑ کا کیا سوال؟ مرنے والے کسی مذموم ارادے سے حویلی میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ پانچ آدمی تھے اور پانچوں مسلح تھے۔ میں رات دس بجے کے بعد حویلی کی چار دیواری میں لگی ہوئی خاردار باڑھ میں کرنٹ بھی چھوڑ دیتا ہوں۔ اس وقت اگر دیوار میں کرنٹ ہوتا تو ان کی لاشیں کوئلہ ہوگئی ہوتیں۔ تم فکر مت کرو، میں پولیس سے نمٹنا جانتا ہوں۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ ''وہاں کی کیا صورت حال ہے؟''

''یہاں صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے لیکن بہت جلد بہتری کی امید ہے۔ مجھے امید ہے کہ میں دو تین دن میں نور کو بازیاب کرالوں گا۔''

''انشاء اللہ!'' صوبیدار میجر صاحب نے کہا۔ ''اپنا خیال رکھنا۔''

''آپ بھی حویلی کی سیکیورٹی کا اور اپنا خیال رکھیے گا، کسی بھی الجھن کے سلسلے میں مجھ سے فوراً رابطہ کیجیے گا۔''

''حویلی کی طرف سے تم بے فکر رہو۔ سرور بہت ہی محنت اور جانفشانی سے اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا ہے۔ اس کی وجہ سے مجھے غنی کی کمی محسوس نہیں ہورہی۔''

پھر رسمی جملوں کی ادائیگی کے بعد انہوں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''حویلی میں کچھ نامعلوم افراد نے داخل ہونے کی کوشش کی ہے۔'' میں نے راجا اور ناصر کو مطلع کیا۔ ''سرور اور اس کے گارڈز نے ان پانچوں کو اندر آنے سے پہلے ہی مار گرایا۔''

''کیا میں ست بدھائی جاؤں؟'' راجا نے فکرمندی سے کہا۔

''فکر اور پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''صوبیدار میجر صاحب اس صورتِ حال سے نمٹ لیں گے۔ وہ بہت تجربہ کار افسر ہیں اور پولیس سے نمٹنا بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔''

اچانک کال بیل کی آواز نے ہم لوگوں کو چونکا دیا۔

قادر بخش نے آکر بتایا کہ سامنے والے بنگلے کی ملازمہ تھی۔ وہ بیگم صاحبہ کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔

''کیوں؟'' راجا چونک کر بولا۔ ''کون بیگم صاحبہ! کیا وہ انہیں جانتی ہے؟''

''میں نے اس سے یہی پوچھا تھا، کہنے لگی کہ ہمارے بنگلے میں قرآن خوانی ہورہی ہے۔ ہماری بیگم صاحبہ نے اس بنگلے کی بیگم صاحبہ کو بلایا ہے۔''

''پھر تم نے کیا جواب دیا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اس سے پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ بیگم صاحبہ اس وقت سو رہی ہیں۔ اس نے کہا کہ جب وہ اٹھیں تو انہیں ہماری بیگم صاحبہ کا پیغام دے دیجیے گا۔''

''ٹھیک ہے، تم جاؤ۔'' میں نے کہا۔

راجا فکرمندی سے بولا۔ ''دیکھیے پتر! یہ کوئی نیا چکر شروع ہوگیا ہے۔ یہاں سبھی برگر ٹائپ لوگ رہتے ہیں۔ قرآن خوانی کا ان لوگوں کو کہاں خیال؟''

''کیوں ان بڑے بنگلوں میں مسلمان نہیں رہتے؟'' میں نے پوچھا۔ ''ممکن ہے واقعی اس بنگلے میں قرآن خوانی ہی ہو رہی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی سازش ہو۔ دونوں امکانات ففٹی ففٹی ہیں۔''

''اب بیگم صاحبہ کہاں سے پیدا کی جائیں؟'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''بیگم صاحبہ تو نہ صرف پیدا ہو چکی ہیں بلکہ......''

''یار کیا ضروری ہے کہ اس بنگلے میں جایا ہی جائے؟'' میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''ان لوگوں نے گن پوائنٹ پر تو دعوت دی نہیں ہے۔''

''مجھے صرف اس بات پر حیرت ہو رہی ہے کہ اس قسم کی پوش آبادیوں میں لوگ گھر گھر جا کر تو قرآن خوانی کی دعوت نہیں دیتے۔'' راجا نے کہا۔ ''اور اگر قرآن خوانی کرتے بھی ہیں تو کسی مدرسے کے طالب علموں کو بلا کر اپنے بزرگوں کی ارواح کو ثواب پہنچا دیتے ہیں اور مدرسے کے بچوں اور مولوی صاحب کو نذرانے کے طور پر کچھ دے دیتے ہیں۔ بقیہ سماں پارٹی کا ہوتا ہے جو مرنے والے کے لیے مغفرت کی دعا تو معمولی بات ہے، اس کا ذکر تک نہیں

کرتے اور خوش گپیوں میں مصروف رہتے ہیں۔"

"یہ تو خیر مہاراجا! آپ بجا فرما رہے ہیں۔ لوگ تو تدفین کے موقعے پر بھی الگ الگ ٹکڑیوں میں بٹ کر کاروباری معاملات، سیاست اور شوبز پر ڈسکس کرتے ہیں، پھر مولوی کے ساتھ ساتھ دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر واپس آجاتے ہیں۔

"یار مسئلہ تھا سامنے والے بنگلے میں قرآن خوانی کا!" ناصر نے کہا۔ "یہ ہم کس معاشرتی بحث میں الجھ گئے؟"

"یار! یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اب بیگم صاحبہ نہیں ہیں تو فوری طور پر تو ان کا بندوبست ہو نہیں سکتا۔ ہاں، بس یہ تجسس ضرور ہے کہ سامنے والوں کی ملازمہ خاص طور پر ہمیں دعوت دینے کیوں آئی؟"

"شام تک دیکھ لیتے ہیں۔" راجا نے کہا۔ "اگر واقعی وہاں قرآن خوانی ہوگی تو شام کو گاڑیوں کی ایک لمبی قطار اس بنگلے کے سامنے ہوگی۔"

"اگر قرآن خوانی نہ ہوئی تو پھر کچھ اور سوچیں گے۔" میں نے کہا۔

"یار فیکے پتر!" راجا نے چڑ کر کہا۔ "ایک تو مسائل خود ہی تیرا پیچھا نہیں چھوڑتے ہیں اور اگر کوئی مسئلہ نہ بھی ہو تو تو خود اسے پیدا کرلیتا ہے۔ بھاڑ میں جائے سامنے والا بنگلا اور بھاڑ میں جائے ان کی ملازمہ!"

مجھے اس کے جھنجلانے پر ہنسی آگئی۔ میں نے کہا۔ "یارا! اتنا مشتعل کیوں ہورہا ہے؟ بندے کو تجسس تو ہوتا ہی ہے نا!"

"تو تجسس کر اپنی ہونے والی بیگم کے لیے۔" راجا نے جل کر کہا۔ "فضول کے مسائل پیدا مت کر۔"

ہم لوگ شام کی چائے پی رہے تھے کہ شامی اوپر سے نیچے آتا دکھائی دیا۔

"کیا بات ہے شامی بادشاہ!" راجا نے کہا۔ "بہت جوش میں نظر آرہے ہو؟"

"یار میں نے آفتاب کے......" وہ ناصر کی طرف دیکھ کر کچھ کہتے ہوئے رک گیا، پھر مجھ سے بولا۔ "ان صاحب سے تعارف نہیں کرایا آپ نے؟"

"یہ بھی ہمارے دوست ہیں۔" میں نے کہا۔ "راجا کی طرح یہ بھی بہت بڑے صحافی ہیں۔"

"شامی! تمہیں اڈیالہ جیل یاد ہے؟" ناصر نے کہا۔

"اڈیالہ جیل کو میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ وہاں......" وہ کہتے کہتے رک گیا، پھر ناصر کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے یاد آگیا...... آپ...... کا نام...... ہاں...... آپ کا نام شاید عامر ہے؟"

"میرا نام......"

"ایک منٹ!" شامی نے اس کی بات کاٹ دی۔ "آپ کا نام ناصر ہے...... ہاں، وہ جیل سپرنٹنڈنٹ بار بار آپ کو اسی نام سے پکار رہا تھا۔"

"تم نے ٹھیک پہچانا۔" ناصر نے کہا۔ "میرا نام ناصر ہے۔"

"کیا تم بھی شامی بادشاہ کے ساتھ اڈیالہ جیل میں رہ چکے ہو؟" راجا نے کہا۔ "ویسے تمہاری حرکتیں تو اسی قسم کی ہیں۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ اب تک تمہاری سرگرمیاں پولیس سے چھپی کیسے رہیں؟"

"اگر تم بکواس کرچکے ہو تو میں کچھ کہوں؟" ناصر نے کہا۔

"اب تمہارے پاس کہنے کو رہ ہی کیا گیا ہے؟" راجا نے کہا۔

"ہاں شامی! تم کچھ بتا رہے تھے؟ راجا کے ساتھ رہ کے تو ناصر بھی اسی کے رنگ میں رنگتا جارہا ہے۔"

"میں نے آفتاب کے ایک دست راست کے بارے میں معلوم کرلیا ہے؟" شامی نے کہا۔ "اس کا نام ارشد ہے۔ وہ آفتاب کی ٹرانسپورٹ کمپنی کا منیجر ہے۔ آفتاب خان کی طرح وہ بھی پہلے ٹرک ڈرائیور تھا، پھر آفتاب نے کچھ ہیرا پھیری کرکے ایک بس خرید لی۔ ارشد خان اس کے ساتھ بس میں کنڈیکٹر تھا اور آفتاب خان اپنی بس کا ڈرائیور بھی خود ہی تھا۔"

مجھے آفتاب خان کے بارے میں ناصر اور راجا پہلے ہی بتا چکے تھے۔ میں نے شامی سے پوچھا۔ "ارشد کے بارے میں اور کیا معلوم ہوا؟"

"وہ آفتاب خان کے کالے دھندوں میں برابر کا شریک ہے۔ آفتاب خان کی بسوں اور ٹرک میں اب بھی منشیات بہت بڑے پیمانے پر اسمگل ہوتی ہیں۔ ارشد کو آفتاب خان کے ہر کالے دھندے کا علم ہے۔ وہ نور کے بارے میں بھی جانتا ہوگا اور اس بریف کیس کے بارے میں بھی جو آفتاب خان نے وکیل سرور ڈھلون کے پاس رکھوایا تھا۔"

"اور یہ ارشد ہوتا کہاں ہے؟"

"بادامی باغ کے علاقے میں آفتاب خان نے اچھی خاصی زمین گھیر رکھی ہے۔ وہاں اس کی بسیں اور ٹرک کھڑے ہوتے ہیں۔ وہیں اس کی ورک شاپ بھی ہے اور اسی جگہ آفتاب خان نے ایک دفتر بھی بنا رکھا ہے۔

ارشد اسی دفتر میں بیٹھتا ہے۔" شامی نے تفصیل سے ارشد کے بارے میں بتایا۔

"وہ آفتاب خان کا سب سے محفوظ ٹھکانا ہے۔" ناصر نے کہا۔ "ممکن ہے اس نے نور کو بھی وہیں کہیں رکھا ہو۔"

"پھر ہم آج ہی ارشد پر ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔" راجا نے کہا۔

"اتنی جلدی مت کریں راجا صاحب!" شامی نے کہا۔ "آفتاب کی طرح ارشد بھی لومڑی کی طرح چالاک ہے۔ اگر وہ جلد بازی میں ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تو پھر اسے پکڑنا بہت مشکل ہوگا۔ ہمیں پوری منصوبہ بندی سے کام کرنا ہوگا۔ وہاں نہ صرف کمپنی کے بہت سے ڈرائیور اور کنڈیکٹر ہوں گے بلکہ ورک شاپ میں کام کرنے والے افراد بھی ہوں گے اور ان میں زیادہ تر لوگ جرائم پیشہ ہوں گے۔ آفتاب اور ارشد کے ساتھ شریف آدمی تو چل ہی نہیں سکتا۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "میں نے اپنے گروہ کے لوگوں سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ سب اس وقت منتشر ہیں۔ کوئی دبئی میں ہے، کوئی انڈیا میں اور کوئی کراچی میں۔"

"ہمیں زیادہ لوگوں کی ضرورت بھی نہیں ہے شامی بادشاہ!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "آفتاب اور ارشد جیسے نچلے درجے کے بدمعاشوں کے لیے تم اکیلے ہی کافی ہو۔" پھر میں نے چونک کر کہا۔ "لیکن تم بھی اکیلے کب ہو، تمہارے ساتھ تو گولی بھی ہے۔ تم ابھی جا کر اسے لے آؤ۔ میری دونوں گاڑیوں میں سے کوئی بھی گاڑی لے جاؤ۔"

"نواب بھائی!" شامی نے کہا۔ "حلیہ تو آپ نے بدل لیا لیکن دشمن آپ کی گاڑیاں بھی تو پہچانتے ہوں گے۔"

"میری کوئی مخصوص گاڑی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں کبھی لینڈ کروزر استعمال کرتا ہوں، کبھی پراڈو اور کبھی ہنڈا سٹی! آج کل تو میں نے اپنے استعمال کے لیے ایک کرولا رکھی ہوئی ہے۔ غنی اور احمد شاہ وغیرہ ڈبل کیبن پک اپ استعمال کرتے ہیں اور ناصر کے پاس بھی کرولا ہے۔"

"یہ تو شامی بادشاہ نے بہت اہم بات بتائی ہے۔" راجا نے کہا، پھر اس نے غنی کو آواز دی۔

حسبِ معمول غنی کمرے کے باہر ہی موجود تھا۔ وہ فوراً اندر آگیا۔ "یس سر!"

"یہ گاڑیاں جو ہمارے استعمال میں ہیں۔ دشمن انہیں بھی تو پہچان سکتے ہیں؟"

"لاہور میں اس میک اور ماڈل کی ہزاروں گاڑیاں ہیں سر!" غنی نے کہا۔ "وہ زیادہ سے زیادہ گاڑی کے نمبر سے ہمیں پہچان سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں نے ہر گاڑی کی نمبر پلیٹ بدل دی ہے۔"

"ویری گڈ!" میں نے کہا۔ "مجھے تم سے اسی حاضر دماغی کی توقع تھی۔"

"گاڑیوں کی نمبر پلیٹس تو میں نے اسی وقت تبدیل کر دی تھیں جب ہم آفتاب خان کو لائے تھے۔"

"اوکے غنی!" میں نے کہا۔ وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔

"شامی بادشاہ!" راجا نے کہا۔ "اب تم ناصر صاحب کی گاڑی لے جاؤ اور گولی کو یہاں لے آؤ۔"

"گولی تو خود آپ لوگوں سے ملنے کو بے تاب ہے۔" شامی نے کہا۔ "میں نے فون پر اسے بتا دیا تھا کہ آج آپ سے میری ملاقات ہوگئی ہے۔" وہ گاڑی کی چابی لے کر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد ناصر نے تشویش سے کہا۔

"سر! یہ بہت خطرناک آدمی ہے، قابل اعتبار تو ہے نا؟"

"ہاں ناصر!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "شامی میرے لیے اتنا ہی قابل اعتبار ہے جتنا راجا ہے اور تم ہو۔"

"سر! مجھے حیرت ہے کہ اس سے آپ کی دوستی کیسے ہوگئی۔ یہ تو وہ شخص ہے جو پیسے کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہے۔ اس کے تعلقات بہت بڑے بڑے لوگوں سے تھے لیکن یہ دوست کسی کا نہیں تھا۔"

"یہ ایک طویل کہانی ہے ناصر!" راجا نے کہا۔ "میں کبھی فرصت میں سناؤں گا کہ شامی، فیکے کا دوست بلکہ مرید کیسے بنا؟"

"ناصر، شامی تو......"

میرے سیل فون کی گھنٹی بجی تو میری بات ادھوری رہ گئی۔ میں نے سیل فون کی اسکرین پر نظر ڈالی تو اس پر مجھے جمال خان شیروانی کا نام دیکھ کر حیرت ہوئی۔ میں نے فوراً ہی کال ریسیو کرلی۔ "السلام علیکم سر! کیسے ہیں آپ؟"

"نواب صاحب!" انہوں نے سرد لہجے میں کہا۔ "مجھے اطلاع ملی ہے کہ معروف ٹرانسپورٹر آفتاب خان کی بیٹی آپ کے قبضے میں ہے؟"

ان کا سرد لہجہ سن کر میں چونک اٹھا۔ مجھے ان کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ یہ ڈپٹی سیکریٹری کا لہجہ ہے، کسی دوست کا لہجہ نہیں ہے۔

میں نے بھی کسی قدر سرد لہجے میں کہا۔ ”آپ بھی سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں۔ آفتاب خان کی بیٹی بھلا میرے قبضے میں کیوں ہوگی؟“

”میں جانتا ہوں رفیق صاحب کہ ارم آپ ہی کے پاس ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے آفتاب خان کا فون آیا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ ان کی بیٹی ارم کو آپ نے اغوا کرلیا ہے۔ آپ اسے فوراً اس کے گھر پہنچا دیں ورنہ میں قانونی کارروائی پر مجبور ہو جاؤں گا۔“

”اگر آپ سنی سنائی باتوں پر یقین رکھتے ہیں تو ضرور قانونی کارروائی کریں۔“ میں بھی سنجیدہ ہوگیا اور میرے لہجے میں تلخی آگئی۔ ”آپ بہت اعلیٰ افسر ہیں، بہت بااختیار ہیں، آپ ست بدھائی کے سرچ وارنٹ حاصل کریں اور شوق سے میرے خلاف قانونی کارروائی کریں لیکن میں بھی کوئی گیا گزرا نہیں ہوں اور اپنا قانونی حق محفوظ رکھتا ہوں۔“

”آپ اس وقت ہیں کہاں؟“ جمال خان نے پوچھا۔

”میں کہیں بھی ہوں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ ارم کو برآمد کریں اور مجھے ہتھکڑیاں پہنا دیں۔“

”دیکھیے نواب صاحب! میں ابھی تو آپ سے درخواست کر رہا ہوں کیونکہ آپ ایک باعزت آدمی ہیں ورنہ میں کسی مجرم سے اس لہجے میں بات نہیں کرتا۔“

”آپ نے میرے مجرم ہونے کا فیصلہ بھی کرلیا؟“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”آپ بااختیار آدمی ہیں، کچھ بھی کرسکتے ہیں لیکن اتنا تو سوچیں کہ میں آفتاب خان کی بیٹی کو اغوا کیوں کروں گا؟ کیا تاوان کے لیے یا پھر......“

”آفتاب خان نے بتایا ہے کہ آپ نے کسی غلط فہمی کی بنا پر ان کی بیٹی کو اغوا کیا ہے۔“

”آپ شوق سے اپنا فرض پورا کریں۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

”کون تھا؟“ ناصر نے پوچھا۔ ”میرا اندازہ ہے کہ دوسری طرف جمال خان شیروانی تھا۔“

”وہ کیا کہہ رہا تھا فیکے پتر؟“ راجا نے کہا۔ ”اور تو اتنے غصے میں کیوں ہے؟“

”کہہ رہا تھا کہ آفتاب خان کی بیٹی کو گھر چھوڑ آئیں ورنہ میں قانونی کارروائی کروں گا۔“

”جمال خان کو کس نے بتایا کہ ارم ہمارے قبضے میں ہے۔“

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ اس مرتبہ اسکرین پر پھر کوئی اجنبی نمبر تھا۔

”ہیلو!“ میں نے سیل فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

”نواب رفیق! تم نے اگر دو گھنٹے کے اندر اندر ارم کو واپس نہ بھیجا تو تمہاری اور ڈپٹی سیکریٹری کی بیٹی کی وڈیو فلم مارکیٹ میں پہنچ جائے گی۔“ دوسری طرف سے دلاور کی آواز سنائی دی۔

”اچھا ابھی دو گھنٹے باقی ہیں؟“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”تمہاری دی ہوئی مہلت کے دس گھنٹے تو پورے ہو چکے ہیں۔“

”باتیں مت بناؤ رفیق!“ دلاور نے درشت لہجے میں کہا۔ ”تمہارے پاس صرف دو گھنٹے ہیں، صرف دو گھنٹے!“

”یہ کون جانتا ہے دلاور کہ کس کے پاس کتنا وقت ہے؟“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”تم مجھے دھمکیاں مت دو اور جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر گزرو لیکن تمہارے پاس ابھی ایک دن باقی ہے۔ میں تمہیں دھمکیاں نہیں دوں گا بلکہ ارم کی لاش تمہارے حوالے کردوں گا۔“

”تمہیں اندازہ نہیں ہے رفیق کہ تم کتنی بڑی مصیبت میں پڑنے والے ہو۔“

”مجھے ہر قسم کی مصیبت کا اندازہ ہے۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”اور تم اتنے ہی جی دار ہو تو یہ چوروں کی طرح نمبر بدل بدل کر فون کیوں کرتے ہو؟“

”یہ میرا ہی نمبر ہے۔“ دلاور نے کہا۔ ”اور میں ہمیشہ تمہیں اسی نمبر پر ملوں گا۔“

”ہمیشہ سے تمہاری کیا مراد ہے؟ دو گھنٹے بعد یا ایک دن بعد؟“ میں نے کہا۔

”اگر تم نے اپنی بدنامی کے خوف سے خودکشی نہ کرلی تو ہمیشہ!“ دلاور نے کہا اور فون کا سلسلہ منقطع کردیا۔

راجا اور ناصر تشویش سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ دلاور کیا کہہ رہا تھا۔

”حیرت تو مجھے شیروانی صاحب پر ہے۔“ راجا نے کہا۔

”یار، اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟“ ناصر نے کہا۔ ”شیروانی ایسا ہی بااصول اور سخت گیر افسر ہے۔ آفتاب خان نے تیرے ظلم کا نقشہ کچھ اس انداز میں کھینچا ہوگا کہ وہ طیش میں آگیا۔“

”فیکے پتر!“ راجا نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”تو ایک دفعہ شیروانی صاحب کو فون تو کر۔ وہ بھی تو......“

سیل فون کی گھنٹی میں اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اس مرتبہ پھر شیروانی مجھے کال کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کی

کال منقطع کردوں لیکن پھر میں نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

”اب کیا پرابلم ہے؟“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”نواب صاحب! میں بہت مصیبت میں ہوں۔“ شیروانی کا لہجہ اس دفعہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ ”آفتاب خان کے کچھ آدمی اچانک میرے گھر میں گھس آئے تھے اور انہوں نے وہ کال گن پوائنٹ پر مجھ سے کرائی تھی۔ ان لوگوں میں ایک آدمی بہت درشت لہجے میں بات کر رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو بھی بات بات پر جھڑک رہا تھا۔ اس نے میری بیٹی کی کنپٹی پر گن رکھ کر مجھے مجبور کیا کہ میں آپ سے وہ باتیں کروں۔“

”آپ اس وقت لاہور میں ہیں یا......“

”میں آج کل لاہور ہی میں ہوں۔“ شیروانی نے کہا۔ ”اگر آپ کے پاس اس کی بیٹی ہے تو واپس کردیں۔ اس نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر دو گھنٹے کے اندر اندر آفتاب خان کی بیٹی گھر نہ پہنچی تو تمہاری بیٹی کی وڈیو فلم مارکیٹ میں پہنچ جائے گی۔“

”آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کی عزت پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔“

”تو پھر آفتاب خان کی بیٹی کو اس کے گھر پہنچا دیں۔“ شیروانی نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔

”آپ ان سے یہ کہیں کہ تم مجھے اس وڈیو کا ماسٹر پرنٹ دے دو۔ میں رفیق سے تمہاری بیٹی کو رہا کرادوں گا۔“

”اگر انہوں نے ماسٹر پرنٹ دے دیا تو آپ اس کی بیٹی کو واپس بھیج دیں گے؟“ شیروانی نے بچوں کی طرح کہا۔ مجھے اس وقت اندازہ ہوا کہ ایک باپ کتنا مجبور ہوتا ہے۔

”جی ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”اگر انہوں نے وہ فلم واپس کردی تو ارم گھر پہنچ جائے گی۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ ارم واقعی تمہارے قبضے میں ہے؟“ جمال شیروانی نے کہا۔

”جی ہاں، ان لوگوں نے میری منگیتر کو اغوا کیا ہے۔ میں نے جوابی طور پر آفتاب خان کی بیٹی کو یرغمال بنالیا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ آپ اقرار کرتے ہیں کہ ارم آپ کے قبضے میں ہے۔“ شیروانی کا لہجہ اچانک بدل گیا۔

”یہ میں نے کب کہا کہ ارم میرے قبضے میں ہے۔“ میں نے بھی قلابازی کھائی۔ ”میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر یہ لوگ میری اور ثمرہ کی اس شرم ناک وڈیو فلم کو واپس کردیں جو انہوں نے دھوکے سے بنائی ہے اور نور کو میرے حوالے کردیں تو میں بھی کوشش کروں گا کہ ارم کو ان کے حوالے کردیا جائے۔“

”آپ کے پاس صرف دو گھنٹے ہیں مسٹر رفیق!“ شیروانی نے کہا۔

”دو گھنٹے کہاں اب تو ایک گھنٹا چالیس منٹ ہی رہ گئے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”پرابلم ان لوگوں کا ہے۔ یہ اتنی جلدی وہ وڈیو فلم کیسے واپس کریں گے۔ نور کو مجھ تک کیسے پہنچائیں گے۔ دو گھنٹے تو ست بدھائی پہنچنے ہی میں لگ جائیں گے۔“

”آپ کو شاید علم نہیں ہے کہ آپ کی تمام گفتگو ریکارڈ ہو چکی ہے۔“ شیروانی نے سرد لہجے میں کہا۔

”چلیے اچھا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تو پھر آپ مجھے پھانسی پر چڑھوا دیں۔“ یہ کہہ کر میں نے فون کا سلسلہ منقطع کردیا۔

جمال خان شیروانی کے ساتھ کوئی نہ کوئی پرابلم ضرور تھا۔ مجھے تو لگ رہا تھا کہ وہ اس وقت بھی گن پوائنٹ پر بول رہا تھا۔

”یہ جمال خان شیروانی کو کیا ہوا ہے؟“ میری پوری بات سن کر ناصر نے کہا۔

”وہ پہلے بھی گن پوائنٹ پر گفتگو کر رہا تھا اور اب بھی!“ میں نے کہا۔ ”میں اس وقت کھٹکا تھا جب اس نے بدلے ہوئے لہجے میں مجھ سے پوچھا تھا کہ آپ اعتراف کرتے ہیں کہ ارم آپ کے قبضے میں ہے۔ لہٰذا میں بھی جوابی طور پر گول مول بات کروں۔ مجھے بھی شبہ ہوگیا تھا کہ میری گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہے۔“

اگر واقعی اس نے یہ باتیں ریکارڈ کی ہیں تو اب دلاور یا آفتاب خان اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ میں نے جان بوجھ کر نور کے اغوا اور ثمرہ کی شرم ناک وڈیو کا تذکرہ کیا ہے۔ بس اچانک مجھے خیال آگیا کہ شیروانی اس مرتبہ بھی کسی اور کی زبان بول رہا ہے۔

گیٹ کھلا اور پورچ میں ناصر کی گاڑی داخل ہوئی جسے شامی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ پسنجر سیٹ پر کوئی خاتون تھیں۔ ہاں، وہ گولی ہی تھی جسے میں پہلی نظر میں پہچان بھی نہ سکا۔ وہ اس گولی سے بالکل مختلف تھی جسے میں جانتا تھا۔ اس نے بہت سلیقے سے میک اپ کر رکھا تھا۔ رنگ تو اس کا پہلے بھی صاف تھا لیکن اب اس کی جلد میں ایک چمک سی تھی۔ اس نے اپنے بال براؤن کر رکھے تھے جو اس وقت کھلے ہوئے تھے اور اس کی کمر تک پہنچ رہے تھے، جسم پر بہت نفیس ساری تھی اور پیروں میں سیاہ پٹیوں والی چپل تھی جو اس کے پیروں میں بہت اچھی لگ رہی تھی۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ راجا کی بھی یہی کیفیت تھی۔ وہ گاڑی سے اتر کر خراماں

خراماں ہماری طرف بڑھی اور مسکرا کر بولی۔ ''مجھے اتنی حیرت سے کیوں دیکھ رہے ہیں آپ لوگ؟ مجھے شامی نے بتایا تھا کہ آپ لوگوں نے حلیہ بدل رکھا ہے۔ آپ لوگوں میں سے نواب صاحب کون ہیں؟'' اس نے سر سے پیر تک ہمارا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''تو خود ہی پہچان گولی!'' شامی نے کہا۔ ''تو تو بہت ذہین بنتی ہے نا؟''

''یہ بات ہے تو ابھی پہچان لیتی ہوں۔'' گولی نے کہا، پھر بہت غور سے ہمارا جائزہ لیا اور اچانک مجھ سے بولی۔ ''السلام علیکم نواب صاحب!''

میں نے چونک کر اسے دیکھا، پھر اس سے پوچھا۔ ''تم نے مجھے کیسے پہچانا گولی؟''

''نواب صاحب! آپ کے قد اور جسم سے۔ آپ کا قد ان سب لوگوں سے لمبا ہے، پھر آپ کی انگلی میں ہیرے کی جو انگوٹھی ہے، میں اسے کیسے بھول سکتی ہوں؟''

''تم نے تو کمال کر دیا گولی!'' راجا نے کہا۔ ''تمہیں تو کسی سراغ رساں ایجنسی میں ہونا چاہیے تھا۔''

''اب ایسی بات بھی نہیں ہے راجا صاحب!'' گولی نے راجا کو اس کی آواز سے پہچانا۔ ''اگر نواب صاحب آپ لوگوں کے ساتھ نہ ہوتے تو شاید میں کبھی انہیں نہ پہچان پاتی۔''

''اچھا، اندر تو چلو۔'' میں نے کہا۔ ''تم کیسی ہو گولی؟''

''میں تو جیسی بھی ہوں، آپ کے سامنے ہوں۔'' گولی نے ہنس کر کہا۔ ''آپ مجھے کچھ کمزور اور پریشان نظر آ رہے ہیں۔''

ہم لوگ لاؤنج میں جا بیٹھے۔ میں نے غنی سے کہا کہ نیلم سے کافی بنواؤ۔

''یہ نیلم کون ہے نواب صاحب؟'' گولی نے پوچھا۔

''نیلم ہماری ملازمہ ہے، میں کام کاج کے لیے اسے ست بدھائی سے یہاں لے آیا ہوں۔''

گولی بھی نور کے اغوا پر بہت افسردہ اور فکر مند ہو گئی۔ شامی نے شاید اسے نور کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔

اسی وقت نیلم کافی کی ٹرالی دھکیلتے ہوئے وہاں آ گئی۔

گولی نے حیرت سے اسے دیکھا، پھر کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

میں نے نیلم سے اس کا تعارف کرایا اور اسے بتایا کہ اب گولی بھی ہمارے ساتھ ہی رہے گی۔

میں نے ابھی کافی ختم بھی نہیں کی تھی کہ میرے سیل فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ اسکرین پر ایک مرتبہ پھر مجھے جمال خان شیروانی کا نام دکھائی دیا۔

میں نے بٹن دبایا اور جھنجلا کر سیل فون کان سے لگا لیا۔

''جی فرمایئے، اب کیا مسئلہ ہے؟''

''نواب صاحب!'' شیروانی نے کہا۔ ''میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔ آپ سے دو مرتبہ فون پر بات ہوئی اور دونوں مرتبہ دلاور میرے سر پر موجود تھا۔ اس نے ثمرہ کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ وہ مجھے دھمکی دے کر گیا ہے کہ اگر ایک گھنٹے کے اندر اندر ارم گھر نہ پہنچی تو میں نہ صرف اس کی وڈیو مارکیٹ میں پھیلا دوں گا بلکہ اسے بھی اغوا کر لوں گا۔ تم چاہے پورے پنجاب کی پولیس کو جمع کر لو۔''

''جہاں تک وڈیو کا تعلق ہے، وہ دلاور کو ابھی تک ملی ہی نہیں ہے ورنہ وہ اس کی ایک کاپی آپ کو ضرور دیتا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ دلاور کی چال بھی ہو سکتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ آپ یا آپ کا کوئی آدمی میرے پاس دوڑا دوڑا آئے گا یا پھر میں آپ کے بنگلے پر پہنچوں گا اور وہ لوگ مجھے وہاں گھیر لیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے بنگلے کے اردگرد دلاور کے آدمی ضرور موجود ہوں گے۔''

''پھر میں کیا کروں؟'' شیروانی نے کہا۔ ''کیا میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہوں؟''

''آپ پولیس کو طلب کریں اور ان لوگوں کے خلاف رپورٹ درج کرائیں، آپ رپورٹ میں رانا زوہیب اور دلاور کا نام بھی ظاہر کر دیں۔''

''میں پولیس کو تو پہلے ہی اطلاع دے چکا ہوں۔'' شیروانی نے کہا۔ ''اور پولیس کا ایک ایس ایس پی اس وقت بھی میرے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا ہے لیکن رپورٹ میں کسی کا نام نہیں لیا ہے میں نے۔''

''اس ایس ایس پی کے بارے میں آپ کچھ جانتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ کس قسم کا آدمی ہے؟ پولیس کے اکثر افسران ان لوگوں کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں۔''

''میں اس ایس ایس پی کے بارے میں اتنا جانتا ہوں کہ اس کی شہرت اچھی نہیں ہے۔''

''آپ ایسا کریں، ثمرہ کو شاپنگ کے لیے پیس (Pace) شاپنگ سینٹر تک بھیج دیں، وہ سینٹر آپ کے بنگلے سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ مشکل سے تین چار منٹ کی ڈرائیو ہو گی۔''

''اس سے کیا ہو گا؟'' شیروانی نے پوچھا۔

''اس سے یہ ہو گا کہ وہاں سے ثمرہ کو میرے آدمی لے جائیں گے اور وہ محفوظ ہاتھوں میں پہنچ جائے گی، پھر دلاور پورے لاہور کے بدمعاش بھی جمع کر لے تو اس کا سراغ نہیں لگا سکے گا۔''

''نواب صاحب! آپ کیا لاہور ہی میں ہیں؟''

''میں اس وقت جہاں بھی ہوں، محفوظ ہوں۔'' میں نے اسے مبہم سا جواب دیا۔ ''آپ اگر مجھ پر اعتبار کرتے ہیں تو ثمرہ کو بھیج دیں ورنہ پولیس تو اس کی حفاظت کے لیے موجود ہی ہے۔ آپ ایسے پولیس افسروں کو بھی ضرور جانتے ہوں گے جو نیک نام ہیں اور اپنی ڈیوٹی فرض سمجھ کر کرتے ہیں۔''

''میں ایسے پولیس افسروں کو جانتا ہوں۔'' شیروانی نے کہا۔

''تو پھر آپ ان میں سے کسی کو بلا لیں۔''

''میں تو عجیب مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔'' شیروانی نے کہا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ بس ایسے پولیس افسروں کو ڈیوٹی پر بلائیں، جو آپ کے خیال میں مخلص اور ایمان دار ہیں۔ میں اس دوران میں دلاور تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' میں نے اسے تسلی دے کر فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

''اولاد کی محبت واقعی ایسی چیز ہے جو انسان کو بزدل بنا دیتی ہے۔ شیروانی جیسا سخت گیر اور بااختیار افسر بھی اس وقت ذہنی طور پر مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔'' میں نے ناصر سے کہا۔

''فکیے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''تو نے اس سے جھوٹ کیوں بولا کہ وہ ویڈیو ابھی تک دلاور کو نہیں ملی ہے؟''

''یہ جھوٹ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر ویڈیو اسے مل گئی ہوتی تو وہ شیروانی کو اس کی ایک کاپی ضرور دیتا۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں نے ابھی تک اس ویڈیو فلم کی کاپیاں تیار نہ کی ہوں۔ آج نہیں تو کل وہ شیروانی کو کاپی بھیج دے گا۔''

''مہاراجا! آپ ذرا اپنے گھٹنوں کو تکلیف دیں۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ آپ کی عقل تو گھٹنوں میں ہے۔ ان کا ایک اہم مہرہ قدوائی مارا گیا ہے۔ اس سے تو یہ پوچھنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ وہ ویڈیو فلمیں کسے دیتا ہے؟ ان کا ایک اور اہم آدمی ڈاکٹر ہمارے قبضے میں ہے۔ ویڈیو فلمز کی تیاری اور ترسیل کے ذمے دار ابھی تو یہ لوگ ہی تھے۔ امکان یہی ہے کہ ویڈیو فلم اب تک دلاور کو نہیں ملی ہے۔ ثمرہ کو اغوا کرنے کی دھمکی تو اس نے شیروانی صاحب کو نفسیاتی طور پر الجھانے کے لیے دی ہے۔ اسے اگر ثمرہ کو اغوا ہی کرنا ہوتا تو وہ اسے اس وقت اغوا کر لیتا جب وہ شیروانی صاحب کے بنگلے پر موجود تھا۔''

اچانک مجھے یاد آیا تو میں نے شامی کو مخاطب کیا۔

''شامی! تم نے آفتاب خان کے کس دست راست کا ذکر کیا تھا؟''

''میں نے ارشد خان کے بارے میں بتایا تھا۔'' شامی نے کہا۔ ''میں نے مزید تصدیق کر لی ہے۔ ارشد خان ہی آفتاب کا دایاں ہاتھ ہے۔ اس سے ہمیں بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔''

''تو پھر دیر کیوں کر رہے ہو؟'' میں نے تنبیہی لہجے میں پوچھا۔ ''اس سے مزید پوچھ گچھ کیوں نہیں کرتے؟''

''میں تو آپ کے حکم کا منتظر تھا۔'' شامی نے کہا۔ ''اسے تو میں آج رات ہی اٹھا لوں گا۔''

''شامی بادشاہ!'' میں نے کہا۔ ''ہم اس وقت ست بدھائی کی حویلی میں نہیں بلکہ ماڈل ٹاؤن کی ایک کوٹھی میں موجود ہیں۔ تم اسے......''

''آپ فکر مت کرو نواب بھائی!'' شامی نے کہا۔ ''میں اتنا گیا گزرا نہیں ہوں کہ لاہور میں کوئی ٹھکانا نہ ملے۔ میں ارشد کو اپنے کسی ٹھکانے پر لے جاؤں گا۔''

''لیکن تم وہاں اکیلے نہیں جاؤ گے۔'' میں نے کہا۔ ''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ ارشد اور قدوائی میں بہت فرق ہے۔ ارشد ایک جرائم پیشہ آدمی ہے اور اس کے اردگرد بھی ایسے ہی لوگ ہوں گے۔''

''شامی کبھی ایسے خطروں سے گھبرایا ہے نہ گھبرائے گا؟'' شامی نے کہا۔

''لیکن میں پھر بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔'' میں نے زور دیتے ہوئے کہا اور ناصر اور راجا کو تاکید کی کہ وہ یہیں بنگلے پر رکیں اور محتاط رہیں۔ قادر بخش کو بلا کر بھی یہی ہدایت دی۔

''آپ یہاں کی فکر مت کرو نواب بھائی!'' شامی نے کہا۔ ''یہاں راجا صاحب اور ناصر صاحب کے علاوہ گولی بھی تو ہے۔''

''ہاں، گولی کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''یہ تو تمہیں بھی موت کے منہ سے نکال لائی تھی۔''

☆☆☆

رات تاریک تھی لیکن فضا میں اتنی خنکی نہیں تھی۔ میں نے اس وقت ڈبل کیبن پک اپ استعمال کرنے کو ترجیح دی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر حسب معمول غنی موجود تھا، اس کے ساتھ احمد شاہ بیٹھا تھا۔ میں اور شامی عقبی نشست پر تھے۔ غنی اپنی عادت کے مطابق بہت تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کر رہا

تھا۔ میں نے کئی بار اسے ٹوکا بھی۔

اس وقت زیادہ رات نہیں گزری تھی۔ صرف ساڑھے دس ہی بجے تھے۔ احمد شاہ اور غنی نے آفتاب خان کا وہ گیراج پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔

ہم لوگ بادامی باغ کے لاری اڈے سے گزر کر دو تین فرلانگ ہی چلے ہوں گے کہ غنی نے گاڑی روک دی اور بولا۔ ''سر! وہ سامنے جو احاطہ نظر آرہا ہے، اس میں آفتاب خان کا گیراج اور ورک شاپ ہے اور اس کا دفتر بھی!''

''تم گاڑی کو ایسی جگہ پارک کرو جہاں وہ کسی کی نظروں میں نہ آئے۔'' میں نے کہا۔

غنی نے اردگرد دیکھا۔ وہاں دور دور تک خالی پلاٹ تھے.... کچھ فاصلے پر ایک پلاٹ میں درختوں کے جھنڈ میں غنی نے گاڑی پارک کر دی۔ اب ہماری گاڑی اس وقت تک کسی کی نظر میں نہیں آسکتی جب تک اسے خاص طور پر تلاش نہ کیا جاتا۔

آفتاب خان کا گیراج وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم لوگ مشکل سے دو منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ گیراج کے اندر تیز روشنی... تھی اور اندر سے لوگوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ورک شاپ میں بھی کام ہو رہا تھا۔

ہم نے گھوم پھر کے اس گیراج کا جائزہ لیا۔ وہ خاصی وسیع و عریض جگہ پر بنایا گیا تھا۔ اس کی چار دیواری بھی خاصی بلند تھی۔ ایک اچھی بات یہ تھی کہ اس کے اردگرد کوئی دوسری عمارت موجود نہیں تھی۔ ہمیں عمارت کے اندرونی نقشے کا بھی علم نہیں تھا۔ ہم اگر عقب سے اس گیراج میں داخل ہوتے تو یہ بھی ممکن تھا کہ ہم ورک شاپ میں اترتے۔ شامی نے آوازوں سے اندازہ لگایا کہ ورک شاپ مین گیٹ کے ساتھ ہی ہے۔

غنی اور احمد شاہ کی پشت پر تھیلے بھی لدے ہوئے تھے۔ شامی کے ہاتھ میں بھی ایک تھیلا تھا، جبکہ میرے ہاتھ خالی تھے۔ میرا ریوالور اور اس کے فاضل راؤنڈز جیکٹ کی جیبوں میں تھے۔

شامی نے ایک جگہ رک کر کہا۔ ''ہمیں یہاں سے باؤنڈری وال پھلانگ کر اندر داخل ہونا چاہیے۔'' اس نے دیوار سے کان لگانے کے بعد کہا۔ ''اس طرف بالکل سناٹا ہے۔''

اس نے اپنے تھیلے سے پتلی سی مضبوط رسی کا لچھا نکالا۔ اس کے ایک سرے پر اس قسم کا ہک لگا ہوا تھا جیسے بحری جہازوں کے لنگر ہوتے ہیں۔ اس ہک میں چار کونے تھے۔ شامی نے مخصوص انداز میں رسی کو گھمایا اور دیوار پر پھینک دیا۔

''ٹھک'' کی ہلکی سی آواز آئی اور وہ ہک چار دیواری میں اٹک گیا۔ شامی نے رسی کو اچھی طرح کھینچ کر اندازہ لگایا کہ ہک صحیح طرح پھنسا ہے یا نہیں، پھر وہ اس کے سہارے بہت مہارت سے اوپر چڑھ گیا۔ اس نے دیوار پر بیٹھ کر اردگرد کا جائزہ لیا، پھر غنی کو اوپر آنے کا اشارہ کیا۔

غنی اور احمد شاہ بھی دیوار پر پہنچ گئے۔ وہ لوگ دیوار پر چھپکلی کی طرح چپکے ہوئے تھے۔

شامی نے رسی اندر پھینکی اور اس کی مدد سے پہلے خود اندر اترا۔ اس نے چند لمحے ٹھہر کر اندر کی سن گن لی، پھر ہمیں بھی نیچے آنے کا اشارہ کر دیا۔ تاریکی میں مجھے صرف شامی کا ہیولا نظر آرہا تھا۔ ہم تینوں بھی اسی طرح نیچے پہنچ گئے۔

شامی نے اس کو اسی طرح چھوڑنے کا ارادہ کیا، پھر کچھ سوچ کر وہ پلٹ کر آیا اور مخصوص جھٹکا دے کر ہک دیوار سے نکال لیا اور اس کا لچھا بنا کر اسے دوبارہ اپنے تھیلے میں رکھ لیا۔

شامی نے بہت مناسب جگہ منتخب کی تھی۔ وہاں سے خاصے فاصلے پر تین چار بسیں اور ٹرک کھڑے ہوئے تھے۔

کافی دور سے ورک شاپ کا شور اور لوگوں کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔

میں اندازے سے اس طرف بڑھا جہاں دفتر ہو سکتا تھا۔ بس مجھے ایک ہی خدشہ تھا کہ ارشد چلا نہ گیا ہو لیکن شامی نے بتایا کہ ارشد رہتا بھی وہیں تھا۔ دفتر کی عمارت دو منزلہ تھی۔ بالائی منزل پر ارشد اور ایک دو سپروائزر رہتے تھے۔

ہم کچھ آگے ہی بڑھے تھے کہ ہمیں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ہم لوگ پھرتی سے زمین پر لیٹ گئے۔ وہاں تو خودرو جھاڑیاں بھی اتنی نہیں تھیں کہ وہ ہمیں چھپا لیتیں۔ وہ آدمی اپنی ہی دھن میں گنگناتے ہوئے ہماری ہی طرف آرہا تھا۔ وہ اگر غور سے زمین کی طرف دیکھ لیتا تو ہم لوگ فوراً ہی اس کی نظر میں آجاتے۔

وہ کچھ نزدیک آیا تو اچانک اس کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا اور ڈپٹ کر بولا۔ ''کون ہو اوئے تم لوگ؟''

''مسافر ہیں سائیں!'' شامی نے کہا اور اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔

''مسافر ہو؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

اتنی دیر میں احمد شاہ چھپکلی کی طرح رینگتے ہوئے اس کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔

''ہاں بھائی، ہم لوگ مسافر ہیں۔'' شامی نے کہا۔ ''ہماری بس خراب ہو گئی تھی تو ہم ادھر آگئے۔''

''کون سی بس...... تم لوگ......''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ احمد شاہ نے اچھل کر اسے دبوچ لیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اور احمد شاہ دونوں زمین پر تھے۔ احمد شاہ کا ایک ہاتھ مضبوطی سے اس کے منہ پر جما ہوا تھا۔

''اگر حلق سے آواز نکالی تو ذبح کر دوں گا۔'' شامی نے نہ جانے کہاں سے ایک خنجر برآمد کرتے ہوئے کہا اور خنجر اس کی گردن پر رکھ دیا۔

احمد شاہ نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا دیا۔ وہ گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

''منیجر کا دفتر کس طرف ہے؟'' شامی نے سرگوشی میں اس سے پوچھا۔

''اس طرف!'' اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''سیدھے جا کر بائیں ہاتھ پر...... گھومو گے تو تمہیں دفتر نظر آجائے گا۔''

''وہاں اس وقت کتنے آدمی ہیں؟'' شامی نے پوچھا۔

''دفتر کے باہر ایک چوکیدار ہے اور اندر ارشد صاحب کے علاوہ ایک چپراسی ہے۔'' اس آدمی نے سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''چوکیدار کے پاس کوئی بندوق وغیرہ ہے؟'' شامی نے پوچھا۔

''ہاں، اس کے پاس ایک رائفل ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

شامی نے احمد شاہ کو اشارہ کیا۔ شامی نے اس کی کنپٹی پر ایک زوردار ہاتھ مارا تو اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ اسے سائڈ میں ڈال کر ہم لوگ اس سمت میں بڑھے جدھر اس نے اشارہ کیا تھا۔

دائیں طرف گھومتے ہی ہمیں دفتر کی عمارت نظر آگئی۔ اس کے سامنے اور اردگرد کیاریاں تھیں لیکن وہ ایسی نہیں تھیں کہ ہم ان میں چھپ سکتے۔

ہم کچھ دور آگے بڑھتے تو چوکیدار کی نظروں میں آجاتے۔ وہ مسلح تھا اور فائر بھی کر سکتا تھا۔ اس کی فائرنگ سے ہم میں سے کوئی زخمی یا ہلاک تو ہوتا ہی، ارشد اور اس کی ورک شاپ میں کام کرنے والے ہوشیار ہو جاتے۔ میں نے چند لمحے اس صورتِ حال پر غور کیا، پھر شامی سے سرگوشی میں کہا۔ ''ہم دفتر کے عقب میں بھی تو جا سکتے ہیں۔''

''ہاں نواب بھائی! میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔''

وہ احاطہ دور دور تک ویران تھا۔ ہم نے ایک لمبا چکر کاٹا اور دفتر کے عقب میں پہنچ گئے۔ بالائی منزل کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ جس سے روشنی باہر آرہی تھی۔ ہم لوگ زمین پر پیٹ کے بل کھسکتے ہوئے آگے بڑھے۔ جلد ہی مجھے چوکیدار نظر آگیا۔ وہ اپنی رائفل کندھے سے لٹکائے ایک کرسی پر ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ اس کا رخ ہماری طرف تھا۔

شامی نے مٹی کا ایک ڈھیلا اٹھایا اور اسے چوکیدار کی طرف اچھال دیا۔ مٹی کا وہ ڈھیلا اس سے چند قدم کے فاصلے پر گرا۔ وہ چونک کر اردگرد دیکھنے لگا۔ ہم لوگ دفتر کی عقبی دیوار کے ساتھ بالکل چپک کر کھڑے ہو گئے۔

میں نے دیوار کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا، چوکیدار اب کھڑا ہو گیا تھا اور حیرت سے اردگرد دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ ٹہلتا ہوا چوکنا انداز میں اس طرف بڑھا جدھر ہم چھپے ہوئے تھے۔

وہ جوں ہی میرے نزدیک آیا۔ میں نے اچھل کر اسے پکڑ لیا اور ایک ہی وار میں اسے ناک آؤٹ کر دیا۔

''اس بے چارے کو مار کیوں دیا؟'' شامی نے کہا۔

''یہ مرا نہیں ہے، صرف بے ہوش ہے۔'' میں نے کہا۔

''نواب بھائی! میں نے اتنا خون خرابا کیا ہے کہ میں

حقیقت

☆ پانی اگر حضرت محمد ﷺ کے ہاتھوں سے ملے تو ''حوضِ کوثر'' کہلائے۔

☆ پانی اگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پاؤں سے نکلے تو ''زم زم'' کہلائے۔

☆ پانی اگر پھول کی پتی سے نکلے تو ''عرق'' کہلائے۔

☆ پانی اگر نیچے سے اوپر اٹھے ''بھاپ'' کہلائے۔

☆ پانی اگر اوپر سے نیچے برسے تو ''بارش'' کہلائے۔

☆ پانی اگر آنکھ سے نکلے تو ''آنسو'' کہلائے۔

☆ پانی اگر جم کر برسے تو ''اولے'' کہلائے۔

☆ پانی اگر برس کے رکے تو ''جھیل'' کہلائے۔

☆ پانی اگر برس کے چل پڑے تو ''ندی'' کہلائے۔

☆ اگر سیلاب کی صورت آئے اور لوگ پیاسے مریں تو پاکستانی عوام کا مقدر کہلائے۔ (ندا مہرین، کراچی)

صرف آواز سن کر بتا سکتا ہوں کہ بندہ مر گیا یا زندہ ہے۔ مجھے بہت ہلکی سی چٹ کی آواز سنائی دی تھی، اس کی گردن ٹوٹ چکی ہے۔"

میں نے جھک کر اس کا جائزہ لیا، وہ بے چارہ واقعی مر چکا تھا۔ اس کی موت پر مجھے افسوس ہوا۔ کسی بھی بے گناہ انسان کی موت واقعی افسوس کا مقام ہے۔

شامی نے اس کی لاش کو گھسیٹ کر دفتر کی عقبی دیوار کے ساتھ ڈال دیا اور ہم لوگ محتاط انداز میں دفتر کی طرف بڑھے۔

اچانک چپراسی ٹائپ ایک شخص ہمارے سامنے آ گیا اور بولا۔ "کون ہو تم لوگ، یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ہمیں ارشد صاحب سے ملنا ہے۔" شامی نے کہا۔ "کہنا، گوجرانوالہ سے سکندر آیا ہے۔"

"اچھا! آپ ٹھہریں، میں صاحب کو اطلاع دیتا ہوں۔" چپراسی نے کہا اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔

اس کے جاتے ہی شامی نے ہمیں بھی چلنے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے غنی اور احمد شاہ کو وہیں رکنے کو کہا اور پھر ہمیں ساتھ لے کر چپراسی کے پیچھے پیچھے خود بھی کمرے میں داخل ہو گیا۔ چپراسی اس سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اچانک سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی نظر ہم پر پڑی۔ وہ چونک کر بولا۔ "کون ہو تم لوگ اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"جناب عالی! میں ڈرائیور ہوں۔ مجھے پندرہ سال کی ڈرائیونگ کا تجربہ ہے۔ آج کل بے روزگار ہوں۔ مجھے اگر آپ اپنی کمپنی میں ملازمت دے دیں تو آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔"

"تمہارا ڈرائیونگ لائسنس کہاں ہے اور وہ کتنا پرانا ہے۔" ارشد نے کہا۔ "ڈرائیونگ کا تجربہ تو وہی مانا جائے گا، جتنا پرانا لائسنس ہوگا۔"

میں نے اس درمیان اس شخص کا ٹھیک ٹھاک جائزہ لے لیا تھا۔ وہ خاصا تندرست و توانا شخص تھا اور ہاتھ پیر کا بھی مضبوط تھا۔

"ڈرائیونگ لائسنس میرے پاس ہے جنابِ عالی!" شامی نے کہا۔

"یہ کون ہے؟" ارشد نے میری طرف اشارہ کیا۔

"یہ میرا بھائی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "یہ بھی ٹرک پر میرے ساتھ کلینر تھا، اگر اسے بھی کوئی چھوٹی موٹی ملازمت مل جائے تو......"

"پہلے تم اپنی ملازمت کا بندوبست تو کر لو۔" ارشد مسکرایا۔ "اپنا ڈرائیونگ لائسنس دکھاؤ۔"

شامی نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اچانک ریوالور نکال لیا۔

ارشد نے حیرت سے شامی کو دیکھا پھر اس نے دراز کی طرف ہاتھ بڑھایا تو شامی انتہائی درشت لہجے میں بولا۔ "نہیں، تم اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کرو گے ورنہ میں کھوپڑی اڑا دوں گا۔ میرا ریوالور بے آواز چلتا ہے۔"

چپراسی نے دہشت زدہ ہو کر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن میں نے ایک ہی تھپڑ میں اسے زمین بوس کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے بھی ریوالور نکال لیا اور جھک کر چپراسی کے سر پر اس کے دستے سے وار کر دیا۔ پھر میں گھوم کر ارشد کی طرف چلا گیا اور اس سے کہا۔ "اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھو اور کھڑے ہو جاؤ۔"

"تم لوگ ہو کون اور کیا چاہتے ہو؟" وہ ہچکچا کر بولا۔ وہ آدمی جی دار تھا ورنہ دو دو ریوالوروں کی زد میں تو اچھے اچھوں کی گھگی بندھ جاتی ہے۔

میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کر لیا اور ریوالور کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔ "میں نے جو کہا ہے، کیا تو نے وہ سنا نہیں؟" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

ارشد نے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے۔ میں نے اسے کھینچ کر ایک طرف دھکیل دیا۔

شامی نے انتہائی مہارت سے پہلے ارشد کی تلاشی لی، پھر اس کی دراز... کی تلاشی لی تو سب سے اوپر والی دراز میں اسے ریوالور نظر آ گیا۔ اس نے ریوالور نکال کر اپنی جیب میں ڈالا۔

"تم لوگ آخر ہو کون؟" ارشد نے پوچھا۔

"ہم موت کے فرشتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور تیرا کام تمام کرنے آئے ہیں لیکن اگر چاہے تو، تو بچ بھی سکتا ہے۔"

"آفتاب خان نے جو بریف کیس وکیل کے ہاتھ بھجوایا تھا، وہ کہاں ہے؟" شامی نے اچانک پوچھا۔

ارشد نے چونک کر ہمیں دیکھا، پھر ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ "آفتاب خان نے مجھے کوئی بریف کیس نہیں بھجوایا۔"

"شامی!" میں نے کہا۔ "تم اپنا کام کرو۔ اسے ختم کر دو، ہم آفتاب خان سے بعد میں نمٹ لیں گے۔"

شامی نے اچانک وہی خنجر نکال لیا جو پہلے بھی مجھے اس کے ہاتھ میں نظر آیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ارشد کی ناف پر گھٹنے سے وار کیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے دہرا ہوا تو شامی نے اس کے پیٹ پر ایک گھونسا رسید کر دیا۔ وہ اوندھے منہ گر پڑا۔ شامی اس کی پشت پر بیٹھ گیا اور اس کا ایک کان پکڑ کر بولا۔ "جلدی بول ورنہ میں تیرا کان کاٹ دوں گا۔"

"میں نہیں جانتا کہ تم کس بریف کیس کی بات کر رہے ہو؟" ارشد نے ڈھٹائی سے کہا۔

شامی نے اس کی گردن کی پشت پر خنجر سے ہلکا سا چرکا لگایا اور بولا۔ "میں نے ابھی صرف اپنے خنجر کی دھار آزمائی ہے، بول ورنہ ایک ایک کر کے تیرے کان اور ناک کاٹ دوں گا۔"

"میں نے کہا نا کہ......"

شامی نے اچانک اس کا ایک کان کاٹ لیا۔ اس نے دوسرا ہاتھ ارشد کے منہ پر جما دیا تھا تاکہ اس کی چیخ نکلے تو حلق ہی میں گھٹ کر رہ جائے۔

وہ بری طرح اپنا سر جھٹکنے لگا۔ شامی نے اس کا کان اس کے سامنے زمین پر پھینک دیا۔ کم از کم اتنی سفاکی میں تو نہیں کر سکتا تھا۔ شامی نے اس کا دوسرا کان پکڑا اور اسے کاٹنے ہی والا تھا کہ ارشد نے اوں اوں کر کے اشارے سے اسے روک دیا۔ شامی نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا دیا۔

"بول کیا کہنا چاہتا ہے؟" شامی نے پوچھا۔

"وہ بریف کیس آفتاب خان کا وکیل میرے پاس لایا ضرور تھا لیکن......"

شامی نے اس کا جملہ پورا بولنے سے پہلے ہی اس کا دوسرا کان پکڑ لیا اور اس پر خنجر رکھ دیا۔

"بتاتا ہوں۔" ارشد کانپتے ہوئے بولا۔ "میرا خون تیزی سے بہہ رہا ہے۔ مجھے......"

"ہم تیری مرہم پٹی بھی کر دیں گے اور تجھے اسپتال بھی لے جائیں گے لیکن صرف اس صورت میں جب تو سچ بولے گا۔" میں نے کہا۔

"وہ بریف کیس اوپر میرے کمرے کی الماری میں ہے۔"

"ہمارے ساتھ کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش مت کرنا۔" شامی نے کہا۔ "میں کم سے کم تجھے تو ذبح کر ہی جاؤں گا۔"

"میں جھوٹ نہیں بول رہا۔" ارشد نے سر اِدھر اُدھر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "وہ بریف کیس میری الماری کے تیسرے خانے میں کپڑوں کے پیچھے رکھا ہے۔"

"غنی!" میں نے بلند آواز میں کہا۔

غنی دوسرے ہی لمحے کمرے میں آ گیا۔

"الماری کی چابیاں کہاں ہیں؟" میں نے ارشد سے پوچھا۔

"وہ میری میز کی دراز میں ہیں۔" ارشد نے کہا۔

میں نے اس کی دراز کھولی تو گاڑی کی چابیوں کے علاوہ ایک کی چین میں تین چار چابیاں اور دکھائی دیں۔ میں نے چابی اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ "یہی الماری کی چابیاں ہیں؟"

"ارشد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے غنی کو ہدایات دے کر اوپر بھیج دیا۔

"اگر یہ جھوٹ نکلا تو میں تیری گردن پر چھری پھیر دوں گا۔" شامی نے سفاکی سے کہا۔ "تو نے کبھی گائے یا بکرے کو ذبح ہوتے دیکھا ہے؟" شامی نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "ضرور دیکھا ہوگا لیکن کبھی کسی انسان کو ذبح ہوتے نہیں دیکھا ہوگا لیکن افسوس یہ ہے کہ تو اب بھی نہیں دیکھ سکے گا۔"

"مجھے دھمکیاں مت دو۔" ارشد نے کہا۔ "میں موت سے نہیں ڈرتا۔ میں تو خود آفتاب خان سے نفرت کرتا ہوں، میں منشیات کی اسمگلنگ کرتا ہوں۔ آفتاب خان میرا پارٹنر ہے۔ ہمارے دھندے میں بے ایمانی بھی بہت ایمان داری سے کی جاتی ہے لیکن آفتاب خان تو یہاں بھی بے ایمانی کرتا ہے۔ میں کافی دن سے یہ بات نوٹ کر رہا ہوں کہ وہ میرے حصے کی پوری رقم مجھے نہیں دیتا۔"

"اگر تجھے آفتاب خان سے اتنی ہی نفرت ہے تو اپنا کان کیوں کٹوایا؟" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

اورا

مغربی صوفیوں کا خیال ہے کہ انسان کے جسم سے مختلف رنگ کی شعاعیں نکلتی ہیں جو جسم کے اردگرد ایک ہالہ سا بناتی ہیں۔ یہ شعاعیں ہر آدمی خارج کرتا ہے خواہ وہ نیک ہو یا بد، فرق یہ ہے کہ نیک و بد کی شعاعوں کا رنگ حسب کردار مختلف ہوتا ہے۔ موت سے عین پہلے یہ اورا نیلگوں مائل بہ سیاہی ہو جاتا ہے۔ ایک اور نظریہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنے اعمال کے مطابق ایک ماحول اپنے اردگرد بنا لیتا ہے۔ بدکار کا ماحول دیوار کی طرح سخت ہوتا ہے، جس سے نہ کوئی فریاد یا دعا باہر جا سکتی ہے اور نہ کاسمک ورلڈ کے عمدہ اثرات اندر آ سکتے ہیں۔ ایسا آدمی خفیہ طاقتوں کی امداد سے محروم ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی کتاب "من کی دنیا" سے

مرسلہ: محمد عثمان علی، راولپنڈی

"میں آفتاب خان سے اس بریف کیس کا سودا خود کرنا چاہتا تھا۔"

"تجھے معلوم ہے کہ اس بریف کیس میں کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دو دن پہلے تک معلوم نہیں تھا، پھر مجھے خیال آیا کہ جب آفتاب خان میرے ساتھ بے ایمانی کر رہا ہے تو میں اس کے ساتھ رعایت کیوں کروں؟ میں نے وہ بریف کیس کھول لیا۔ اس میں کچھ فائلیں اور بہت سی ڈی وی ڈیز تھیں۔ میں نے ایک ڈی وی ڈی چلا کر دیکھی تھی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ بریف کیس آفتاب خان کے لیے کتنا اہم ہے، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ یہ گھناؤنا کام بھی کرتا ہے۔"

"ان فائلوں میں کیا ہے؟"

"مجھے انگریزی نہیں آتی ورنہ میں وہ فائلیں بھی ضرور پڑھتا۔"

اسی وقت غنی واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں خاصا بڑا بریف کیس تھا بلکہ اسے چھوٹا موٹا سوٹ کیس بھی کہا جا سکتا تھا۔ میں نے وہ بریف کیس کھول کر دیکھا، وہ ڈی وی ڈیز سے بھرا ہوا تھا، ہر ڈی وی ڈی پر اس لڑکی یا لڑکے کا نام لکھا تھا جنہیں بلیک میل کیا جاتا ہوگا۔

"اب ایک بات اور بتا دو۔" میں نے ارشد سے کہا۔

"پہلے میرا خون روکنے کا کوئی بندوبست تو کرو ورنہ میں مر جاؤں گا۔"

"میں نے کہا نا کہ ہم سب کچھ کریں گے لیکن اپنے سوالات کے جواب لینے کے بعد۔"

"اب کیا پوچھنا ہے؟" ارشد نے جھنجلا کر کہا۔

"قدوائی نے جو ویڈیو فلم تمہیں پہنچائی تھی، وہ کہاں ہے؟"

ارشد چونک کر بولا۔ "قدوائی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"میرے تعلق کو چھوڑو۔" میں نے کہا۔ "تم یہ بتاؤ کہ وہ ویڈیو فلم کہاں ہے؟"

"قدوائی تو سیدھا سادا بندہ تھا۔" ارشد نے کہا۔ "اس کا تو آفتاب خان سے کوئی خاص تعلق بھی نہیں تھا۔ وہ پارٹی کا پُرجوش کارکن تھا اس لیے کبھی کبھار آفتاب خان سے مل لیتا تھا۔ اس کا ایک ہی شوق تھا۔ وہ مووی کیمرے سے بہت بہترین ویڈیو بناتا تھا، پھر کچھ پیسے لے کر اسے ایک نجی ٹی وی چینل کو فروخت کر دیتا تھا۔"

"وہ ویڈیو کہاں ہے جو قدوائی نے تمہیں دی تھی؟" شامی نے ایک مرتبہ پھر اس کے بال مضبوطی سے پکڑ لیے۔

وہ ابھی تک اوندھے منہ زمین پر پڑا تھا اور شامی اس کی پشت پر سوار تھا۔

"وہ بھی میں نے اسی دراز میں رکھی تھی جس میں بریف کیس تھا لیکن وہ بے ضرر سی ویڈیو فلم ہوگی، تمہیں اس سے کیا ملے گا۔ مجھے جب قدوائی کی موت کی اطلاع ملی تو میں نے سوچا تھا کہ میں یہ ویڈیو اس کے گھر پہنچا دوں گا۔"

میں نے غنی کو ایک مرتبہ پھر اشارہ کیا کہ وہ اوپر جا کر ارشد کی الماری سے وہ ویڈیو لے آئے۔ تھوڑی دیر بعد غنی واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈی وی ڈی تھی۔ اس ڈی وی ڈی میں میری فلم کے علاوہ مزید فلمیں بھی ہو سکتی تھیں۔

"اب تو مجھے چھوڑ دو۔" ارشد کراہ کر نحیف آواز میں بولا۔ اس کا خون تیزی سے ضائع ہو رہا تھا اور لگ رہا تھا کہ اگر مزید وہ کچھ دیر اسی حالت میں رہا تو مر جائے گا۔

"ایک آخری سوال!" میں نے کہا۔ "وہ لڑکی نور کہاں ہے جسے آفتاب خان نے اغوا کیا ہے؟"

"میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" ارشد نے دانت بھینچ کر کہا۔

"لگتا ہے تم نے مرنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟" میں نے کہا۔

"مجھے مارنا چاہتے ہو تو مار دو۔" اس نے کہا۔ "اب میں تم سے زندگی کی بھیک نہیں مانگوں گا۔"

"آفتاب خان لڑکیوں کو اغوا کر کے کہاں رکھتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ لڑکیاں بھی اغوا کرتا ہے، میں نے یہ سنا تو تھا لیکن مجھے یقین نہیں تھا۔" ارشد نے کہا۔ "میں شروع ہی سے قتل اور اغوا کا مخالف ہوں اس لیے آفتاب خان اس سلسلے میں مجھے اعتماد میں نہیں لیتا۔"

"تم پھر جھوٹ بول رہے ہو۔" شامی نے کہا اور دوسرا کان پکڑ لیا۔

"اب تم چاہے میرے جسم کے ٹکڑے کر دو، مجھے کچھ معلوم ہی نہیں ہے تو تمہیں کیا بتاؤں گا؟" ارشد کراہ کر بولا۔

"میں آخری دفعہ پوچھ رہا ہوں۔" شامی نے کہا اور اچانک اسے سیدھا کر دیا۔

اس کا چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ کان سے بہنے والا خون اس کے چہرے اور گردن پر پھیل گیا تھا اور فرش پر بھی جم گیا تھا۔

شامی نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں کے نیچے دبائے اور ایک ہاتھ سے اس کی تھوڑی پکڑ کر اوپر اٹھائی اور

بولا۔ "اب میں تمہیں ذبح ہی کر دوں گا۔" اس نے اپنا خنجر ارشد کے گلے پر رکھ دیا۔ "اگر آخری وقت میں کلمہ پڑھنا چاہتے ہو تو پڑھ لو۔"

"میں نے زندگی بھر برے کام کیے ہیں۔ اب آخری وقت میں کلمہ پڑھ کے کون سا میں جنت میں چلا جاؤں گا۔ تم اپنا کام کرو۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔

شامی اس کے گلے پر اپنا خنجر پھیرنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے روک لیا۔ مجھے اس وقت ارشد کے لہجے میں سچائی کی جھلک محسوس ہو رہی تھی۔

شامی نے ارشد کو چھوڑا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور حیرت سے مجھے دیکھا۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔

"چلو، اسے اسپتال لے چلو۔" میں نے کہا۔

"اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔" ارشد مایوسی سے بولا۔ "مجھے لگتا ہے کہ...... میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ میری...... آنکھوں ...... کے سامنے...... اندھیرا...... ہی...... اند......"

وہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کی نبض دیکھی، وہ بہت سست رفتاری سے چل رہی تھی۔

"اس کے زخم سے خون روکنے کا کوئی بندوبست کرو۔" میں نے تیزی میں شامی سے کہا۔ "اور اسے کسی اسپتال تک پہنچا دو۔"

شامی نے اس کی قمیص پھاڑ کے اس کے زخم پر پٹی باندھ دی۔ خون یوں بھی رک چکا تھا۔

"اسے کسی اسپتال تک پہنچانے میں خطرہ ہے۔" شامی نے کہا۔

"ایک طریقہ ہے، ہم جس راستے سے اندر آئے ہیں، اسی سے باہر چلے جائیں۔ پھر ہم میں سے کوئی مین گیٹ کی طرف سے آ کر اس کے کسی آدمی کو اطلاع دے دے کہ ارشد بہت بری طرح زخمی ہو گیا ہے، اسے فوری طور پر اسپتال پہنچا دو ورنہ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔"

"اس کے لیے اتنا کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے نواب بھائی؟" شامی نے کہا۔ "یہ مر گیا تو کیا فرق پڑے گا بلکہ اس کا تو مر جانا ہی بہتر ہے۔"

"نہیں شامی!" میں نے کہا۔ "میں دشمن کی جان اس وقت تک نہیں لیتا جب تک میری جان خطرے میں نہ ہو۔"

ہم لوگ یہاں سے باہر نکلنے ہی والے تھے کہ اس کے چپراسی کو ہوش آنے لگا۔

شامی نے کہا۔ "لیں، اب تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔ چپراسی ہوش میں آ گیا ہے۔ یہ خود ہی ارشد کو اسپتال پہنچانے کا بندوبست کر دے گا۔"

چپراسی نے تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھول دیں۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا۔ پھر وہ اچانک اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا لیکن شامی نے فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "آواز مت نکالنا ورنہ تمہارا بھی یہی حشر کریں گے جو ارشد کا کیا ہے؟"

اس نے دہشت ناک نظروں سے ارشد کو دیکھا، فرش پر جما ہوا خون دیکھا اور بری طرح لرزنے لگا۔

"ہم تمہیں چھوڑ دیں گے لیکن ایک شرط پر!" شامی نے کہا۔

اس نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا۔

شامی نے اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹایا اور بولا۔ "ہمارے جانے کے بعد ارشد کو اسپتال لے جانا، یہ ابھی مرا نہیں ہے لیکن اگر اسپتال نہ پہنچا تو مر جائے گا، اور سنو! شور کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم جس طرح خاموشی سے آئے تھے، اسی طرح خاموشی سے چلے جائیں گے۔" پھر وہ مجھ سے بولا۔ "آپ اس کا خیال رکھیں، میں باہر جا کر دیوار پر رسی پھینکتا ہوں۔"

وہ اپنا تھیلا لے کر باہر چلا گیا۔ چپراسی کی آنکھوں میں ابھی تک وحشت تھی، اس نے غور سے ارشد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے...... تو لگ رہا ہے...... کہ...... ارشد...... صاحب...... مر گئے۔"

"یہ ابھی زندہ ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اگر تم نے اسے اسپتال لے جانے میں دیر کی تو مر جائے گا۔ میں پھر ایک دفعہ کہہ رہا ہوں کہ ہمارے جانے کے بعد شور شرابا کرنے کے بجائے ارشد کو اسپتال پہنچانے کا بندوبست کرنا۔"

اس نے خوف زدہ انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔

کچھ دیر بعد شامی لوٹ آیا اور بولا۔ "آئیے، ہمارے دونوں آدمی اوپر پہنچ چکے ہیں۔ اسے بھی ساتھ لے لیں۔" اس نے چپراسی کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں، اللہ کے واسطے! مجھے معاف کر دیں، میں کچھ نہیں کروں گا، کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔" وہ گڑگڑا کر بولا۔

"بے وقوف! ہم تمہیں قتل کرنے نہیں لے جا رہے ہیں۔" شامی نے کہا۔ "بس، ذرا باہر تک لے جا رہے ہیں۔ جب ہم چلے جائیں تو تم اپنے آدمیوں کو ارشد کے بارے میں بتا سکتے ہو۔"

If you want to download Urdu novels,Imran series, Monthly Digests,Shuaa,Kiran,Khwateen Digest,Suspense digest, Vist www.paksociety.com
if site is not opening send complaint at admin@paksociety.com
or at
0336-5557121

شامی نے چپراسی کا کالر پیچھے سے پکڑا اور اسے زبردستی گھسیٹتے ہوئے باہر کی طرف لایا کیونکہ وہ کسی طور بھی باہر آنے پر آمادہ نہیں تھا۔

غنی اور احمد شاہ دونوں دیوار پر بلیوں کی طرح بیٹھے تھے۔ شامی نے مجھے اوپر چڑھنے کا اشارہ کیا اور جب میں اوپر پہنچ گیا تو اس نے چپراسی سے کہا۔ ''اگر تم ہماری اجازت کے بغیر یہاں سے ہلے بھی تو میں اوپر ہی سے گولی مار کے تمہاری کھوپڑی اڑا دوں گا۔ خاموشی سے یہیں کھڑے رہنا۔''

''تم فکر مت کرو شامی!'' میں نے اوپر سے کہا۔ ''یہ یہاں سے جانے کی کوشش کرے گا تو میں اسے گولی ماردوں گا۔''

شامی چند سیکنڈ میں دیوار پر پہنچ گیا۔

ہم سب ایک ایک کر کے نیچے اتر گئے۔ شامی ہم سب کے بعد آیا اور مخصوص جھٹکا دے کر رسی نکالی اور بولا۔ ''اب فوراً اپنی گاڑی تک پہنچیں۔ چپراسی دہشت زدہ انداز میں چیختے ہوئے بھاگا ہے۔''

ہم دوڑتے ہوئے اپنی گاڑی تک پہنچے اور دو منٹ سے بھی کم عرصے میں گاڑی میں بیٹھ گئے۔

غنی کے ہاتھ میں وہ بریف کیس بھی تھا جو اس نے ارشد کی الماری سے حاصل کیا تھا۔ اس کی جیب میں وہ ڈی وی بھی تھی، میں نے اس سے ایک مرتبہ پھر تصدیق کرلی تھی۔ ڈی وی اس کی جیب میں موجود تھی۔

دوسرے ہی لمحے ہماری گاڑی تیز رفتاری کے ریکارڈ توڑتی ہوئی وہاں سے روانہ ہوگئی۔

مین روڈ پر پہنچ کر میری ہدایت کے مطابق غنی نے گاڑی کی رفتار کافی حد تک کم کردی۔

مجھے آج بہت بڑی کامیابی نصیب ہوئی تھی اور اس کا سہرا شامی کے سر تھا۔ شامی ہی نے ارشد کا سراغ لگایا تھا ورنہ کوئی اس پر شبہ بھی نہیں کرسکتا تھا کہ آفتاب نے وہ بریف کیس ارشد کے پاس رکھوایا ہوگا۔ اب مجھے صرف نور کی فکر تھی، وہ نہ جانے کس حال میں تھی؟ میں اس کے بارے میں سوچتا تو کلیجا منہ کو آنے لگتا اور اسی شدت سے دلاور اور رانا زوہیب کے خلاف میری نفرت اور غصے میں اضافہ ہوجاتا تھا۔

ہم گھر پہنچے تو سوا ایک بجا تھا۔ گویا ہم نے یہ اتنا بڑا اور کامیاب آپریشن صرف ڈھائی گھنٹے میں مکمل کرلیا تھا۔ راجا اور ناصر بے چینی سے ہمارے منتظر تھے۔

''کوئی گڑبڑ؟'' میں نے ناصر سے پوچھا۔

''کوئی ایسی بات نہیں ہے فیکے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''تو بتا، تو کون سا تیر مار کے آیا ہے؟''

''میں پہلے وہ ویڈیو دیکھوں گا، پھر کچھ کہوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے اپنی ویڈیو فلم کی ڈی وی بھی حاصل کرلی ہے لیکن اسے ڈی وی ڈی پر منتقل کرانا مشکل ہے، یہ کام تو کوئی پروفیشنل ہی کرسکتا ہے۔ ہم کسی عام اسٹوڈیو میں تو جا نہیں سکتے۔''

''یہ کوئی پرابلم نہیں ہے، میرا ایک دوست پروڈکشن ہاؤس چلا رہا ہے، وہ خود بھی آئی ٹی کا ماہر ہے۔ اس نے اپنے اسٹوڈیو میں پورا سسٹم لگا رکھا ہے۔ میں وہیں جا کر اس کو شفٹ کرادوں گا۔''

''یار! اس سے بھی آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم کوئی ڈی وی پلیئر خرید لیں۔ اسے کمپیوٹر کے مانیٹر کے ذریعے دیکھا جاسکتا ہے۔''

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔'' میں نے کہا۔ ''یار مہاراجا! کبھی کبھی تو واقعی اپنا گھٹنا استعمال کرلیتا ہے۔'' راجا نے مجھے گھور کر دیکھا تو میں نے کہا۔ ''بھئی عقل مندی کی بات کہنے کے لیے۔''

''ابھی اتنا خوش مت ہو فیکے پتر!'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''پہلے ان ڈی وی ڈیز کا دیدار کرلے۔ یہ نہ ہو کہ پھر پہلے کی طرح اس بریف کیس میں ہندی فلموں اور گیت مالا کی ڈی وی ڈیز بھری ہوں۔''

''چل، پھر پہلے یہی کام کرلیں۔''

''یار پہلے کھانا کھالے۔'' راجا نے کہا۔

''تجھے بھوک لگ رہی ہے تو، تو کھالے، میں تو پہلے یہ ڈی وی ڈیز دیکھوں گا۔'' میں نے کہا۔

''چل یہی سہی۔'' راجا نے مرے مرے لہجے میں کہا۔ ''لیکن فیکے پتر! اگر میں بھوک کی شدت سے فوت ہوگیا تو میرا خون تیری گردن پر ہوگا۔''

''یار میری گردن پر اتنے خون ہیں کہ اگر انہیں شمار کرنے بیٹھوں تو صرف خون ہی رہ جائے گا، گردن غائب ہوجائے گی۔''

کافی دیر بات چیت کا سلسلہ چلتا رہا۔ ناصر نے اس دوران میں ڈی وی ڈی پلیئر کا انتظام کر کے لگا دیا تھا۔

میں نے اس بریف کیس میں سے ٹٹول کر ایک ڈی وی ڈی یوں نکالی جیسے قرعہ اندازی کے لیے لوگ پرچیاں نکالتے ہیں۔ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کہیں اوپر تو دو چار ڈی وی ڈیز اصل نہیں ہیں۔ اندر پھر وہی گیت

مالا اور ہندی فلمیں نہ ہوں۔

ڈی وی ڈی چلنا شروع ہوئی، وہ لڑکی مجھے بہت بھولی بھالی لگ رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں لڑکا بہت گھاگ اور مکار تھا، یقیناً یہ ڈی وی ڈی اسی لڑکی یا اس کے باپ کو بلیک میل کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔

وہ اتنی شرم ناک ویڈیو تھی کہ مجھ سے مزید نہیں دیکھا گیا اور میں نے ڈی وی ڈی پلیئر آف کر دیا۔ مجھے پسینا آ گیا تھا، ناصر کے چہرے پر بھی غصے اور نفرت کے تاثرات تھے اور راجا تو بلند آواز میں مسکین شاہ اور آفتاب کو گالیاں دے رہا تھا۔ ہم نے ایک ایک کر کے آدھی سے زیادہ ڈی وی ڈیز دیکھیں، ان سب میں یہی کچھ تھا۔ ان میں چند ایسے معروف سیاست دان بھی تھے جنہیں میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ ان سب ڈی وی ڈیز کے کور پر اس شخص یا لڑکی کا نام مع ولدیت لکھا ہوا تھا جس کی ویڈیو فلم بنائی گئی تھی۔ میں نے تمام ڈی وی ڈیز دوبارہ اس بریف کیس میں بھریں اور انہیں احتیاط سے اپنی الماری میں رکھ دیا۔

''چل، اب کھانا کھالے۔'' میں نے راجا سے کہا۔

''دیکھے پتر! یہ فلمیں دیکھ کر تو میری بھوک مر گئی ہے، اب مجھ سے کچھ نہیں کھایا جائے گا۔ نیلم سے ایک کپ کافی اور ایک آدھ سینڈوچ بنوا لیتا ہوں۔''

ناصر نے بھی کھانے سے انکار کر دیا۔

میری طبیعت بھی مکدر ہو گئی تھی اور شامی بھی غم و غصے کی تصویر بنا ہوا تھا۔

میں نے غنی سے کہا۔ ''نیلم سے کہو، وہ ہم سب کے لیے کافی اور سینڈوچ ہی لے آئے۔ اس وقت ہم میں سے کسی کا بھی کچھ کھانے کا موڈ نہیں ہے۔''

شامی نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''نواب بھائی! ہم بہت گناہ گار ہیں۔ بے شمار انسانوں کا خون میری گردن پر ہے۔ میں نے نہ جانے کتنے ڈاکے ڈالے ہیں، کتنے لوگوں کو لوٹا ہے لیکن ایسی بے غیرتی کا کام کبھی نہیں کیا۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں اس مسکین شاہ کا نرخرہ اپنے دانتوں سے ادھیڑ کر پھینک دوں۔ حرام زادہ! بہت معتبر اور نیک بنتا ہے، میں دیکھوں گا کہ وہ کتنا نیک ہے۔''

''شامی بادشاہ!'' میں نے کہا۔ ''یہاں تو ہر آدمی بے حسی اور بے غیرتی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے، تم کس کس کو دیکھو گے؟''

''جس جس کے بارے میں جانتا ہوں، اسے تو جہنم رسید کر ہی دوں گا۔''

☆☆☆

رات خاصی گزر چکی تھی۔ مجھے اچانک ارم کا خیال آیا۔ میں آج اس کے کمرے میں نہیں گیا تھا، میں نے نیلم سے پوچھا۔ ''نیلم! ارم کا کیا حال ہے؟''

''وہ تو زیادہ وقت روتی ہی رہتی ہے صاحب جی!'' نیلم نے کہا۔ ''میں نے باجی کو بھی اس کے پاس بھیجا تھا، انہوں نے اسے بہت تسلی دی کہ تم فکر مت کرو، تمہیں یہاں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

''باجی!'' میں چونک اٹھا۔ ''یہ باجی کہاں سے پیدا ہو گئیں؟''

''وہ جی گولی......''

''اچھا اچھا!'' میں نے کہا۔ ''تم گولی کو باجی کہہ رہی ہو؟''

''صاحب جی! ان کا نام تو عجیب سا ہے، پھر وہ مجھ سے اتنی بڑی بھی ہیں۔''

''ارے ہاں، وہ سامنے والے بنگلے میں تو آج قرآن خوانی تھی ناں؟''

''ہاں جی!'' نیلم جلدی سے بولی۔ ''وہاں تو شام کو بہت مہمان آئے تھے، بہت گاڑیاں تھیں۔''

میرے ذہن سے ایک بوجھ اتر گیا، ورنہ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ قرآن خوانی میں اس گھر کی کسی عورت کو بلانا بھی کہیں کوئی سازش نہ ہو۔ جب چاروں طرف مصائب کے پہاڑ کھڑے ہوں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ انسان اپنے سائے سے بھی بدکتا ہے اور رسی کو سانپ سمجھ کر خوف زدہ ہو جاتا ہے۔

''صاحب جی! میں آپ کے لیے کافی لاؤں؟'' نیلم نے پوچھا۔

''نہیں، اب میں سونے کی کوشش کروں گا۔'' میں نے کہا۔ ''تم بھی جا کر سو جاؤ۔''

نیلم کے جانے کے بعد میں دیر تک بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ میرا جسم تو تھکن سے چور تھا لیکن ذہن میں مختلف خیالات آ رہے تھے۔ اب مجھے سب سے زیادہ فکر نور کی تھی۔ میں نے آفتاب خان کو جو مہلت دی تھی، وہ بھی صبح پوری ہونے والی تھی، میں نے اسے بھی ذہنی طور پر ڈسٹرب کرنے کا فیصلہ کر لیا، جب میں بے سکون تھا تو وہ سکون سے کیسے سو سکتا تھا؟

میں نے سیل فون نکال کر اس کا نمبر ملایا اور سیل فون

کان سے لگا لیا۔ ''ہیلو!'' فوراً ہی اس کی آواز سنائی دی۔

''آفتاب خان! تمہاری دی ہوئی مہلت تو کب کی ختم ہو چکی ہے، میری مہلت صبح ختم ہو رہی ہے، تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟''

''دیکھو، میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ اب نور میرے پاس نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، صبح تمہیں اپنی بیٹی کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں مل جائیں گی، پھر میں اس کا ایک ہاتھ روانہ کروں گا، پھر دوسرا ہاتھ اور......''

''اللہ کے واسطے مجھ پر رحم کرو۔'' آفتاب خان ہذیانی انداز میں بولا۔

''یہ بات تمہارے منہ سے کچھ اچھی نہیں لگتی آفتاب خان!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''رحم کا مطلب جانتے ہو تم؟''

''میں نے تمہاری منگیتر کو اغوا کر کے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔'' اس نے کہا۔

''اور جن دوسری لڑکیوں کو اغوا کرایا ہے، وہ کوئی نیکی تھی؟'' میں نے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم اتنے بے رحم اور سفاک نہیں ہو۔'' آفتاب خان نے کہا۔ ''میری اس غلطی کو معاف کر دو۔''

''نور کے لیے تو میں پوری دنیا کو الٹ پلٹ کر سکتا ہوں آفتاب خان!'' میں نے کہا۔ ''تم کیسے کہہ رہے ہو کہ میں سفاک نہیں ہوں۔ اپنے دشمنوں کے لیے تو میں اتنا سفاک ہوں کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ صبح کوریئر سے تمہیں ایک پارسل موصول ہوگا۔ اس میں تمہاری بیٹی کی انگلیاں ہوں گی۔ تم اب تک یہ بھی اندازہ لگا چکے ہو گے کہ میں جو کہتا ہوں، اس پر عمل بھی کرتا ہوں۔''

''میں تو اس حرام زادے مسکین شاہ کے چکر میں مارا گیا۔'' آفتاب خان بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''تمہارا وہ حمایتی دلاور کہاں گیا جس نے مجھے بارہ گھنٹے کی مہلت دی تھی؟''

''سب لوگ مفاد پرست اور اپنے مطلب کے چوکس ہیں۔ جب تک میں ان کے کام کا تھا، یہ میرے لیے کام کر رہے تھے۔ شاہ جی سے اختلاف ہوتے ہی ان سب نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔''

''وہ لوگ آنکھیں پھیریں یا منہ۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''مجھے صبح تک نور چاہیے ورنہ......''

''مجھے بار بار دہشت زدہ مت کرو، کچھ سوچنے دو۔''

''تم صبح تک سوچتے رہو۔'' میں نے کہا۔ پھر اچانک میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا تمہاری کمپنی کا منیجر ارشد جانتا ہے کہ نور کہاں ہے؟''

دوسری طرف بالکل سناٹا چھا گیا۔ میں سمجھا کہ فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن مجھے آفتاب خان کے تیز تیز سانسوں کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ لائن پر ہے۔ وہ ارشد کے نام سے بری طرح چونکا ہوگا۔

چند لمحوں بعد اس کی آواز سنائی دی۔ ''تو ارشد کا یہ حال تم نے بنایا ہے؟''

''میں نہیں جانتا اس کا کیا حال ہے؟'' میں نے کہا۔ ''میں نے تم سے صرف یہ پوچھا ہے کہ ارشد، نور کے بارے میں کچھ جانتا ہے؟''

''وہ نور کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' آفتاب نے کہا۔

''ہاں، تمہاری اطلاع کے لیے یہ بتا دوں کہ اب وہ بریف کیس میرے قبضے میں ہے جس کے لیے تم نے مجھے اتنا دوڑایا ہے۔''

''کیا مطلب!'' وہ شدید حیرت سے بولا۔

''مطلب یہ کہ مجھے وہ بریف کیس مل گیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم ارشد تک پہنچ ہی گئے، میں بھی سوچ رہا تھا کہ ہمارا ایسا کون سا دشمن ہے جو ارشد کی جان لینے پر آمادہ ہو جائے گا اور اس کا صرف ایک کان کاٹ کر چھوڑ دے گا۔''

''اب تم اندازہ لگا لو کہ اس طرح میں ایک دن نور تک بھی پہنچ جاؤں گا لیکن تم تک صرف ارم کی لاش پہنچے گی۔'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اب ساری رات وہ بھی جاگ کر گزارے گا، میں بھی دیکھوں گا کہ وہ مجھے کب تک نور کے بارے میں نہیں بتاتا۔

یہی سوچتا ہوا میں نہ جانے کب سو گیا۔

میں اس وقت شاید نیم غنودگی میں تھا، جب میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے سیل فون اٹھا کر اسکرین پر نظر ڈالی۔ وہ کال صوبیدار میجر صاحب کی تھی، میں نے فوراً سیل فون کان سے لگا لیا۔ ''ہیلو، صوبیدار میجر صاحب خیریت تو ہے؟''

''حویلی پر پولیس نے دھاوا بولا تھا۔ ان کی قیادت ڈی آئی جی کرائمز کر رہا تھا۔''

''پھر؟''

''ان کے پاس سرچ وارنٹ بھی تھا اس لیے میں انہیں

حویلی میں داخل ہونے سے نہ روک سکا۔"

"کیا پولیس ابھی حویلی میں موجود ہے؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"نہیں، ان لوگوں نے حویلی کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن انہیں یہاں سے کوئی بھی ایسی چیز نہیں ملی۔ ڈی آئی جی بہت زیادہ پریشان نظر آرہا تھا۔ اس نے مجھ سے معذرت کی اور بولا۔ "سر! میں معذرت خواہ ہوں۔" میں نے کہا کہ یہ معذرت آپ نواب صاحب سے کورٹ میں کیجیے گا۔"

"پولیس والوں نے حویلی کی کسی چیز کو نقصان تو نہیں پہنچایا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں سر! انہوں نے صرف تلاشی لی ہے لیکن اتنے برے طریقے سے کہ پوری حویلی کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ ڈاکٹر شہناز اور ڈاکٹر شہلا نے اس ڈی آئی جی کو بے بھاؤ کی سنائی ہیں۔"

"ٹھیک ہے، آپ بے فکر رہیں، میں ابھی آئی جی صاحب سے بات کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

پہلے میں نے سوچا کہ عبداللہ جان کو اس وقت ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں ہوگا لیکن انہیں اس واقعے کی اطلاع دینا بھی ضروری تھا۔

میں نے ان کا نمبر ملالیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی، میں نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے۔ عبداللہ جان صاحب یقینی طور پر اس وقت بہت گہری نیند میں ہوں گے۔ میں مایوس ہو کر لائن منقطع ہی کرنے والا تھا کہ دوسری طرف سے فون اٹھالیا گیا۔ پھر عبداللہ جان کی بھاری بھرکم اور بارعب آواز سنائی دی۔ "ہیلو!"

"السلام علیکم سر! میں رفیق بول رہا ہوں، نواب رفیق شیرازی!"

"خیریت تو ہے نواب صاحب؟" عبداللہ جان صاحب ایک دم فکر مند ہو گئے۔

"اس دور میں خیریت کہاں ہے عبداللہ صاحب؟" میں نے کہا۔ "نہ کسی کی جان محفوظ ہے، نہ مال اور نہ عزت!"

"رفیق صاحب! صاف صاف بتائیں آخر بات کیا ہے؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے میری حویلی پر پولیس نے چھاپا مارا ہے۔ انہیں کسی مغویہ کی تلاش تھی۔ پولیس کا خیال ہے کہ اس کے اغوا میں میرا ہاتھ ہے۔"

"ارے!" عبداللہ جان صاحب غالباً اٹھ کر بیٹھے ہوں گے۔ "کس کی رپورٹ پر ایسا ہوا؟"

"مجھے کچھ علم نہیں سر!" میں نے کہا۔ "میں تو اس وقت ست بدھائی میں ہوں بھی نہیں، اپنے ایک دو ضروری کام نمٹانے لاہور آیا ہوا ہوں۔" میں نے کہا۔

"چھاپا مارنے کون آیا تھا؟" وہ ایک دم سخت گیر پولیس افسر بن گئے۔ "اس کے پاس سرچ وارنٹ تھے؟"

"میرے سیکیورٹی چیف نے مجھے اطلاع دی ہے کہ اس کے پاس حویلی کے سرچ وارنٹ تھے۔ چھاپا مارنے والی ٹیم کی سربراہی ڈی آئی جی کرائمز بہ نفس نفیس خود کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"میں ابھی معلوم کرتا ہوں کہ یہ سب کس کی رپورٹ پر کیا گیا ہے اور سرچ وارنٹ کس مجسٹریٹ نے جاری کیے ہیں؟"

"میں پولیس پر مقدمہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ ان لوگوں نے تلاشی کے دوران میں نہ صرف حویلی کے سامان کو الٹ پلٹ کیا بلکہ میرے لاکھوں روپے کے ڈیکوریشن پیسز بھی غائب ہیں، بہت سا قیمتی سامان اور فرنیچر ان لوگوں نے تباہ کر دیا ہے اور حویلی کے افراد کو ہراساں کرنے کے ساتھ ساتھ خواتین کے ساتھ بھی بدزبانی کی ہے۔ میں اس معاملے کو بہت اوپر تک لے جاؤں گا۔"

"آپ پریشان نہ ہوں۔ پولیس نے اگر آپ کا کوئی نقصان کیا ہے تو سخت نوٹس لیا جائے گا۔ میں ابھی اس ڈی آئی جی سے بھی جواب طلب کرتا ہوں کہ وہ کس کے حکم پر وہاں دوڑا چلا گیا۔ اسے کم سے کم میرے علم میں تو یہ بات لانا چاہیے تھی۔" پھر وہ آہستہ سے بولے۔ "ویسے مجھے یہ آپ کے خلاف کوئی بہت بڑی سازش لگ رہی ہے۔ کسی کی اتنی جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ آپ جیسے مرتبے کے آدمی کی حویلی پر اپنے طور پر چڑھ دوڑے۔ میں دیکھتا ہوں اس سلسلے میں کیا ہو سکتا ہے؟" انہوں نے کہا۔

"سر! میں نے آپ کو اطلاع اس لیے دی ہے کہ بعد میں آپ مجھ سے شکایت نہ کریں۔"

"آپ نے بہت اچھا کیا۔ میں ابھی اس معاملے کی تحقیقات کا حکم دے دیتا ہوں۔ آپ بے فکر ہو جائیں، ویسے پولیس پر مقدمہ کرنے کا حق تو آپ محفوظ رکھتے ہیں۔" انہوں نے رسمی کلمات ادا کرنے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے سرور کا نمبر ملایا اور اس سے کہا۔ "سرور! پولیس نے حویلی میں جو سامان الٹ پلٹ کیا ہے، تم اسے مزید الٹ پلٹ کر دو۔ جو قیمتی ڈیکوریشن پیس میں لندن اور پیرس سے لایا تھا، ان کی بڑی تعداد کو کہیں غائب کر دو اور اگر کوئی پوچھے تو یہی جواب دینا کہ پولیس نے حویلی کے افراد کے ساتھ انتہائی بدسلوکی کی، خواتین کے ساتھ بدزبانی کی اور پوری حویلی کا سامان الٹ پلٹ کر دیا۔"

"اوکے سر!" سرور نے کہا۔ "میں ابھی یہاں ایسا منظر پیش کروں گا کہ لگے گا پولیس والوں نے یہاں لاٹھی چارج کیا ہے، میں ڈاکٹر صاحبہ اور دوسری خواتین کو بھی سمجھا دیتا ہوں، آپ فکر مت کریں۔ تمام کام آپ کی مرضی کے مطابق ہو جائے گا۔"

اسی وقت شامی میرے پاس آگیا اور بولا۔ "نواب بھائی! ابھی میرے ایک آدمی نے مجھے اطلاع دی ہے کہ پولیس نے ست بدھائی کی حویلی پر چھاپا مارا ہے۔ وہاں کی تلاشی لی ہے؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "یہ اطلاع مجھے مل چکی ہے اور میں نے آئی جی صاحب کو بھی اس واقعے سے آگاہ کر دیا ہے۔ میں اس ڈی آئی جی کو تو ایسا سبق سکھاؤں گا کہ آئندہ وہ کبھی کسی شریف آدمی کے گھر کی طرف رخ کرتے ہوئے بھی ڈرے گا۔" پھر میں چونک کر بولا۔ "لیکن شامی! یہ اطلاع تمہیں کیسے اور کہاں سے ملی؟"

"پولیس میں بھی میرے ایک دو مخبر موجود ہیں۔" اس نے کہا۔ "میں نے آج ہی ان سے کہا تھا کہ اگر پولیس ست بدھائی میں کوئی کارروائی کرے یا اس کا منصوبہ بنائے تو فوراً مجھے اطلاع دینا۔" پھر وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "نواب بھائی! اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ یہ سب اس رانا کی حرامزدگی ہے، آپ کہو تو میں کل اس کا سر اتار لاؤں؟"

"ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے شامی!" میں نے کہا۔ "پہلے مجھے نور کو بازیاب کرانا ہے۔ نور کے ملنے کے بعد میں خود رانا کی کھوپڑی اڑا دوں گا۔ پانی واقعی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ اب ان کی یہ جرأت ہو گئی کہ وہ میری حویلی کی تلاشی بھی لینے لگے۔"

"انہیں وہاں سے کوئی چیز ملی تو نہیں نا!" شامی نے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ ایسی کوئی چیز جسے وہ آپ کے خلاف استعمال کر سکیں؟"

"غنی اور سرور بہت ذہانت اور دور اندیشی سے کام کرتے ہیں۔ انہوں نے کافی پہلے حویلی سے سب کچھ غائب کر دیا تھا۔ پھر پولیس کو وہاں اسلحہ ملا ہوگا تو میرے پاس ہر اسلحے کا لائسنس موجود ہے۔ شاید اس لیے وہ اسلحہ وہاں سے لے بھی نہیں گئے۔"

ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ گولی بھی وہاں آگئی۔ اس نے ہمدردی سے کہا۔ "نواب صاحب! آپ کی مشکلیں اور پریشانیاں تو مزید بڑھ گئی ہیں۔ حالات جوں کے توں ہیں بلکہ پہلے سے بھی بدتر ہو گئے ہیں۔"

"لیکن اب حالات جوں کے توں نہیں رہیں گے؟" میں نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

"گولی!" شامی نے کہا۔ "تو اٹھ ہی گئی ہے تو ہمیں اچھی سی چائے ہی پلا دے۔"

"میں سوئی ہی کب تھی۔ پھر تم اٹھ کر آئے تو میں بھی اٹھ کر چلی آئی۔ میں ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

"گولی! تم پریشان مت ہو۔ نیلم کو اٹھا دو۔ وہ چائے بنا لائے گی۔"

"ارے اب چائے بنانے کے لیے میں نیلم بے چاری کو کیا اٹھاؤں؟" یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلی گئی۔

آسمان پر صبح کاذب کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ ہم لوگوں نے گرما گرم چائے پی، گولی اس کے ساتھ حلوا بھی بنا لائی تھی۔ رات بھی ہم لوگوں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس وقت بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔

ہم نے چائے پی اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ناصر اپنے کمرے سے باہر نکلا تو سیدھا میرے کمرے کی طرف چلا آیا۔ وہ ہمیں بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"خیریت تو ہے سر!" اس نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

میں نے اسے بتایا کہ پولیس نے رات میری ست بدھائی کی حویلی پر چھاپا مارا ہے۔

"آپ نے اسی وقت مجھے کیوں نہیں بتایا۔ میں اپنے اخبار میں بہت ہی دھانسو قسم کی خبر لگاتا۔ اپنا فوٹو گرافر وہاں بھیج کر حویلی کی تصویریں بنواتا۔"

"یہ چار بجے صبح کا واقعہ ہے۔ اس وقت تک تمام اخبارات چھپ چکے ہوتے ہیں۔ میں نے اس لیے تمہیں اس وقت بے آرام نہیں کیا۔ یہ خبر کل بھی تو لگ سکتی ہے۔" پھر میں کچھ توقف کے بعد بولا۔ "میں نے آئی جی صاحب کو اس واقعے سے آگاہ کر دیا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ انہیں خود بھی اس واقعے کا علم نہیں تھا ورنہ اتنی بڑی کارروائی جس کی سربراہی ڈی آئی جی کر رہا ہو، آئی جی کے علم اور اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔"

"میں اس کے باوجود اپنے اخبار میں خبر دے دیتا ہوں۔"

”کیا بچوں والی باتیں کر رہے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”یہ کوئی اتنی بڑی خبر نہیں ہے۔“

”خبر کو بڑا اور چھوٹا تو رپورٹر بناتے ہیں سر!“ ناصر نے مسکرا کر کہا۔ ”میں تو پولیس کے خلاف ایسی خبر شائع کراؤں گا کہ پوری وزارتِ داخلہ ہل کر رہ جائے گی۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ پولیس نے یہ کارروائی، رانا زوہیب کے ایما اور مسکین شاہ کے حکم پر کی ہوگی۔“

”مسکین شاہ براہ راست تو پولیس کو حکم نہیں دے سکتا۔“ میں نے کہا۔ ”اس نے سیکریٹری داخلہ یا وزیر داخلہ سے کہا ہوگا۔“

”کچھ بھی ہو سر!“ ناصر نے کہا۔ ”میں اپنے اخبار میں یہ خبر ایسے زاویے سے لگاؤں گا کہ پورا پریس اور الیکٹرانک میڈیا پولیس کے پیچھے پڑ جائے گا۔“

”فی الحال تو تم یہ کام کرو کہ فوری طور پر ڈی وی پلیئر کو آن کرو۔ میں اسی انتظار میں بیٹھا ہوں۔“

”شٹ!“ ناصر اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کے بولا۔ میرا دماغ بھی ماؤف ہو کر رہ گیا ہے۔ میں ابھی جا کر ڈی وی پلیئر لے آتا ہوں۔“

”اب ایسی بھی کوئی ایمرجنسی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”پہلے ناشتا کر لو۔“

میرے لاشعور میں کہیں یہ خوف بھی تھا کہ اگر اس ڈی وی میں میری ویڈیو نہ ہوئی تو کیا ہوگا شاید اسی لیے میں اسے جانے سے روک رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد راجا بھی ہماری آوازوں سے بیدار ہو گیا۔ اس نے کمرے میں جھانک کر کہا۔ ”ٹھیکے پتر! کیا تو نے رت جگا کیا ہے؟“

”یار! رت جگا ہی سمجھ لے۔“ میں نے کہا۔ پھر اسے ست بدھائی پر پولیس کے چھاپے کی تفصیل بتادی۔

”اب ان لوگوں کی اتنی جرأت ہو گئی ہے۔“ راجا بھنا کر بولا۔ ”اگر ہمارے ہوتے ہوئے پولیس والے نواب رفیق شیرازی آف ست بدھائی کی حویلی پر چھاپا ماریں اور اسے الٹ پلٹ کریں تو لعنت ہے ہمارے صحافی ہونے پر اور ہمارے تعلقات پر!“ راجا کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا تھا۔

”یہی میں بھی نواب صاحب سے کہہ رہا تھا۔“ ناصر نے کہا۔ ”آپ رات ہی میں ہمیں بتاتے۔“

”یار، میں کتنی دفعہ بتاؤں کہ پولیس نے چھاپا رات کو نہیں، صبح کے چار بجے کے قریب مارا تھا۔ اس وقت تم لوگ کس اخبار میں خبر لگواتے۔“

”ٹھیکے پتر!“ راجا نے کہا۔ ”تو ہمیں بہت ہلکا لے رہا ہے۔ تو نے ابھی میرے قلم کی کاٹ دیکھی نہیں ہے۔“

”یار! یہ بات تو مجھ سے کہہ رہا ہے۔ مجھ سے زیادہ کون تیرے قلم کی کاٹ سے واقف ہوگا؟“

”تو ابھی وکیل کو فون کر اور ان سے کہہ کہ تو پولیس کے خلاف مقدمہ کرنا چاہتا ہے۔ نواب رفیق کی حویلی میں گھسنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔“

”میں بھی مقدمہ کرنا چاہتا ہوں لیکن عبداللہ جان کی وجہ سے فی الحال رک گیا ہوں۔“

”وہ بے چارے کیا کر سکتے ہیں۔ وہ سرکاری افسر ہیں۔ وہ اگر باز پرس بھی کریں گے تو وزارت داخلہ کا چیف سیکریٹری یا پھر خود صوبائی وزیر داخلہ ان کی زندگی اجیرن کر دے گا۔ یہ سب کچھ اسی مسکین شاہ کے کہنے پر ہو رہا ہے۔ اس مسکین شاہ کو تو میں سرعام بے نقاب کروں گا۔“

”نواب صاحب!“ ناصر نے کہا۔ ”اس بریف کیس میں ڈی وی ڈیز کے علاوہ کچھ فائلیں بھی تھیں۔ ذرا ان فائلوں پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔ ممکن ہے ان میں کوئی کام کی بات ہو؟“

گوری کمرے سے اٹھ کر نہ جانے کس وقت چلی گئی تھی۔ پھر وہ نیلم کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تو نیلم ناشتے کی ٹرالی دھکیل رہی تھی اور گوری نے بھی دونوں ہاتھوں میں کوئی ڈش تھام رکھی تھی۔

”نیلم! ناشتا صرف ہم لوگ کریں گے، کوئی بیس پچیس آدمی نہیں کریں گے۔“ راجا نے کہا۔

”یہ سب تو باجی نے کیا ہے۔“ نیلم نے جواب دیا۔ ”کہہ رہی تھیں کہ سب رات سے بھوکے ہیں اس لیے اس وقت سب کو خوب ڈٹ کر ناشتا کرنا چاہیے۔“

”اتنا ناشتا؟“ میں نے ٹرالی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

اس میں تر تراتے ہوئے پراٹھے تھے، بھنا ہوا قیمہ تھا، انڈوں کا آملیٹ تھا۔ اس کے علاوہ گاجر کا حلوا تھا، پوریاں تھیں اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ راجا کے کہنے پر نیلم نے ناشتا ڈائننگ ٹیبل پر لگا دیا۔

ہر چیز بہت لذیذ تھی اور اس کا ذائقہ منفرد بھی تھا۔ یقیناً یہ گوری کے ہاتھوں کا کمال تھا۔

سب نے خوب ڈٹ کر ناشتا کیا۔ پھر گرما گرم کافی پی کر تو گویا توانائی کئی گنا زیادہ بڑھ گئی۔ ناشتے کے بعد میں نے بریف کیس سے وہ فائلیں نکال لیں۔ ناصر باہر گوری اور نیلم دونوں کچن میں چلی گئیں۔

میں نے سب سے اوپر والی فائل کھولی۔ اس میں مسکین شاہ کا نام دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ اس فائل میں اس کے ان بینک اکاؤنٹس اور اثاثوں کی تفصیل تھی جو ملک سے باہر تھے اور ان کی مالیت اربوں روپے تھی۔ یہ تمام بینک اسٹیٹمنٹ، لندن اور امریکا کی جائداد کی ملکیت کے کاغذات کی فوٹو کاپی تھی۔ آفتاب خان نے اس کے لیے بہت محنت کی ہوگی۔

دوسری فائل میں مسکین شاہ کے ہاتھ سے بنی ہوئی ایک لسٹ تھی جس میں ملک کے معروف افسران، بیوروکریٹس اور پولیس افسروں کے نام تھے۔ ناموں کے آگے رقم کا اندراج تھا۔ کوئی بھی رقم چھ ہندسوں سے کم نہیں تھی۔ نیچے مسکین شاہ نے تمام رقوم کا ٹوٹل کیا تھا اور لکھا تھا کہ ان لوگوں سے ہر ماہ اتنی رقم وصول کرنا ہے۔ وہ فوٹو کاپی نہیں تھی بلکہ اصل تھی۔ اس میں مسکین شاہ کا نام تو نہیں تھا لیکن تحریر سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ مسکین شاہ ہی کی ہو سکتی ہے ورنہ آفتاب خان اسے اتنا سنبھال کر کیوں رکھتا۔

تیسری فائل پر بزنس لکھا ہوا تھا۔ اس میں ہیروئن اور اسلحے کی اسمگلنگ کی تفصیلات تھیں۔ اس بزنس کے تین پارٹنر تھے۔ مسکین شاہ، چودھری سلامت اور آفتاب خان۔

دوسرے صفحے پر ان رقوم کا حساب کتاب درج تھا۔ جو ان لوگوں کے حصے میں آتی تھیں۔ یہ بھی کسی کی تحریر تھی لیکن پہلی تحریر سے مختلف تھی۔

میں جیسے جیسے فائلیں پڑھ رہا تھا، میرا جوش بڑھتا جا رہا تھا۔

ایک فائل میں مسکین شاہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط تھے جو اس نے مختلف محکموں کے اعلیٰ افسران کے نام لکھے تھے۔ ان خطوط میں صرف یہ تھا کہ میں فلاں آدمی کو بھیج رہا ہوں۔ اس کا کام ہو جانا چاہیے۔ نیچے مسکین شاہ کے دستخط بھی تھے۔ یہ خطوط بھی فوٹو کاپی تھے لیکن مجھے تحریر اس تحریر سے ملتی جلتی لگی جس میں مختلف افسروں اور صنعت کاروں کے نام درج تھے اور ان کے آگے رقوم لکھی ہوئی تھیں۔

میں نے تحریر کو دوبارہ غور سے دیکھا۔ وہ ایک ہی آدمی کے ہاتھ کی تحریر تھی۔ میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔

میں ہر فائل دیکھ کر راجا کی طرف بڑھا دیتا تھا۔ راجا کا چہرہ بھی جوش سے تمتما رہا تھا۔

ایک خط پولیس کے ایک اعلیٰ افسر کے نام تھا۔ اس میں لکھا تھا ”میں اپنا آدمی بھیج رہا ہوں، اسے وہ رقم دے دو جو تم پر واجب ہے۔“ اس کے نیچے بھی مسکین شاہ کے دستخط تھے۔

راجا تو گویا جوش سے اچھلنے لگا۔ اس نے کہا۔ ”میں نے بھی اس مسکین شاہ کو واقعی مسکین بنا کر نہ چھوڑا تو میرا نام راجا نہیں۔“

ان فائلوں کے نیچے دو تین آڈیو کیسٹ تھے۔ آڈیو کیسٹ پلیئر اب متروک ہو چکے ہیں لیکن اب بھی دکانوں پر مل جاتے ہیں۔

”ٹھیکے پتر!“ راجا نے کہا۔ ”میں نے ایک کیسٹ پلیئر اور ریکارڈر یہاں تیرے بیڈ روم میں بھی دیکھا تھا۔“

”میرے بیڈ روم میں؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”یار، جس بندے سے تو نے کوٹھی خریدی ہے، وہ اپنا سارا سامان تو یہیں چھوڑ کر گیا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ تیرے بیڈ روم میں ایک ٹیپ ریکارڈر اور کیسٹ پلیئر بھی تھا۔“

”اگر تھا بھی تو اس کا علم نیلم کو ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”وہی میرے کمرے کی صفائی کرتی ہے۔“

راجا نے غنی کو آواز دے کر کہا کہ نیلم کو یہاں بھیج دو۔

تھوڑی دیر بعد نیلم کمرے میں داخل ہوئی۔

”نیلم! یہاں کوئی ٹیپ ریکارڈر بھی تھا؟“ میں نے پوچھا۔

وہ سہم کر رہ گئی۔ ”جی صاحب جی! وہ ...... اس میں ...... ریڈیو بھی تھا ...... تو میں ...... اسے اپنے ...... کمرے میں ...... لے گئی تھی ...... آپ تو ...... اسے ...... استعمال نہیں کرتے ہیں ...... میں نے ......“

”ذرا وہ ٹیپ ریکارڈر لے آؤ۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔

نیلم شاید سمجھ رہی تھی کہ میں ٹیپ ریکارڈر اٹھانے پر اسے ڈانٹوں گا۔

وہ فوراً ٹیپ ریکارڈر لے کر آ گئی۔

”مجھے کچھ کام ہے، پھر یہ ٹیپ ریکارڈر تم واپس لے جانا۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔

نیلم خوش ہو گئی کہ میں اس سے ناراض نہیں ہوں۔ اس کے جانے کے بعد راجا نے ٹیپ ریکارڈر میں کیسٹ لگا کر ریوائنڈ کیا اور اسے پلے کر دیا۔

اس میں سے مہناز کی آواز ابھری۔ ”میرا تجھ سے ایسا بندھن ہے، جیسے دل سے رشتہ دھڑکن کا!“

راجا نے میری طرف مایوسی سے دیکھا۔

میں نے اس سے زیادہ اپنی مایوسی کم کرنے کو ہنس کر کہا۔ ”یار! یہ گانا بھی بہت اچھا ہے، چل یہ گانا ہی سن لیں۔“

"ٹھیکے پتر!" راجا نے کہا۔ "تو کسے دھوکا دے رہا ہے؟ مجھے یا اپنے آپ کو؟"

گانا مسلسل چل رہا تھا۔ "ہو جیسے دھرتی سے ناتا ساون کا! میرا تجھ سے ایسا بندھن......"

اچانک گانا ختم ہو گیا اور ایک آواز ابھری۔ "ہیلو! کیا اب مجھے بار بار فون کرنا پڑے گا؟ رقم اب تک کیوں نہیں پہنچی؟...... کوئی مہلت نہیں...... تم کئی مہینوں سے یہی کر رہے ہو...... کل تک رقم نہ پہنچی تو...... تمہاری بیٹی کی ویڈیو پوری مارکیٹ میں پھیل جائے گی۔"

دوسری طرف سے بولنے والے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ لگتا تھا کہ آفتاب خان نے کسی خفیہ ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے یہ گفتگو ریکارڈ کی تھی۔ فون اگر ٹیپ ہوتا تو دونوں طرف کی گفتگو ریکارڈ ہوتی۔

دوسری کیسٹ میں صرف نور جہاں کے درد بھرے گانے تھے لیکن بالکل آخر میں مسکین شاہ نے ایک پولیس افسر کا نام لے کر اسے گالی دی تھی اور کہا تھا۔ "تو اس زعم میں مت رہنا زاہد کہ تو ایس ایس پی ہے۔ تو اچھی طرح جانتا ہے کہ مجھے یہاں تک پہنچایا کس نے ہے؟ تو اب مسکین شاہ کو دھوکا دے گا...... اب تو مجھے ہی ڈبل کراس کر رہا ہے، تیری......" اس نے جملے کے شروع اور آخر میں انتہائی فحش گالیاں دیں اور بولا۔ "حرام زادے! تو بھول گیا کہ تیری ویڈیو فلم میرے پاس ہے۔ میں تجھے نہ صرف جیل بھجوا دوں گا بلکہ تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا......" اس نے پھر ایک گالی دی۔

تیسری کیسٹ میں بھی گانوں کے درمیان میں ایسی ہی گفتگو تھی لیکن اس میں کسی کا نام نہیں لیا گیا تھا۔

راجا کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ "ٹھیکے پتر! تو نے تو واقعی تیر مارا ہے۔ میں نے تو کل رات مذاق میں یہ کہا تھا۔" وہ جوش میں آ کر مجھ سے لپٹ گیا۔

شامی بھی نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ میں نے بہت احتیاط سے وہ آڈیو کیسٹ، فائلیں اور تمام ڈی وی ڈیز بریف کیس میں رکھ کر اسے الماری میں رکھ دیا۔

"ٹھیکے پتر!" راجا نے کہا۔ "میں پہلی فرصت میں ان آڈیو کیسٹس کو سی ڈی پر منتقل کرا لوں گا۔ کیسٹ کا تو کوئی بھروسا نہیں کہ کب اس کا ٹیپ پھنس جائے یا ٹوٹ جائے بلکہ میں تو اس کی کئی کاپیاں بنواؤں گا۔ اب تو اونٹ پہاڑ کے نیچے آیا ہے۔"

مسکین شاہ جو دنیا کے سامنے بہت نیک طینت، پاکباز اور عوام کا ہمدرد بنتا تھا، اس کا اصل چہرہ بہت گھناؤنا تھا لیکن اب اس کے ظلم کی درازرسی کو اللہ نے ہمارے ذریعے کھینچنے کا بندوبست کر دیا تھا۔ سنو کہ ہم بندگان بے بس، علیم بھی ہیں، خبیر بھی ہیں، سزا جزا اب یہیں پر ہوگی، یہیں پر یوم حساب ہوگا! مجھے فیض کی ایک نظم یاد آئی جو مسکین شاہ کے حسب حال تھی۔ وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر۔ وہ حساب ہم نے چکا دیا۔

ناصر کمرے میں داخل ہوا تو ہمیں دیکھ کر چونک اٹھا اور بولا۔ "کوئی خاص بات ہے، آپ لوگ اتنے خوش کیوں نظر آ رہے ہیں؟ کیا آئی جی صاحب نے اس ڈی آئی جی کے خلاف کوئی ایکشن لے لیا؟"

"یہ تو بہت چھوٹی بات ہے ناصر!" راجا نے کہا۔ "تم سنو گے تو تمہارے ہوش اڑ جائیں گے۔"

"یار، اس سے پہلے کہ راجا تمہارے ہوش اڑائے، تم ذرا یہ ڈی وی پلیئر کمپیوٹر میں لگا دو۔" میں نے ہنس کر کہا۔

ناصر کو اتنا اندازہ نہیں تھا کہ راجا نے یہ بات کیوں کہی ہے، اس نے فوراً ہی ڈی وی پلیئر مانیٹر کے ساتھ منسلک کر دیا۔

میں نے الماری سے وہ ڈی وی نکالی جو ارشد سے حاصل کی تھی اور ناصر کو دے دی۔

ناصر اسے ریوائنڈ کرنے لگا اور میرا دل نہ جانے کیوں زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ڈی وی کو ریوائنڈ کرنے کے بعد اس نے پلے کا بٹن دبا دیا۔

وہ ایک پولیس آفیسر کی ویڈیو تھی۔ اس میں بھی سب کچھ وہی تھا جو دوسری ویڈیوز میں تھا۔ راجا نے اٹھ کر دروازہ اندر سے بند کر دیا کہ کہیں نیلم یا گولی میں سے کوئی اچانک کمرے میں نہ آ جائے۔

تیسری ویڈیو دیکھ کر میرا دل اتنی زور زور سے دھڑکنے لگا گویا پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ وہ میری ہی ویڈیو فلم تھی۔ میں اس وقت نشے میں دھت لگ رہا تھا۔ ثمرہ بھی نشے میں تھی، پھر مجھ سے مزید دیکھا نہ گیا اور میں نے چیخ کر کہا۔ "بند کرو اسے۔"

ناصر نے گھبرا کر ڈی وی پلیئر آف کر دیا۔

راجا نے بھی چونک کر مجھے دیکھا اور گھبرا کر بولا۔ "ٹھیکے پتر! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں، میری طبیعت ٹھیک ہے۔" میں نے گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں میلوں سے بھاگتا چلا آ رہا ہوں، پسینا میرے چہرے پر پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔

موسم میں خنکی تھی اس کے باوجود راجا نے اٹھ کر اسپلٹ آن کر دیا اور تولیا اٹھا کر میرے چہرے کا پسینا خشک کرنے لگا۔ ناصر نے پانی کا گلاس بھر کے مجھے دیا جسے میں نے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

"ٹھیکے پتر!" راجا نے کہا۔ "تو لیٹ جا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے جبراً مسکرانے کی کوشش کی۔ "بس ویڈیو دیکھ کر فوری طور پر مجھے اپنے وجود سے کراہیت محسوس ہوئی تھی کہ میں ایسی گھناؤنی حرکتیں بھی کر سکتا ہوں۔"

"تجھے کیوں شرمندگی اور کراہیت محسوس ہو رہی ہے؟" راجا نے کہا۔ "ٹھیکے پتر! تو اپنے ہوش میں ہی کب تھا؟"

"لیکن راجا! اگر یہ ویڈیو کوئی اور دیکھتا تو میرا امیج تو خاک میں مل جاتا۔ مجھے تو اپنے ملک میں منہ چھپانے کو جگہ نہ ملتی اور مجھے یہاں سے کہیں اور جانا پڑتا۔ اگر یہ ویڈیو جمال خان شیروانی دیکھ لیتا تو اس کا کیا حال ہوتا۔ ہمارے لاکھ سمجھانے کے باوجود بھی وہ غصے میں پاگل ہو کر مجھے قتل کرنے نکل کھڑا ہوتا۔"

میری حالت آہستہ آہستہ اعتدال پر آ گئی۔

راجا فریج سے کولڈ ڈرنک نکال لایا اور مجھے دیتے ہوئے بولا۔ "ٹھیکے پتر! اسے پی جا۔"

"یار، تم لوگوں نے تو مجھے مریض بنا دیا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "وقتی طور پر میرا بلڈ پریشر بڑھ گیا ہوگا۔ اب میں بالکل نارمل ہوں۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تو ذہنی طور پر بھی نارمل ہو جائے۔" راجا نے کہا۔ "لیکن ڈاکٹر کہتے ہیں کہ پیدائشی ایب نارمل لوگوں کا علاج ممکن نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا بھی ہے تو بہت طویل ہوتا ہے۔" راجا اپنی بے سروپا باتوں سے مجھے ہنسانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ناصر نے اچانک کہا۔ "راجا! تم مجھے کوئی ایسی خبر سنانے والے تھے کہ میرے ہوش اڑ جائیں؟"

"او بھائی! میں دو دو ایب نارمل لوگوں کو کیسے سنبھالوں گا؟" راجا نے ہنس کر کہا۔

"مہاراجا! اب ناصر کو بتا بھی دے۔" میں نے کہا۔ "اسے بھی خوش ہونے کا حق ہے۔"

راجا نے ناصر کے سامنے پہلے فائلیں رکھ دیں۔ میں ناصر کے چہرے کا بہ غور جائزہ لے رہا تھا۔ وہ جیسے جیسے فائلیں اور ان میں لگے کاغذات پڑھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بھی جوش سے سرخ ہوتا جا رہا تھا۔

"مسکین شاہ تو گیا کام سے۔" ناصر نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"ایک منٹ!" راجا نے کہا۔ "ابھی تیرے ہوش کہاں اڑے ہیں؟"

اس نے آڈیو کیسٹس نکالیں اور ایک ایک کر کے اسے سنا دیں۔

ناصر نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ "ہرا! اب میں دیکھتا ہوں کہ یہ مسکین شاہ، دلاور اور رانا زوہیب کتنے بڑے بدمعاش ہیں؟"

"دیکھا، اڑ گئے نا ہوش!" راجا نے چہک کر کہا۔

"میرے تو صرف ہوش اڑے ہیں، مسکین شاہ تو اب عالم بالا کی طرف پرواز کرنے والا ہے۔" وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ "یار، یہ آفتاب خان بہت ذہین بھی ہے اور کمینہ بھی! اس نے اپنے ہی باس کو بلیک میل کرنے کا سامان کر رکھا تھا۔"

"مسکین شاہ اس سے بھی بڑا کمینہ ہے۔" میں نے کہا۔ "آفتاب خان جانتا ہوگا کہ آئندہ مسکین شاہ اس کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ اس نے احتیاط کے طور پر یہ سب کچھ کر ڈالا۔"

"جو اس کے کام تو نہ آ سکا لیکن ہمارے کام آئے گا۔"

"یہ بھی ایک طرح سے اس کے کام آئے گا۔" ناصر نے کہا۔ "مسکین شاہ راستے سے ہٹ جائے گا تو آفتاب خان محفوظ ہو جائے گا۔ وہ سیاسی طور پر تو ختم ہو جائے گا لیکن زندہ تو رہے گا نا!"

"اب سوچو کہ ہم اس مہم کی ابتدا کہاں سے کریں۔" راجا نے کہا۔

"یار، پہلے تو ہمیں میڈم نور کو ان کے چنگل سے نکالنا ہے۔" ناصر نے کہا۔ "وہ گویا مایوس اور بددل ہو کر یا انتقاماً انہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

اچانک میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ اسکرین پر جمال خان شیروانی کا نام تھا۔

"ہیلو!" میں نے سیل فون کان سے لگا کر کہا۔

"نواب رفیق!" شیروانی صاحب کی پژمردہ آواز سنائی دی۔ "ان لوگوں نے دھمکی دی ہے کہ اگر آپ نے ابھی آدھے گھنٹے کے اندر اندر ارم کو نہ چھوڑا تو وہ میری بیٹی کی ویڈیو مارکیٹ میں پھیلا دیں گے۔"

"آپ ان کی دھمکیوں میں مت آئیں۔" میں نے

کہا۔ ”صرف ثمرہ کی حفاظت کا انتظام کرلیں۔ اس ویڈیو کا ماسٹر پرنٹ میرے پاس ہے۔ ابھی تک انہیں اس ویڈیو کو ڈی وی ڈی پر منتقل کرنے کا موقع ہی نہیں ملا ہے۔“

”نواب صاحب! کیا واقعی ایسا ہے؟“ شیروانی نے بے یقینی سے پوچھا۔

”جی ہاں، وہ ویڈیو میرے پاس موجود ہے لیکن آپ ان لوگوں پر یہ ظاہر مت کیجیے گا کہ آپ کو اس کا علم ہوگیا ہے۔ وہ اگر دھمکی دیں تو آپ بھی درشت لہجے میں جواب دیں کہ تم لوگ جو کرنا چاہتے ہو، کرلو۔“

”کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“ جمال خان شیروانی کو ابھی تک میری بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

”اگر آپ چاہیں تو اس ویڈیو کا ماسٹر پرنٹ میں آپ کو بھی دکھا سکتا ہوں لیکن آپ اسے دیکھ نہیں سکیں گے۔ آپ میری بات پر یقین کریں، وہ ویڈیو واقعی میرے پاس ہے۔ ہاں، وہ لوگ جھنجلا کر ثمرہ کو اغوا کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں۔“ میں بولتے بولتے رکا، پھر کہا۔ ”شیروانی صاحب! آپ کے بیٹے کے بھی بچے ہیں؟“

”میرا ایک پوتا ہے جو ابھی بہت چھوٹا ہے۔“ جمال خان شیروانی نے جواب دیا۔

”دشمن آپ کے پوتے یا بہو کو بھی اغوا کرسکتے ہیں اور آپ کے بیٹے کو بھی۔“ میں نے کہا۔ ”آپ ان کی حفاظت کا بھرپور بندوبست کردیں اور مطمئن ہوجائیں۔“

”میں نے اپنے اعتبار کے ایک ایس ایس پی کی ڈیوٹی اپنے بنگلے پر لگوالی ہے۔ وہ بہت نیک نام افسر ہے۔“

”ایس ایس پی کا نام کیا ہے؟“ میں نے یونہی پوچھ لیا۔

”اس کا نام زاہد علی ہے۔“ جمال خان شیروانی نے جواب دیا۔

میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ مسکین شاہ نے بھی کسی ایس ایس پی زاہد کا نام لیا تھا۔

میں نے جمال خان شیروانی سے پوچھا۔ ”آپ زاہد صاحب کو کب سے جانتے ہیں؟“

”میری ان سے دو چار ملاقاتیں ہوئی ہیں لیکن وہ پولیس کے محکمے کے خاصے نیک نام اور ایمان دار افسر ہیں۔ ان کے بارے میں یہی مشہور ہے۔“

”شیروانی صاحب! آپ اس ایس ایس پی کو فوراً وہاں سے ہٹا دیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں، وہ انتہائی کمینہ اور گھٹیا آدمی ہے۔“

”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟“ شیروانی الجھ کر بولا۔

”اس لیے کہ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ کو کس نے مشورہ دیا تھا کہ ایس ایس پی زاہد کی ڈیوٹی وہاں لگائیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے سیکریٹری داخلہ سے بات کی تھی۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ زاہد بہت ایمان دار افسر ہے۔ مجھے بھی ان کی شخصیت میں بہ ظاہر ایسی کوئی برائی نظر نہیں آئی اس لیے میں نے انہیں ڈیوٹی پر بلالیا۔“

”سیکریٹری خارجہ بھی کوئی نیک نام آدمی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بات تو آپ بھی اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ آپ سے اس کا ملنا جلنا رہتا ہوگا۔ یوں بھی وہ آپ ہی کی طرح ایک اعلیٰ سول افسر ہے۔“

”ہاں، میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ انتہائی رشوت خور اور گھٹیا انسان ہے۔“ جمال خان شیروانی نے کہا۔

”اور آپ نے اس گھٹیا انسان کے مشورے پر ایک دوسرے گھٹیا انسان کو اتنی بڑی ذمے داری سونپ دی۔ آپ فوراً اسے وہاں سے چلتا کریں۔“

”اچھا، میں اسے اپنے بنگلے سے ہٹا دیتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

میرے دل میں نہ جانے کیوں وسوسے اٹھ رہے تھے۔ میں نے غنی سے کہا کہ گاڑی نکالو۔

”کہاں جارہا ہے فیکے پتر؟“ راجا نے چونک کر پوچھا۔

”میں ذرا جمال خان شیروانی کے بنگلے کی طرف جارہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”فیکے پتر، تو واقعی پاگل ہوگیا ہے۔“ راجا نے کہا۔ ”جمال خان شیروانی تجھے اس حلیے میں پہچانے گا کب؟“

”میں اس سے ملوں گا ہی نہیں، بس ذرا اس کے بنگلے کی نگرانی کروں گا۔ میری چھٹی حس کسی خطرے کی گھنٹی بجا رہی ہے۔“

”چھٹی حس؟“ راجا نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔ ”کیا تجھے یقین ہے فیکے پتر کہ تیری بقیہ پانچوں حسیں کام کررہی ہیں؟“

”یہ مذاق کا وقت نہیں ہے راجا!“ میں نے جھنجلا کر کہا۔

”پھر تو اکیلا نہیں جائے گا۔“ راجا نے کہا۔

”میں اکیلا کب جارہا ہوں۔ غنی اور احمد شاہ کو ساتھ لے جارہا ہوں؟“ میں نے کہا۔

”میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔“ راجا نے فیصلہ کن

لہجے میں کہا۔

”خدمت کر راجا!“ میں نے کہا۔

”ہاں میرے لیے تو تو ایسے ہی جملے استعمال کرے گا، خدمت کر، پلے پر چل، دو دن رہ، ابا تالا لایا۔“

”راجا! کبھی تو سنجیدہ ہوجایا کر۔“ میں نے کہا۔ ”تم لوگوں کا یہاں رہنا ضروری ہے۔ تو شاید بھول گیا ہے کہ ہمارے قبضے میں آفتاب خان کی بیٹی ہے۔“

”سر ٹھیک کہہ رہے ہیں راجا!“ ناصر نے کہا۔ ”ہم لوگوں کا یہاں رہنا بہت ضروری ہے، سر تو صرف باہر سے جمال خان شیروانی کے بنگلے کا جائزہ لیں گے۔ ان کے ساتھ احمد شاہ اور غنی جیسے لوگ ہیں۔“

”اچھا، مجھ سے سیل فون پر رابطہ رکھنا۔“ راجا نے کہا۔

غنی گاڑی پورچ میں لے آیا تھا۔ اس مرتبہ بھی اس نے ڈبل کیبن پک اپ نکالی تھی۔ وہ گاڑی کے پاس بہت مستعد انداز میں کھڑا ہوا تھا۔

”احمد شاہ کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”اسے بھی بلالو۔“

غنی فوراً ہی اندر کی طرف چل دیا۔ پھر فوراً ہی وہ مجھے احمد شاہ کے ساتھ نظر آیا۔

”سر ہم لوگ پوری طرح مسلح ہیں۔“ احمد شاہ نے جواب دیا۔

”ہمیں وہاں کسی ایسی صورتِ حال کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا کہ ہتھیار استعمال کرنے کی نوبت آجائے لیکن نوبت آبھی سکتی ہے۔“ میں نے کہا۔

اچانک شامی مین گیٹ کی ذیلی کھڑکی سے اندر داخل ہوا۔

”وہ مجھے دیکھ کر چونکا اور تیزی سے میری طرف بڑھا۔ میں اس وقت تک گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔

”کہاں چلے نواب بھائی؟“ شامی نے پوچھا۔

”میں ایک ضروری کام سے جارہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”چلو، پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“ شامی نے کہا اور عقبی نشست کا دروازہ کھول کر میرے ساتھ بیٹھ گیا۔

میں نے غنی کو چلنے کا اشارہ کیا۔ اس نے گاڑی گیٹ سے باہر نکال کر پوچھا۔ ”کس طرف چلوں سر؟“

”گلبرگ!“ میں نے جواب دیا۔ ”تم نے جمال خان شیروانی کا بنگلا دیکھا ہے؟“

”میں نے ابھی تک نہیں دیکھا۔“ غنی نے جواب دیا۔

”تم گلبرگ پہنچ کر چودھری ظہور الٰہی روڈ پر پہنچو۔ میں وہاں سے تمہیں پتا سمجھادوں گا۔“

”خیریت تو ہے نواب بھائی؟“ شامی نے پوچھا۔ ”جمال خان شیروانی کے بنگلے پر جانے کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟“

”مجھے لگ رہا ہے شامی کہ وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہونے والا ہے۔ تم اسے میری چھٹی حس کہہ لو۔“

پھر شامی خاموش ہوگیا۔ میں بھی خاموشی سے جمال خان شیروانی اور زاہد کے بارے میں سوچتا رہا۔ ہماری گاڑی گلبرگ کے علاقے میں داخل ہوچکی تھی۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے سیل فون جیب سے نکالا۔ اسکرین پر جمال خان شیروانی کا نام تھا۔

”ہیلو!“ میں نے سیل فون کان سے لگا کر کہا۔

”نواب صاحب! کچھ بدمعاش میری بیٹی کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔“ وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔

”کب؟“ میں نے پوچھا۔

”ابھی ایک منٹ پہلے وہ لوگ یہاں سے نکلے ہیں؟“

”گاڑی کا نمبر تو آپ نے نوٹ کیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نمبر تو نوٹ نہیں کرسکا لیکن وہ آف وہائٹ کرولا ہے۔ اسی سال کا ماڈل ہے۔“

غنی چودھری ظہور الٰہی روڈ پر گھوما تو مجھے ایک کرولا تیزی سے مخالف سمت سے آتی دکھائی دی۔

”غنی گاڑی روکو۔“ میں نے چلّا کر کہا۔

غنی نے گھبرا کر بریک لگادیے۔

کرولا تیز رفتاری سے ہمارے سامنے سے گزر گئی۔ مجھے اس میں ثمرہ کی صرف ایک جھلک دکھائی دی۔ میں نے غنی سے کہا۔ ”گاڑی کو یوٹرن دے کر اس کرولا کا پیچھا کرو؟“

غنی نے بہت خطرناک انداز میں یوٹرن لیا۔ جلد بازی میں اس نے مخالف سمت سے آنے والی کوسٹر کا بھی خیال نہ کیا۔

کوسٹر کا ڈرائیور اگر ماہر نہ ہوتا تو بہت خوف ناک تصادم ہوتا۔ بس سیکنڈوں کے فرق سے ہماری گاڑی نکل گئی۔ کوسٹر کے ڈرائیور نے غنی کو چیخ کر گالی دی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید غنی اس سے بھڑ جاتا لیکن اس وقت تو ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔

غنی کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہوگیا۔

”ہوتا ہے، ایسا بھی ہوتا ہے۔“ شامی نے غنی کی پیٹھ

تھپک کر کہا۔ ''ویسے غلطی تمہاری ہی تھی۔ اب ڈرائیونگ پر دھیان دو اور غصہ تھوک دو۔''

غنی نے ایک نظر مجھ پر ڈالی، پھر سر جھٹک کر گاڑی کی رفتار خوف ناک حد تک بڑھا دی۔ دو منٹ کی برق رفتار ڈرائیونگ کے بعد مجھے وہ ٹویوٹا نظر آ گئی۔

''اب ذرا احتیاط سے چلو غنی!'' میں نے کہا۔ ''ان لوگوں کو یہ احساس نہیں ہونا چاہیے کہ ہم ان کا تعاقب کر رہے ہیں۔''

''پہلے یہ تو کنفرم کر لو کہ یہ ہماری مطلوبہ ٹویوٹا ہے یا کوئی اور ہے؟'' شامی نے کہا۔

''یہ وہی ٹویوٹا ہے شامی بادشاہ!'' احمد شاہ نے کہا۔ ''جب غنی نے بریک لگایا تھا، میں نے اسی وقت اس کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔''

''ویری گڈ!'' میں نے خوش ہو کر کہا۔ ''مجھے ایسے ہی حاضر دماغ لوگوں کی ضرورت ہے۔''

گاڑیاں آگے پیچھے بھاگتی رہیں، ٹویوٹا کبھی دائیں مڑ رہی تھی، کبھی بائیں، پھر وہ چکر کاٹ کر مین روڈ پر آ جاتی تھی۔

''حرام زادہ!'' میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

''کیا ہوا نواب بھائی؟'' شامی نے پوچھا۔

''ان مردودوں کو شبہ ہو گیا ہے کہ ہم لوگ ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اپنے شبہے کی تصدیق کے لیے وہ لوگ بلا مقصد گاڑی ادھر ادھر دوڑا رہے ہیں۔''

''تو پھر ان لوگوں سے یہیں دو دو ہاتھ کیے لیتے ہیں۔'' شامی نے کہا۔

''ہاں شامی بادشاہ!'' میں نے کہا۔ ''میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔''

میں نے کہا اور غنی سے مخاطب ہوا۔ ''غنی! گاڑی کی رفتار بڑھاؤ اور اس ٹویوٹا کے نزدیک لے چلو۔''

غنی نے ایکسی لریٹر پر پیر کا دباؤ بڑھا دیا۔

ہمیں دھچکا سا لگا اور گاڑی جیٹ فائٹر کی طرح دوڑنے لگی۔

میں نے عقبی نشست سے کچھ آگے کھسک کر اسپیڈ میٹر چیک کرنا چاہا لیکن دیکھ نہ سکا۔

''غنی!'' میں نے کہا۔ ''ہماری گاڑی اتنی طاقت ور اور برق رفتار تو ہے نہیں، تم نے کیا انجن میں کچھ......''

''جی سر!'' غنی نے نظریں ونڈ اسکرین پر جمائے جمائے کہا۔ ''یہ گاڑی ہمیشہ ہمارے ہی استعمال میں رہتی ہے، میں نے اپنی ہی ورک شاپ میں لے جا کر گاڑی کے انجن میں کچھ تبدیلیاں کرائی ہیں۔''

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہم اس وقت ملتان روڈ پر ہیں۔ اس بھاگ دوڑ میں مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ ہم کن کن راستوں سے گزر رہے ہیں۔

اچانک ٹویوٹا سے ایک فائر ہوا اور گولی ہماری گاڑی کے بائیں دروازے سے رگڑ کھاتی ہوئی گزر گئی۔ فوراً ہی احمد شاہ نے بھی ریوالور نکال لیا اور کھڑکی میں سے ہاتھ نکال کر ٹویوٹا پر فائر کر دیا۔

اس فائر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ احمد شاہ بہترین نشانے باز تھا لیکن بائیں ہاتھ سے کسی چلتی ہوئی گاڑی کو نشانہ بنانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس صورت میں مزید مشکل ہو جاتا ہے جب ہدف کا صحیح طور پر نشانہ نہ لیا جا سکے۔

ٹویوٹا سے دوسرا فائر ہوا تو گولی گاڑی کی چھت سے ٹکرا کر نکل گئی۔

احمد شاہ نے ریوالور کے دستے سے ونڈ اسکرین توڑ دیا۔ اب وہ ٹویوٹا کو نشانے پر لے سکتا تھا۔

اس نے ٹویوٹا کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ٹویوٹا کو لہراتے دیکھا۔ احمد شاہ نے اس کے ایک ٹائر کو نشانہ بنایا تھا۔ اس نے دوسرا فائر کیا اور دوسرا عقبی ٹائر بھی ناکارہ کر دیا۔

گاڑی فوراً ہی رک گئی۔ غنی نے بھی بریک لگا دیے۔

''وہ لوگ گاڑی سے اتر کر بھاگ رہے ہیں سر!'' احمد شاہ نے کہا۔ ''کچھ لوگ بائیں طرف کی جھاڑیوں میں گئے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔ دو آدمی دائیں طرف بھاگے ہیں۔''

پھر احمد شاہ بھی دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر کود گیا۔ میں نے عقبی دروازہ کھولا اور باہر چھلانگ لگا دی۔ باہر کود کر میں نشیب میں لڑھکتا ہوا چلا گیا۔ اسی وقت شامی کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ وہ غنی سے کہہ رہا تھا۔ ''ہم لوگ دوسری طرف سے انہیں گھیرتے ہیں غنی!''

میں نے گاڑی سے باہر آنے کے بعد ارد گرد کا جائزہ لیا۔ ہم لوگ کسی متروک سڑک پر تھے۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ لوگ اتنی آزادی اور دیدہ دلیری سے فائرنگ کیسے کر رہے تھے۔

احمد شاہ مجھ سے آگے تھا لیکن اس وقت وہ جھاڑیوں میں نہ جانے کس طرف نکل گیا تھا۔ میں بھی اندازے سے اس طرف بڑھا جدھر ان لوگوں کی موجودگی کا امکان تھا۔ پھر میں آگے بڑھتا ہی چلا گیا لیکن مجھے ان لوگوں کا کوئی سراغ نہ ملا۔ احمد شاہ بھی جھاڑیوں میں کہیں گم ہو گیا تھا۔

میں مزید آگے بڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ میری بائیں جانب والی جھاڑیوں اور خودرو گھاس میں اچانک ہلچل سی پیدا ہوئی۔ میں پھرتی سے جھاڑیوں میں لیٹ گیا۔

پھر میں نے کسی کی گھٹی گھٹی آواز سنی۔ ''اب بھاگنے کی یا آواز نکالنے کی کوشش بھی کی تو گلا دبا دوں گا۔''

میں جھاڑیوں میں لیٹے ہی لیٹے آواز کی جانب سرکنے لگا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ بولنے والے نے احمد شاہ کو مخاطب کیا ہے یا کسی اور کو؟ ممکن ہے ان لوگوں نے احمد شاہ پر قابو پا لیا ہو؟ میں نے سوچا لیکن احمد شاہ اتنی آسانی سے ان کے ہاتھ آنے والا نہیں تھا کہ وہ خاموشی سے اسے بے بس کر دیتے۔

''تو کیا سمجھتی ہے۔'' وہی آواز پھر سنائی دی۔ آواز میں غراہٹ نمایاں تھی لیکن بولنے والا بہت دبے دبے لہجے میں بول رہا تھا۔ ''تیرے باپ کے بھیجے ہوئے یہ آدمی تجھے یہاں سے چھڑا کر لے جائیں گے؟ اگر ایسا کوئی موقع......''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا اور اس کے حلق سے ایک کراہ بلند ہوئی۔

پھر فوراً ہی کوئی سرگوشی میں بولا۔ ''خاموشی سے میرے ساتھ چلو...... جلدی کرو...... میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔''

یہ آواز سن کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ وہ آواز احمد شاہ کی تھی۔

''لیکن تم ہو کون؟'' اس مرتبہ مجھے ثمرہ کی آواز سنائی دی۔

''میں نے کہا نا کہ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔'' احمد شاہ سرگوشی میں بولا۔ ''بس اب نکل چلو۔''

اسی وقت مجھے دائیں جانب کی جھاڑیوں میں ہلکی سی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے غور سے ادھر دیکھا۔ کوئی بہت محتاط انداز میں اس طرف بڑھ رہا تھا جہاں احمد شاہ موجود تھا۔

میں بھی محتاط انداز میں اسی طرف کھسکنے لگا۔

میں کچھ اور آگے بڑھا تو مجھے جھاڑیوں کی اوٹ میں ایک شخص نظر آیا۔ اس کا رخ احمد شاہ کی طرف تھا اور ہاتھ میں لمبی نال کا ریوالور تھا۔ شاید اس نے ریوالور پر سائلنسر فٹ کر رکھا تھا۔

اچانک کچھ فاصلے پر ایک فائر ہوا۔ وہ بدک کر پلٹا تو اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر فائر کرتا۔ میرے ریوالور نے شعلہ اگلا اور دھماکے کے ساتھ ہی اس کے حلق سے کرب ناک چیخ بلند ہوئی۔ گولی اس کے سینے میں پیوست ہو گئی تھی۔

کم عمر بیٹے نے باپ سے پوچھا۔ ''ابو، ابو پاگلوں کو کیسے قابو کیا جاتا ہے؟''

''اچھے میک اپ، خوبصورت لباس اور دلکش اداؤں کے ذریعے میرے بچے۔'' باپ نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

زمین پر گرنے کے بعد اس نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا اور اوندھے منہ گر گیا۔

میں تیزی سے آگے بڑھا اور اس کا جائزہ لیا۔ وہ زندگی کی قید سے نجات پا چکا تھا۔ میں نے اس کا ریوالور قبضے میں لیا اور بہت پھرتی سے اس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب میں چند سو روپوں کی رقم کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔

میں اس کی تلاشی لے کر فارغ ہوا ہی تھا کہ کوئی درشت لہجے میں بولا۔ ''بس، اب اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ورنہ......''

وہ آواز احمد شاہ کی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر میں فوراً گھوموں گا تو احمد شاہ سے کچھ بعید نہیں ہے کہ وہ فائر کر دے۔

''ویری گڈ احمد شاہ!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''بہت اچھے جا رہے ہو۔''

''سر!...... یہ آپ ہیں؟'' احمد شاہ نے کہا۔ ''آپ ٹھیک تو ہیں؟''

''ہاں، ابھی تک تو ٹھیک ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''سر، یہاں سے فوراً نکلیں۔ فائر کی آواز نے اس کے دوسرے ساتھیوں کو بھی چوکنا کر دیا ہوگا۔''

''چلو!'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

احمد شاہ کے ساتھ سہمی ہوئی ثمرہ بھی تھی۔

احمد شاہ جھکا جھکا اس طرف بڑھا جدھر ہماری گاڑی کھڑی تھی۔ میں ان دونوں کے پیچھے تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ ثمرہ کے علاوہ گاڑی میں چار آدمی اور تھے۔ جن میں سے دو تو ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے گویا دو ابھی باقی تھے، پھر مجھے اس فائر کا خیال آیا جس پر چونک کر میرے ہاتھوں مارے جانے والے آدمی نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ فائر کس نے کیا تھا؟ فائر کی آواز سے مجھے کچھ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ وہ فائر ریوالور سے کیا گیا ہے یا پستول سے؟ یقیناً احمد شاہ کو علم ہوگا۔ وہ آواز سن کر بتا سکتا تھا کہ فائر کس بور کے ریوالور

یا پستول سے ہوا ہے۔
اسی وقت پھر ایک کرب ناک چیخ بلند ہوئی اور خاموشی چھا گئی، پھر چند لمحے بعد ایک فائر مزید ہوا اور اس کے ساتھ ہی ایک اور کرب ناک چیخ بھی سنائی دی، پھر بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ بھاگنے سے گھاس اور جھاڑیوں میں سے عجیب طرح کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔

میں پوری طرح آواز کی طرف متوجہ تھا۔ احمد شاہ بھی اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ بھاگنے والا اسی طرف آ رہا تھا جہاں ہم موجود تھے۔ اچانک میرے سامنے ایک شخص آ گیا۔ اس نے گہرے رنگ کا شلوار قمیص پہن رکھا تھا۔ پیروں میں موٹے تلے والی پشاوری چپل تھی اور ہاتھ میں ریوالور تھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر اچانک ٹھٹک گیا اور ایک دم مجھ پر گن تان لی۔ اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا، کہیں سے ایک فائر ہوا اور ریوالور بردار کی کھوپڑی میں سوراخ ہو گیا۔ وہ چند لمحے کھڑا رہا، پھر کٹے ہوئے درخت کی طرح اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔

احمد شاہ نے گھوم کر دیکھا، پھر چونک کر بولا۔ ”یہ لڑکی کہاں گئی؟“

موقع پا کر ثمرہ وہاں سے فرار ہو گئی تھی۔

میں اور احمد شاہ تیزی سے اس طرف لپکے جس طرف ثمرہ فرار ہوئی تھی۔ وہ ان کانٹے دار جھاڑیوں میں زیادہ دور نہیں جا سکتی تھی۔

ہم مزید آگے بڑھے تو ثمرہ کی آواز سن کر ٹھٹک کر رک گئے۔ وہ چیخ رہی تھی۔ ”چھوڑ دو مجھے...... چھوڑ دو۔“

”چھوڑ دوں گا۔“ مجھے شامی کی آواز سنائی دی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ ”لیکن ہمیں اپنا دشمن مت سمجھو۔“

”میں کہتی ہوں مجھے چھوڑ دو ورنہ......“

میں اور احمد شاہ بھاگ کر وہاں پہنچے، ثمرہ شامی سے الجھی ہوئی تھی اور اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے بری طرح مچل رہی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر اچانک اس کی کنپٹیاں پکڑیں اور دبا دیں۔ وہ شامی کے ہاتھوں میں جھول کر رہ گئی۔

”اسے اٹھاؤ اور گاڑی کی طرف چلو۔“ میں نے احمد شاہ سے کہا۔

احمد شاہ نے اسے اپنے کندھے پر اٹھا لیا اور تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھا۔ غنی ہم سے پہلے ہی گاڑی تک پہنچ چکا تھا۔ ہم نے اسے گاڑی میں ڈالا اور غنی تیز رفتاری سے واپسی کے لیے روانہ ہو گیا۔

جب وہ مین روڈ پر آیا تو میں نے اس سے کہا۔

”غنی! مجھے اور شامی کو راستے میں اتار دو اور تم ثمرہ کو لے کر شیروانی کے بنگلے پر چلے جاؤ۔ احمد شاہ بھی تمہارے ساتھ ہوگا۔“

”او کے سر!“ غنی نے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”سر! میں شیروانی صاحب کو اپنے بارے میں کیا بتاؤں؟“

”بتا دینا کہ میں نواب صاحب کا چیف سیکیورٹی آفیسر ہوں اور نواب صاحب کی ہدایات پر آپ کے بنگلے پر ڈیوٹی دے رہا تھا۔“

”ٹھیک ہے سر!“ غنی نے کہا۔ ”میں سمجھ گیا۔“

اس نے مجھے اور شامی کو ایسی جگہ چھوڑ دیا جہاں ہمیں ٹیکسی آسانی سے مل سکتی تھی۔

میں ٹیکسی کی تلاش میں نظریں دوڑا رہا تھا کہ راجا کا فون آ گیا۔ ”سب خیریت تو ہے فیکے پتر؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں، سب خیریت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں آدھے گھنٹے میں گھر پہنچ رہا ہوں، پھر تجھے تفصیل سے سب کچھ بتاؤں گا۔“

”اچھا!“ راجا نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ”تو تفصیل سے بتانے کو بھی کچھ ہے؟“

”کچھ نہیں، بہت کچھ ہے مہاراجا!“ میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس وقت تک شامی ایک ٹیکسی روک چکا تھا۔

حسب عادت اس نے ٹیکسی دو بلاک پہلے ہی رکوا لی اور وہاں سے ہم محتاط انداز میں پیدل روانہ ہو گئے۔

گھر پہنچے تو راجا اور ناصر بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ شامی بھی میرے ساتھ ہے۔ میں نے انہیں ثمرہ کے اغوا اور پھر بازیابی کی تفصیل بتائی تو دونوں حیران رہ گئے۔

”فیکے پتر!“ راجا ہنس کر بولا۔ ”ہم فضول میں تیرے حواس خمسہ پر شک کر رہے تھے۔ تیری تو واقعی چھٹی حس بھی کام کر رہی ہے۔“

”اب جلدی سے میرے لیے کافی منگوا ورنہ میری ساتویں اور آٹھویں حس بھی کام کرنے لگیں گی۔“ میں نے کہا۔

”میں جانتا ہوں فیکے پتر! تو کتنا حساس ہے۔“

”یار ناصر!“ میں نے چونک کر کہا۔ ”میرے خیال میں اب ہمیں مزید اس حلیے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ابھی اپنے اس ہونق میک اپ ماسٹر کو بلاؤ تاکہ وہ ہمارا حلیہ درست کر سکے۔“

”سر، ضرورت تو اب بھی ہے لیکن......“

”میرے خیال میں ایسی کوئی خاص ضرورت نہیں

ہے۔“ میں نے زور دیتے ہوئے کہا۔

”ہاں یار ناصر!“ راجا نے کہا۔ ”میں خود اس حلیے سے تنگ آ گیا ہوں۔ کیا دشمنوں کے خوف سے ہم زندگی بھر ان ہی شکلوں کے ساتھ پھرتے رہیں گے؟“

”اچھا، میں اس میک اپ مین کو بلواتا ہوں۔“ ناصر نے ہنس کر کہا۔ پھر اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔

☆☆☆

میں نے کئی دن بعد اپنی شکل دیکھی تو عجیب سا احساس ہوا۔ ایسا لگا جیسے میں خود کہیں گیا ہوا تھا اور ابھی ابھی لوٹا ہوں۔ میں دیر تک آئینے کے سامنے کھڑا اپنا چہرہ دیکھتا رہا۔ اس دن مجھے اپنے چہرے کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ نہ جانے وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو پلاسٹک سرجری کے ذریعے اپنا وہ چہرہ کھو دیتے ہیں جو زندگی بھر ان کی شناخت رہتا ہے۔

میں تیار ہو کر باہر نکلا تو راجا اور ناصر لاؤنج ہی میں موجود تھے اور اپنی اصل شکلوں میں تھے۔

راجا تو بے اختیار مجھ سے لپٹ گیا اور بولا۔ ”فیکے پتر! کتنے عرصے بعد تجھے دیکھ رہا ہوں۔“

”او بھائی!“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”لگتا ہے تیرا دماغ بالکل ہی چل گیا ہے؟ ابھی پندرہ منٹ پہلے تو ہماری ملاقات ہوئی تھی۔“

”ہاں ہوئی تھی۔“ راجا نے کہا۔ ”لیکن وہ تو کوئی اجنبی تھا، جس کی ملاقات مجھ سے ہوئی تھی۔“

”اچھا اب یہ فلسفہ بگھارنا بند کر اور......“

”حالانکہ ابھی تنہائی میں یہی فلسفہ تو بگھار رہا تھا۔“ راجا نے میری بات کاٹ دی۔ ”توبہ توبہ آواز بلند سوچ رہا تھا فیکے پتر!“

”یار راجا!“ میں نے کہا۔ ”غنی اور احمد شاہ ابھی تک لوٹے نہیں؟“

”یار، وہ بچے تو ہیں نہیں جو تو اتنا فکر مند ہو گیا ہے۔“

”وہ بچے نہیں ہیں لیکن شیروانی کے بنگلے پر ایس ایس پی زاہد کی ڈیوٹی ہے۔ اس سے کچھ بعید نہیں کہ......“

ناصر اچھل پڑا۔ ”ہاں، ایس ایس پی زاہد سے کچھ بھی بعید نہیں کہ اس نے غنی اور احمد شاہ ہی کو اغوا کے شبہے میں دھر لیا ہو۔“

میں اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔

”اب تو کہاں چلا؟“ راجا نے پوچھا۔

”میں شیروانی کے بنگلے پر جا رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اس کمینے ایس ایس پی نے اگر اس گاڑی کی تلاشی لی ہوگی تو وہ غنی اور احمد شاہ پر ناجائز اسلحہ رکھنے کا کیس بھی بنا دے گا۔“

”لیکن وہ ایسا کیوں کرے گا؟“ ناصر نے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے کہ اسے یہ چکر چلانے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ غنی اور احمد شاہ کو گرفتار کرے گا پھر ان پر اغوا کا مقدمہ بنا کے انہیں حوالات میں بھجوا دے گا پھر......“

”ناصر!“ میں نے کہا۔ ”تم کیسے صحافی ہو کہ......“

”یار فیکے!“ راجا نے کہا۔ ”یہ مفروضے قائم کرنے

ریموٹ کنٹرول میں ٹی وی

ٹی وی کے ریموٹ کنٹرول میں ٹی وی دینے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن ایسا ہوا ہے یہ ”آل ان ون پریمیئر“ ریموٹ کنٹرول سام سنگ نے بنایا ہے۔ اس کا اپنا آڈیو سسٹم بھی ہے اور مختلف ٹی وی چینلز ٹیون ہو سکتے ہیں، اس کی ضرورت یوں پڑی کہ اگر آپ ٹی وی پر کوئی میچ دیکھ رہے ہیں اور بیگم صاحبہ ڈراما دیکھنا چاہتی ہیں تو آپ میں سے ایک ٹی وی اسکرین دیکھ لے، دوسرا ریموٹ کنٹرول سنبھال کر بیٹھ جائے۔

آئیڈیا پیڈ

ٹیبلٹ کمپیوٹر درمیانے سائز کے ایسے آلات ہیں، جنہیں آپ موبائل فون اور لیپ ٹاپ کے درمیان کی ٹیکنالوجی کہہ سکتے ہیں۔ لینوو نے آئیڈیا پیڈ متعارف کرایا ہے۔ یہ لیپ ٹاپ جیسا ہے لیکن اس کا ٹچ اسکرین کی بورڈ سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ یہ بڑے آئی فون جیسا لگتا ہے۔ ڈیجیٹل کتابیں پڑھنے، اطلاعات کو ترتیب دینے، تصاویر کا سائز تبدیل کرنے، ویب سرفنگ کے لیے بہترین ہے۔

فون کو الیکٹرونک ریڈر بنانے والا

نئے الیکٹرونک ریڈرز کے ہجوم میں یہ سافٹ ویئر نمایاں ہے جو کسی بھی لیپ ٹاپ، نوٹ بک یا اسمارٹ فون کو تصاویر سے مزین الیکٹرونک ریڈر میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ ”بائکیوای ریڈر“ پبلشر کی اور ڈیجیٹل پی ڈی ایف فائلز، کتابوں اور جرائد کے درست فارمیٹ کو محفوظ کر لیتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ ویڈیو اور ویب لنکس سمیت ملٹی میڈیا کو بھی سپورٹ کرتا ہے۔ یہ آن لائن دستیاب ہوگا۔ مزے کی بات کہ یہ بالکل مفت ہے۔

مرسلہ: ندیم ابراہیم...... دبئی

سے بہتر ہے کہ تو غنی کو فون کرلے۔''

''واہ!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''کیا زبردست بات کی ہے مہاراجا! یہ بات میرے ذہن میں کیوں نہیں آئی؟''

''اچھا زیادہ طنز کرنے کی ضرورت نہیں ہے پھیکے پتر!'' راجا منہ بنا کر بولا۔ ''تیرے ذہن میں کچھ اور ہو تو وہ بھی بتادے۔''

''او بھائی دانش مند! میں غنی کو پہلے ہی فون کر چکا ہوں۔ اس کا سیل فون بند ہے۔ اسی لیے تو مجھے پریشانی ہے۔ نہ صرف غنی بلکہ احمد شاہ کا سیل فون بھی آف ہے۔''

''یہ تو واقعی پریشانی کی بات ہے۔'' ناصر نے کہا۔

''اسی لیے میں جمال خان شیروانی کے بنگلے پر جا رہا ہوں۔''

''چل پھر میں بھی چلتا ہوں۔'' راجا نے کہا۔ ''ناصر کو بھی ساتھ لے لے۔ اگر زاہد واقعی کسی گڑبڑ کا ذمے دار ہے تو وہ میرے اور ناصر ہی کے قابو میں آئے گا۔''

''شامی بادشاہ!'' میں نے کہا۔ ''تمہارا گھر میں رہنا ضروری ہے۔ غنی اور احمد شاہ بھی موجود نہیں ہیں۔ اب ہم......''

''تم آپ فکر مت کرو نواب بھائی!'' شامی نے کہا۔ ''میں اور کوئی یہاں موجود ہیں۔ اس طرف سے تم بالکل مطمئن ہو جاؤ۔''

اس دفعہ میں نے اپنی ہی گاڑی میں جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسٹیئرنگ پر ناصر تھا۔ وہ غنی کی طرح گاڑی بہت تیز چلاتا تھا لیکن اس وقت زیادہ محتاط ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

ہم جمال خان شیروانی کے گھر کے نزدیک پہنچے تو مجھے دور ہی سے غنی کی ڈبل کیبن پک اپ دکھائی دی۔

''گاڑی کو باہر روکنے کے بجائے اندر پورچ میں لے لینا۔'' میں نے ناصر سے کہا۔

ناصر نے گیٹ پر پہنچ کر ہارن دیا تو بڑے گیٹ میں ایک ذیلی کھڑکی کھلی اور پولیس کا ایک سپاہی باہر آگیا اور بولا۔ ''جی سر، کس سے ملنا ہے آپ کو؟''

''شیروانی صاحب سے۔'' ناصر نے مختصر جواب دیا۔

''آپ کا نام سر!'' سپاہی نے پوچھا۔

''نواب رفیق احمد شیرازی آف ست بدھائی، شیروانی صاحب سے ملاقات کریں گے۔''

''نواب...... رفیق......'' وہ جلدی سے اندر کی طرف بڑھ گیا۔ پھر وہ جس تیزی سے اندر گیا تھا، اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے باہر آیا اور فوراً ہی بڑا گیٹ کھول دیا۔

برآمدے میں مجھے شیروانی صاحب کے ساتھ سادہ لباس میں ایک اور شخص نظر آیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہی ایس ایس پی زاہد ہے۔

مجھے گاڑی سے اترتا دیکھ کر جمال خان شیروانی صاحب میری طرف لپکے اور بولے۔ ''آیئے نواب صاحب!''

زاہد نے چونک کر مجھے دیکھا۔ جمال خان شیروانی نے اس سے میرا تعارف کرایا۔

زاہد نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن میں نے اسے نظر انداز کر دیا اور شیروانی صاحب سے پوچھا۔ ''شیروانی صاحب! آپ کی بیٹی تو خیریت سے پہنچ گئی؟''

''جی ہاں نواب صاحب!'' شیروانی نے جواب دیا۔

''وہ آپ کے آدمی ہیں؟'' زاہد نے پوچھا۔

''آپ کن آدمیوں کی بات کر رہے ہیں؟'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''وہی جو ثمرہ کو اغوا کر کے لے گئے تھے؟''

''ہوش میں رہ کر بات کرو آفیسر!'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''میرے آدمیوں نے تو اسے اغوا کرنے والوں سے بچایا ہے۔'' پھر میں جمال خان شیروانی سے مخاطب ہوا۔ ''میرے دونوں آدمی کہاں ہیں؟''

''وہ پولیس کی حراست میں ہیں۔'' زاہد نے جواب دیا۔

''کس جرم میں؟'' ناصر نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''شیروانی صاحب کی بیٹی کو اغوا کرنے کے جرم میں۔'' زاہد نے جواب دیا۔

''ویری گڈ!'' ناصر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''آپ تو خود یہ کام کرتے رہے ہیں ایس ایس پی صاحب!'' ناصر نے کہا۔ ''مسکین شاہ کے کہنے پر آپ نے کئی لڑکیوں کو اغوا کرا کے سمندر پار اسمگل کیا ہے۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' زاہد دہاڑ کر بولا۔ ''اور تم ہو کون؟''

''میں تو معمولی سا ایک جرنلسٹ ہوں ایس ایس پی صاحب لیکن جانتا سب کچھ ہوں۔''

''کیا جانتے ہو؟'' ایس ایس پی پھر دہاڑا۔ ''لگتا ہے تمہیں بھی حراست میں لینا پڑے گا۔''

یہ پرپیچ وسنسنی خیز داستان جاری ھے
مزید واقعات آیندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

جب کوئی بڑے بڑے مصائب و آلام کو آسانی سے جھیل جائے اور ایک آسان سا کام اسے مشکل ترین لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ عقل کے پھیر کا شکار ہے... اور اسی ہیر پھیر میں وہ بالآخر اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں اسے منہ کی کھانی پڑتی ہے... اگر رستہ بدلنے کے بجائے وہ بھی اپنا مزاج بدلتا تو شاید اتنا بدذائقہ منہ کرنے سے بچ جاتا۔

میں نہ مانوں ہار...... کی تفسیر اور تعزیر کا دلچسپ منظر نامہ

مریم کے خان

اپنے دام میں

انہیں صحرا میں بھٹکتے ہوئے آج تیسرا دن تھا اور ان کے پاس بمشکل سے دو دن کی خوراک اور پانی باقی رہ گیا تھا۔ شام کے سائے لمبے ہونے پر انہوں نے پڑاؤ ڈالنے کی تیاری شروع کر دی۔ ساری گڑبڑ وہاں سے شروع ہوئی جب ولیم نے مقامی آدمیوں سے جھگڑا کیا۔ وہ گائڈ اور پورٹر کے طور پر ان کے ساتھ تھے۔ ولیم کا خیال تھا کہ وہ انہیں غلط سمت میں لے جا رہے تھے۔ دراصل ولیم شروع سے ان کے خلاف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ لٹیروں کے ساتھی ہیں اور بالآخر انہیں صحرا میں کسی مصیبت میں پھنسا دیں گے۔ ماریا اور جیک اس سے متفق نہیں تھے۔ وہ دونوں میاں بیوی تھے اور ان کی ولیم سے ملاقات شمالی افریقا کے ملک مالی کے دارالحکومت بماکو میں ہوئی تھی۔ ماریا اور جیک کا تعلق کینیڈا سے تھا جبکہ ولیم امریکی تھا۔

ماریا تقریباً تیس سال کی ایک صحت منداور دلکش عورت تھی۔ اس نے جغرافیہ کے مضمون میں ماسٹرز کیا تھا۔ اسے ٹورنٹو کے ایک کالج میں لیکچرر کی پیشکش ہوئی تھی لیکن فی الحال وہ کچھ عرصے آرام اور تفریح کرنا چاہتی تھی۔ جیک ٹورنٹو میں ایک سیاحتی ادارہ چلا رہا تھا۔ وہ عام طور سے

افریقا کے لیے چیلنج بنا تا تھا لیکن عجیب بات تھی کہ خود اس نے کبھی افریقا کا سفر نہیں کیا تھا۔ اس لیے فارغ ہونے کے بعد ماریا نے اس سے افریقا کی سیر کی بات کی تو جیک سوچ میں پڑ گیا اور پھر وہ مان گیا۔ افریقا میں اس کے ایجنٹ کام کر رہے تھے اس لیے اسے وہاں کی سیاحت میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ انہوں نے دسمبر کے آخر میں شمالی افریقا جانے کا پروگرام بنایا، اس وقت وہاں کا موسم بہتر ہو جاتا تھا۔

مالی کا انتخاب ماریا نے کیا تھا، اس کی خواہش تھی کہ وہ دریائے نائیجر کے طاس کی طرف سفر کریں جس سے اس کی علمی قابلیت میں بھی اضافہ ہوتا اور ان کی تفریح بھی ہو جاتی۔ لیکن جیک کی خواہش تھی کہ اس سفر میں صرف وہی دونوں نہ ہوں بلکہ ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی شامل ہو جائیں تو بہتر رہے گا۔ اسے خوف تھا کہ افریقا میں ان دونوں میاں بیوی کو کوئی حادثہ پیش نہ آ جائے۔ اس نے ایسی لٹنے یا قتل کی بہت ساری کہانیاں سن رکھی تھیں۔ اس نے تو اس حد تک سنا تھا کہ افریقا کے بعض علاقوں میں سفید فاموں کو لوٹنا اور قتل کرنا جائز سمجھا جاتا تھا کیونکہ ان علاقوں میں سفید فاموں کو دشمن سمجھا جاتا تھا۔

جیک نے کوشش کی تھی کہ وہ سینیگال یا گیمبیا چلے جائیں لیکن ماریا کا کہنا تھا کہ یہ چھوٹے ملک ہیں اور یہاں دیکھنے کے لیے کچھ خاص نہیں ہے انہیں مالی یا اس جیسے کسی بڑے ملک جانا چاہیے۔ اس بار بھی ماریا کی بات مانی گئی اور انہوں نے مالی جانے کا فیصلہ کیا اور وہاں پر دریائے نائیجر کے طاس تک سفر کا ارادہ کیا۔ لیکن اس کا حتمی فیصلہ وہ مالی پہنچ کر کرتے۔ جیک کا کہنا تھا کہ یہ سفر آسان نہیں تھا۔ کیونکہ اس میں انہیں ویران صحراؤں سے گزرنا پڑتا۔ جیک نے ماریا سے کہا۔ ”جب تک ہمیں کچھ اور لوگ نہ مل جائیں ہم اس سفر پر نہیں جا سکتے۔“

ماریا کو امید تھی کہ بماکو میں انہیں دوسرے سیاح ضرور ملیں گے اور ان میں سے کچھ نہ کچھ دریائے نائیجر کی مہم میں ان کا ساتھ دینے پر آمادہ بھی ہو جائیں گے۔ لیکن جب وہ بماکو پہنچے تو انہیں خلافِ توقع بہت ہی کم مغربی سیاح نظر آئے۔ جیک کے مقامی ایجنٹ شہزور نے اسے بتایا کہ آج کل شمالی اور وسطی افریقا میں مغربی سیاحوں کا اغوا زوروں پر ہے۔ انہیں صحراؤں میں رکھا جاتا ہے جہاں حکومت کا میلوں تک نام و نشان نہیں ہوتا۔ پھر انہیں بھاری تاوان کے عوض رہا کیا جاتا تھا۔ تاوان براہِ راست ان کی حکومتوں سے لیا جاتا تھا۔ جن سیاحوں کا تاوان نہیں دیا جاتا تھا انہیں صحرا کی تپتی ریت میں گردن تک دفن کر دیا جاتا تھا جہاں وہ نہایت اذیت سے مرتے تھے۔ اغوا کرنے والے نہایت منظم تھے اور ان کا نیٹ ورک یورپ تک پھیلا ہوا تھا۔ تاوان کی رقم جو عام طور سے سونے کی صورت میں ہوتی تھی۔ بحیرۂ روم میں وصول کی جاتی تھی۔ اس لیے مغربی سیاحوں نے شمالی افریقا کا رخ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ سن کر جیک نے بھی فوری طور پر دریائے نائیجر کی مہم ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر ماریا اب بھی پر امید تھی۔ اس نے جیک سے کہا۔

”اغوا کی زیادہ تر واردتیں الجیریا اور مراکش میں ہو رہی ہیں۔ مالی ایک پر امن ملک ہے۔“

”اتنا بھی پر امن نہیں ہے۔“ جیک نے اسے سمجھایا۔ ”کچھ عرصے پہلے تک یہاں خانہ جنگی جاری تھی اور اب بھی یہاں مسلح گروپ موجود ہیں۔“

”لیکن حال میں یہاں کے بارے میں ایسی کوئی بات سننے میں نہیں آئی ہے۔“ ماریا نے اصرار کیا۔

”اچھا دیکھیں گے۔“ جیک نے شاید جان چھڑانے کے لیے کہا۔

وہ کئی دن تک بماکو میں تفریح کرتے رہے۔ یہ چھوٹا سا لیکن پر سکون شہر ہے جہاں افریقی ثقافت کے نمونے بھی دیکھنے کو ملتے تھے، یہاں قدیم روایتی بازار تھے جن میں کئی منزلہ عمارتوں کے نیچے پردے تلے بازار ہوتے تھے جہاں لوگ صدیوں پرانے انداز میں خرید و فروخت کرتے تھے۔ ان بازاروں میں جا کر انسان خود کو پرانے دور میں محسوس کرتا تھا۔ یہ تین چار دن بہت اچھے گزرے لیکن بماکو زیادہ بڑا شہر نہیں تھا۔ انہوں نے تقریباً سارا شہر دیکھ لیا تھا۔ اب ماریا کی خواہش تھی کہ دریائے نائیجر کے طاس تک سفر نہ سہی لیکن اندرون ملک کی سیر تو کر سکتے تھے۔

پانچویں دن وہ رات کے وقت ایک ذرا جدید قسم کی تفریح گاہ میں تھے کہ ان کی ملاقات وہاں ولیم سے ہو گئی۔ تقریباً چالیس سال کا ولیم دیکھنے میں اسمارٹ اور تیز طرار شخص نظر آتا تھا، اس کی چھوٹی اور تیز آنکھوں سے ہمہ وقت شک جھلکتا تھا جیسے وہ کسی پر اعتبار نہ کرتا ہو۔ لیکن ان سے وہ بہت اچھی طرح ملا تھا۔ پہلی ملاقات میں اس نے ماریا اور جیک کو ڈنر کی دعوت دیدی۔ وہ انہیں بماکو کے سب سے شاندار ہوٹل میں لے گیا تھا جہاں روایتی فائیو اسٹار کھانے پیش کیے جاتے تھے۔ ماریا کی خواہش تھی کہ وہ کسی اچھے مقامی ریستوران جاتے جہاں روایتی ڈشیں پیش کی جاتی ہوں۔ اسے خاص طور سے بھیڑ کے گوشت سے بنی ایک ڈش

اچھی لگتی تھی جسے اس کی اپنی چربی میں خشک بھونا جاتا تھا اور پھر اسے موٹی اور نرم مقامی روٹی کے ساتھ کھاتے تھے۔

ولیم خوش مزاج اور شاہ خرچ امریکی تھا لیکن افریقا اور یہاں کے لوگوں کے بارے میں اس کے خیالات اچھے نہیں تھے۔ وہ جب ان کا ذکر کرتا اس کے لہجے میں حقارت آ جاتی تھی۔ وہ بھی چار دن پہلے یہاں آیا تھا اور شہر کی سیر کرتا پھر رہا تھا۔ اسے شکوہ تھا کہ اسے ایک بھی اچھا آدمی نہیں ملا۔ ”یہاں سب چور یا دھوکے باز ہیں، ان پر آدمی ایک فیصد بھی اعتبار نہیں کر سکتا۔“

”ایسا نہیں ہے۔“ ماریا نے تردید کی۔ ”ہمیں تو اب تک بہت اچھے لوگ ملے ہیں، کسی نے ہمارے ساتھ دھوکا کرنے کی کوشش نہیں کی۔“

”یہ صرف ان کا دکھاوا ہے۔“ ولیم کے لہجے میں یقین تھا۔ ”جیسے ہی تم ان کے دام میں آؤ گی یہ تمہیں لوٹنے میں ایک منٹ کی دیر نہیں لگائیں گے۔“

ماریا کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے ولیم کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔ اسے مقامی لوگ ویسے ہی لگے تھے جیسے ساری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں الگ سے ہٹ کر کوئی بات نہیں تھی۔ گفتگو کے دوران جیک نے دریائے نائیجر کے سفر کا ذکر کر دیا۔ ولیم سن کر چونک اٹھا۔ ”میں تو خود اس سلسلے میں سوچ رہا تھا لیکن مجھے اکیلے سفر کرتے ہوئے خوف آتا ہے میں یہاں کے لوگوں پر بھروسا نہیں کر سکتا۔ یہ مجھے دھوکا دے کر کسی ویرانے میں لے جا کر، لوٹ کر قتل کر سکتے ہیں یا ان قزاقوں کو بیچ سکتے ہیں جو آج کل مغربی سیاحوں کو اغوا کر کے ان کا تاوان وصول کر رہے ہیں۔“

”آج کل مالی میں ایسا نہیں ہو رہا ہے۔“ ماریا نے اسے بتایا۔ ویسے وہ پہلی بار ولیم سے خوش نظر آئی تھی کیونکہ اس نے اس سفر کی حمایت کی تھی۔ اس کی خوشی دیکھ کر جیک نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”دراصل ہمارا بھی یہی ارادہ تھا لیکن ہم بھی اسی وجہ سے رک گئے کہ ہمارے ساتھ کوئی اور نہیں ہے۔“

ولیم نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ”تو کیا خیال ہے؟ ہم تینوں مل کر ایک اچھی ٹیم بنا سکتے ہیں اور اس طرح ہم زیادہ محفوظ ہوں گے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ ماریا نے جلدی سے اس کی تائید کی۔ ”دو کے مقابلے میں تین بہتر ہوتے ہیں۔“

جیک اب بھی ہچکچا رہا تھا لیکن ماریا کی خوشنودی کی خاطر وہ مان گیا اور طے پایا کہ وہ وسائل اور حالات کا جائزہ لے کر ایک دو دن میں اس سفر کو حتمی شکل دیں گے۔ ولیم دولت مند تھا اس کے لیے مسئلہ نہیں تھا۔ بس اس کے پاس وقت کم تھا، وہ صرف دو ہفتے اور رک سکتا تھا۔ اس کے بعد اسے واپسی کی فلائٹ پکڑنا تھی۔ یہ فلائٹ اسے دارالسلام سے ملتی۔ بماکو سے مقامی فلائٹ دارالسلام لے جاتی اور اسے دو ہفتے کے اندر واپس آنا تھا۔ اس لیے انہیں عجلت میں پروگرام بنانا پڑا۔ طے پایا کہ وہ مالی کے ایک اندرونی شہر سیگیو سے سفر کا آغاز کریں گے جو دریا کے کنارے واقع ہے وہاں سے طاس کا علاقہ زیادہ دور نہیں ہے۔ اس علاقے میں کئی چھوٹی بڑی جھیلیں تھیں اور یہاں سرما میں خاصی بارشیں ہوتی تھیں جس کی وجہ سے یہاں کبھی پانی کی کمی نہیں ہوئی۔ جب خشک سالی شدت اختیار کر جائے تو شمال سے خانہ بدوش قبیلے یہاں کا رخ کرتے تھے۔

دریائے نائیجر کا شمار افریقا اور دنیا کے چند بڑے دریاؤں میں ہوتا ہے۔ اس کا آغاز مالی سے ہوتا ہے اور مالی کے وسط میں جہاں صحرائے اعظم کا آغاز ہوتا ہے وہیں دریائے نائیجر کا طاس بھی ہے۔ مالی سے آغاز کر کے یہ دریا نائیجر اور پھر نائیجریا سے ہوتا ہوا جنوبی بحر اوقیانوس میں جا گرتا ہے۔ صحرا سے آغاز میں اس میں پانی اتنا نہیں ہوتا لیکن جب یہ نائیجیریا کے بارانی علاقوں میں داخل ہوتا ہے تو اس کا پاٹ کئی میل چوڑا ہو جاتا ہے۔

جیک نے اپنے مقامی ایجنٹ شہزور سے گائڈ اور پورٹر مہیا کرنے کو کہا۔ شہزور مخلوط النسل مسلمان تھا۔ اس کا باپ ہندوستانی مسلمان تھا اور ماں مالی کی رہنے والی تھی۔ شہزور نے سیگیو میں ان کے لیے ایک گائڈ اور ایک پورٹر کا بندوبست کر دیا۔ مہم کے لیے چار عدد اونٹ حاصل کیے گئے ان پر سواری کرنے کے ساتھ سامان بھی لادا جا سکتا تھا۔ وہ ایک جیپ میں سیگیو پہنچے جہاں گائڈ عبدالہادی اور پورٹر مراد ان کے منتظر تھے۔ سامان وہ ساتھ لے کر آئے تھے۔ کیونکہ خدشہ تھا کہ ضرورت کا کچھ سامان شاید سیگیو سے دستیاب نہ ہو، اس لیے تمام خریداری انہوں نے بماکو میں کر لی تھی۔ سامان میں دو عدد خیمے بھی تھے۔ سیگیو میں رات انہوں نے خیموں میں گزاری تھی تاکہ وہ سفر سے پہلے ہی اس کے عادی ہو جائیں۔ ماریا نے اونٹ پر بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا، لہٰذا اس کے لیے ایک عدد گدھا حاصل کیا گیا۔

ولیم پہلے دن سے عبدالہادی اور مراد کے بارے میں مشکوک تھا۔ وہ اسے چہرے سے جرائم پیشہ اور لٹیرے لگ رہے تھے۔ جیک نے اسے سمجھایا کہ وہ نئے لوگ نہیں

ہیں۔ شہزور نے اگر انہیں چنا ہے تو اس کا انتخاب بہترین ہوگا۔ جب شہزور کو ان پر اعتماد ہے تو انہیں بھی ان لوگوں پر اعتماد کرنا چاہیے۔ مگر ولیم اس کے لیے تیار نہیں تھا، اس نے روانگی سے پہلے ہی جیک کا اس معاملے میں اتنا دماغ کھایا کہ وہ جھنجلا گیا اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں انہیں اس مہم سے الگ کر دیتا ہوں۔ اب نئے گائڈ اور پورٹر کو تم تلاش کرو گے۔“

یہ سن کر ولیم ٹھنڈا ہو گیا تھا کیونکہ اسے اس قسم کے کاموں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ مجبوراً وہ ان لوگوں کے ساتھ سفر کرنے پر راضی ہو گیا لیکن سفر کے آغاز سے ہی اس کا رویہ عبدالہادی اور مراد سے اچھا نہیں تھا۔ پہلے دن وہ دریا کے ساتھ ساتھ سفر کرتے رہے تھے۔ یہاں دریا کے ساتھ تو زمین سبز تھی اور درختوں کے ساتھ جھاڑیاں بھی پھیلی تھیں لیکن دریا سے چند میل دور سوائے ریت کے اور کچھ نہیں تھا۔ البتہ جہاں کہیں بستیاں تھیں وہاں لوگوں نے اپنی مدد آپ کے تحت دریا کا پانی پہنچا کر صحرا کو نخلستان بنا لیا تھا لیکن ایسی آبادیاں کہیں کہیں تھیں۔ وہ جتنا آگے بڑھتے جاتے آبادی اسی تناسب سے کم ہوتی جاتی، البتہ طاس کا علاقہ خوب آباد تھا کیونکہ وہاں پانی اور زرخیز زمینوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ماریا کا مقصد طاس کے شمال مغربی سرے پر آخری بستی ٹمبکٹو تک جانا تھا جہاں سے صحرائے اعظم شروع ہو جاتا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ ٹمبکٹو جانا ہر مہم جو کا خواب ہوتا تھا۔ کیونکہ صحرائے اعظم میں یہ آخری انسانی آبادی تھی اور اس کے بعد سیکڑوں میل تک صرف ویرانہ اور ریگ زار تھا۔

پہلی شام جب انہوں نے پڑاؤ ڈالا تو عبدالہادی جیک کے پاس آیا۔ مغربی سیاحوں کے ساتھ سفر کر کے اس کی انگریزی رواں ہو گئی تھی۔ اس نے جیک سے کہا۔ ”جناب ہم اس طرح کام نہیں کر سکتے۔ امریکی صاحب مسلسل ہمیں باتیں سنا رہا ہے اور ہمارے کاموں میں دخل دے رہا ہے۔“

جیک نے دیکھا تھا، ولیم اپنے سامان کے معاملے میں بہت چوکنا تھا اور جب عبدالہادی یا مراد میں سے کوئی سامان کے پاس جاتا تو وہ انہیں ڈانٹنے لگتا۔ یہ رویہ کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ جیک سمجھتا تھا اگر ان کے گائڈ اور پورٹر ان سے ناخوش ہوئے تو ان کے لیے سفر آسان نہیں رہے گا۔ اس نے عبدالہادی سے وعدہ کیا کہ وہ ولیم کو اس معاملے میں سمجھائے گا اور اب اسے شکایت نہیں ہوگی لیکن جب اس نے ولیم سے بات کی تو اس کا ردِعمل نہایت شدید تھا، اس نے حقارت سے دور اونٹوں کے ساتھ زمین پر دری بچھائے لیٹے دونوں مقامیوں کی طرف دیکھا اور بولا۔

”یہ چور ہیں، جب یہ میرے سامان کی طرف دیکھتے ہیں تو حرص ان کے چہروں پر نظر آنے لگتی ہے۔ میں ان پر اعتماد نہیں کر سکتا۔“

”پلیز ولیم۔“ جیک نے عاجزی سے کہا۔ ”اگر تمہارا یہی رویہ رہا تو یہ واپس چلے جائیں گے اور ہماری مہم ناکام رہ جائے گی۔“

ماریا نے بھی کہا۔ ”اتنی جلدی دوسرے پورٹر اور گائڈ نہیں ملیں گے۔“

”بلکہ سرے سے نہیں ملیں گے، جب ان کو پتا چلے گا کہ ہم نے خود اپنے پورٹر اور گائڈ کو بے عزت کر کے بھگا دیا ہے۔“ جیک نے ولیم کو ڈرایا۔ ”یہ ہمارا سامان یہیں پھینک کر اپنے اونٹ بھی ساتھ لے جائیں گے۔“

اس بات نے ولیم کو کسی قدر فکر مند کر دیا تھا۔ ظاہر ہے صحرا میں اپنا سامان اٹھا کر سفر کرنا کسی صورت ممکن نہیں تھا۔ اس نے بادل ناخواستہ کہا۔ ”ٹھیک ہے میں انہیں اب کچھ نہیں کہوں گا لیکن ان سے بولو میرے سامان سے دور رہیں۔“

ماریا نے ولیم کی طرف دیکھا۔ ”اس صورت میں تمہیں اپنا سامان خود ہینڈل کرنا پڑے گا۔“

”کیا مطلب؟“ ولیم کے ماتھے پر بل آ گیا۔

”اگر تم انہیں اپنے سامان کو ہاتھ لگانے سے منع کرو گے تو اسے اونٹ پر رکھنے اور اتارنے کی ذمے داری بھی تمہیں اٹھانی پڑے گی۔“

”اونٹ پر سامان باندھنا اور اتارنا آسان کام نہیں ہے۔“ جیک نے کہا۔ ولیم خاموش ہو گیا اور اگلے دن کا سفر پرسکون گزرا۔ یہاں دریا زیادہ گہرا نہیں تھا لیکن اس میں پانی موجود تھا اور اسی لحاظ سے خطرات بھی۔ عبدالہادی نے انہیں خبردار کیا تھا کہ پانی سے دور رہیں کیونکہ یہاں مگرمچھ کثرت سے پائے جاتے ہیں اور دریا کے گدلے پانی میں گھات لگا کر اس طرح حملہ کرتے ہیں کہ آدمی یا جانور کو آخری لمحے تک پتا نہیں چلتا۔ چشم زدن میں مگرمچھ اپنے شکار کو پانی میں کھینچ کر لے جاتے ہیں اور اس کے بعد موت ہی اس کا مقدر بنتی ہے۔ آئے دن دریا کے کنارے مویشی چرانے والے انسان اور ان کے جانور ان مگرمچھوں کا نشانہ بنتے تھے۔

چوتھے دن وہ ٹمبکٹو کی طرف جانے کے لیے دریا کے کنارے سے الگ ہو گئے۔ اس وقت وہ دریا کے کنارے

آباد بستی موپٹی سے کوئی سو کلومیٹر آگے آ چکے تھے۔ انہوں نے دریا کی دو الگ الگ شاخوں کے ملنے کے مقام کو کراس کیا اور جب وہ دریائے نائیجر کے انتہائی مغربی حصے تک پہنچے تو ان کا راستہ دریا سے الگ ہو گیا، اب انہیں شمال مغرب کی طرف جانا تھا۔ یہاں سے صحرا کا آغاز ہو جاتا تھا۔ لیکن عبدالہادی کا کہنا تھا کہ اصل صحرا ٹمبکٹو سے آگے تھا کیونکہ یہاں صرف ٹمبکٹو ہی نہیں بلکہ ایسی اور بھی کئی صحرائی بستیاں آباد تھیں۔ کیونکہ شمال سے آنے والے صحرائی خانہ بدوش ان بستیوں سے ہوتے ہوئے مغرب میں الجزائر اور سینیگال جاتے تھے۔ وہ صحرا سے مختلف چیزیں اور کھالیں لے کر آتے تھے اور انہیں ان ممالک کی بستیوں میں فروخت کرتے تھے اور اس کے بدلے خوراک حاصل کر کے واپس صحرا میں لوٹ جاتے تھے۔

ولیم دو دن تو اپنے وعدے پر قائم رہا تھا، پھر اس کا خراب رویہ لوٹ آیا۔ جیک اور ماریا اسے ایک حد تک سمجھا سکتے تھے۔ وہ ان کا ایک ہم سفر تھا اور اس سے ان کا ایسا تعلق نہیں تھا کہ وہ کسی معاملے میں اس پر دباؤ ڈال سکتے۔ پھر ولیم ان کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ وہ ماریا سے بہت احترام سے پیش آتا تھا اور ماریا نے اس کے انداز میں کبھی اپنے لیے کوئی عامیانہ پن محسوس نہیں کیا تھا۔ خرچ کرنے کے معاملے میں بھی وہ فراخ دل واقع ہوا تھا اور مہم کے چالیس فیصد اخراجات وہی ادا کر رہا تھا باقی ساٹھ فیصد ماریا اور جیک کے حصے میں آئے تھے۔ بس مقامی لوگوں کے بارے میں وہ اپنے خیالات اور رویے میں کوئی تبدیلی لانے سے قاصر تھا۔ چوتھے دن جب وہ صحرا میں سفر کر رہے تھے تو اس دوران میں ولیم نے مراد کو کسی معمولی سی بات پر بے نقط ڈالی تھیں۔ وہ بے چارہ خاموشی سے سن رہا تھا۔ ماریا نے بہ مشکل اسے مراد سے دور کر کے خاموش کرایا ورنہ ایسا لگ رہا تھا وہ اس پر ہاتھ بھی چھوڑ دے گا۔ مراد اس بے عزتی پر دکھی نظر آنے لگا اور عبدالہادی کا چہرہ بھی ستا گیا تھا۔

شام کو جب انہوں نے پڑاؤ ڈالا اور ولیم صحرا میں چہل قدمی کرنے چلا گیا تو ماریا نے جیک سے کہا۔ ”اس کا رویہ خراب ہوتا جا رہا ہے۔“

جیک نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”وہ تو ہے لیکن ہم اس معاملے میں کیا کر سکتے ہیں؟“

”دیکھو جیک! اگر ہم نے کچھ نہیں کیا تو ولیم کے کیے کا خمیازہ ہمیں بھی بھگتنا ہوگا۔ اگر ہادی اور مراد چلے گئے تو ہماری مہم یہیں ختم ہو جائے گی۔ حالانکہ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہوگا۔“

جیک نے سوچا اور ماریا سے کہا۔ ”ٹھیک ہے، ایسا کرو ولیم کو سمجھانے کا کام تم کرو اور ان دونوں سے میں بات کرتا ہوں۔ میں انہیں کچھ اضافی رقم کا لالچ دیتا ہوں تاکہ یہ ولیم کے رویے کو برداشت کرتے رہیں۔“

لیکن عبدالہادی نے جیک کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا۔ ”امریکی صاحب کا رویہ اب ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ اگر ایسا رہا تو پھر ہم سفر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ کوئی معاوضہ ہمارے لیے عزت کا بدل نہیں ہو سکتا۔“

جیک پریشان ہو گیا۔ ”دیکھو تم لوگ ہمیں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ پھر ولیم جو کر رہا ہے وہ اس کا ذاتی فعل ہے، ہمارا اس میں کیا قصور ہے؟“

”آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔“ عبدالہادی نے کہا۔ ”لیکن امریکی صاحب کو چھوڑ کر جائیں گے تو آپ کو بھی چھوڑنا پڑے گا۔ اس نے کل مراد کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ وہ بہت حساس لڑکا ہے۔“

”میں اس کے لیے تم سے معذرت چاہتا ہوں۔ میں مراد سے بھی معافی مانگ لوں گا۔“

عبدالہادی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”صاحب مسئلہ آپ کا نہیں ہے، امریکی صاحب کا ہے۔ جب تک اس کا رویہ ٹھیک نہیں ہوگا ہمارے لیے کام کرنا مشکل ہوگا۔“

عبدالہادی، ولیم سے اتنا چڑنے لگا تھا کہ اس کا نام بھی نہیں لیتا تھا، اسے امریکی صاحب کہتا تھا۔ مراد تو اس سے بات ہی نہیں کرتا تھا اور اس کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ ولیم سے زیادہ سے زیادہ دور رہے۔ ان دونوں نے ولیم کے سامان کو ہاتھ لگانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ ولیم خود ہی اپنا سامان اونٹ پر لادتا اور اتارتا تھا۔ یہ کام آسان نہیں تھا لیکن ولیم کو اپنے رویے کی کچھ نہ کچھ قیمت تو ادا کرنا تھی۔ چھٹے دن وہ کھلے صحرا میں تھے۔ ان کے چاروں طرف ریت تھی اور آسمان پر سورج آگ برسا رہا تھا۔ اس دن انہیں پہلی بار شدید گرمی سے واسطہ پڑا تھا۔ جب وہ دریا کے کنارے سفر کر رہے تھے تب بھی موسم گرم ہی ہوتا تھا لیکن یہ گرمی تو کچھ اور ہی تھی۔ وہ بار بار پانی پی رہے تھے لیکن حلق تھا کہ تر ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ عبدالہادی نے انہیں سمجھایا۔

”اس طرح پانی پینے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، آپ سب صبر کی عادت ڈالو ورنہ جتنا پانی پیو گے پیاس اتنی ہی زیادہ

لگے گی۔‘‘

’’تم کون ہوتے ہو ہمیں پانی پینے سے روکنے والے۔‘‘ ولیم نے غرا کر کہا۔ ’’ہمارے پاس جب پانی کی کوئی کمی نہیں ہے تو ہم کیوں نہ پئیں؟‘‘

’’یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔‘‘ ماریا نے ولیم اور جیک سے کہا۔ ’’تم دونوں نے محسوس نہیں کیا کہ ہم جتنا پانی پی رہے ہیں، ہماری پیاس اتنا ہی بھڑک رہی ہے۔‘‘

وہ بھی یہ بات محسوس کر رہے تھے لیکن خود کو پانی پینے سے نہیں روک پا رہے تھے، اوپر سے گرمی نے بھی انہیں پاگل کر دیا تھا۔ وہ رومال پانی میں تر کر کے سر پر رکھتے رہے جو ایک منٹ سے بھی پہلے خشک ہو جاتا تھا۔ شام کو جب سورج مغرب کے افق پر تھا اور گرمی ذرا کم ہوئی تو انہوں نے پڑاؤ ڈالنے کی تیاری شروع کر دی۔ اچانک انہیں اونٹوں کی طرف سے شور سنائی دیا۔ ولیم چلا رہا تھا۔ عبدالہادی بھی زور زور سے کچھ کہہ رہا تھا لیکن اس کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ماریا اور جیک بھاگ کر اونٹوں کے پاس پہنچے تو وہاں ایک خوفناک منظر دکھائی دے رہا تھا۔ مراد نے ولیم کو زمین پر گرایا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک بڑا اور خطرناک خنجر تھا۔ یہ مخصوص مقامی ہتھیار تھا اور تقریباً ہر شخص کے پاس ہوتا ہے۔

مراد نے خنجر ولیم کی گردن پر رکھ دیا تھا اور شاید اسے مارنے ہی والا تھا۔ خوف سے ولیم کی آنکھیں آخری حدوں تک پھیل گئی تھیں۔ وہ مراد کے مقابلے میں کہیں تومند اور طاقت ور تھا لیکن اس وقت بالکل بے دم دکھائی دے رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ خنجر کو حرکت میں لاتا، جیک نے جھپٹ کر اسے دھکا دیا اور غصے سے بولا۔ ’’یہ کیا کر رہے ہو؟‘‘

’’صاحب آپ درمیان سے ہٹ جاؤ۔‘‘ مراد خطرناک لہجے میں بولا۔ ’’اس نے مجھے باپ کی گالی دی ہے۔‘‘

’’بکواس مت کرو، خنجر رکھو۔‘‘ جیک نے کہا۔ ’’ہادی اسے سمجھاؤ۔‘‘

’’میں کیا سمجھاؤں۔‘‘ اس کا لہجہ سرد تھا۔ ’’سمجھانے کی ضرورت تو اس کو ہے۔‘‘ اس نے ولیم کی طرف اشارہ کیا جو کھڑا ہو گیا تھا اور ہمت جمع کر رہا تھا۔ خطرے کی حد سے نکلنے کے بعد اس کی زبان پھر تیز ہو گئی۔ اس نے زہریلے انداز میں جیک سے کہا۔

’’میں نے کہا تھا یہ سب چور اور لٹیرے ہوتے ہیں۔ اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تا کہ میرا سامان لوٹ لے۔‘‘

’’جھوٹ مت بولو۔‘‘ مراد نے ترش لہجے میں کہا۔ ’’تم نے بلاوجہ مجھے گالی دی، میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔‘‘

مراد نے ولیم کی طرف بڑھنے کی کوشش کی لیکن اس بار عبدالہادی نے اسے روک لیا۔ ’’نہیں، اس کے خون سے ہاتھ رنگنے کی ضرورت نہیں ہے ہم انہیں دوسری سزا دیں گے۔‘‘

عبدالہادی نے اپنے اونٹوں سے ان کا سامان اتار پھینکا۔ جیک اور ماریا انہیں روکنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ ان کی بات سننے کے موڈ میں نہیں تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے سارا سامان اتار دیا اور پھر ولیم سے کہا۔ ’’دیکھ لو تمہاری ساری چیزیں یہاں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ بعد میں تم مت کہنا کہ ہم نے کچھ چرا لیا ہے۔‘‘

’’اس سے تمہاری اصلیت نہیں چھپے گی۔‘‘ ولیم بولا۔ اس نے ان لوگوں کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ ’’تم کیا سمجھتے ہو، تمہارے بغیر صحرا میں سفر نہیں کر سکتے۔‘‘

عبدالہادی ہنسا۔ ’’تمہارے بارے میں مجھے یقین ہے تم ایسا کر سکو گے۔ اچھا سلام۔‘‘

جیک اور ماریا ان لوگوں کو روکنے کی کوشش کرتے رہ گئے لیکن وہ اونٹوں پر سوار ہو کر رخصت ہو گئے۔ ولیم ایک طرف اپنے بیگ سے ٹکا سگریٹ سلگا رہا تھا۔ جب وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو ماریا اس پر جھپٹ پڑی۔ ’’یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ بتاؤ، اب ہم کیا کریں گے؟‘‘

’’کچھ نہیں۔‘‘ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ’’ہم خود سفر کریں گے۔‘‘

’’اس سامان کے ساتھ جنہیں دو اونٹوں نے اٹھا رکھا تھا؟‘‘ ماریا نے طنز کیا۔

’’ہاں...... سامان گدھے پر لادیں گے اور ہم پیدل چلیں گے۔‘‘

جیک متوحش انداز میں آس پاس دیکھ رہا تھا، اسے امید تھی کہ عبدالہادی اور مراد لوٹ آئیں گے۔ اس نے ولیم سے کہا۔ ’’تمہارا دماغ درست ہے؟ اتنا سامان ایک گدھے پر کیسے آئے گا اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس صحرا میں ہم راستہ کیسے تلاش کریں گے؟‘‘

اس بات نے ولیم کو دہلا دیا تھا، شاید اس بارے میں اس نے بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ جھپٹ کر جیک کے پاس آیا۔ ’’کیا مطلب...... تمہیں راستہ نہیں معلوم؟‘‘

’’مجھے کیا معلوم؟‘‘ وہ جھلا گیا۔ ’’میں پہلی بار اس صحرا میں آیا ہوں۔‘‘

ماریا کے پاس اس علاقے کے کچھ نقشے تھے۔ وہ انہیں دیکھنے لگی۔ جیک اور ولیم بھی اس کے پاس آ گئے۔ جغرافیہ میں ماہر ہونے کی وجہ سے وہی نقشوں کو سمجھ سکتی تھی۔ اس نے ایک نقشے پر انگلی رکھی۔ ’’یہ دیکھو، یہ راستہ ٹمبکٹو کی طرف جاتا ہے۔ ہم وہاں پہنچ گئے تو ہمیں مدد مل جائے گی۔‘‘

’’مدد کیا ملے گی؟‘‘ ولیم نے بدمزگی سے کہا۔ ’’ہمیں پھر رقم خرچ کر کے ان چوروں کی خدمات حاصل کرنا پڑیں گی۔‘‘

’’وہ بے چارے اپنی رقم چھوڑ گئے ہیں۔‘‘ ماریا نے غصے سے کہا۔ ’’ہم نے انہیں صرف تیس فیصد ادائیگی کی تھی، ستر فیصد معاوضہ اور دینا تھا۔‘‘

’’تب وہ ہمارے سامان سے کچھ چرا کر نہ لے گئے ہوں؟‘‘ ولیم نے تشویش سے کہا اور اٹھ کر اپنا سامان دیکھنے لگا۔ اس نے انہیں بھی مشورہ دیا کہ وہ اپنا سامان دیکھ لیں۔ مگر وہ بیٹھے رہے۔ ماریا کو رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا کہ اب انہیں سارا کام خود کرنا پڑے گا۔ انہوں نے خود خیمے لگائے اور اپنا سامان رکھا۔ پھر انہوں نے جیسے تیسے کھانا کھایا کیونکہ ان کا کھانا بھی مراد بناتا تھا حالانکہ یہ اس کی ذمے داری نہیں تھی۔ اس دوران میں ولیم اپنی ایک ایک چیز ٹٹولتا رہا تھا۔ پھر اس نے اعلان کیا کہ اس کی سب چیزیں موجود ہیں کچھ غائب نہیں ہے۔

’’ہمیں پہلے ہی معلوم تھا۔‘‘ جیک زیرِلب بولا۔ ’’تم نے ہمارے سفر کو تباہ کر دیا ہے۔‘‘

’’اس سے بہتر تھا ہم دونوں ہی آ جاتے۔‘‘ ماریا بولی۔

اگلی صبح نہایت مشکل ثابت ہوئی تھی۔ ان کا سامان خاصا زیادہ تھا اور ایک گدھے پر لادنا ناممکن تھا۔ اس لیے انہوں نے پہلے ضروری سامان نکالا اور اسے گدھے پر بار کیا، اس میں ان کی خوراک، پانی اور خیمے تھے۔ اس کے بعد باقی سامان میں سے ذاتی چیزیں خود اٹھانے کا فیصلہ کیا اور جو چیز وہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ انہیں چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ بھی اچھا خاصا سامان تھا مگر زیادہ تر ولیم کا تھا۔ اس میں اس کا کپڑوں سے بھرا ہوا ایک بیگ بھی شامل تھا۔ کچھ سامان جیک اور ماریا کا بھی رہ گیا تھا۔ نقشے کے مطابق وہ اگر سارا دن سفر کرتے تو رات تک ٹمبکٹو لازمی پہنچ جاتے۔ اس لیے انہوں نے سورج نکلتے ہی سفر شروع کر دیا تھا۔ یہ دن بھی بے حد گرم تھا اور وہ سارا دن بے تحاشا پانی پیتے رہے تھے۔ پھر شام کے سائے گہرے ہونے لگے اور تاریکی چھا گئی لیکن ٹمبکٹو یا کسی بھی بستی کے آثار نمودار نہیں ہوئے تھے۔ ماریا کو یقین تھا کہ وہ نقشے کے مطابق درست سفر کر رہے تھے اور انہیں ٹمبکٹو پہنچ جانا چاہیے تھا۔

’’خاتون ہم کہیں نہیں پہنچے۔‘‘ ولیم نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ’’شاید تم ٹھیک سے نقشہ نہیں سمجھ سکیں؟‘‘

’’نہیں، نقشہ تو بہت آسان ہے۔‘‘ ماریا نے کہا۔ ’’دراصل مجھے اپنی درست لوکیشن کا نہیں معلوم ہے اگر درست جگہ کا پتا چل جائے تو نقشہ سمجھ میں آ سکتا ہے۔‘‘

جیک فکرمند ہو گیا۔ ’’اس کا مطلب ہے ہم راستہ بھٹک گئے ہیں۔‘‘

’’نہیں، ضروری نہیں ہے ممکن ہے ٹمبکٹو کچھ دور رہ گیا ہو اور جب کل ہم سفر کریں تو کچھ دیر میں وہاں پہنچ جائیں۔‘‘

مگر اگلے دن بھی وہ سارا دن سفر کر کے بھی کہیں نہیں پہنچے اور ان کے چاروں طرف ایک جیسا ریتیلا اور کہیں کہیں سے پتھریلا صحرا دکھائی دیتا رہا جس میں جا بہ جا ریت کے ٹیلے تھے۔ اس دن بھی انہوں نے بے تحاشا پانی پیا تھا اور اب ان کے پاس پانی کا صرف ایک کین رہ گیا تھا۔ اس میں کل دو گیلن پانی آنے والے دن کے لیے بالکل ناکافی تھا۔ اس دن بھی انہوں نے فی کس ایک گیلن پانی پیا تھا۔ ماریا نے کہا۔ ’’یہ تو کل صبح ہی ختم ہو جائے گا۔‘‘

’’شام تک ہم میں سے صرف گدھا بچے گا۔‘‘ جیک مایوسی سے بولا۔

ان کے گدھے کو پیاس برداشت کرنے کی عادت تھی۔ مگر اب وہ بھی پانی کے لیے بے چین نظر آنے لگا تھا۔ وہ اسے پانی نہیں دے سکتے تھے کیونکہ ان کے پاس اتنا پانی تھا ہی نہیں۔ وہ حساب سے پانی لے کر چلے تھے۔ اگر عبدالہادی اور مراد ان کے ساتھ ہوتے تو وہ گزشتہ شام تک ٹمبکٹو تک پہنچ گئے ہوتے اور گدھے کو بھی پانی مل گیا ہوتا۔ مگر اب گدھے کا پانی ایک طرف رہا تھا خود ان کا پانی بھی ختم ہونے والا تھا اور یہاں گرمی اتنی شدید تھی کہ وہ پانی کے بغیر مزید چند گھنٹے بھی نہیں گزار سکتے تھے۔

تیسرا دن طلوع ہوا تو پہلی بار انہوں نے پانی کی راشن بندی کی اور طے کیا کہ ہر گھنٹے بعد وہ صرف ایک گھونٹ پانی لیں گے۔ دوپہر تک انہوں نے ہر ایک گھنٹے بعد اتنا ہی پانی پیا لیکن اس کے بعد پانی کی کمی سے ان کی حالت خراب

If you want to download Urdu novels,Imran series, Monthly Digests,Shuaa,Kiran,Khwateen Digest,Suspense digest, Vist www.paksociety.com
if site is not opening send complaint at admin@paksociety.com
or at
0336-5557121

ہونے لگی تھی۔ گدھے کی حالت ان سے زیادہ خراب تھی کیونکہ تین دن سے اس نے بالکل پانی نہیں پیا تھا۔ شام سے ذرا پہلے وہ چلتے چلتے یک دم بیٹھ گیا اور دوبارہ نہیں اٹھا۔ ان کی ہر کوشش کے جواب میں وہ زمین پر بیٹھ کر ہانپتا رہا۔ اسے اٹھانے کی کوشش میں وہ بھی ہانپنے لگے تھے۔ جیک نے کہا۔

''یہ اب نہیں اٹھے گا اس کا وقت ختم ہو گیا ہے۔''

اس لمحے ان سب کو احساس ہوا کہ وہ کتنی جان لیوا صورتِ حال سے دوچار تھے۔ وہ صحرائے اعظم میں راستہ بھٹک گئے تھے اور ان کے پاس پانی بہت کم رہ گیا تھا، یہ زیادہ سے زیادہ کل صبح تک چل سکتا تھا اور اس کے بعد اگر وہ کسی بستی تک نہ پہنچتے تو ان کا پیاس سے فوت ہو جانا یقینی تھا۔ انہوں نے گدھے پر سے خوراک اور کچھ ضروری چیزیں ساتھ لیں اور باقی سامان بھی اتار کر گدھے کو آزاد کر دیا لیکن وہ اس کے باوجود بیٹھا رہا، ایسا لگ رہا تھا جیسے سچ مچ اس کا آخری وقت آ گیا ہو۔ وہ اسے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ ان کے لیے بوجھ اٹھانا دشوار ہو رہا تھا لیکن مجبوری تھی۔ وہ خوراک کا بیشتر حصہ چھوڑ چکے تھے لیکن کچھ نہ کچھ تو ساتھ رکھنا تھا۔ اگرچہ کھانے کی طلب کسی کو نہیں تھی وہ صرف پانی چاہتے تھے۔

رات کی تاریکی چھانے تک ان کے پاس مشکل سے دو لیٹر پانی بچا تھا۔ رات ہونے سے گرمی ختم ہوئی تھی لیکن موسم کی خشکی محسوس ہوتی رہی۔ پانی کی طلب برقرار تھی۔ وہ سب خاموش اور نڈھال بیٹھے تھے۔ جیک اور ماریا میں اتنی بھی سکت نہیں تھی کہ وہ ولیم کو الزام دے سکتے کہ یہ سب اس کی وجہ سے ہوا۔ اس نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ان سب کی جانیں بھی خطرے میں ڈال دی تھیں۔ وہ اب شرمندہ نظر آتا تھا، دن میں کئی بار اس نے ان سے معذرت بھی کی کہ وہ اس کی وجہ سے اس جان لیوا صورتِ حال میں پڑے تھے۔ جیک اس سے بات کر رہا تھا لیکن ماریا بات نہیں کرتی تھی البتہ اس نے اسے برا بھلا بھی نہیں کہا تھا۔

حسب توقع پانی رات کو ہی ختم ہو گیا۔ انہیں پیاس برداشت کرنے کی عادت نہیں تھی اس لیے وہ پانی پیتے رہے اور جب اگلے دن کا سورج طلوع ہوا تو ان کے پاس پانی کا ایک قطرہ نہیں رہا تھا اور انہوں نے پیاس کی حالت میں سفر شروع کر دیا تھا۔ ان کے پاس خوراک بھی کم رہ گئی تھی مگر اس کی پروا نہیں تھی کیونکہ آج انہیں پانی نہ ملتا تو کل تک اس خوراک کو استعمال کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ ماریا نازک عورت تھی اور اس کی حالت زیادہ خراب تھی اگر جیک نے اسے سہارا نہ دے رکھا ہوتا تو وہ شاید کبھی نہ اٹھنے کے لیے گر جاتی۔ خود جیک کے قدم بھی لڑکھڑا رہے تھے۔ ولیم ڈولتا ہوا چل رہا تھا اور کبھی کبھی وہ گر بھی جاتا تھا لیکن پھر اٹھ جاتا۔ بلند ہوتے سورج تلے گرمی ایسی قیامت کی پڑ رہی تھی کہ سانس لینا بھی محال لگ رہا تھا۔

''آج ہمارا آخری دن ہے۔'' ماریا نے ڈوبتے لہجے میں کہا۔ ''ہم مر کر یہیں رہ جائیں گے۔''

''پلیز ایسی باتیں مت کرو۔'' جیک نے کہا۔ ''شاید آج ہم کسی آبادی تک پہنچ جائیں۔''

''آبادی۔'' ولیم نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''یہاں آبادی بھی انہی جیسے لوگوں کی ہے، جو ہمیں صحرا میں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔''

''انہیں تم نے مجبور کیا تھا۔'' ماریا چلائی۔

''ٹھیک ہے یہ میری غلطی تھی لیکن میں اب بھی ان پر اعتماد کے لیے تیار نہیں ہوں، یہ ہم مغربی لوگوں سے نفرت کرتے ہیں اور ان کا بس چلے تو یہ ہمیں قتل کر دیں۔''

''پلیز تم چپ کر جاؤ۔'' جیک نے ماریا کا پارہ چڑھتے دیکھ کر ولیم سے التجا کی۔ لیکن ولیم اپنی دھن میں کہے جا رہا تھا۔

''پلیز۔'' اس بار جیک نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم اپنی بکواس بند کرو گے۔''

ولیم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور شانے اچکا کر رہ گیا۔ اس وقت وہ شمال مشرق کی طرف ایک بلند ہوتے ٹیلے پر چڑھ رہے تھے۔ ماریا کو امید تھی کہ وہ اس طرف کسی صحرائی بستی تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان کے قدموں تلے ریت پھسل رہی تھی مگر وہ ہمت کر کے چڑھ رہے تھے۔ صبح کے دس بجنے والے تھے اور ابھی بہت طویل اور گرم ترین دن پڑا تھا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اگر وہ کہیں پہنچ نہیں پاتے تو شام کی نوبت ہی نہیں آتی اور وہ اس سے پہلے مر چکے ہوتے۔ جیسے جیسے وہ ٹیلے کے اوپری حصے تک پہنچے اور جب انہوں نے دوسری طرف دیکھا تو ایک لمحے کو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

یہ ایک صحرائی بستی تھی۔ مٹی اور پتھر سے بنے نیچی چھتوں والے مکانات تھے۔ تقریباً ہر گھر میں کھجور کے درخت لگے تھے اور بستی کے عقب میں ایک سرسبز نخلستان دکھائی دے رہا تھا۔ یقیناً بستی اور نخلستان کا وجود کسی چشمے کا مرہون منت تھا۔ ماریا اور جیک آگے تھے پہلے انہوں نے بستی کو دیکھا۔ وہ سکتے کی کیفیت میں کھڑے تھے۔ ولیم پیچھے آ رہا تھا۔ اس نے بستی کو دیکھا تو اس کا ابتدائی ردعمل یہی تھا لیکن پھر وہ چونکا۔

''یہ مسلم بستی ہے۔''

جیک نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''وہ دیکھو سب سے آگے مسجد ہے' اس کا مینار بتا رہا ہے یہ مسجد ہے۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ کون ہیں۔'' ماریا بولی۔ ''یہ ہمیں پناہ دیں گے۔''

''ضرور دیں گے۔'' ولیم نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''لیکن جیسے ہی انہیں پتا چلے گا کہ ہم مسلم نہیں ہیں ان کے خنجر نکل آئیں گے۔''

''تم بلاوجہ ڈر رہے ہو۔'' جیک نے کہا۔ ''مراد کا ردعمل فطری تھا، اگر کوئی میرے باپ کو گالی دے گا تو میں بھی اس پر چڑھ دوڑوں گا۔ میرا نہیں خیال کہ یہ بُرے لوگ ہیں۔''

''اگر بُرے نہیں ہیں تب بھی خطرہ مول لینے کے بجائے ہمیں چالاکی سے کام لینا چاہیے۔'' ولیم نے کہا۔ ''اس میں کیا حرج ہے اگر ہم مسلم بن جائیں؟''

ماریا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں اسے مناسب نہیں سمجھتی کہ صرف ایک خدشے کی وجہ سے جھوٹ بولوں۔''

''میں بھی۔'' جیک نے کہا۔ ''مجھے اعتماد ہے اگر ان لوگوں کو پتا چل جائے کہ ہم کرسچن ہیں تب بھی ان کا رویہ اچھا ہی ہوگا اور یہ ہمیں پناہ دیں گے۔''

''تمہاری مرضی' میں تو مسلم بن جاؤں گا۔'' ولیم نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''اس کا فرق تم لوگ خود ہی دیکھ لوگے۔''

''لیکن ہم جو ہیں خود کو وہی بتائیں گے۔'' ماریا نے بھی مضبوط لہجے میں کہا۔ وہ نیچے اترنے لگی، جیک اس کے ساتھ تھا۔ چڑھائی کے مقابلے میں اترائی کہیں زیادہ مشکل ثابت ہو رہی تھی۔ وہ کئی بار گرے اور گرم ریت پر لڑھکتے چلے گئے۔ ولیم بھی ان کے پیچھے گرتا پڑتا چلا آ رہا تھا۔ ابھی وہ نصف ٹیلے تک پہنچے تھے کہ بستی والوں نے انہیں دیکھ لیا اور فوراً ہی کوئی ایک درجن افراد ان کی طرف دوڑ پڑے۔ ان کا انداز دیکھ کر وہ تینوں رک گئے۔ ولیم ہذیانی انداز میں بولا۔

''یہ ہم پر حملہ کرنے آ رہے ہیں۔''

''نہیں' یہ شاید ہماری مدد کے لیے آ رہے ہیں۔'' جیک نے تذبذب سے کہا۔ کچھ دیر کے لیے وہ بھی ڈر گیا تھا۔ آنے والے مخصوص صحرائی لباس میں تھے جس نے انہیں سر سے پاؤں تک ڈھانپ رکھا تھا۔ پاس آ کر انہوں نے ان تینوں کا جائزہ لیا اور پھر بہت احتیاط سے انہیں سہارا دے کر نیچے لے جانے لگے۔ ولیم بھڑکا تھا لیکن جیک نے اس سے سخت لہجے میں کہا۔ ''اگر تم نے ان کے ساتھ کوئی غلط سلوک کیا تو تمہارا راز خود فاش ہو جائے گا۔''

یہ سن کر ولیم ٹھنڈا پڑ گیا تھا لیکن دو آدمیوں کی گرفت میں وہ سخت بے چین اور ڈرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ آنے والے اپنی مقامی زبان میں ان سے کچھ کہہ رہے تھے۔ اگرچہ... وہ ایک لفظ نہیں سمجھ پا رہے تھے لیکن لہجے سے لگ رہا تھا وہ انہیں تسلی دے رہے ہیں۔ وہ انہیں مسجد میں لے آئے۔ مسجد کے صحن میں بھی کھجور کے درخت لگے تھے اور ان کے سائے تلے کئی افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک شخص نے ذرا مختلف لباس پہنا ہوا تھا اور وہ شاید بستی کا سردار تھا۔ وہ کھڑا ہوا تو جیک نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا اور بولا۔ ''ہمیں صرف انگریزی زبان آتی ہے، کیا یہاں کوئی انگریزی جاننے والا ہے؟''

سردار مسکرایا اور انگریزی میں ہی بولا۔ ''مہمان، مجھے انگریزی آتی ہے اور میں اس بستی کا سردار عبدالکریم ہوں۔ کیا تم لوگ اپنا تعارف کراؤ گے۔ تم لوگ کون ہو؟''

''ہم تین دن سے صحرا میں بھٹک رہے ہیں اور کل رات سے ایک قطرہ پانی نہیں پیا ہے۔ میرا نام جیک ہے اور یہ میری بیوی ماریا ہے۔ ہم کرسچن ہیں۔'' آخری جملہ جیک نے ہچکچا کر ادا کیا تھا۔ اس کے ذہن میں ولیم کی بات آئی تھی کہ ان کے بارے میں جانتے ہی مقامی لوگوں کا رویہ بدل جائے گا۔ عبدالکریم نے سوالیہ نظروں سے ولیم کی طرف دیکھا۔

''اور یہ کون ہے؟''

ولیم آگے بڑھا اور اس نے کہا۔ ''میرا نام یوسف ہے اور میں مسلمان ہوں۔''

اس پر عبدالکریم نے ولیم اور جیک کو باری باری سینے سے لگایا اور بولا۔ ''خوش آمدید میرے مہمانو!'' پھر اس نے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا اور مقامی زبان میں کچھ حکم دیتے ہوئے جیک اور ماریا کی طرف اشارہ کیا اور پھر ان سے بولا۔ ''میرے معزز مہمانو، تم دونوں کے قیام اور طعام کا بندوبست کر دیا گیا ہے، تم ان کے ساتھ چلے جاؤ۔ اللہ نے چاہا تو تمہیں یہاں کسی قسم کی کوئی تکلیف اور کمی نہیں ہوگی۔''

یہ دو کمسن لڑکے تھے جو جیک اور ماریا کو ہاتھ تھام کر اپنے ساتھ لے گئے۔ ولیم منتظر تھا کہ اسے کب پانی اور کھانا دیا جاتا ہے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید اسے مسلم ظاہر کرنے کی وجہ سے خصوصی اہمیت دی جائے گی۔ جب ماریا اور جیک چلے گئے تو عبدالکریم اس کی طرف متوجہ ہوا اور مسکرا کر بولا۔ ''میرے مسلم برادر، تمہیں آج پہلا رمضان مبارک ہو۔''

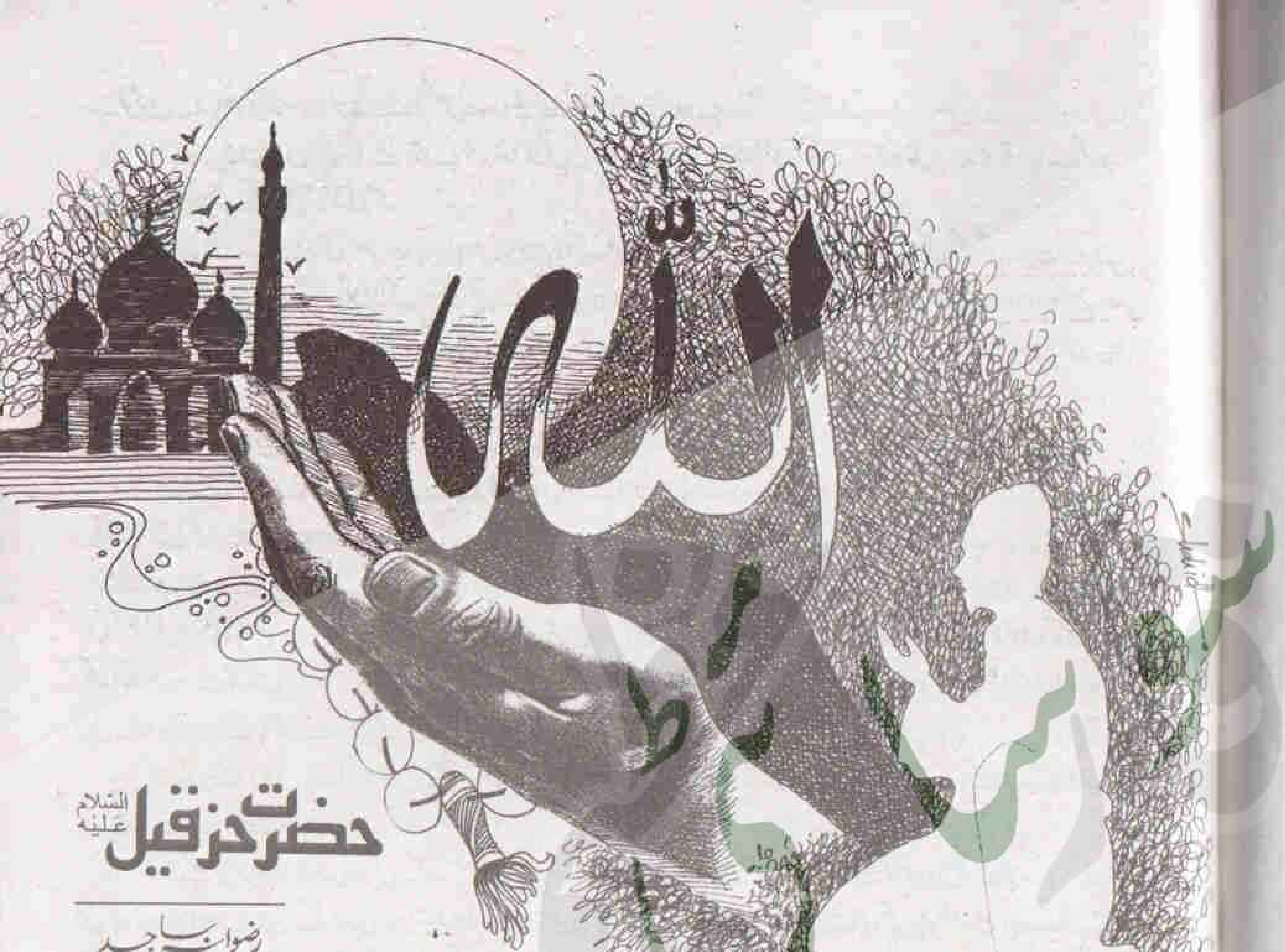

حضرت حزقیل علیہ السلام

رضوان ساجد

دنیا کی سب سے سرکش قوم بنی اسرائیل نے ہر موڑ پر بغاوت کی اور قدم قدم پر ٹھوکر بھی کھائی مگر صد افسوس کہ راہِ حق پر چلنا اسے پھر بھی نہ آیا۔ یکے بعد دیگر انبیا آتے رہے اور بت پرستی کا اندھیرا چھانٹتے رہے۔ اسی سلسلے کی ایک اور کڑی حضرت حزقیلؑ کی ہدایات بھی ہیں... حسب روایت آپؑ کو بھی رد کیے جانے کا دکھ... سفر کی صعوبت... کبھی محبت اور کبھی نفرت سہنے جیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر انبیا کا یہ شعار ہے کہ وہ کبھی کسی آزمائش سے منہ نہیں موڑتے۔ انہی آزمائشوں سے گزرنا ہی دراصل انبیا کی تربیت ہے اور ان میں کامیابی پانا ہی نبوت کی معراج ہے اور اللہ اپنے برگزیدہ بندوں کا امتحان ایسے ہی لیتا ہے۔

حضرت یرمیاہؑ کے پیغام کو بڑھانے والے ایک اور نبی کا احوال

صدقیاہ نے انہیں طلب کیا۔ اس خفیہ ملاقات میں صدقیاہ کو پھر مشورہ دیا کہ ان لوگوں کی بات نہ ماننا جو بخت نصر سے مقابلہ کرنے کی صلاح دیتے ہیں۔ اگر تو نے مقابلہ کیا تو تیری فوجیں شکست سے دوچار ہوں گی اور تو بابل کے حوالے کیا جائے گا۔

بادشاہ نے سر جھکا کر اس کی بات سنی لیکن جو اس کے مقدر میں تھا وہ ہونا تھا اس لیے وہ ایک مرتبہ پھر اس ارادے سے باز رہا کہ اپنے آپ کو بابل کے حوالے کر دے۔ بس اتنی رعایت کی کہ حضرت یرمیاہ علیہ السلام کو قید خانے سے نکال کر محافظوں کے صحن میں رکھا گیا۔

محل کے عُہدے داروں نے سخت اعتراض کیا اور ایک وفد بنا کر بادشاہ کے پاس پہنچے۔

''ہم تجھ سے عرض کرتے ہیں کہ اس آدمی کو قتل کروا دے کیونکہ یہ جنگی مردوں کے ہاتھوں کو جو اس شہر میں باقی ہیں اور

سب لوگوں کے ہاتھوں کو سست کرتا ہے۔ یہ شخص ہمارا خیر خواہ نہیں بلکہ بدخواہ ہے۔''

بادشاہ اپنے امیروں کے سامنے اتنا بے بس تھا کہ قتل کی اجازت دے دی۔ ''وہ تمہارے قابو میں ہے۔ جو جی چاہے کرو۔ میں تمہارے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔''

اس اجازت کے ملتے ہی حضرت یرمیاہ علیہ السلام کو ایک حوض میں ڈال دیا جس میں پانی نہیں بلکہ کیچڑ تھی۔ ان امیروں کو امید تھی کہ وہ کیچڑ میں دھنس کر ہلاک ہو جائیں گے۔ انہوں نے اپنی دانست میں انہیں مار ہی دیا تھا لیکن خدا نے حضرت یرمیاہ علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا کہ میں تجھے چھڑا لوں گا۔ یہ وعدہ اس طرح پورا ہوا کہ ایک حبشی خواجہ سرا نے انہیں حوض سے نکالا اور صدقیاہ کے پاس پہنچا دیا۔

''میں تجھ سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ تو مجھ سے کچھ نہ چھپا۔'' بادشاہ نے کہا۔

''میرے کچھ بتانے کا اب کیا فائدہ۔ تو میری صلاح ماننے والا نہیں بلکہ شاید یہ ہو کہ تو مجھے قتل کرا دے۔''

''میں تجھ سے عہد کرتا ہوں، نہ میں تجھے قتل کروں گا اور نہ ان لوگوں کے حوالے کروں گا جو تیرے قتل کے درپے ہیں۔''

جب یہ عہد لے لیا تو حضرت یرمیاہ علیہ السلام نے صدقیاہ سے کہا کہ خداوند لشکروں کا خدا اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ اگر تو نکل کر شاہ بابل کے امرا کے پاس چلا جائے گا تو تیری جان بچ جائے گی اور یہ شہر آگ سے جلایا نہ جائے گا اور تو اور تیرا گھرانا زندہ رہے گا لیکن اگر تو شاہ بابل کے امرا کے پاس نہ جائے گا تو یہ شہر کسدیوں کے حوالے کر دیا جائے گا اور وہ اسے جلا دیں گے اور تو ان کے ہاتھ سے رہائی نہ پائے گا۔''

''میں ان یہودیوں سے ڈرتا ہوں۔'' صدقیاہ نے کہا۔ ''جو کسدیوں سے جا ملے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ مجھے ان کے حوالے کریں اور وہ مجھ پر طعنہ ماریں۔''

''وہ تجھے ہرگز حوالے نہیں کریں گے۔'' حضرت یرمیاہ علیہ السلام نے کہا۔ ''میں تیری منت کرتا ہوں تو خداوند کی بات جو میں تجھ سے کہتا ہوں، مان لے۔ اس سے تیرا بھلا ہوگا اور تیری جان بچ جائے گی۔ دیکھ وہ سب عورتیں جو شاہ یہوداہ کے محل میں باقی ہیں شاہ بابل کے امرا کے پاس پہنچ جائیں گی اور کہیں گی۔

تیرے دوستوں نے تجھے فریب دیا
اور تجھ پر غالب آئے
جب تیرے پاؤں دھنس گئے
تو وہ الٹے پھر گئے

''دیکھ، میں تیری بات مان لیتا ہوں۔'' صدقیاہ نے کہا ''جو باتیں میرے اور تیرے درمیان ہوئی ہیں وہ کسی پر ظاہر نہ کرنا ورنہ میرے امرا تجھے قتل کیے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔''

حضرت یرمیاہ علیہ السلام کو دوبارہ قید خانے کے صحن میں پہنچا دیا گیا۔

اسی دوران میں یہ خبریں بجلی کے کوندوں کی طرح لپکنے لگیں کہ بابل سے ایک بڑا لشکر روانہ ہو چکا ہے۔ یہ خبریں ابھی ہوا میں تھیں کہ بابل کی فوجوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ بابل بہت جلد محاصرہ کرے گا۔

حضرت حزقیل علیہ السلام نے جو کچھ اپنی پیش گوئی میں کہہ دیا تھا وہ سب یروشلم میں پیش آ رہا تھا۔

محاصرہ طول کھینچتا جا رہا تھا۔ اب جو باہر تھے وہ اندر نہیں جا سکتے تھے اور جو اندر تھے وہ اندر قید ہو گئے۔ ان کے پاس کھانے پینے کی چیزیں اندر نہیں پہنچ سکتی تھیں۔

قحط پہلے ہی پڑا ہوا تھا۔ جو کچھ باہر سے آ جاتا تھا اس کے بھی لالے پڑ گئے۔ لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا۔ جس دکان پر معلوم ہوتا غذائی اجناس موجود ہیں، لوگ وہاں پہنچ جاتے اور اشیا لوٹ لیتے۔ لوٹ مار بھی کتنے دن چلتی۔ لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ سڑکوں پر لاشیں پڑی تھیں۔ ان لاشوں کے تعفن سے وبائی امراض پھوٹ پڑے۔ خدا نے اپنے پیغمبروں سے عہد کیا تھا کہ میں

انہیں کال سے ماروں گا اور وبا سے ماروں گا اور تلوار سے۔ پہلے دو عہد پورے ہو گئے تھے ابھی قتلِ عام ہونا باقی تھا۔

صدقیاہ کے امیروں نے بڑے فخر سے فوجیں تیار کیں اور انہیں ایک دروازے سے باہر نکالا۔ ان سپاہیوں نے ایک منزل آگے بڑھ کر دشمن کا استقبال کیا لیکن قومی جذبے سے عاری یہ فوجی پہلی جھڑپ کی تاب بھی نہ لا سکے اور الٹے قدموں لوٹ آئے۔ دروازے پھر بند ہو گئے۔ یہ آخری امید بھی کمزور چراغ کی طرح بجھ گئی۔ اب دو ہی صورتیں تھیں یا تو دشمن اندر آ جائے یا لڑے بغیر واپس چلا جائے۔ صدقیاہ انتظار کرتا رہا کہ اس کا حمایتی فرعونِ مصر اس کی مدد کو پہنچے گا لیکن اس کی آنکھیں ترستی ہی رہیں۔

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ فرار ہوا جائے۔ رات جب تاریک ہو گئی۔ صدقیاہ نے محدود سامان سمیٹا اور فرار کے لیے نکلا۔ دیواروں کے درمیان ایک پھاٹک، شاہی باغ کے برابر تھا اس سے وہ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ نکلا اور بیابان کی راہ لی۔

یہ فرار بالکل اس تمثیل کی طرح تھا جو حضرت حزقیل علیہ السلام نے نہر کبار کے کنارے، اسیروں کو دکھائی تھی جس میں انہوں نے دیوار میں سوراخ کیا تھا اور اپنے سامان کے ساتھ باہر نکلے تھے کہ دیکھو اس طرح حاکمِ یروشلم فرار ہونے پر مجبور ہو جائے گا۔

وہ اس بیابان میں ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ بابل کے کچھ سپاہیوں نے اسے دیکھ لیا اور اس کا پیچھا کر کے اس کے اور اس کے ساتھیوں کے سروں پر پہنچ گئے۔ اس کے بیٹے بھی ان میں شامل تھے۔ سب کے سب گرفتار ہوئے۔ ربلہ لے جائے گئے جہاں بخت نصر پڑاؤ ڈالے بیٹھا تھا۔

ادھر بابل کی فوجیں یروشلم میں داخل ہو گئیں۔ شہریوں کا خون بہنے لگا۔ شاہی محلات اور عام گھروں کو جلا دیا گیا۔ ہیکل سلیمانی کو آگ لگا دی گئی۔

جس قدر زر و جواہر شہر میں تھا لوٹ لیا گیا۔ یروشلم کی کل آبادی کو غلام بنا کر بابل کی طرف ہانک دیا گیا۔ صرف کسانوں کو ان کے کھیتوں میں رہنے دیا۔ باقی شہر خالی ہو گیا۔

بخت نصر نے صدقیاہ کے بیٹوں کو اس کی آنکھوں کے سامنے ذبح کیا اور یہوداہ کے سب شرفا کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اب اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا وقت تھا کہ صدقیاہ کو بابل لے جایا جائے گا مگر وہ اس شہر کو دیکھ نہیں سکے گا۔ یہ پیش گوئی اس وقت سمجھ میں نہیں آئی تھی مگر اب آ گئی جب بخت نصر نے فتویٰ جاری کیا کہ صدقیاہ کی آنکھیں نکال لی جائیں۔ جلاد آگے بڑھے اور صدقیاہ کو اندھا کر دیا اور جب اس کے زخم اچھے ہو گئے اور آنکھوں کی جگہ گڑھے نمایاں ہو گئے تو اسے زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔

بابل جاتے ہوئے جب وہ تل ابیب سے گزرا تو اسیر بنی اسرائیل نے اپنے اندھے بادشاہ کو حسرت سے دیکھا جو بابل جا رہا تھا لیکن بابل دیکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

یروشلم سے آئے ہوئے ہزاروں شہریوں کو تل ابیب میں ان اسیروں کے پاس چھوڑ دیا گیا جو ان سے پہلے یہویقیم کے دور میں یہاں آئے تھے اور جن میں حضرت حزقیل علیہ السلام بھی شامل تھے۔

وہ لوگ ابھی موجود تھے جو حضرت حزقیل علیہ السلام کی پیش گوئیوں کو گلیوں میں گشت کرتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔ اب وہی سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

کچھ دن گزرے تو یہ چہ میگوئیاں بھی ہونے لگیں کہ سزا صرف یروشلم ہی کو کیوں ملی۔ جو قومیں یہوداہ کے ساتھ تھیں۔ بابل کے خلاف سازش میں قدم قدم پر شریک تھیں انہوں نے عین وقت پر ساتھ چھوڑ دیا۔ ان کا انجام کیا ہوگا؟ کیا ان پر بھی عدالت ہوگی؟ کیا ان پر بھی غضب نازل ہوگا؟

یہ باتیں کچھ دنوں آپس میں ہوتی رہیں اور پھر حضرت حزقیل علیہ السلام کے کانوں تک بھی پہنچنے لگیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے

ان قوموں پر بھی نبی بنا کر بھیجا تھا۔ ان قوموں کے لیے بھی آپ پر وحی اتری۔

''اے آدم زاد! بنی عمون کی طرف متوجہ ہو اور ان کے خلاف نبوت کر۔ بنی عمون سے کہہ خداوند خدا کا کلام سنو۔ خداوند خدا یوں فرماتا ہے کہ چونکہ تو نے میرے مقدس پر جب وہ ناپاک کیا گیا اور اسرائیل کے ملک پر جب وہ اجاڑا گیا اور بنی یہوداہ پر جب وہ اسیر ہو کر گئے، قہقہہ لگایا۔ اسی لیے میں تجھے اہلِ مشرق کے حوالے کردوں گا کہ تو ان کی ملکیت ہو اور وہ تجھ میں اپنے ڈیرے ڈالیں گے اور تیرے اندر اپنے مکان بنائیں گے اور تیرے میوے کھائیں گے اور تیرا دودھ پئیں گے۔''

اسی طرح موآب کے لیے وحی آئی۔

''خداوند خدا یوں فرماتا ہے کہ چونکہ موآب نے بھی یہوداہ کے ساتھ اچھا نہیں کیا لہٰذا میں اہلِ مشرق کو اس کے اور بنی عمون کے خلاف چڑھا لاؤں گا کہ ان پر قابض ہوں تاکہ قوموں کے درمیان بنی عمون کا ذکر باقی نہ رہے اور میں موآب کو سزا دوں گا اور وہ جانیں گے کہ خداوند میں ہوں۔''

ادوم کے لیے حکم جاری ہوا۔

''چونکہ ادوم نے بنی یہوداہ سے کینہ کشی کی اور ان سے انتقام لے کر بڑا گناہ کیا اس لیے خداوند خدا یوں فرماتا ہے کہ میں ادوم پر ہاتھ چلاؤں گا۔ اس کے انسان اور حیوان کو نابود کردوں گا اور میں اپنی قوم بنی اسرائیل کے ہاتھ سے ادوم سے انتقام لوں گا اور وہ میرے غضب و قہر کے مطابق ادوم سے سلوک کریں گے اور میرے انتقام کو معلوم کریں گے۔''

صور کے لیے کلامِ خداوندی میں کہا گیا۔

''دیکھ اے صور، میں تیرا مخالف ہوں اور بہت سی قوموں کو تجھ پر چڑھا لاؤں گا، جس طرح سمندر اپنی موجوں کو چڑھاتا ہے اور وہ صور کی شہر پناہ کو توڑ ڈالیں گے اور اس کے برجوں کو ڈھا دیں گے اور میں اس کی مٹی تک کھرچ ڈالوں گا اور اسے صاف چٹان بنا دوں گا۔ میں بابل بخت نصر کو گھوڑوں، رتھوں، سواروں، فوجوں اور بہت سے لوگوں کے انبوہ کے ساتھ شمال سے صور پر چڑھا لاؤں گا۔ وہ قتل کریں گے، دولت کو لوٹیں گے، مالِ تجارت غارت کریں گے، تیرے رنگ محلوں کو ڈھا دیں گے۔''

ابھی صیدا کے خلاف سزا کا اعلان باقی تھا۔ اس کے لیے حکم ہوا۔

''اے آدم زاد، صیدا کا رخ کر کے اس کے خلاف نبوت کر اور کہہ خداوند خدا یوں فرماتا ہے کہ دیکھ میں تیرا مخالف ہوں۔ میں اس میں وبا بھیجوں گا اور اس کی گلیوں میں خونریزی کروں گا اور مقتول اس کے درمیان اس تلوار سے جو چاروں طرف سے اس پر چلے گی گریں گے اور وہ معلوم کریں گے کہ میں خداوند ہوں۔''

اسی طرح ان سب علاقوں کی طرف احکامات جاری ہوتے رہے جہاں جہاں بنی اسرائیل کی شاخیں آباد تھیں اور جن پر حضرت حزقیل علیہ السلام کو نبی مبعوث کیا گیا تھا۔ یہ باتیں وہ اسیر بنی اسرائیل کے سامنے بھی دہراتے رہے جس سے ان کی تشفی ہوتی رہی لیکن یہ کانٹا پھر بھی کھٹکتا رہا کہ خود ان کا کیا ہوگا۔ وہ اپنے وطن لوٹیں گے یا نہیں۔ خدا کی نظروں میں پھر سے سرخرو ہو سکیں گے یا نہیں؟ یہ ایسے سوالات تھے جن کا جواب حضرت حزقیل علیہ السلام ہی دے سکتے تھے۔ اب لوگ ان سے اس کی بابت پوچھنے آرہے تھے لیکن انہیں ہر مرتبہ مایوسی ہو رہی تھی۔ حضرت حزقیل علیہ السلام اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ وہ انتظار میں تھے کہ اس بارے میں خدا ان سے کیا کہتا ہے۔ آخر ایک روز وحی نازل ہوئی۔

''خداوند خدا یوں فرماتا ہے کہ اب میں یعقوبؑ کی اولاد کی اسیری کو موقوف کروں گا اور تمام بنی اسرائیل پر رحم کروں گا۔ وہ اپنی رسوائی اور خطا کاری جس سے وہ میرے گناہ گار ہوئے برداشت کریں گے۔ جب وہ اپنی زمین میں امن سے بود و باش کریں گے تو کوئی ان کو نہ ڈرائے گا۔ جب میں ان کو امتوں میں سے واپس لاؤں گا اور ان کے دشمنوں کے ملکوں سے فراہم کروں گا اور بہت سی قوموں کی نظروں میں ان کے درمیان میری تقدیس ہوگی تب وہ جانیں گے کہ میں خداوند ان کا خدا ہوں اس لیے کہ میں نے ان کو اقوام کے درمیان اسیری میں بھیجا اور میں نے ہی ان کو ان کے ملک میں جمع کیا اور ان میں سے ایک کو بھی وہاں نہ چھوڑا اور میں پھر کبھی ان سے منہ نہ چھپاؤں گا کیونکہ میں نے اپنی روح بنی اسرائیل پر نازل کی ہے۔

☆☆☆

مصر، یہوداہ کے بین الاقوامی تعلقات میں اہم کردار ادا کیا کرتا تھا۔ جب موقع دیکھتا، اسرائیل کو دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر الگ ہو جاتا تھا لہٰذا خدائی حکم اس کی تباہی کا ارادہ باندھتا ہے اور حضرت حزقیل علیہ السلام کو بذریعہ وحی اس سے آگاہ کرتا ہے۔

''اے آدم زاد! تو شاہِ مصر فرعون کے خلاف ہو اور اس کے اور تمام ملک مصر کے خلاف نبوت کر۔ کلام کر اور کہہ خداوند خدا یوں فرماتا ہے کہ دیکھ اے شاہِ مصر فرعون میں تیرا مخالف ہوں۔ تو بڑے نگر مچھ کی طرح ہے لیکن میں تیرے جبڑوں میں کانٹے اٹکاؤں گا اور تیرے دریاؤں کی مچھلیاں تیری کھال پر چمٹاؤں گا اور تجھے تیرے دریاؤں سے باہر کھینچ نکالوں گا۔ میں تجھ کو اور تیرے دریاؤں کی مچھلیوں کو بیابان میں پھینک دوں گا۔ تو کھلے میدان میں پڑا رہے گا۔ تو نہ بٹورا جائے گا نہ جمع کیا جائے گا۔

ملک مصر کے اجڑے ہوئے شہر چالیس برس تک اجاڑ رہیں گے اور میں مصریوں کو قوموں میں پراگندہ اور مختلف ممالک میں تتر بتر کروں گا۔

چالیس برس کے آخر میں، میں مصریوں کو ان قوموں کے درمیان سے جہاں وہ پراگندہ ہوئے جمع کروں گا اور میں مصر کے اسیروں کو واپس لاؤں گا اور ان کے وطن میں واپس پہنچاؤں گا لیکن ان کی مملکت تمام مملکتوں میں حقیر ہوگی۔ وہ کبھی سرفراز نہیں ہوں گے کیونکہ میں ان کو پست کروں گا۔

میں شاہ بابل کے بازاروں کو قوت بخشوں گا اور اپنی تلوار اس کے ہاتھ میں دوں گا لیکن فرعون کے بازوؤں کو توڑ دوں گا اور وہ اس کے آگے اس گھائل کی مانند جو مرنے کے قریب ہو، آہیں بھرے گا۔

☆☆☆

حضرت حزقیل علیہ السلام کی امت کے لوگ جواب یروشلم کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر توبہ کر چکے تھے اور حضرت حزقیل علیہ السلام کو سچا نبی ماننے لگے تھے، آپؑ کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ یروشلم کو غیروں کے قبضے میں گئے کئی برس ہو گئے تھے لیکن جلاوطنوں کی واپسی کی کوئی سبیل نظر نہ آتی تھی۔ یہ لوگ بار بار آپؑ سے پوچھتے تھے کہ خدا سے پوچھیں ہماری واپسی کب تک ہوگی؟ خدا کی طرف سے یہ وعدہ کئی مرتبہ کیا جا چکا تھا کہ میں اسیروں کو ان کے وطن واپس لے جاؤں گا لیکن یہ طے نہیں ہوتا تھا کہ واپسی کب تک ہوگی۔ حضرت یرمیاہ علیہ السلام نے یہ مدت ستر سال بتائی تھی۔ اسیروں کو یہ سوچ کر دکھ ہوتا تھا کہ اس وقت تک وہ زندہ نہ رہیں گے۔ ان کی زندگی غلامی میں کٹ جائے گی۔ آزادی کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکیں گے۔ ہاں ان کی اگلی نسل اس سے فیض یاب ہو تو ہو۔ ہم تو یہیں مر کھپ جائیں گے اور یہیں دفن ہوں گے۔ ہمیں آزاد ملک میں قبر بھی نصیب نہیں ہوگی۔ خود حضرت حزقیل علیہ السلام کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگا۔

ایک روز ایک وفد حضرت حزقیل علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا اور یہی باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک بزرگ نہایت دردمندی سے اپنی بے بسی پر آنسو بہا رہے تھے۔

''میری زندگی اب کتنی رہ گئی ہے۔ خدا کا وعدہ پورا بھی ہوا تو میں زندہ کہاں ہوں گا۔ بہت سے لوگ پہلے ہی مر کھپ گئے۔ انہیں کیا معلوم ہوگا کہ اسرائیلی بحال ہو گئے۔ ہم اب بھی اپنے وطن چلے گئے تو یروشلم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ پائیں گے۔''

''یروشلم تو کھنڈر ہو گیا۔ اگر ہم چلے بھی گئے تو کیا دیکھیں گے؟'' ایک دوسرے بزرگ نے کہا۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہ اب یروشلم کی شان و شوکت کون لوٹائے گا اور ہم جو مرنے کو تیار بیٹھے ہیں اسے آباد ہوتے ہوئے کیسے دیکھیں گے؟''

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ خداوند کے حکم سے روح حضرت حزقیل علیہ السلام کو ایک وادی میں لے گئی جو ہڈیوں سے بھری ہوئی تھی، حضرت حزقیل علیہ السلام ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ انہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے کہ روح نے حکمِ خداوندی سے مخاطب کیا۔

''اے آدم زاد! کیا یہ ہڈیاں زندہ ہوسکتی ہیں؟''

''خدا ہی بہتر جانتا ہے۔''

''تم ان پر نبوت کرو اور کہو خداوند فرماتا ہے کہ میں تمہارے اندر روح ڈالوں گا اور تم زندہ ہو جاؤ گی۔''

حضرت حزقیل علیہ السلام نے حکم کے مطابق نبوت کی۔ اسی دوران میں ایک شور بلند ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ ہڈیوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ ہر ہڈی اپنی ہڈی کی تلاش میں نکلی اور آپس میں ملنا شروع ہو گئیں۔ پھر نسیں اور گوشت ان پر چڑھنے لگا۔ پھر کھال آگئی۔ یہ انسان تھے مگر مردہ۔ ان میں دَم نہیں تھا۔ پھر تیز ہوا چلنے لگی۔ اس ہوا نے ان سب کو زندہ کر دیا۔ ہزار ہا انسان تھے جو اپنے پیروں پر کھڑے تھے۔

''اے آدم زاد! یہ ہڈیاں تمام بنی اسرائیل ہیں۔ یہ بھی یہی کہتے تھے ہماری ہڈیاں سوکھ گئیں۔ ہماری امید جاتی رہی، ہم بالکل فنا ہو گئے۔ ہمیں کون زندہ کرے گا؟ مگر دیکھ یہ اب زندہ ہیں۔''

''میں جان گیا، تو ہی خدا ہے۔ تو یروشلم کے کھنڈر پر عمارت تعمیر کرسکتا ہے۔''

''اپنے لوگوں سے کہنا، دیکھو میں تمہاری قبروں کو کھولوں گا اور تم کو ان سے باہر نکالوں گا اور میں اپنی روح تم میں ڈالوں گا اور میں تم کو تمہارے ملک میں بساؤں گا۔''

یہ خواب (رویا) جو حضرت حزقیل علیہ السلام کو دکھایا گیا تھا محض تمثیل نہیں تھی بلکہ حقیقت پر مبنی تھا۔ اس کی تحقیق مفسّرین نے اپنے اپنے طور پر کی ہے۔

محمد بن اسحٰق فرماتے ہیں کہ لوگوں نے ایک وبا دیکھی تھی جس میں لوگ مر رہے تھے تو یہ موت کے ڈر سے وہاں سے نکل کر زمین میں کہیں اور منتقل ہو گئے۔ یہ ایک بستی تھی جسے داوردان کہا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق وہاں بھی فرمایا کہ مر جاؤ تو یہ سب کے سب موت کے منہ میں چلے گئے۔ پھر اللہ نے ان کی لاشوں کو درندوں اور پرندوں کا شکار ہونے سے منع کر دیا اور ان سے حفاظت فرمادی اور پھر طویل عرصہ گزر جانے کے بعد وہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت حزقیل علیہ السلام کو وہاں لے جایا گیا۔

حضرت عبداللہ بن عباس کے مطابق یہ لوگ موت کی وادی میں اس لیے سو گئے تھے کہ انہوں نے جہاد سے انکار کیا تھا اور ایک وادی میں چھپ گئے تھے۔ وہیں ان کو موت آگئی۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا۔

اس واقعے کی خبر جب حضرت حزقیل علیہ السلام نے اپنے لوگوں تک پہنچائی تو انہیں تشفّی ہوگئی کہ وہ غلامی میں مُردوں کی زندگی گزار رہے ہیں۔ دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور اپنے وطن کو دیکھ سکیں گے۔

مردہ ہڈیوں کی بحالی اس بات کی علامت تھی کہ اسرائیل کا سارا گھرانا بحال ہوگا۔ اس میں جنوبی اور شمالی دونوں سلطنتیں شامل ہیں۔ جب اسرائیلی دوسری قوموں میں سے اکٹھے کیے جائیں گے تو یہ دونوں متحد ہو جائیں گے۔ ان کے لیے خاص وعدہ ہے کہ صرف ایک ہی بادشاہ ان پر حکمران ہوگا۔

اس اتحاد کے لیے حضرت حزقیل علیہ السلام کے لیے یہ حکم جاری ہوا۔

''اے آدم زاد! ایک چھڑی لے اور اس پر لکھ یہوداہ اور اس کے رفیق بنی اسرائیل کے لیے۔ پھر دوسری چھڑی لے اور اس پر لکھ افرائیم کی چھڑی یوسفؑ اور اس کے رفیق تمام بنی اسرائیل کے لیے اور ان کو جوڑ دے کہ ایک ہی چھڑی تیرے لیے ہو اور وہ تیرے ہاتھ میں ایک ہوں گی۔

میں بنی اسرائیل کو قوموں کے درمیان سے جہاں جہاں وہ گئے ہیں نکال لاؤں گا اور ہر طرف سے ان کو فراہم کروں گا اور ان کو ان کے ملک میں لاؤں گا اور میں ان کو اس ملک میں اسرائیل کے پہاڑوں پر ایک ہی قوم بناؤں گا اور ان سب پر ایک ہی بادشاہ ہوگا۔''

اسرائیل کی بحالی کے بعد حضرت حزقیل علیہ السلام کو ایک اور خطرے کی طرف متوجہ کیا گیا۔

''اسرائیل قائم ہو جائے گا تو دوسری قومیں اس پر توجہ دیے بغیر نہ رہ سکیں گی بلکہ اسے چیلنج کریں گی۔ آخری ایام میں انتہائی شمالی حصوں کی قومیں خاص کر یاجوج اور ماجوج اسرائیل سے جنگ کرنے کو اپنی فوجیں اکٹھی کریں گی۔ اسرائیل کھلے

دیہات میں جہاں فصلیں نہ ہوں گی سکونت پذیر ہوگا۔ اس کی خوش حالی بے مثال ہوگی اس لیے شمال سے حملہ آور دشمنوں کے منہ میں پانی بھر آئے گا۔ خدا کا قہر یاجوج کے لشکر کو چاروں طرف سے گھیر لے گا۔ فطرت کی ساری قوتیں اس کے خلاف چھوڑ دی جائیں گی۔ سخت زلزلہ آئے گا۔ کیڑے مکوڑے، چرند پرند اور انسان سب میرے حضور تھرتھرائیں گے اور میں اپنے سب پہاڑوں سے اس پر تلوار طلب کروں گا اور ہر ایک انسان کی تلوار اس کے بھائی پر چلے گی اور میں وبا بھیج کر اور خونریزی کر کے اسے سزا دوں گا اور اس پر اور اس کے لشکروں پر اور ان بہت سے لوگوں پر جو اس کے ساتھ ہوں گے بڑے بڑے اولے اور آگ اور گندھک برساؤں گا اور اپنی بزرگی اور اپنی تقدیس کراؤں گا۔

خداوند خدا یوں فرماتا ہے کہ دیکھ اے یاجوج میں تیرا مخالف ہوں۔ تو اسرائیل کے پہاڑوں پر اپنے سب لشکر اور حمایتیوں سمیت گر جائے گا اور میں تجھے ہر قسم کے شکاری پرندوں اور میدان کے درندوں کو دوں گا کہ کھا جائیں اور میں اپنے مقدس نام کو اپنی اُمّت اسرائیل میں ظاہر کروں گا اور پھر اپنے مقدس نام کی بے حرمتی نہ ہونے دوں گا اور قومیں جانیں گی کہ میں خداوند اسرائیل کا قدوس ہوں۔

دشمن بالکل بے بس ہو جائے گا اور اسرائیل جنگ کے بعد مالِ غنیمت جمع کرے گا۔ سات مہینوں تک وہ مردوں کو دفن کرتے اور ملک کو پاک صاف کرتے رہیں گے۔

☆☆☆

یروشلم کی تباہی کو چودہ برس ہو گئے تھے۔ اب اسرائیلیوں نے اپنے آپ کو نئے حالات اور ماحول کے مطابق ڈھال لیا تھا اور جلد واپسی کی امید جاتی رہی تھی۔ اگر وہ حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی ستر سالہ جلاوطنی کی پیش گوئی پر ایمان بھی رکھتے تھے تو یہ طے تھا کہ معدودے چند ہی افراد واپس جاسکتے تھے البتہ حضرت حزقیل علیہ السلام کی معرفت بحالی کا وعدہ ان کو یقین دلاتا تھا کہ خدا اپنی قوم اسرائیل سے محبت رکھتا اور ان کی فکر اور نگہداشت کرتا ہے۔

☆☆☆

اسیری کو 25 سال گزر گئے تھے اور یروشلم کو تسخیر ہوئے 14 سال ہوئے تھے کہ خدا نے اپنے پیغمبر کی دلداری فرمائی۔ خدا کو معلوم تھا کہ تعمیرِ ہیکل کے وقت تک حضرت حزقیل علیہ السلام زندہ نہیں رہیں گے۔ خدا انہیں مستقبل کے ہیکل کا نقشہ دکھانے کے لیے عالمِ رویا میں ملک اسرائیل لے گیا اور ایک بلند پہاڑ پر اتار دیا۔ انہوں نے جنوب کی طرف دیکھا تو ایک شہر کا سا نقشہ نظر آیا۔ پھر ندا آئی۔

''اے آدم زاد! اپنی آنکھوں سے دیکھ اور کانوں سے سن اور جو کچھ میں تجھے دکھاؤں اس سب پر خوب غور کر کیونکہ تو اسی لیے یہاں پہنچایا گیا ہے کہ میں یہ سب کچھ تجھے دکھاؤں۔ پس جو کچھ تو دیکھتا ہے بنی اسرائیل سے بیان کر۔''

وہ شخص اس شہر میں ایک ایک چیز کو ناپتا پھر رہا ہے اور حضرت حزقیل علیہ السلام اس کے ساتھ ہیں۔ تھوڑی دیر میں حضرت حزقیل علیہ السلام پہچان لیتے ہیں۔ یہ یروشلم تھا مگر پہلے سے زیادہ خوبصورت۔ وہ ایک ایک چیز کو ذہن میں رکھتے ہیں۔ انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ اس نئی ہیکل میں خدا اپنے لوگوں کے درمیان اپنی ابدی سکونت گاہ قائم کر رہا ہے۔ اب وہ کبھی بت پرستی سے خدا کے نام کو ناپاک نہیں کریں گے۔

جب وہ عالمِ رویا کی اس سیر سے واپس آئے تو اس سفر کی تفصیلات سے اپنے سامعین کو آگاہ کیا، کیونکہ حکم یہی تھا کہ جو کچھ وہ دیکھیں اسے بنی اسرائیل سے بیان کریں۔

''مجھے مشرقی پھاٹک دکھایا گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مسکن کے گرداگرد دیوار ہے۔ ایک شخص ہے جس کے ہاتھ میں پیمائش کا سرکنڈا ہے جس سے وہ دیوار کی چوڑائی ناپ رہا ہے۔ تب وہ مشرق کے رخ پر پھاٹک پر آیا اور اس کی سیڑھی پر چڑھا اور اس پھاٹک کے آستانے کو ناپا۔ مختلف کوٹھریوں کو ناپتا رہا۔ جھروکوں اور ستونوں کو ناپتا پھرا اور میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

پھر وہ مجھے باہر کے صحن میں لے گیا اور کیا دیکھتا ہوں کہ حجرے ہیں اور چاروں طرف صحن میں فرش لگا تھا اور اس فرش پر تیس حجرے تھے۔

شمالی پھاٹک کی لمبائی اور چوڑائی ناپی۔ اس کی کوٹھریاں تین اس طرف اور تین اس طرف تھیں۔ اوپر جانے کے لیے سات زینے تھے۔ اس کی ڈیوڑھی ان کے آگے تھی۔

وہ مجھے جنوب کی راہ سے لے گیا اور کیا دیکھتا ہوں کہ جنوب کی طرف ایک پھاٹک ہے اور اس میں اس کی ڈیوڑھی ہے۔ اوپر جانے کے لیے سات زینے تھے اور اس کی ڈیوڑھی ان کے آگے تھی اور اس کے ستونوں پر، کھجور کی صورتیں تھیں اور جنوب کی طرف اندرونی صحن کا پھاٹک تھا۔ اس کے بعد مجھے اندرونی صحن میں لایا گیا۔ اس کی ڈیوڑھی میں اردگرد دریچے تھے۔ اس میں اوپر جانے کے لیے آٹھ زینے تھے۔ اندرونی صحن میں دو پھاٹک تھے۔ ایک مشرق کی طرف دوسرا شمال کی جانب۔ پھاٹکوں کے ستونوں کے پاس دروازہ دار حجرہ تھا جو سوختنی قربانیاں دھونے کے لیے مخصوص تھا۔ پھاٹک کی ڈیوڑھی میں دو میزیں اس طرف اور دو اس طرف تھیں کہ ان پر سوختنی قربانی اور خطا کی قربانی اور جرم کی قربانی ذبح کریں۔ سوختنی قربانی کے لیے تراشے ہوئے پتھروں کی چار میزیں تھیں جن پر ذبح کرنے کے ہتھیار رکھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد میرا راہنما مجھے ہیکل میں لایا اور ستونوں کو ناپا۔ چھ ہاتھ کی چوڑائی ایک طرف اور چھ ہاتھ کی دوسری طرف۔ یہی خیمے کی چوڑائی تھی۔ ہیکل کی دیواروں کے ساتھ ساتھ کم از کم تیس حجرے تھے۔

ہیکل اور مقدس کے دو دروازے تھے اور دروازوں کے دو دو پلّے تھے جو مڑ سکتے تھے۔ پھر میں کیا دیکھتا ہوں کہ ہیکل خدا کے جلال سے منور ہے اور میں نے کسی کی آواز سنی جو ہیکل میں سے میرے ساتھ باتیں کرتا تھا اور ایک شخص میرے پاس کھڑا تھا اور اس نے مجھے فرمایا، ''اے آدم زاد! یہ میری تخت گاہ اور میرے پاؤں کی کرسی ہے جہاں میں بنی اسرائیل کے درمیان ابد تک رہوں گا اور بنی اسرائیل اور ان کے بادشاہ، پھر کبھی میرے مقدس نام کو اپنی بدکاری اور اپنے بادشاہوں کی لاشوں سے ان کے مرنے پر ناپاک نہ کریں گے۔'' پھر حکم ہوا کہ احکام اور آئین کے بارے میں جتنی ہدایات ہیں انہیں احتیاط سے لکھ لے اور یہ بھی کہ وہ کون ہیں جن کو اس نئی ہیکل کو ناپاک کرنے کے باعث کاہن شدید سزا کے ماتحت ہیں۔

''بنی لاوی جو مجھ سے دور ہو گئے جب اسرائیل گمراہ ہوا کیونکہ وہ اپنے بتوں کی پیروی کرکے مجھ سے گمراہ ہوئے۔ وہ بھی اپنی بدکرداری کی سزا پائیں گے۔ تو بھی وہ میرے مقدس میں خادم ہوں گے اور میرے گھر کے پھاٹکوں پر نگہبانی کریں گے اور میرے گھر میں خدمت گزاری کریں گے۔''

''لاوی کاہن یعنی بنی صدوق جو میرے مقدس کی حفاظت کرتے تھے جب بنی اسرائیل مجھ سے گمراہ ہو گئے میری خدمت کے لیے میرے نزدیک آئیں گے اور میرے حضور کھڑے رہیں گے وہی میرے مقدس میں داخل ہوں گے اور وہی خدمت کے لیے میری میز کے پاس آئیں گے اور میرے امانت دار ہوں گے اور وہ نہ سر منڈائیں گے نہ بال بڑھائیں گے۔ وہ صرف اپنے بال کتروائیں گے اور جب اندرونی صحن میں داخل ہوں تو کوئی کاہن شراب نہ پیے اور وہ بیوہ یا مطلقہ سے بیاہ نہ کریں بلکہ بنی اسرائیل کی نسل کی کنواریوں سے یا اس بیوہ سے جو کسی کاہن کی بیوہ ہو۔

اور وہ میرے لوگوں کو مقدس اور عام میں فرق بتائیں گے اور ان کو نجس اور طاہر میں امتیاز کرنا سکھائیں گے اور وہ جھگڑوں کے فیصلے کے لیے کھڑے ہوں گے۔ میری تمام مقررہ عیدوں میں میری شریعت اور میرے آئین پر عمل کریں گے۔''

عبادت کے نئے ضابطے بتائے جا رہے تھے اور نبی سے کہا جا رہا تھا کہ وہ ان کو لکھتا جائے اور بنی اسرائیل کے سامنے کھول کر بیان کر دے تاکہ جب وہ اپنے وطن کو لوٹیں یا جب تک یہاں رہیں تو ان ضابطوں پر عمل کرتے رہیں۔

خدا کی بات ابھی جاری تھی۔

''اور وہ کسی مردے کے پاس جانے سے اپنے آپ کو ناپاک نہ کریں مگر فقط باپ یا ماں یا بیٹے یا بیٹی یا بھائی یا کنواری بہن کے لیے وہ اپنے آپ کو ناپاک کر سکتے ہیں۔''

''اور ان کے لیے ایک میراث ہوگی۔ میں ہی ان کی میراث ہوں اور تم اسرائیل میں ان کو ملکیت نہ دینا اور وہ نذر کی قربانی اور خطا اور جرم کی قربانی کھائیں گے اور تم اپنے پہلے گندھے آٹے سے کاہن کو دینا تاکہ گھروں میں برکت ہو۔''

یہ احکامات کاہنوں کے لیے تھے۔ اس کے بعد خدا نے بادشاہ کے لیے آئین و احکام بیان کیے۔

''اے اسرائیل کے امرا تمہارے لیے یہی کافی ہے۔ ظلم اور لوٹ مار کو دور کرو۔ عدالت و صداقت کو عمل میں لاؤ اور میرے لوگوں پر سے اپنی زیادتی کو موقوف کرو۔''

''پہلے مہینے کی پہلی تاریخ کو ایک بے عیب بچھڑا لینا اور مقدس کو پاک کرنا اور کاہن خطا کی قربانی کے بچھڑے کا لہو لے گا اور اس میں سے کچھ مسکن کے ستونوں پر اور مذبح کی کرسی کے چاروں کونوں پر اور اندرونی صحن کے دروازے کی چوکھٹوں پر لگائے گا۔

''تم پہلے مہینے کی چودھویں کو عیدِ فسح منانا جو سات دن کی عید ہے اور اس میں بے خمیری روٹی کھائی جائے گی۔''

اس کے بعد حضرت حزقیل علیہ السلام نے اپنے سامعین کو بتایا۔ ''پھر وہ مجھے اس مدخل کی راہ سے جو پھاٹک کے پہلو میں تھا کاہنوں کے مقدس حجروں میں جن کا رخ شمال کی طرف تھا لایا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مغرب کی طرف پیچھے کچھ خالی جگہ ہے۔ تب اس نے مجھے فرمایا، دیکھ یہ وہ جگہ ہے جس میں کاہن جرم کی قربانی اور خطا کی قربانی کو جوش دیں گے اور نذر کی قربانی پکائیں گے تاکہ ان کو بیرونی صحن میں لے جا کر لوگوں کی تقدیس کریں۔

پھر وہ مجھے بیرونی صحن میں لایا اور صحن کے چاروں کونوں کی طرف مجھے لے گیا اور دیکھو صحن کے ہر کونے میں ایک اور صحن تھا۔ صحن کے چاروں کونوں میں چالیس چالیس ہاتھ لمبے اور تیس تیس ہاتھ چوڑے صحن متصل تھے۔

پھر مجھے ہیکل کے دروازے پر واپس لایا گیا۔ دیکھتا ہوں کہ ہیکل کے آستانے کے نیچے سے پانی مشرق کی طرف نکل رہا ہے۔ اس مرد نے جس کے ہاتھ میں پیمائش کی ڈوری تھی، مشرق کی طرف بڑھ کر ہزار ہاتھ ناپا اور مجھے پانی میں سے چلایا اور پانی ٹخنوں تک تھا پھر اس نے ہزار ہاتھ اور ناپا اور مجھے اس میں سے چلایا اور پانی گھٹنوں تک تھا۔ پھر اس نے ایک ہزار اور ناپا اور مجھے اس میں سے چلایا اور پانی کمر تک تھا۔ پھر اس نے ایک ہزار اور ناپا اور وہ ایسا دریا تھا جسے میں عبور نہیں کر سکتا تھا کیونکہ پانی چڑھ کر تیرنے کے درجے کو پہنچ گیا اور ایسا دریا بن گیا جس کو عبور کرنا ممکن نہ تھا اور اس نے مجھ سے کہا، اے آدم زاد! کیا تو نے یہ دیکھا؟

وہ مجھے لایا اور دریا کے کنارے پر واپس پہنچایا اور جب میں واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دریا کے کنارے دونوں طرف بہت سے درخت ہیں۔ تب اس نے مجھے فرمایا کہ یہ پانی مشرقی علاقے کی طرف بہتا ہے اور میدان میں سے ہو کر سمندر میں جا ملتا ہے اور سمندر میں ملتے ہی اس کے پانی کو شیریں کر دے گا۔ اور یوں ہوگا کہ جہاں کہیں یہ دریا پہنچے گا ہر ایک چلنے پھرنے والا جاندار زندہ رہے گا اور مچھلیوں کی بڑی کثرت ہوگی کیونکہ یہ پانی وہاں پہنچا اور شیریں ہو گیا۔ پس جہاں کہیں یہ دریا پہنچے گا زندگی بخشے گا اور یوں ہوگا کہ ماہی گیر اس کے کنارے کھڑے رہیں گے۔ اس کی مچھلیاں اپنی اپنی جنس کے مطابق بڑے سمندر کی مچھلیوں کے مانند کثرت سے ہوں گی اور دریا کے قریب اس کے دونوں کناروں پر ہر قسم کے میوہ دار درخت اگیں گے جن کے پتّے کبھی نہ مرجھائیں گے اور جن کے میوے کبھی موقوف نہ ہوں گے۔ وہ ہر مہینے نئے میوے لائیں گے کیونکہ ان کا پانی مقدس میں جاری ہے اور ان کے میوے کھانے کے لیے اور ان کے پتّے دوا کے لیے ہوں گے۔

پھر مجھے یہ خوش خبری سنائی گئی کہ تم یعنی اسرائیل میں اس وقت جو بھی ہوں گے زمین کو تقسیم کرو گے تاکہ یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں سے منسوب بارہ قبیلوں کی میراث ہو۔ اور تم سب یکساں اسے میراث میں پاؤ گے جس کی بابت میں نے قسم کھائی کہ تمہارے باپ دادا کو دوں اور یہ زمین تمہاری میراث ہوگی۔

اور یوں ہوگا کہ تم اپنے اور ان بیگانوں کے درمیان جو تمہارے ساتھ بستے ہیں اور جن کی اولاد تمہارے درمیان پیدا ہوئی، میراث تقسیم کرنے کے لیے قرعہ ڈالو گے اور یوں ہوگا کہ جس جس قبیلے میں کوئی بیگانہ بستا ہوگا اسی میں تم اسے میراث دو گے۔

اور یہوداہ کی سرحد سے متصل مشرقی سرحد سے مغربی سرحد تک ہدیہ کا حصہ ہوگا جو تم وقف کرو گے۔ اس کی چوڑائی پچیس ہزار اور لمبائی باقی حصوں میں سے ایک کے برابر مشرقی سرحد سے مغربی سرحد تک اور مقدس اس کے وسط میں ہوگا۔ ہدیہ کا حصہ جو تم خداوند کے لیے وقف کرو گے پچیس ہزار لمبا اور دس ہزار چوڑا ہوگا اور یہ مقدس ہدیہ کا حصہ کاہنوں کے

لیے ہوگا۔ اسی طرح شمال میں اتنا ہی حصہ ان کاہنوں کے لیے ہوگا جو صدوق کے بیٹوں میں سے مقدّس کیے گئے ہوں گے اور زمین کے ہدیہ میں سے بنی لاوی کے حصے سے متصل یہ ان کے لیے ہدیہ ہوگا جو نہایت مقدّس ٹھہرے گا اور کاہنوں کی سرحد کے مقابل بنی لاوی کے لیے ایک حصہ ہوگا۔

اسی طرح دوسرے قبیلوں بن یامین، شمعون اور اشکار وغیرہ کے لیے زمین مختص کی جائے گی۔

شہر سے باہر جانے کے راستے شمال میں قبائل اسرائیل سے نامزد ہوں گے۔ تین پھاٹک شمال کی طرف۔ ایک پھاٹک روبن کا۔ ایک یہوداہ کا ایک لاوی کا۔ اور مشرق کی طرف ایک یوسف کا۔ ایک بنیامین کا اور ایک دان کا۔ جنوب کی طرف ایک شمعون کا ایک اشکار کا اور ایک زبولون کا اور مغرب کی طرف ایک حد کا ایک آشر کا اور ایک نفتال کا۔ اس کا محیط اٹھارہ ہزار اور شہر کا نام اسی دن سے یہ ہوگا کہ ”خداوند وہاں ہے۔“

ملک کا دورہ ختم ہوا تو آپ کی یہ رویا بھی ختم ہوگئی بلکہ اس کے بعد حزقی ایل کی کتاب میں کسی رویا کا ذکر نہیں ملتا۔ اس کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ یہاں نبوت کے تمام کام مکمل ہوگئے۔ اب صرف ایک کام رہ گیا تھا کہ آپ کو جو کچھ دکھایا گیا اسے جلاوطنوں کے سامنے پیش کرتے رہیں۔ انہیں حوصلہ دلاتے رہیں کہ اللہ نے انہیں قبول کرلیا ہے اور ان کی بحالی کا وعدہ کیا ہے۔

ان کا وطن پھر سے آباد ہوگا اور دوسری قوموں میں ان کی عزت بڑھے گی اور جو لوگ اس وقت تک زندہ ہوں گے وہ دیکھیں گے کہ ان کے سچے نبی نے جو سچی پیش گوئیاں کی تھیں وہ ایک ایک کرکے پوری ہوئی ہیں، مصر پر آفت ٹوٹے گی۔ سقوطِ بابل ہوگا اور پھر ایسے حکمران سامنے آئیں گے جن کے دل میں جلاوطنوں کے لیے ہمدردی پیدا ہوگی اور انہیں اپنے وطن واپس جانے کی اجازت مل جائے گی اور ہیکل دوبارہ تعمیر ہوگا۔ اس دن کے بعد سے حضرت حزقیل علیہ السلام گھوم پھر کر لوگوں کو امید دلاتے تھے کہ مشکل کے دن ختم ہونے کو ہیں۔ ان کا خدا انہیں دوبارہ اپنے اپنے گھروں میں بسائے گا۔ ساتھ ہی وہ انہیں یہ بھی تلقین کرتے رہے کہ ایفائے عہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ناپاکی کو دور کریں۔ بت پرستی کی لعنت سے خود کو پاک کریں اور خدائی احکامات پر عمل کریں۔ یہ جلاوطن اتنا عرصہ وطن سے دور رہے تھے۔ دوسری قوموں سے بھی ان کا میل جول نہیں تھا لہٰذا بت پرستی کی طرف رجحان یوں بھی کم ہوگیا تھا۔ حضرت حزقیل علیہ السلام کی تعلیمات اب ان پر پوری طرح اثر انداز ہو رہی تھیں۔

ایک عرصے بعد جب ستر سال پورے ہوئے تو سائرس اعظم نے بابل پر حملہ کیا اور بخت نصر کے وارثوں سے حکومت چھین لی۔ سائرس اعظم کو بنی اسرائیل پر رحم آیا اور انہیں آزادی نصیب ہوئی۔ یہ جلاوطن اپنے وطن یروشلم کی طرف لوٹے۔ وہ خزانے بھی واپس کردیے جو بخت نصر اپنے ساتھ لایا تھا اور یروشلم کی دوبارہ تعمیر کا حکم دیا۔ ہیکل کی تعمیر ہوئی۔ مکانات اور عمارات کھڑی ہوگئیں۔ یہ وہی نقشہ تھا جو حضرت حزقیل علیہ السلام کو عالم رویا میں دکھایا گیا تھا۔ غالباً حضرت حزقیل علیہ السلام نے اس نقشے کی جو تفصیل اپنے پاس لکھ لی تھی اور اپنے لوگوں کو اس سے آگاہ کیا تھا، ان لوگوں نے تعمیر کے وقت اسی تفصیل کو پیشِ نظر رکھا۔

تیس سال کے عرصے میں شہر دوبارہ تعمیر ہوگیا۔ شاندار مکانات تعمیر ہوچکے تھے، محلات رونق افروز تھے، فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ آبادی اتنی ہوگئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا جو لوگ مر چکے تھے انہیں بھی زندہ کردیا گیا ہو۔ ہیکل میں خدا کی عبادت ہو رہی تھی۔ بتوں کا نام و نشان نہیں تھا۔

محمد بن اسحٰق فرماتے ہیں کہ حضرت حزقیل علیہ السلام کے بنی اسرائیل میں ٹھہرنے کی مدت ہم سے بیان نہیں کی گئی۔ الغرض آپ ایک عرصہ بنی اسرائیل میں ٹھہرے رہے پھر اللہ نے ان کو اپنے پاس بلالیا۔

حضرت حزقیل علیہ السلام کی موت کب واقع ہوئی، کہاں تدفین ہوئی۔ تعمیرِ یروشلم کو اپنی آنکھ سے دیکھا یا نہیں؟ اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ بس اتنا معلوم ہے کہ ان کی خدمت 571 ق م تک جاری رہی۔ ان کی خاندانی زندگی کے بارے میں بھی صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ شادی شدہ تھے۔ آپ کی زوجہ کا انتقال جلاوطنی کے دور میں ہوگیا تھا۔

ماخذات

توریت - عہد تحقیق کا تاریخی سفر - قصص الانبیاء - قصص القرآن - انبیاء قرآن

زیادتی کسی بھی چیز کی ہو آسانی سے ہضم نہیں ہو پاتی... اس بے وقوف نے بھی جب بہت زیادہ عقل مندی کا مظاہرہ کیا تو بہت سے عقل کے اندھوں کی چھٹی حس کچھ یوں بیدار ہوگئی کہ ان کے چلن کو سمجھتے ہوئے تمام چالوں کو مات دے بیٹھے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو اپنی ہار یقینی تھی۔

فتح و شکست کی جنگ میں عقل کے گھوڑے دوڑانے والوں کا ماجرا

ناممکن چوری

عبدالقیوم شاد

میں تمہیں دس لاکھ ڈالرز کچھ نہ چرانے کے لیے دوں گا۔“ میلوری نے کہا۔ وہ بیری ونسٹن کے بعد دنیا کا سب سے بڑا تاجر تھا۔ جو انڈوں کے برابر سائز کے ہیرے فروخت کرتا تھا۔

وک نے اس کی پیشکش پر غور کیا۔ اس کی جگہ کوئی اور چور ہوتا تو شاید اس کی پیش کش پر حیران ہوجاتا، مگر وہ وک تھا۔ جو ڈبل فائیو کہلاتا تھا۔ مانا ہوا نامی گرامی چور، جس کے بارے میں مشہور تھا کہ دنیا کا کوئی حفاظتی نظام ایسا نہیں جسے وہ ناکام نہ بنا سکے۔ اس کی جیت کا راز اس کی ذہانت اور مہارت میں مضمر تھا۔ وہ پچپن ہزار ڈالرز معاوضے کے عوض پچپن سینٹ مالیت کی کوئی بھی چیز چرانے پر ہر وقت آمادہ رہتا تھا۔

وک کے بارے میں ایک واقعہ بھی مشہور تھا جو اس کی مہارت کا ثبوت بھی تھا۔ ایک مرتبہ کسی نے اس سے شرط بدلی اور اس نے پچپن ہزار ڈالرز کے عوض وہ شرط جیت بھی لی۔ اس شرط کو پورا کرتے ہوئے اس نے ایک رقاصہ اور گلوکارہ کے لباس کی سلائی سے کئی ٹانکے چرالیے تھے۔

"توتم مجھے دس لاکھ ڈالر صرف اس لیے دوگے کہ میں کچھ چراؤں گا نہیں۔ آخر بات کیا ہے، تم مجھے اتنی بھاری رقم کیوں دینا چاہتے ہو۔ جبکہ تمہیں معلوم ہے کہ میری فیس صرف پچپن ہزار ڈالرز ہے، نہ ایک سینٹ کم نہ ایک سینٹ زیادہ، اگرچہ میرا اصول نہیں رہا ہے کہ میں اپنے کرم فرماؤں سے یہ پوچھوں کہ وہ کوئی معمولی چیز چوری کرانے کے لیے مجھے اتنی بھاری رقم کیوں دیتے ہیں۔ پھر بھی میں یہ ضرور پوچھوں گا کہ آخر تم میری فیس سے اٹھارہ گنا سے بھی زیادہ رقم دینے پر تیار کیوں ہو؟"

میلوری ہنسا۔ "محض اس لیے کہ شاید تم گرفتار ہو جاؤ گے۔ میں صرف تمہارے اس وعدے پر یہ رقم دینے کے لیے تیار ہوں کہ اگر تم پکڑے گئے تو تم یہ بتائے بغیر کہ اس کام کے لیے میں نے تمہاری خدمات حاصل کی تھیں، خاموشی سے چوری کی کوشش کرنے کی سزا کاٹ لوگے۔"

"اچھا۔" وک نے سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن تمہیں یہ کیسے یقین ہے کہ میں اپنے وعدے پر قائم بھی رہوں گا۔"

"جس عورت نے مجھے تمہارا پتا دیا تھا اسی نے یہ بھی بتایا تھا کہ تم ایک قابلِ اعتماد اور قول کے پکے مرد ہو۔ جو وعدہ کرتے ہو اسے ہر قیمت پر پورا کرتے ہو۔"

"خوب، بہت خوب، بہرحال میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر پکڑا گیا تو اس گفتگو کا تذکرہ نہیں آئے گا۔" وک نے کہا۔ "اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم چاہتے کیا ہو؟"

"میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے دفتر کا دروازہ کھولو۔ اس کے الارم کو ناکارہ بنا دو پھر دروازہ کھلا چھوڑ کر یہاں سے فرار ہو سکتے ہو تو فرار ہو جاؤ۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ نچلی منزل پر موجود حفاظتی عملہ اور سیکیورٹی گارڈز کتنی جلد یہاں پہنچتے ہیں۔"

وک ایک مرتبہ پھر سوچ میں پڑ گیا۔ میلوری کی یہ تمام گفتگو اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ وہ اس کا اصل مقصد نہیں سمجھ پایا تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ اگر اس نے میلوری کے دفتر سے کوئی چیز نہیں چرائی تو اس پر صرف نقب زنی اور دفتر میں چوری کے ارادے سے داخل ہونے کا الزام لگایا جائے گا۔ "تم یہ کام خود کیوں نہیں کر لیتے؟ اس الارم کو بجا دو اور دیکھ لو کہ سیکیورٹی گارڈ کتنی دیر میں یہاں پہنچتے ہیں۔ اس طرح تمہیں ایک بھی سینٹ خرچ نہیں کرنا پڑے گا اور تمہارا مقصد بھی پورا ہو جائے گا۔"

"اس لیے کہ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم کیا واقعی اس تمام حفاظتی نظام کو غچہ دے سکتے ہو۔ ساتھ ہی میں یہ اطمینان بھی کر لینا چاہتا ہوں کہ دروازے کے تالے کتنے مضبوط ہیں؟"

"تالا تو کوئی بھی ہو اسے کھولا جا سکتا ہے۔" وک نے کہا۔ "لیکن تالا کھولنے میں اتنا وقت ضرور لگ سکتا ہے کہ چور اسی دوران میں پکڑ لیا جائے۔"

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں، تم یہ بتاؤ کہ یہ کام کرنے پر تیار ہو یا نہیں؟"

وک نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ "ٹھیک ہے، مجھے تمہاری یہ پیشکش منظور ہے۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ انعامی رقم مجھے کب اور کس طرح ملے گی؟"

میلوری نے جیب سے بٹوا نکالا اور اس میں سے ایک کارڈ نکال کر وک کو دے دیا۔ "میں نے دس لاکھ ڈالرز سوئزرلینڈ کے اس بینک میں جمع کر دیے ہیں۔ اس بینک کو فون کر کے کارل سے گفتگو کر لو اور اسے اس کارڈ پر لکھے ہوئے کوڈ نمبر بتا کر اسے ہدایت دو کہ یہ رقم وہ تمہارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دے۔ میں کارل کو ہدایت دے چکا ہوں۔ وہ اس وقت تمہارے فون کا ہی منتظر ہوگا۔ تم آج رات اس سے فون پر رابطہ قائم کر سکتے ہو۔"

وک نے میلوری کا دیا ہوا کارڈ احتیاط سے اپنی جیب میں رکھ لیا اس دوران میں اس کی تیز نظریں کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ دوسری چیزوں کے علاوہ اس کمرے میں ایک تجوری بھی تھی۔ اس تجوری میں دہرے دروازے لگے ہوئے تھے، ایک طرف چھوٹی سی میز پر خوبصورت سا ایکوریم رکھا ہوا تھا۔ اس کی تہ میں بچھے ہوئے سنگ ریزوں پر آبی پودوں کے درمیان خوبصورت رنگ برنگی مچھلیاں آرام کر رہی تھیں۔ تجوری کے دہرے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ تجوری کے خانوں میں چھوٹی چھوٹی طشتریوں میں سیاہ مخمل کے نرم گدیلوں پر کئی ہیرے قطار میں بڑے سلیقے سے رکھے تھے۔

میلوری کی آنکھیں بھی وک کی نظروں کا تعاقب کر رہی تھیں۔ اس نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔ "اس جگہ موجود تمام ہیرے بیمہ شدہ ہیں۔ یہ ہیرے کوئی تین کروڑ ڈالرز میں بیمہ کرائے گئے ہیں۔ بیشتر ہیرے پچاس ہزار سے ایک لاکھ ڈالر مالیت کے ہیں۔ ان ہیروں میں دو ہیرے سب سے زیادہ قیمتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک ہیرے کی قیمت دس لاکھ ڈالر فی سے زیادہ ہے۔"

"مجھے تعجب ہے کہ وہ بیمہ کرنے والے کون احمق ہیں کہ انہوں نے ایسی صورت میں ان ہیروں کا بیمہ کیا ہے جبکہ تم ان ہیروں کو والٹ میں رکھنے کے بجائے یہاں اپنی تجوری میں رکھتے ہو اور پھر یہ تجوری بھی کھلی رکھتے ہو۔"

"عام طور پر وہ ایسی صورت میں ہیروں کا بیمہ نہیں کرتے لیکن اس عمارت میں حفاظتی انتظامات بہت سخت اور مکمل ہیں اور اس تمام عمارت میں تمام کاروباری ادارے اسی نوعیت کے ہیں۔ اس لیے انہوں نے ان ہیروں کا بیمہ کر لیا تھا۔ پھر سیکیورٹی ایجنسی کا دفتر بھی نچلی منزل پر واقع ہے۔ بہرحال اب وہ بیمہ کمپنی دھمکی دے رہی ہے کہ اگر میں نے یہ ہیرے والٹ میں نہ رکھوائے تو میری پالیسی منسوخ کر دی جائے گی۔ میں ان لوگوں پر ثابت کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ ہیرے میرے دفتر میں بھی اتنے ہی محفوظ ہیں جتنے کسی والٹ میں ہو سکتے ہیں۔"

میلوری یہ کہہ کر کچھ دیر کے لیے رکا اور اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "اس عمارت میں جو شخص بھی داخل ہونا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ اس نے اس عمارت میں واقع کسی بھی ادارے سے پہلے سے ملاقات کا وقت لے رکھا ہو۔ اس کے بعد یہ بھی ہے کہ اس عمارت میں داخل ہوتے یا باہر جاتے وقت ہر شخص کو حفاظتی چیکنگ کے مرحلے سے گزرنا ہوتا ہے۔ اس عمارت میں واقع تمام دفاتر کے دروازوں کو بند رکھا جاتا ہے۔ جو شخص بھی اندر داخل ہوتا ہے ایک خفیہ سوراخ سے پہلے اس کا جائزہ لیا جاتا ہے۔"

میلوری یہ کہہ کر اس تجوری کی طرف بڑھ گیا جس کے اندر طشتریوں پر ہیرے رکھے ہوئے تھے۔ "جہاں تک اس تجوری کا تعلق ہے تو یہ دباؤ کے نظام سے وابستہ پلیٹوں پر رکھی ہوئی ہے۔ جس سے منسلک تار فرش سے گزر کر نیچے واقع سیکیورٹی ایجنسی میں پہنچتے ہیں۔ اگر اس تجوری کو بال برابر بھی اپنی جگہ سے کھسکایا جائے یا پھر اس تجوری پر کسی بھی جگہ کوئی برمار کھا جائے یا اس پر ٹارچ کی روشنی ڈالی جائے تو سیکیورٹی آفس میں الارم بج اٹھتے ہیں۔ سیکیورٹی گارڈز کا کہنا ہے کہ وہ اسلحے سے مسلح ہو کر پلک جھپکتے ہی کسی بھی شخص کے دفتر سے باہر جانے سے پہلے یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ اگرچہ مجھے ان کی پھرتی پر بھروسا ہے مگر ان کی پھرتی کا امتحان تمہیں لینا ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے اپنے طور پر بھی کچھ حفاظتی اقدام کر رکھے ہیں۔ آؤ، میں تمہیں دکھا دوں۔"

وہ دونوں آگے پیچھے اس کمرے سے نکل کر دفتر کے بیرونی کمرے میں آئے۔ جہاں ایک خوبصورت اور پرکشش حسینہ ٹائپنگ میں مصروف تھی۔ "یہ مس ڈائل ہیں۔ میری سیکریٹری۔ ان دنوں یہ ہمارے نئے کیٹیلاگ کی تیاری میں مصروف ہیں جو عنقریب چھپنے کے لیے جانے والا ہے۔ مس ڈائل ایک ماہر نشانہ باز بھی ہیں۔"

ایک لمحے پہلے مس ڈائل فہرست کی ٹائپنگ میں مصروف تھی۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں ایک خوفناک آٹومیٹک پستول نظر آ رہا تھا۔ جس کا رخ وک کی طرف تھا۔ وک کو اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ یہ پستول اس کے ہاتھ میں اچانک کہاں سے آ گیا تھا۔ اس نے مس ڈائل کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں ایک سرد اور سنگین بے رحمی تھی۔ وک کو مس ڈائل کی آنکھیں قطعی پسند نہیں آئیں۔

"شکریہ مس ڈائل!" میلوری نے کہا۔

پستول پھر غائب ہو گیا اور مس ڈائل دوبارہ ٹائپنگ میں مصروف ہو گئی۔ وک نے ایک گہری سانس لی جیسے وہ موت کے غار سے زندہ نکل آیا ہو۔

استقبالیہ کے طور پر استعمال ہونے والے گوشے سے پرے ہال میں اسٹیل کے پیڈسٹلوں سے پیوستہ بلٹ پروف شیشے کے کیسوں میں چھوٹے چھوٹے بلب روشن تھے۔ ہر کیس میں مخملی فرش پر ایک ہیرا جگمگا رہا تھا۔

"کیا یہ ہیرے رات کو انہی کیسوں میں چھوڑ دیے جاتے ہیں؟" وک نے سوال کیا۔

"نہیں، دفتر بند کرنے سے پہلے ہم یہ تمام ہیرے یہاں سے نکال کر تجوری میں رکھ دیتے ہیں۔" میلوری نے جواب دیا۔

آخری کیس کے مقابل ایک بغلی دروازہ کھول کر وک کو اس دروازے میں موجود دہرے تالے کے پیچیدہ نظام کے متعلق بتانے لگا۔

"جب یہ الارم آن ہوتا ہے تو ہر مرتبہ جب بیرونی دروازہ کھلتا ہے تو اس کا میکنزم حرکت میں آ جاتا ہے۔ اس میکنزم سے بچاؤ کی صورت یہی ہے کہ اس دروازے کو بیک وقت دو چابیوں سے کھولا جائے۔ ان میں سے ایک عدد چابی میرے پاس اور دوسری مس ڈائل کے پاس رہتی ہے۔" میلوری نے اس نظام کی وضاحت کی۔ "دونوں چابیوں کو ایک ساتھ گھمایا جاتا ہے۔ اگر صرف ایک چابی گھمائی جائے یا انہیں یکے بعد دیگرے گھمایا جائے تو نیچے سیکیورٹی آفس میں الارم بج اٹھتا ہے۔"

وک نے اس وضاحت پر غور کیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اگر ایک تالے کو کھولنے کی کوشش کی جائے گی تو بھی سیکیورٹی آفس میں الارم بج اٹھے گا اور سیکیورٹی گارڈز دوسرے تالے کی طرف چور کے متوجہ ہونے سے پہلے ہی موقع پر آ موجود ہوں گے۔ اندرونی دیوار میں دو دروازے تھے۔ میلوری نے ان میں سے ایک دروازہ کھولا جو غسل خانے میں کھلتا تھا۔

”دوسرے دروازے کے پیچھے کیا ہے؟“ وک نے دریافت کیا۔

میلوری نے دوسرا دروازہ بھی کھول دیا۔ یہ سامان رکھنے کی ایک چھوٹی سی کمرے نما الماری تھی۔ جس میں ویکیوم کلینز اور دوسری مختلف میزیں رکھی تھیں۔

”ویکیوم کلینر کی کیا ضرورت ہے؟“ وک نے دریافت کیا۔

”مس ڈائل ہر صبح اس سے فرش کی گرد صاف کرتی ہے۔ اس طرح ہمیں یہاں کسی صفائی کرنے والے کو بلانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس صفائی کے لیے مس ڈائل کو علیحدہ سے الاؤنس دیا جاتا ہے۔“

میلوری نے دروازہ بند کر دیا اور وک کو ساتھ لے کر اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ ”تمہیں اپنا کام کل کرنا ہوگا۔“ کمرے میں پہنچ کر اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے میلوری نے کہا۔ ”ہم ساڑھے تین بجے دفتر بند کر دیتے ہیں۔ ساڑھے تین بجے کے بعد تم کسی بھی وقت یہ کام کر سکتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ کل تم مجھے دفتر بند ہونے سے پہلے اپنے ارادے سے آگاہ کر دو کہ تم یہ کام کر رہے ہو یا نہیں۔“

”ٹھیک ہے میں اطلاع دے دوں گا اور کچھ؟“

”بس ٹھیک ہے۔ ہاں جب باہر نکلو تو دروازہ بند کرتے جانا۔“ یہ کہہ کر میلوری نے سلسلۂ کلام ختم کر دیا۔

وک جب میلوری کے کمرے سے نکل کر مس ڈائل کے پاس سے گزرا تو مس ڈائل نے ٹائپنگ روک کر الارم کا رابطہ منقطع کرنے کے لیے سوئچ دبا دیا تا کہ وک دفتر سے باہر جا سکے۔

وک نے باہر آ کر ہال کا جائزہ لیا اور ہنگامی ضرورت کے لیے استعمال ہونے والے زینے سے اتر کر نیچے آ گیا۔ نیچے لفٹ کے ساتھ ہی دیوار پر ایک بڑا سا بورڈ آویزاں تھا جس پر اس عمارت کی مختلف منزلوں پر واقع دفاتر کے نام لکھے ہوئے تھے۔ وک نے چوتھی منزل پر واقع دفاتر کے نام پڑھنے شروع کر دیے اور پھر ایک فون بوتھ میں داخل ہو کر ایک نمبر ڈائل کیا۔

”ہیلو، بیکلنس کوائنس اینڈ اسٹیمپس!“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”آپ کا دفتر کب تک کھلا رہتا ہے؟“ وک نے پوچھا۔

”ساڑھے چار بجے تک!“ دوسری طرف سے جواب ملا۔

”میرا نام ٹیلر ہے۔ میں چند قدیم سکے خریدنا چاہتا ہوں۔ کل تین بجے آپ کے آفس آؤں گا۔“

”بہت بہتر مسٹر ٹیلر کل تین بجے آپ سے ملاقات ہوگی۔“

وک نے ریسیور رکھ دیا اور بوتھ سے نکل کر مین دروازے کی طرف بڑھ گیا جہاں دروازے کے ساتھ ہی ایک طرف سیکیورٹی گارڈ کی میز پڑی ہوئی تھی۔ اس وقت گارڈ مین ایک سیلز مین کے اٹیچی کیس کا جائزہ لے رہا تھا۔ جائزہ مکمل کرنے کے بعد اس شخص کو باہر جانے کی اجازت دے دی گئی اور وک نے اس عمارت میں داخل ہونے کا اپنا پاس سیکیورٹی گارڈ کی طرف بڑھا دیا۔

گارڈ نے پاس اس سے لے کر اس کے جسم کے ساتھ ساتھ ایک برقی آلہ پھرایا۔ یہ آلہ لباس میں موجود دھات کی کسی بھی شے کی موجودگی کا پتا دے سکتا تھا۔ مطمئن ہو کر اس نے وک کو عمارت سے باہر جانے کی اجازت دے دی۔

وک گھر پہنچا تو ہیلی کو میلوری سے ہونے والی تمام گفتگو سناتے ہوئے کہا۔ ”بات یہ ہے ہیلی کہ ابھی تک میں یہ نہیں سمجھ سکا ہوں کہ میلوری دو کروڑ ڈالرز مالیت کے ان ہیروں کی حفاظت کے لیے مجھے دس لاکھ ڈالرز کیوں دے رہا ہے؟ ان ہیروں میں میلوری کے زیادہ سے زیادہ ایک کروڑ ڈالرز تو لگے ہوں گے۔ ان ایک کروڑ ڈالر میں سے اس کا منافع جو کچھ ہوگا اس میں سے وہ دس لاکھ ڈالرز بلاوجہ نہیں دے رہا ہے۔ وہ کوئی احمق نہیں ہے۔ بلاوجہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وہ جو کام مجھ سے لینا چاہتا ہے وہ بغیر رقم خرچ کیے خود بھی کر سکتا ہے۔“

”ہاں واقعی یہ بات تو ہے۔“ ہیلی نے کہا۔ ”کوئی چکر تو نہیں ہے؟“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ کوئی بڑا کھیل کھیلنا چاہتا ہے اور مجھے پھنسا کر اپنا کام نکالنا چاہتا ہے۔“

”تو کیا تم پھنسنے پر آمادہ ہو؟“

”پھنسوں گا تو اسی صورت میں جب میں پکڑا جاؤں گا ڈیئر۔“

اگلے روز سہ پہر کے ٹھیک تین بجے وک گارڈ کی ڈیسک کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے پیلے رنگ کی ٹی شرٹ اور چست پتلون پہن رکھی تھی۔ پیروں میں کریپ سول کے جوتے تھے۔ بڑے بڑے گہرے رنگ کے شیشوں والا چشمہ اس کے چہرے اور آنکھوں کو چھپائے ہوئے تھا۔ اس نے رجسٹر پر اپنا نام جے۔ ٹی ٹیلر لکھا۔ پھر متعلقہ خانے میں بیکلنس کوائنس اینڈ اسٹیمپس کے الفاظ تحریر کر کے اپنے دستخط کیے۔

گارڈ نے رجسٹر اپنی طرف کھینچ کر ایک خانے میں اس کے آنے کا وقت لکھا اور وک کو اس کا پاس دینے سے قبل بیکلنس کوائنس اینڈ اسٹیمپس کے دفتر سے فون پر بات کر کے تصدیق کر لی کہ وہ لوگ اس ملاقات کے منتظر ہیں۔

بیکلنس کوائنس اینڈ اسٹیمپس کے دفتر میں پہنچنے کے بعد وک نے کہا۔ ”میں قدیم سکوں سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ کرنسی کی قیمت جتنی تیزی سے کم ہو رہی ہے اس کی بنا پر میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں کچھ رقم ان قدیم نادر سکوں کی شکل میں محفوظ کر لوں جن کی قیمت ہر گزرتے سال کے ساتھ بڑھتی رہتی ہے۔ میں ہر ماہ دو سو ڈالرز کی رقم ان قدیم سکوں کی خریداری میں لگانا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟“

کلرک نے چند مختلف فائل کارڈوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک الماری سے پلاسٹک کا تھیلا نکالا۔ شفاف تھیلے میں دو سکے موجود تھے وہ تھیلا اس نے وک کے سامنے رکھ دیا۔

وک چند منٹ ان سکوں کو بغور دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”میں ذرا دیر کے لیے باہر جا کر اس بارے میں سوچنا چاہتا ہوں کہ کون سا سکہ مجھے خریدنا چاہیے۔“

کلرک نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے باہر جانے کے بعد کلرک دروازہ اندر سے بند کر کے پھر اپنی نشست پر آ بیٹھا۔ وک وہاں سے سیدھا لابی میں پہنچا اور فون بوتھ میں داخل ہو کر اس نے میلوری کے دفتر کا نمبر ملایا۔

”مسٹر وک، مسٹر میلوری سے ملنے آئے ہیں۔“ وک نے فون پر مس ڈائل کی آواز سنتے ہی سیکیورٹی گارڈ کے لہجے میں کہا۔

”انہیں اوپر بھیج دیجیے۔“ مس ڈائل کی آواز ابھری۔

چند منٹ بعد وک میلوری کے دفتر میں بیٹھا اس سے کہہ رہا تھا۔ ”میں آج ہی کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

میلوری نے حیرانی سے وک کو دیکھا اور کہا۔ ”میں سمجھ رہا تھا کہ تم مجھے فون پر اطلاع دو گے۔“

”میں ٹیلی فونز پر بھروسا نہیں کرتا۔ انہیں ٹیپ کیا جا سکتا ہے۔ پھر سیکریٹری بھی ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو سن سکتے ہیں۔“

”لیکن...... تمہارے اوزار کہاں ہیں؟“

”ضرورت کی ہر چیز میرے پاس ہے۔“

آپ بھی پوچھیے

☆ایک مرد ”بے چارہ“ کب لگتا ہے؟

O جب وہ گھر میں بیوی سے اور باہر اپنی محبوبہ سے جھوٹ بولے۔

☆ کوئی شخص کسی لڑکی کو چھیڑے تو دس آدمی اس کی پٹائی کر دیتے ہیں اگر وہ اسے بہن کہہ دے تو؟

O وہ لڑکی خود اس کی پٹائی کر دیتی ہے۔

☆ کیا عورت ہیرا ہے؟

O جی ہاں! بیش قیمت ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی مہلک بھی!

☆ ایک اچھی طالبہ میں کیا خصوصیات ہونی چاہئیں؟

O آج کل کے تمام فیشن سے آگاہ ہو۔

☆ سگریٹ اور عورت میں کیا فرق ہے؟

O پہلی کلیجا جلاتی ہے اور دوسری دل!

☆ عورت کے لیے سب سے اذیت ناک بات کیا ہوتی ہے؟

O کسی دوسری عورت کی تعریف سننا۔

☆ زندگی میں محبت کتنی بار کرنی چاہیے؟

O ایک بار فیل ہونے پر تین موقعے تو یونیورسٹی بھی دیتی ہے۔

قیمتی انگلی

ایک عورت ٹرین میں سفر کر رہی تھی۔ کھڑکی بند کرتے ہوئے اس کی انگلی کھڑکی میں آ گئی اور کٹ گئی تو عورت نے ریلوے پر پچاس لاکھ ہرجانے کا دعویٰ کر دیا۔ جج نے عورت سے پوچھا کہ پچاس لاکھ ایک انگلی کے؟ تو عورت نے جواب دیا۔

”میری انگلی اس سے بھی زیادہ قیمتی تھی۔“

جج نے پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“

عورت نے جواب دیا ”اسی سے تو میں اپنے شوہر کو نچاتی تھی۔“

مرسلہ: عمران حیدر بلوچ، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

''لیکن تم چوروں جیسے لباس میں تو نہیں ہو؟'' میلوری کی حیرت برقرار تھی۔

''اچھا۔'' وک نے ہنس کر کہا۔ ''چوروں کا لباس کیسا ہوتا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ لیکن چور ایسا بھڑکیلا لباس بھی نہیں پہنتے جیسا تم پہنے ہوئے ہو۔ اس لباس میں تو توجہ تمہاری طرف مرکوز ہو جاتی ہے۔''

وک پھر ہنسا۔ ''اس کی پروا نہ کرو۔ ضرورت ہوئی تو میں اپنے چہرے پر نقاب بھی ڈال سکتا ہوں۔''

جب وک میلوری کے کمرے سے نکلا تو حسب عادت مس ڈائل نے ٹائپنگ روک دی۔ ''میں اپنے ہاتھ دھونا چاہتا ہوں اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو۔''

مس ڈائل نے اثبات میں سر کو جنبش دے کر غسل خانے کی طرف اشارہ کر دیا اور پھر ٹائپنگ میں مصروف ہو گئی۔

وک آفس کے عقب میں چلا گیا۔ بغلی دروازے کے ساتھ اس نے الارم کے سوئچ کو آف کر دیا۔ اس کے بعد اس نے دروازہ کھول کر دروازے اور ہینڈل کے کھٹکے کے درمیان کریڈٹ کارڈ پھنسا دیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر وہ غسل خانے میں داخل ہوا اور سنک میں نل کھول دیا۔ چند منٹ بعد وہ غسل خانے سے نکلا اور مس ڈائل کا شکریہ ادا کیا۔ مس ڈائل نے اس کے باہر جاتے ہی دروازے کو بند کر دیا۔

وک نے راہداری کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ تیزی سے بغلی دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ دروازے میں پھنسا ہوا اپنا کریڈٹ کارڈ نکال کر جیب میں رکھا۔ ٹائپ رائٹر کی کھٹ کھٹ کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔ وک نے بغلی دروازے کو احتیاط سے بند کر کے الارم کا سوئچ پھر آن کر دیا اور مختلف سامان کے لیے مخصوص الماری میں خود کو بند کر لیا۔ اس الماری میں اب بھی مس ڈائل کے ٹائپ رائٹر کی آواز آ رہی تھی لیکن اب یہ آواز بہت مدھم تھی۔

وک نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اب اسے ساڑھے تین بجے کا انتظار تھا۔

چند منٹ بعد ٹائپ رائٹر کی کھٹ کھٹ بند ہو گئی۔ مس ڈائل اور میلوری اب ہال میں رکھے ہوئے شوکیسوں سے ہیرے جمع کرتے ہوئے باتوں میں مصروف تھے۔

''میرا خیال ہے کہ میں صبح کے بجائے اسی وقت ویکیوم سے دفتر صاف کر دوں۔'' مس ڈائل نے کہا۔ ''کل دوپہر کو مجھے کیٹلاگ لے کر پرنٹر کے پاس بھی جانا ہے۔''

یہ تجویز سن کر وک کی سانس جیسے رک سی گئی۔

''نہیں۔ اس وقت چھوڑو، یہ ہیرے تجوری میں رکھنے کے بعد مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے گی۔ تمہیں کچھ چیزیں میری کار میں لے جا کر رکھنا ہیں۔''

''آپ اپنی چابی مجھے دے دیں۔ میں واپس آکر صاف کر دوں گی۔'' مس ڈائل نے کہا۔

''نہیں آج صفائی کو چھوڑو۔'' میلوری نے کہا۔

وک نے اطمینان کا سانس لیا۔ اگر کہیں مس ڈائل صفائی کرنے پر مصر ہو جاتی تو اس کا تمام منصوبہ ہی دھرا کا دھرا رہ جاتا۔

چند منٹ اور گزر گئے۔ پھر اس نے مس ڈائل اور میلوری کے دفتر سے باہر جانے کی آوازیں سنیں۔ وہ کچھ دیر اور وہیں کھڑا رہا اور پھر اس کمرے نما الماری سے نکل آیا۔ دفتر بالکل ویران اور خاموش تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ میلوری کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

اس نے رومال ہاتھ میں لے کر دروازہ کھولا۔ اس مرحلے پر وہ ہر احتیاط کرنا چاہتا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ کہیں بھی اس کے ہاتھوں کے نشانات نہ رہنے پائیں۔

وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ تجوری کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے ہیروں کی طشتریاں بھری ہوئی تھیں۔ لیکن وہ دونوں طشتریاں خالی تھیں جن میں وہ گزشتہ روز بڑے بڑے ہیرے رکھے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ اس کے علاوہ ایکیوریم بھی اب کمرے میں موجود نہیں تھا۔

چند لمحوں بعد وہ الارم کو خاموش کر کے پھر بغلی دروازے سے باہر آ گیا اور اب وہ دس لاکھ ڈالر انعام کا مستحق ہو چکا تھا۔ اس نے میلوری سے دروازے کے تالے توڑنے کا وعدہ نہیں کیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میلوری نے ایسا سوچ لیا ہو۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ پھر بیکٹس کوانس اینڈ اسٹیمپس کے دفتر میں موجود تھا۔

''کہیے کیا فیصلہ کیا آپ نے؟'' کلرک نے اس سے دریافت کیا۔

''میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا اس لیے دونوں سکے ہی خرید رہا ہوں۔'' وک نے جواب دیا۔

تمام کارروائی مکمل ہونے کے بعد وہ دونوں سکے لے کر جب باہر نکلا تو کلرک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہم اگلے

ماہ بھی آپ کا انتظار کریں گے۔''

''ضرور ضرور۔'' وک نے کہا اور لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

نچلی منزل پر لفٹ سے نکل کر وہ گارڈ کی ڈیسک کی طرف بڑھا اور اس کے سامنے اپنا پاس پیش کر دیا۔ اس کے بعد وک نے گارڈ کو دو سکے اور ان کی خریداری کی رسید دکھائی۔ دوسرے شخص نے جو وردی پہنے ہوئے نہیں تھا۔ غور سے وک کا جائزہ لیا اور لباس میں پوشیدہ دھات کی بنی ہوئی کسی بھی چیز کا پتا لگانے والا حساس آلہ اس کے جسم کے چاروں طرف پھرایا اس کے بعد اس نے وک کے جسم کو تھپتھپا کر دیکھا۔

''آپ کو چند منٹ انتظار کی زحمت کرنا ہوگی۔'' سیکیورٹی گارڈ نے کہا۔

''ضرور، ضرور۔'' وک نے اطمینان سے جواب دیا۔

گارڈ نے بیکٹس کوانس اینڈ اسٹیمپس کے دفتر فون کر کے معلوم کیا کہ کیا مسٹر ٹیلر ان کے دفتر آئے تھے اور دو سکے خریدے تھے؟ دوسری طرف سے اثبات میں جواب پا کر گارڈ نے فون رکھ دیا۔ ''شکریہ جناب۔'' اس نے وک سے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' وک نے کہا اور عمارت سے باہر آ گیا۔

☆☆☆

گھر پہنچ کر وک نے ہیلی کو تمام تفصیل سنا کر کہا۔ ''سو میرا مشن مکمل ہو گیا۔''

اس کے بعد اس نے میلوری کو فون کیا۔ ''مسٹر میلوری! میں وک بول رہا ہوں۔ میرا مشن مکمل ہو چکا ہے۔''

''مجھے تعجب ہے کہ تم اب مجھے فون کر رہے ہو۔ تمہارا تو کہنا ہے کہ فون ٹیپ کیے جا سکتے ہیں۔''

وک نے اس سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''آج تم اپنے کمرے میں تجوری کا دروازہ بند کرنا بھول گئے تھے۔ میں نے اسے بند کر دیا ہے مجھے ڈر تھا کہ کہیں سیکیورٹی ایجنسی اس پر تم سے جھگڑ نہ بیٹھے اور بیمہ کمپنی تمہارے ہیروں کا بیمہ منسوخ نہ کر دے۔''

''یہ کیا کہہ رہے تھے تم؟'' ہیلی نے وک سے اس وقت پوچھا جب وہ ٹیلی فون بند کر چکا تھا۔

''میں میلوری کو اطلاع دے رہا تھا کہ اس نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ ناکام ہو چکا ہے۔''

''کیسا منصوبہ؟''

''وہ مجھے قربانی کا بکرا بنانا چاہتا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ مجھے چوری کے الزام میں گرفتار کرا دے اور ہیروں کی دگنی قیمت وصول کرے۔ ایک تو ہیروں کے خریداروں سے اور دوسری طرف بیمہ کمپنی سے، میرا خیال ہے کہ اس نے کسی عرب شیخ سے ان ہیروں کو اس کے ہاتھ فروخت کرنے کا سودا کر لیا ہے جو اپنے ملک سے چھپ کر امریکی ڈالروں سے یہ ہیرے خریدنا چاہتا ہے۔ اب میلوری کو وہ ہیرے صبح واپس تجوری میں رکھنے ہوں گے کیونکہ اب وہ ان ہیروں کی گمشدگی کا کوئی بہانہ نہیں بنا سکے گا۔''

''لیکن وک سوال پیدا یہ ہوتا ہے کہ میلوری ان ہیروں کو عمارت سے باہر کس طرح نکال کر لے گیا۔ جبکہ اس عمارت سے باہر جانے والی ہر چیز کی پڑتال کی جاتی ہے۔''

''میرا خیال کیا، مجھے یقین ہے کہ اس مقصد کے لیے انہوں نے ایکیوریم کو استعمال کیا ہے۔ ہیروں کو غائب کرنے کی پرانی ترکیب ہے یہ۔'' وک نے جواب دیا۔

''اور وہ شیخ ان ہیروں کو امریکا سے باہر کیسے لے جاتا۔ ظاہر ہے اگر میلوری ان ہیروں کے چوری ہو جانے کی رپورٹ کر دیتا تو اس شیخ کو کوئی نہ کوئی غیر قانونی طریقہ ہی اختیار کرنا پڑتا۔''

''ارے ڈارلنگ یہ کیا مشکل بات ہے۔ وہ عرب شیخ یقیناً ڈپلومیٹک بیگ کے ذریعے وہ ہیرے یہاں سے بھجواتا کیونکہ ڈپلومیٹک بیگ کی تلاشی نہیں لی جاتی۔''

ہیلی نے میٹھی نظروں سے وک کو دیکھا اور کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ آج رات تو تم گھر پر ہی ٹھہرو گے؟ بہت کام کر لیا ہے تم نے۔''

''نہیں ڈیئر ابھی مجھے ایک اور کام بھی کرنا ہے۔ میں آج رات میلوری سے ملاقات کروں گا اور اس سے اس کا معاوضہ طلب کروں گا کہ اس نے دانستہ طور پر مجھے گرفتار کرانے کی کوشش کی اور ان ہیروں سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس لالچی کو میں سبق بھی دینا چاہتا ہوں۔''

''وہ کیسے؟''

''میں اس کے ایکوریم میں ماہی گیری کرنا چاہتا ہوں۔ میں زیادہ لالچ سے بھی کام نہیں لوں گا۔ میں اس ایکوریم میں ہاتھ ڈال کر بس ایک ہیرا نکالوں گا۔ اب قسمت۔ وہ ہیرا ایک ہزار ڈالر مالیت کا ہوتا ہے یا پھر دس لاکھ ڈالر مالیت کا۔'' یہ کہہ کر اس نے ہیلی کے گال کو تھپتھپایا۔ ''بہرحال کون بدنصیب ہے جو یہ کہتا ہے کہ ایمانداری کا پھل اچھا نہیں ہوتا۔''

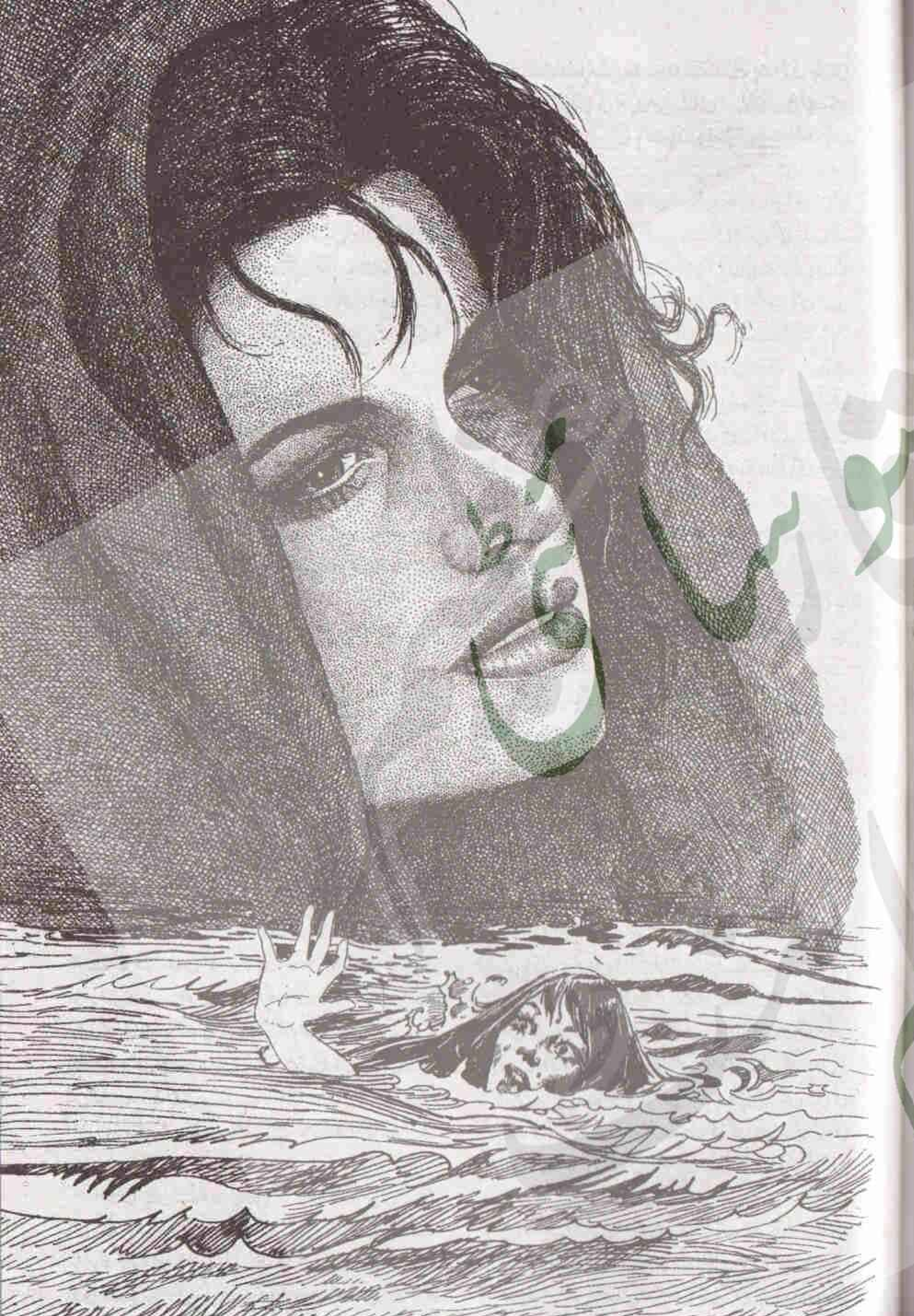

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

دوسرا اور آخری حصّہ

جنّت

ناصر ملک

جنّت اور جہنم کا تصور انسان کی پیدائش سے زیادہ قدیم ہے... جہنم کا احساس جتنا خوفناک... جنت کا اتنا ہی حسین مگر... اس کے حسن سے لطف اندوز ہونے کے لیے انسان کو جانے کتنے ہی طوفانوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جب قدم قدم پر آزمائش کے بھنور پیروں سے لپٹیں... جب خواب آنکھوں کو بصارت سے محروم کردیں... جب خواہشات دل میں زخم بن جائیں تو انسان کا بچپن اچانک ہی بڑھاپے کی دہلیز کو چُھوتا محسوس ہوتا ہے... اور جوانی درمیان میں ہی گم ہوجاتی ہے۔ ”وہ ابھی اُڑتا اور مگر... پھر زخمی ہوگئے پر“ کے مانند اچانک آسمان کی بلندیوں سے یوں گرا کہ پیروں تلے بچھی پستی بھی اسے اپنے قد سے اونچی دکھائی دینے لگی... ایسے میں اگر بے چین لہریں ساحل سے ٹکرائیں، یا دریا میں سیلاب آجائے... یا کوئی پانی کی سطح پر ہی بسیرا کرلے تو عجب کیا۔

دنیا سے بےزار اور کچھ الگ سا کر گزرنے کی دھن میں مگن عجیب انسانوں کی عجیب داستان

پروفیسر کولڑکپن میں خود سے چپک جانے والی سموں کے لمس کی یاد آ گئی۔ تنفس معتدل نہ رہا۔ پہلی مرتبہ اپنی ذات میں کچھ ٹوٹتا بکھرتا محسوس ہوا۔ اُس نے بہ دقت تمام خود کو سموں کی سحر انگیز گرفت سے آزاد کیا اور اُلٹے قدموں چلتے ہوئے ریلنگ تک چلا آیا اور ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ مشتعل سانسوں پر قابو پاتے ہوئے لرزیدہ آواز میں بولا۔ ''سموں! وہ بیس سال پرانی بات ہے۔ وہ بچپن تھا، یہ بڑھاپا ہے۔ بڑھاپے میں محبت، نظر اور دِل...... سب کچھ بوڑھا ہو جاتا ہے۔ ہم بوڑھے ہوگئے ہیں۔ ایسے میں نہ پہچاننے پر ہمیں شرمسار نہیں ہونا چاہیے۔''

وہ وہیں ٹھہری رہی۔ بولی ''سچ بتاؤ! کیا میں نے بے ہوشی میں کچھ بتایا تھا؟''

''نہیں!''

''یہ کیسا بڑھاپا ہے جو صرف مجھ پر اُترا ہے، تم پر نہیں۔'' وہ تاسف بھرے لہجے میں بولی۔ ''تم نے شاید مجھے پہچان کر مرنے سے بچایا تھا مگر افسوس! میں اپنے سیمو کو پہچاننے میں ناکام رہی۔''

پروفیسر نے تسلی دی۔ ''بہر حال! یہ اتنی بڑی بات نہیں، کہ اِسے یوں دِل پر لیا جائے۔''

وہ پروفیسر وسیم سے شاید کبھی کھل کر بات نہ کر پاتی، سیمو سے کھلی تو چپ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اپنے بارے میں، اپنے شوہر کے بارے میں، اپنے بیٹے کندن چند اور بیٹی شکنتلا کے بارے میں ڈھیر ساری باتیں کر کے بھی ایک تشنگی سی محسوس کر رہی تھی۔

اُس نے بتایا کہ اُس کے باپ دیپک چند اور ماں روپ دیوی کا چند سال پیشتر دیہانت ہو گیا تھا۔ شوہر کا ساتھ چھوٹے پانچواں سال گزر رہا تھا۔ وہ کھانستے کھانستے خون تھوکنے لگا تھا۔ علاج کارگر ثابت نہ ہوا اور وہ راکھ بن کر ساگر میں بہہ گیا۔ کندن چند میٹرک کے بعد سائنس پڑھنے کے لیے ملتان کے کالج میں زیرِ تعلیم تھا۔ شکنتلا نرسنگ کے پہلے سال میں تھی۔ وہ ساگر کنارے بنے ہوئے ناپختہ گھر میں مہینوں اپنے بچوں کے آنے کا انتظار کرتی تھی۔ وہ آتے تو اُس کی زندگی میں بہار آ جاتی۔ چلے جاتے تو انتظار کا کرب ہر دن بڑھ جاتا۔

دونوں بچوں نے فون پر بتایا تھا کہ وہ چند چھٹیاں لے کر ماں کے پاس رہنے کے لیے آرہے ہیں۔ وہ نہیں آئے، ساگر کا بپھرا ہوا پانی آ گیا۔ پوری کی پوری بستی ملیا میٹ ہوگئی۔ دریا برد ہوگئی۔ اُسے یاد تھا کہ وہ چند عورتوں کے ساتھ گاؤں سے پختہ سڑک پر جانے والے راستے پر دوڑی جارہی تھی کہ اچانک پانی کی اونچی لہر نے اُن سب کو دبوچ لیا۔ پھر اُسے بھی پانی میں مسلسل ہاتھ پاؤں مارنا ہی یاد رہا تھا، باقی سب کچھ محو ہوگیا۔

پروفیسر نے اُس کی کتھا سُن کر عافیت کا ایک گہرا سانس لیا اور جی ہی جی میں بولا۔ ''تو یہ بات تھی، میں بھی کہوں کہ اِسے اپنے خاندان کی فکر کیوں نہیں؟ اِس پر مرنے والے پہلے ہی مر چکے ہیں، بچے محفوظ جگہ پر محفوظ حالت میں ہیں، ایسے میں اِسے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟''

دونوں آمنے سامنے کھڑے خاموش موازنہ کر رہے تھے۔ بیس برسوں کے گزرنے پر دونوں ایک جیسے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ پروفیسر کے پاس جنت تھی۔ سموں کے پاس جیتے جاگتے دو جسم تھے جنہیں دیکھ کر وہ زندہ رہتی تھی۔

❁ ❁ ❁

اُس نے دورانِ ملاقات شہاب سے کتنی ہی مرتبہ کہا تھا کہ وہ اپنے والدین کو اُن کے ہاں بھیجے مگر وہ مسکرا کر تسلی دینے کے انداز میں کہتا۔ ''جان! ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ جب قریب آجائیں گے تو پھر فراق میں تڑپنے کا لطف ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائے گا۔''

وہ اُس کی باتوں میں آ کر بھول جاتی کہ کیا کہنے کے لیے آئی تھی۔ وہ چلا جاتا تو یاد آتا، پھر سر پیٹ کر خود کو کوسنے لگتی۔ وہ چاہتی تھی کہ شادی جب بھی انجام پذیر ہو، منگنی بغیر کسی تاخیر کے فوری طور پر ہو جانی چاہیے۔ وہ شہاب کو بتا نہیں سکتی تھی کہ اُس نے اپنے پاپا کو کس طرح اِس شادی پر رضامند کیا تھا۔

پھر جب اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے عمران اور وجدان کے دِلوں کی سنی گئی تو وہ بے جا گھبراہٹ کا شکار ہوگئی۔ ماما نے بڑے چاؤ سے عمران کی منگیتر اندادان کے لیے سامان تیار کر کے اچھی خاصی رقم خرچ کرتے ہوئے وین ٹو بھیجا تھا۔ ہزاروں میل دور دونوں نے منگنی کی رسم ادا کی جسے تمام گھر والوں نے وڈیو فلم پر دیکھا اور اُدھوری خوشی کو مکمل سمجھ کر دِل کو راضی کرلیا۔ پاپا نے عمران کو اِس شرط پر وین ٹو میں منگنی کی تقریب منعقد کرنے کی اجازت دی تھی کہ دونوں کی شادی پاکستان میں انجام پائے گی۔ عمران نے بہ خوشی پاپا کا حکم مان لیا۔ ماما اور پاپا نے وجدان کی منگنی پر جی کھول کر خوشیاں منائیں۔ ایک واہمہ جو مصباح کے دل میں چور بن کر بیٹھا ہوا تھا کہ پاپا اور ماما خوش نہیں ہوں گے، از خود ہی مر گیا۔

اپنے گھر میں رقصاں خوشیوں میں عکس عکس نہاتی ہوئی مصباح کو روز بہ روز شہاب کے چہرے پر چھانے والی مایوسی کی پرچھائیاں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ وہ صبح سے شام تک ایک ہی جہت میں سرگرداں تھا۔ ایک ہی ترکیب سوچتا رہتا تھا۔ کس طرح مصباح کو دُنیا سے چھپانے کے لیے اپنی آنکھ کا سرمہ بنالے؟ اُسے اپنے بابا کی سفاکی سے بھی ڈر لگتا تھا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ بیٹے کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر وہ مصباح کے خاندان پر قیامت بن کر ٹوٹ پڑے۔ اُسے اتنا تو اندازہ تھا کہ سلطان علی اور اُس کا خاندان، اگرچہ غریب نہیں تھا، مگر بابا کا ہم پلہ نہیں تھا اور نہ ہی اتنے لمبے ہاتھ رکھتا تھا۔

وہی گراسی پلاٹ، وہی سنگی بنچ...... بدلتی راتوں کی تنہائی اور اسپتال سے سنائی دینے والی کراہیں اور سسکیاں...... ایک رات عشق نے اُس کی بے بسی کو بھانپ لیا۔ ہاتھ بڑھا کر اپنے ساتھ چلاتے ہوئے سمجھانے لگا کہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔ اُسے احساس تھا اسی لیے اپنے ارادوں کو پتھر اور فولاد کی طرح مضبوط کرتا جاتا تھا۔

بیٹھے بیٹھائے سجھائی دینے والی ترکیب اچھی تھی مگر اس میں خودغرضی کا پہلو نمایاں تھا۔ اُس نے سر جھٹک کر خود کلامی کی۔ ''مجھے ہر حال میں اپنی مصباح چاہیے۔ خواہ دُنیا میں کچھ رہے یا نہ رہے، مجھے کسی سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔''

اُس نے پکے منصوبہ سازوں کی طرح پلاننگ شروع کر دی۔ وہ اتنا محتاط تھا کہ کہیں کوئی سقم نہ رہ جائے اور بنا بنایا کھیل چوپٹ ہو جائے۔ اُسے دو دوستوں کی معاونت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اپنے نوکروں یا ساتھ رہنے والوں پر اعتبار کرنا نقصان دہ نظر آیا۔ ایسے میں فرخ اور بابر کی طرف دھیان چلا گیا۔ وہ دونوں نہ صرف پڑھے لکھے اور مضبوط اعصاب کے مالک تھے بلکہ اُس پر جان نثار کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔

تینوں نے ایک ہوٹل میں شہاب کے لیے ریزرو کمرے میں بیٹھ کر منصوبے کی جزئیات پر سیر حاصل گفتگو کی۔ فرخ نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''یار شہاب! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اِس تمام خطرناک پلان کا نتیجہ ہماری توقع کے برعکس نکلے۔''

''مثلاً...... کچھ وضاحت کرو۔'' بابر نے کہا۔

''ہم دونوں آئی بی کے اہلکار بن کر مخصوص مقام سے شہاب اور مصباح کو اغوا کر لیتے ہیں اور ایگری فارم تک لے جانے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ تفتیش کے نام پر دونوں کو ہراساں کر لیتے ہیں۔ اِنہیں ڈراتے دھمکاتے ہیں کہ بغیر نکاح کے گھومنے پھرنے والے جوڑے پر کون کون سی دفعات لگ سکتی ہیں اور اِنہیں دانستہ ایک موقع دیتے ہیں کہ یہ نکاح پڑھوا لیں۔ فرض کرو کہ یہاں تک معاملہ بہ خوبی نمٹ جاتا ہے مگر مصباح شرعی نکاح یا کورٹ میرج پر رضامند نہیں ہوتی، وہ اَڑ جاتی ہے، پھر ہم کیا کریں گے؟ یہ ڈراما اگر طویل دورانیے پر محیط ہو جاتا ہے تو ہم دو طرف سے گھر جائیں گے۔''

''تم شاید ڈر گئے ہو۔'' شہاب نے مایوسی سے کہا۔

''نہیں دوست!'' فرخ نے کندھا تھپتھپایا۔ ''ڈر صرف تمہارے ناظم باپ کے اندھے اختیارات کا ہے، کہیں یہ نہ ہو کہ وہ پورے ضلع کی پولیس کو ہمارے پیچھے لگا دے۔''

''کیا میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں گا؟'' شہاب نے تلخی سے کہا ''ویسے بھی مصباح کو خاک پتا ہوگا کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ میں ڈر جاؤں گا تو وہ بھی مجھے دیکھ کر ڈر جائے گی اور جو کہتا جاؤں گا، وہ کرتی جائے گی۔''

''یہ بات تمہارے اور ہمارے مابین ہی رہے گی، تمہارے باپ کو یا مصباح کے گھر والوں کو اس کا علم نہیں ہوگا۔''

''شہاب! اِس ڈرامے میں بہت سے جھول ہیں۔ اِسے نئے سرے سے ترتیب دینا ہوگا۔'' بابر بھی فرخ کا حامی ہوگیا۔

''میں جو سوچ سکتا تھا، سوچ چکا، اَب سوچنے کی ذمّے داری بھی تم دونوں پر عائد ہوتی ہے۔ مجھے تو بس اتنا علم ہے کہ مجھے... ہر حال میں اپنی مصباح کو حاصل کرنا ہے۔'' شہاب نے بے بسی سے کہا۔

فرخ نے کن انکھیوں سے بابر کو دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہا سنا پھر بولا۔ ''شہاب! ہمیں کچھ وقت دو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم مصباح کو بجائے حاصل کرنے کے، ہمیشہ کے لیے اُسے گنوا بیٹھو۔ یہ بہت حساس معاملہ ہے۔''

شہاب نے بے بسی سے کندھے اُچکائے۔ اِس کے علاوہ اُس کے پاس کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

''کیا تم براہِ راست اپنے ہونے والے سسر سے مل کر اپنی مجبوری بیان نہیں کر سکتے؟'' فرخ نے شہاب سے پوچھا۔

''اگر ایسا ممکن ہوتا تو میں اتنا لمبا چکر کیوں کاٹتا؟'' وہ منہ بنا کر بولا ''وہ اتنے گرے پڑے لوگ نہیں ہیں کہ میں اکیلا رشتہ مانگنے اُن کے گھر چلا جاؤں اور وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھما کر بابل کے گیت گاتے ہوئے الوداع کر دیں۔''

اُس کے کہنے کا انداز اتنا مضحکہ خیز تھا کہ دونوں بے

اختیار ہنس پڑے۔ بابر نے کہا۔ ”تم فکر نہ کرو شہاب! ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں عشق میں ناکامی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔“

”مجھے کوئی آس دلاؤ، کوئی مضبوط دلاسا دو تو مجھے چین آئے۔“

”ہوں!“ فرخ کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھا سوچتا رہا، پھر پُریقین لہجے میں بولا۔ ”میں نے سوچ لیا ہے، تم گھر جاؤ، اپنی دل نشیں کو ہاتھ میں لو۔ تمہیں فون پر ایگری فارم پر مدعو کروں تو اُسے گاڑی میں بٹھا کر روانہ ہو جانا۔ اُسے کس طرح لے کر آنا ہے، کس طرح اعتماد میں لینا ہے، یہ تمہارا کام ہے۔ آگے سارا کام ہمارا ہے۔“

وہ تشکیک آمیز انداز میں بولا۔ ”کچھ پتا بھی تو چلے کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟“

”یہ بتانا سردست ضروری نہیں ہے۔“

بابر نے سوالیہ نگاہوں سے گھورا۔ ”کچھ تو بتاؤ!“

”بتانے کا موقع آئے گا تو ضرور بتاؤں گا۔“

پھر دونوں کو فرخ کی بات پر اتفاق اور اعتبار کرنا پڑا۔ شہاب گھر پہنچا اور فون پر مصباح سے گپ شپ کرنے لگا۔ اُس کے دریافت کرنے پر گول مول انداز میں سمجھانے لگا۔ ”عن قریب تمہیں خوش خبری سنانے کا ارادہ رکھتا ہوں، سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔ خاموشی سے انتظار کرو۔“

”تمہارے والدین کب آ رہے ہیں ہمارے ہاں؟“

”بہت بے صبری ہو رہی ہو!“ وہ ہنسا۔ ”کہہ تو دیا ہے کہ بہت جلد تمہیں سرپرائز دے رہا ہوں۔“

”یہ کیسا سرپرائز ہوگا جس کے بارے میں مجھے پہلے سے ہی پتا ہوگا؟“ مصباح نے مسکرا کر کہا۔

”تم کچھ بھی نہیں جانتی ہو میری جان!“

”پھر بتا ہی دو، کیوں پریشان کر رہے ہو؟“

”پریشان نہیں، حیران کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں بھی دیکھ لوں گی کہ تم کون سا تیر چلاتے ہو۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔ جی ہی جی میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔

شہاب فون بند کرنے کے بعد چین کی نیند سو نہ پایا۔ اُسے رہ رہ کر اپنی بے بسی اور سوچے جانے والے شارٹ کٹ پر شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ اتنا پڑھ لکھ کر، اتنا خوبصورت اور بے داغ عشق کرنے کے بعد بھی اُسے مجرمانہ طریقے سے مصباح کو حاصل کرنا پڑ رہا تھا، یہ اُس کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا مگر وہ اس آگ کے دریا کو عبور کرنے کے لیے ڈوب جلنے سے خود کو روک نہیں پا رہا تھا۔ رات گزری، بے چینی میں دن بھی گزر گیا مگر فرخ نے رابطہ نہیں کیا۔ اُس نے فون کیا تو پتا چلا کہ وہ اپنا موبائل گھر بھول گیا ہے۔

شام کو حسب وعدہ مصباح ہوٹل میں اُس کے سامنے اپنی تمام تر حشر سامانیوں سمیت جلوہ افروز تھی اور مسکرا کر پوچھ رہی تھی۔ ”تم نے خوامخواہ کہانی کو تجسس انگیز موڑ دینے کی کوشش کی ہے ورنہ شاید کچھ بھی ایسا نہیں ہے جو مجھے حیران کر دے۔“

وہ زیرِ لب مسکرایا، بولا۔ ”دیکھتی جاؤ۔“

وہ اُس پر غصہ بھری نگاہ ڈال کر کھڑی ہو گئی۔ کرسیوں کے بیچ سے نکل کر جانے لگی تو اُس نے گھبرا کر پوچھا۔ ”اے! کہاں جا رہی ہو؟“

وہ گردن موڑ کر بولی۔ ”تم نے خود ہی تو کہا ہے کہ دیکھتی جاؤ، میں دیکھ رہی ہوں اور یہاں سے جا بھی رہی ہوں۔ خدا حافظ!“

وہ دوڑ کر اُس کے مقابل آ گیا۔ دونوں شانوں سے پکڑ کر روکتے ہوئے بولا۔ ”احمق لڑکی! میرے کہنے کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں تھا۔“

”تو کیا تھا؟“ وہ منہ بنا کر بولی۔

وہ اُسے تقریباً کھینچ کر ٹیبل پر لے آیا۔ کرسی پر بٹھا کر ہنستے ہوئے بولا۔ ”میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ تم دیکھتی جاؤ کہ میں کیا کرتا ہوں۔“

”وہ تو میں دیکھ ہی رہی ہوں۔“ وہ بدستور بگڑی ہوئی تھی۔

”کیا......؟“

”کہ تم اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہو۔“

”شکر کرو...... فارغ بیٹھ کر مکھیاں تو نہیں مارتا نا!“

وہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اُسے دھیان ہی نہیں رہا کہ شہاب کی نگاہیں اُسی پر جمی ہوئی ہیں۔ اُسے یوں ہنستے دیکھ کر شہاب کا چہرہ گویا ساکت ہو گیا، آنکھوں کی پتلیاں ٹھہری گئیں۔ یک ٹک دیوانوں کی طرح اُسے بس دیکھے گیا۔ اُس کی نظروں کی آشفتگی کی تاب نہ لا کر وہ ہنستے ہنستے رُک گئی بلکہ...... سن رہ گئی۔ خفت زدہ ہو کر سر جھکا کر سوچنے لگی۔

”ہائے شہاب! میں جب بھی ہنستی ہوں، تم مجھے یوں پاگلوں کی طرح پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہو کہ مجھے شرم آ جاتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تمہیں دکھانے کے لیے ایسے ہی ہنستی رہوں، مگر جب ہنستی ہوں تو تمہاری آنکھیں مجھے ٹوکنے لگتی ہیں...... بولو! میں کیا کروں؟“

ایک جذبات آگیں گہرا سانس لے کر شہاب نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔ ”مصباح! تم دُنیا کی سب سے زیادہ خوبصورت لڑکی ہو۔ بلا مقابلہ مس یونیورس ہو...... ہنستی ہو تو یوں لگتا ہے جیسے تمہاری جلترنگ کی تال پر پورا زمانہ جھوم کر رقص کرنے لگا ہو، چپ ہوتی ہو تو لگتا ہے جیسے قیامت آنے والی ہے اور ہر کوئی ساکت ہو کر اُس کا انتظار کر رہا ہو۔“

مصباح کا جی چاہا کہ وہ کھڑی ہو جائے اور ہوٹل میں موجود لوگوں کی پروا کیے بغیر جی کھول کر ہنسے، ہنس ہنس کر بے حال ہو جائے اور جھوم جھوم کر اپنی سُدھ بُدھ کھو دے...... کوئی یوں ٹوٹ کر چاہے تو پوری دُنیا حیثیت کے ثانوی خانے میں جا گرتی ہے۔

ڈرنک اور سینڈوچ سرو ہو گئے۔ پلیٹوں کی کھنکار کے بیچ ہی شہاب کے موبائل فون کا بزر بجنے لگا۔ اُس نے فون نکال کر آن کیا اور کان سے لگا کر ”ہیلو“ کہا۔ فرخ نئے نمبر سے بول رہا تھا۔ ”شہاب! کہاں ہو؟“

”میں گھر میں نہیں ہوں۔“

”جہاں ہو، کیا صرف مجھے ہی سن رہے ہو؟“

”ہاں! تم بات کرو، میں سن رہا ہوں۔“

”ہمارا پروگرام حتمی شکل اختیار کر گیا ہے۔ آؤٹ ڈور شوٹنگ میں صرف ہیرو اور ہیروئن کا انتظار ہے۔ کب ڈیٹ مل سکتی ہے، یہ تو تم ہی بتا سکتے ہو۔“ فرخ کے لہجے میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

”ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ فون کر کے بتا دوں گا۔ کیا تم اسی نمبر پر موجود رہو گے؟“ شہاب نے دانستہ طور پر مصباح کو دیکھنے سے گریز کیا۔

”ٹھیک ہے۔ جب بھی شہر سے میرے ایگری فارم کی طرف چل نکلو، فون کر کے اطلاع کر دینا۔ ہم شہزادۂ عالم پناہ اور ملکۂ عالیہ کے لیے باملاحظہ ہوشیار کی صدائیں سجائے منتظر ہوں گے۔“

”اوکے!“ شہاب نے کہا تو فرخ نے فون بند کر دیا مگر شہاب نے فون کان سے نہیں ہٹایا بلکہ تسلسل سے محوِ گفتگو رہا ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ کیا تمہاری فیملی بھی وہیں موجود ہوگی؟“

چند لمحے خاموش رہا۔ اُس کا انہماک ظاہر کر رہا تھا کہ وہ فون پر مخاطب کی بات سن رہا ہے۔ پھر بولا۔ ”ارے واہ! پھر تو گرینڈ فنکشن ہوگا۔ مجھے ماما کی محبت کا علم تو ہے مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ میری محبت میں اس حد تک آگے جا سکتی ہیں۔“

اُس کا چہرہ خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔

مصباح بغور اُس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھ رہی تھی، سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ شہاب کہہ رہا تھا۔ ”کیا واقعی؟ ارے یار تم مجھے قسطوں میں مارنے کا ارادہ رکھتے ہو شاید! ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ میں پہنچ جاؤں گا۔ خدا حافظ!“

شہاب نے فون بند کر دیا۔ وہ جلدی سے بولی۔ ”بہت خوش دکھائی دے رہے ہو، کیا بات ہے؟“

شہاب کے لبوں پر جاندار مسکراہٹ تیر گئی۔ آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ شرارت بھرے لہجے میں بتانے لگا۔ ”میں ہر اُس خبر پر خوش ہوتا ہوں جو تمہارے اور میرے وصال کے متعلق ہوتی ہے، بھلے وہ افواہ ہی کیوں نہ ہو۔“

”جو پوچھا ہے، وہ بتاؤ۔ شاعری مت جھاڑو۔“ وہ جھینپ سی گئی۔

”سرپرائز!“

”کیسا سرپرائز؟“

”تم صبح میرے ساتھ آؤٹنگ پر چل رہی ہو۔ از اٹ اوکے؟“ شہاب نے اُس کی خوبصورت آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

وہ حیرت سے بولی۔ ”کہاں؟“

”جہاں میں جاؤں گا۔“

”تم کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

”جہاں مجھے میرا دل لے جائے گا۔“

وہ زچ ہو گئی۔ منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔ شہاب وارفتگی بھری نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مصباح! کیا میرے ساتھ چلوگی؟“

”نہیں...... بالکل بھی نہیں۔“

”کیا مجھ پر اعتماد نہیں کرتی ہو؟“

”اپنے دل سے پوچھو۔ سچ مل جائے گا۔“

”میرا دِل تو کہتا ہے کہ تم میرے جھوٹ پر بھی آنکھیں بند کر کے بھروسا کرتی ہو۔“ وہ پورے مان سے بولا۔

”نہیں...... بالکل بھی نہیں۔“ وہ خفگی سے بولی۔ ”میں تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہوں۔ تم جب تک مجھے بتاؤ گے نہیں کہ مجھے کہاں لے جانے کا ارادہ رکھتے ہو، میں تمہارے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گی۔“

”بتا دوں تو سارا مزہ ہی کرکرا ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے، تم اپنا مزہ بچاؤ، میں اپنا آپ بچاتی ہوں۔“

"کیا مطلب؟" پہلی مرتبہ شہاب کے لہجے سے ناگواری چھلکی تھی۔ "کیا میری شخصیت اُبھی تک ناقابلِ اعتبار ہے؟"

"چھپانے والا بھروسے کے قابل نہیں ہوتا۔"

اُس کے چہرے پر خفگی کے تاثرات نمایاں تھے۔ خود پر قابو پاتے ہوئے روٹھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ٹھیک ہے مس مصباح! شاید یک طرفہ محبت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ تمہیں بتا دیتا ہوں۔ سرپرائز کے چکر میں پڑ کر تمہیں بدگمان نہیں کرتا، سننے کے بعد جی میں آئے تو مجھ پر اعتماد کرلینا اور جی نہ مانے تو میں ضد نہیں کروں گا۔"

وہ بدستور منہ پھلائے بیٹھی رہی۔

"دریائے سندھ کے کنارے پر واقع ایک گاؤں میں ہماری حویلی اور زمین باپ دادا سے چلی آرہی ہے۔ میں اُسی حویلی میں پیدا ہوا تھا۔ میری ماما ہر سال اُسی حویلی میں، اُسی کمرے میں میری سالگرہ بڑے دھوم دھام سے مناتی ہیں۔ بابا نے کبھی شرکت نہیں کی مگر ماما کو اُن کی عدم دلچسپی کی کبھی پروا بھی نہیں رہی۔ کل میرے روکنے کے باوجود انہوں نے وہیں پر میری سالگرہ منانے کا اہتمام کر رکھا ہے۔" وہ بجھے بجھے لہجے میں اُسے بتا رہا تھا۔ صاف عیاں تھا کہ وہ بادلِ ناخواستہ بول رہا تھا۔ "میرا کزن فون کر کے مجھے بتا رہا تھا کہ میری ماما نے بطور خاص تمہیں بھی وہاں مدعو کیا ہے۔ وہ اپنی ہونے والی بہو کو دیکھنا چاہتی ہیں۔ مجھ پر ماما نے بھی خاصا دباؤ ڈال رکھا ہے، میں چاہتا تھا کہ تمہیں کچھ بتائے بغیر آؤٹنگ کا بہانہ کر کے وہاں لے جاؤں۔ تمہیں سرپرائز دوں مگر مجھے کیا علم تھا کہ تمہیں میری چند قدموں کی ہمراہی پر بھی یقین نہیں ہے۔"

مصباح کا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ اُس نے شہاب کو منہ کھولنے پر مجبور کرلیا تھا۔ بہ مشکل ہنسی دباتے ہوئے بولی۔

"تمہاری آبائی حویلی یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"بیس پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ بہ مشکل نصف گھنٹے کا سفر ہے۔" وہ بے پروائی سے بولا اور ٹیبل پر جھک گیا۔

"مجھے کتنی دیر تمہارے ساتھ رہنا پڑے گا؟" مصباح اُس کے مایوسی بھرے چہرے کو دیکھ کر لطف لے رہی تھی۔

"ایک گھنٹا آنے جانے میں لگتا ہے۔ وہاں جب تک رہنا چاہو گی، رہ لینا۔ جب بھی کہو گی، واپس پہنچا دوں گا۔" شہاب کے چہرے پر آس کا رنگ پھیلنے لگا۔

"اگر میں تمہاری مما کو پسند نہ آئی تو......" وہ تشویش سے بولی۔

"کیا کبھی کسی نے چاند کو بدصورت کہا ہے؟"

"میں چاند نہیں ہوں۔"

"چاند سے زیادہ خوبصورت تو ہو ناں!"

"تم کہتے ہو، تمہاری ماں کو تمہارے کہے پر اعتبار نہ آیا تو کیا ہوگا؟"

"ہونا کیا ہے؟ بس تمہاری چھٹی ہوجائے گی اور وہ نئی لڑکی کی تلاش میں نکل کھڑی ہوں گی۔" شہاب نے اتنی بے پروائی سے کہا کہ مصباح کو غصہ آگیا۔ بھڑک کر بولی۔

"تو پھر اپنی ماما سے کہہ دو کہ وہ کوئی اور لڑکی دیکھ لیں۔"

"ناں بابا ناں!" شہاب نے ہنس کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ ہاتھ میں دبے ہوئے سینڈوچ پر منہ مارتے ہوئے کہا۔ "تم ہو تو شہاب ہے، شہاب کی دُنیا ہے، سب کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ ماما بہت اچھی ہیں۔ تمہاری ایک نہیں، اَن گنت تصویریں دیکھ چکی ہیں اور تمہیں دل و جان سے قبول بھی کرچکی ہیں۔"

"میری تصویریں؟" وہ چونکی۔ "میری تصویریں تمہارے پاس یا تمہاری ماما کے پاس کیسے پہنچیں؟"

شہاب نے اُسے تھوڑی دیر تنگ کیا۔ پھر اپنے موبائل فون کی میموری میں فیڈ امیجز دکھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس فون میں تمہاری نہ جانے کتنی ادائیں محفوظ کر رکھی ہیں، جب بھی بے قرار ہوتا ہوں، تمہاری تصویر دیکھ کر خود کو تسلی دے لیتا ہوں۔ سمجھیں؟"

وہ جھینپ گئی۔ سر جھکا کر سوچنے لگی۔ "اے موبائل فون کو ایجاد کرنے والے! تمہارا دل و جان سے شکریہ...... تم نے چاہنے والوں پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ رہتی دُنیا تمہیں سلام پیش کرتی رہے گی......"

✿ ✿ ✿

بجلی کا نہ ہونا بجلی بن کر پروفیسر کے اعصاب پر مسلسل گر رہا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُسے جنت میں محصور کردیا گیا ہو۔ تاحدِ نگاہ ٹھاٹیں مارتے ہوئے پانی نے ہر راہ مسدود کردی تھی۔ سموں نے اچھی طرح گھوم پھر کر جنت کا جائزہ لیا اور پھر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بجلی کے حادثاتی تعطل پر تشویش ظاہر کی۔

چونکہ پروفیسر کو گزشتہ کئی دِنوں سے دریا کا ہی پانی پینا پڑ رہا تھا، اِس لیے طبیعت بھی مکدر رہنے لگی تھی۔ پہلے دن حفظِ ماتقدم کے طور پر وہ فلٹر پیپرز کے ذریعے پانی فلٹر کر کے پیتا رہا مگر کب تک؟ آخر فلٹر پیپرز بھی ختم ہوگئے۔ اُس کا معدہ گڑبڑ کرنے لگا تھا۔

جس وقت سموں بیڈ شیٹ اپنے بدن پر اچھی طرح اوڑھے سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنے میلے کپڑے دھو رہی تھی، اُس وقت پروفیسر باتھ روم میں پہلوؤں پر ہاتھ رکھے قے کر رہا تھا۔

اُس کے قائم کردہ میڈیکل ڈیپارٹمنٹ میں پیٹ کی خرابی کی گولیاں موجود تھیں جنہیں وہ تواتر سے استعمال کر رہا تھا۔ ہاضمے کا پاؤڈر بھی موجود تھا۔ ہر کھانے کے بعد تھوڑا سا پھانک لیتا تھا مگر افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ بار بار فون پر افتخار بیگ سے رابطہ کر کے اُسے بجلی بحال کرنے کی استدعا کر رہا تھا۔ وہ بھی مجبور تھا۔ ایسے میں اُسے ایک خیال سوجھا۔ اُس نے افتخار بیگ سے کہا کہ وہ ڈاکٹر اشولال سے رابطہ کرے اور یہاں پہنچنے کی کوئی سبیل نکالے۔ افتخار نے ایک مرتبہ پھر جل جانے والی وائرنگ کی تفصیل معلوم کی، ممکنہ سامان کی فہرست بنائی اور جلد پہنچنے کا وعدہ کیا۔ پروفیسر کو عین موقع پر یاد آگیا کہ اُس کے کھانے پینے کا بیشتر سامان فریج بند رہنے کی وجہ سے خراب ہوچکا ہے۔ اُس نے جلدی جلدی خوراک کی فہرست بھی افتخار کو نوٹ کروادی۔

پروفیسر باہر کی دُنیا کے ساتھ صرف موبائل فون کے ذریعے جڑا ہوا تھا۔ فون کی اسکرین پر دکھائی دینے والی بیٹری چارجنگ کو ظاہر کرتی لکیریں بھی ایک ایک کر کے معدوم ہوتی چلی جارہی تھیں۔ یہ وہ بیٹری تھی جو اُس نے ہنگامی حالت کے لیے ایکسٹرا خرید کر رکھی ہوئی تھی۔

پانی کی سطح یک لخت بلند تو ہوئی مگر پھر غیر معمولی سست روی سے گرتی جارہی تھی۔ سموں کو یہاں آئے دو دِن گزر چکے تھے۔ بچوں کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی اور ان سے رابطے کے لیے بے چین تھی۔ مگر رابطہ ممکن نہیں تھا۔ وہ بار بار اِس سے اپنی پریشانی کا اظہار بھی کر رہی تھی کہ اُس کے بچے اُسے مردہ سمجھ کر رو پیٹ رہے ہوں گے، یا یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس کی تلاش میں جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھا رہے ہوں۔ پروفیسر نے اُسے دلاسا دیا تھا کہ اُس کا مُرشد یہاں آنے ہی والا ہے، واپس جائے گا تو اُسے لے کر شہر چلا جائے گا جہاں سے وہ اپنے بچوں سے ملنے کے لیے چلی جائے گی۔ وہ قدرے مطمئن ہوگئی۔

سموں کے ساتھ اتنا وقت گزارنے پر پروفیسر نے خود پر اپنے نظریات کی حقیقت ثابت کردی تھی۔ لڑکپن کی بے دھڑک نسبت کے باوجود اُس نے اپنے آپ کو سموں کے قریب نہیں آنے دیا تھا۔ سموں کی حد سے بڑھی ہوئی بے تکلفی نے بھی اُس پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا تھا۔ جوانی بیوگی کی زد میں برسوں سے تشنہ تھی۔ وہ بدن جس پر وہ اپنا اُدھیکار سمجھتی تھی، اُس سے گریزاں رہا تو بھڑک اُٹھی۔ حیلے بہانوں سے جتلانے لگی کہ ایسی تنہائی میں وہ غنیمت بھرا موقع لے کر جنت میں اُتری ہوئی حور ہے، ہاتھ بڑھا کر اپنے حصار میں لیتے ہوئے وہ اُن لمحوں کو قید کرلے جو اُس کی دسترس میں آنے سے پہلے ہی چھین لیے گئے تھے۔ وہ اُسے اُن اُدھورے لمحوں کا طعنہ دے کر اکسانے کی بھرپور کوشش کرتی رہی، منہ کی کھا کر پلٹتی رہی پھر نئی طاقت سے جھپٹتی رہی مگر کچھ بھی تو حاصل نہ ہوا۔ ایسے میں بے اختیار بول پڑی۔

"سیموا تم ایسے برف کی طرح پہلے تو نہیں تھے؟"

"تو بھی پہلے بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح نہیں تھی سموں!" پروفیسر نے آنکھیں چرالیں۔

سموں دھلے ہوئے کپڑے ریلنگ پر ڈالتے ہوئے کن اکھیوں سے پروفیسر کی جانب دیکھ رہی تھی۔ سوچ رہی تھی۔ "وہ بھی کیا دِن تھے جب گھر کے چھوٹے سے آنگن میں بندھے ہوئے تار پر کپڑے ڈالنے لگی تھی کہ سیمو نے دبے پاؤں عقب میں آکر اُسے بانہوں میں بھر لیا تھا۔ گیلے کپڑوں سمیت اُٹھا کر کمرے میں لے آیا تھا اور......"

پروفیسر اُسے دیکھ رہا تھا۔ بول پڑا۔ "ہوا چل رہی ہے، ریلنگ سے کپڑے اُڑ کر دریا میں جا گرے تو مسئلہ پیدا ہوجائے گا۔ اِنہیں گانٹھ دے دو۔"

وہ گانٹھ دینے کو جھکی۔ ایسے میں دل میں انگڑائیوں کے تل پر لہرانے والے جذبات نے اندھا دھند یلغار کردی بدن کو رُک رُک کر توڑنے والا، پلٹ پلٹ کر جوڑنے والا راکھ بن کر پانی میں بہہ چکا تھا۔ ہر آن بولنے والا بدن برسوں سے خاموشی کا عذاب جھیل رہا تھا۔ جب ہم کلام دکھائی دیا تو عضو عضو بول اُٹھنے پر بضد دکھائی دینے لگا۔ دل اپنی آنکھیں موند کر اُس کی آنکھوں میں کرچیاں بھرنے لگا تھا۔

سموں نے گانٹھ دیتے ہوئے پورے بدن کو لپیٹنے والی چادر کی گانٹھ کو غیر محسوس انداز میں کھول دیا۔ بیڈ شیٹ کندھوں سے سرک کر گرنے لگی تو وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئی، چادر کو سنبھالنے کی کوشش میں عریاں ہونے لگی۔ چادر پیروں میں گر گئی۔ وہ اوندھے منہ چادر پر گر گئی۔ دھڑام کی آواز نے پروفیسر کو بھاگ کر قریب آنے پر مجبور کردیا۔ وہ قریب آیا۔ سفید چمکدار بدن کے نیچے پڑی چادر کا کونہ کھینچا۔ نکال کر اوڑھانا چاہتا تھا کہ آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ وہ ایک جھٹکے سے سیدھے رخ ہوگئی تھی اور دعوت بھری نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ پروفیسر جہاں کا تہاں رہ گیا۔

پیچھے ہٹنا چاہا تو ہٹ نہ پایا۔ نظر چرانا چاہی تو ناکام رہا۔ دماغ سمجھا رہا تھا۔ ”یہی وہ امتحان ہے جسے پاس کرنے کے ساتھ ساتھ تم دُنیا پر یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے کہ تمہیں عورت سمیت دُنیا کی کوئی ضرورت نہیں، فیل ہو جاؤ گے تو کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہو گے۔“

مگر دل پیچھے رہنے والا نہیں تھا، کچوکے پر کچوکا دینے لگا۔ ترغیب دینے لگا۔ ”آگے بڑھو! قلعے کی دیواریں شق ہو گئی ہیں، دروازے کھل گئے ہیں اور پوری سلطنت تمہاری فتحیابی کے لیے سراپا دُعا بنی ہوئی ہے۔ کوئی دیکھنے والا نہیں، کوئی طعنہ دینے والا نہیں...... ایسے میں پیچھے ہٹ گئے تو پوری دُنیا کے مردوں کے لیے کھلی گالی بن جاؤ گے۔“

سموں کی نگاہوں نے پروفیسر کی بے بسی تاڑ لی تھی۔ اگلے مرحلے کو سرانجام دینا ازحد ضروری تھا۔ فوراً شرما کر چھوئی موئی ہو گئی۔ چادر کو کھینچ کر چھپتی گئی۔ چند ہی لمحوں میں نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ اُس نے اپنا منہ بھی چادر میں لپیٹ لیا تھا اور انتظار کر رہی تھی کہ اُس کے بدن کی حرارت پر آنکھیں تاپتا ہوا سیمو چادر کا ایک ایک بل کھولے اور آن کی آن میں اُسے تلاش کر لے۔ اُس نے منزل سجھا دی تھی، راستہ چاہنے والے اپنے ہاتھوں سے بنا لیتے ہیں۔

مگر اُس کی توقع کے برعکس، چاہنے والا اُس کے تعاقب میں نہیں آیا تھا۔ خاموشی میں قدموں کی چاپ اُبھری، جنت نے چند ہلکورے لیے پھر طویل خاموشی چھا گئی۔ انتظار کی کوفت اُٹھانے کے بعد اُس نے نہایت آہستگی سے چہرے پر سے کپڑا سرکایا، دیکھا، چاہنے والا کہیں دکھائی نہیں دیا تو اُٹھ بیٹھی۔ وہ اُس سے چند قدم دور اُس کی جانب پیٹھ کیے کرسی میں بیٹھا تھا۔ اُس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ زیر و زبر ہوتی دل کی دُنیا کا پتا نہیں چلتا تھا۔ وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔ ”ہونہہ! بزدل کہیں کا!“

چادر کو اپنے تن پر اچھی طرح اوڑھایا، ریلنگ پر لٹکتے ہوئے کپڑوں کو گرہیں دیں اور پروفیسر کے پاس آ گئی۔ خفت بھرے لہجے میں بولی۔ ”وہ دراصل اچانک گانٹھ کھل گئی تھی۔“

پروفیسر پر اُس کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ آنکھیں موندے بدستور ساکت بیٹھا رہا۔ وہ اُس پر استہزائیہ نظر ڈال کر مقابل کی کرسی میں بیٹھ گئی۔ کچھ دیر کے بعد پروفیسر نے خود پر قابو پا لیا اور آنکھیں کھول دیں۔ سموں کی عریاں پنڈلیاں دکھائی دیں، پنڈلیوں کے نیچے مچھلی کی طرح چمکدار پاؤں نظر آئے تو اُس نے گھبرا کر پھر آنکھیں بند کر لیں۔

سموں بغور اُس کی حرکات کا جائزہ لے رہی تھی۔ جھکے جھکے لہجے میں بولی۔ ”سیمو! آنکھیں کھولو، میں کوئی اور نہیں، تمہاری سموں ہوں۔“

”تم سموں تو ہو مگر میری نہیں ہو۔“ پروفیسر کے لہجے میں واضح ارتعاش موجود تھا۔

”مجھ پر اپنی نیم پلیٹ لگانے والا دُنیا میں نہیں رہا۔“

”مگر نیم پلیٹ تو موجود ہے ناں!“

”تم جسے نیم پلیٹ قرار دے رہے ہو، تمہارا مذہب اُسے کتبہ قرار دیتا ہے۔“

پروفیسر نے آنکھیں کھول دیں۔ عجیب نظروں سے جی بھر کر سموں کے سرخ گلنار چہرے کو دیکھا پھر اُٹھ کر راہ داری کی طرف چل دیا۔ بیڈروم کا چکر کاٹ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ پندرہ برسوں پر محیط بھرپور ازدواجی زندگی گزارنے والی سموں کو بہ خوبی اندازہ تھا کہ وہ عقبی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنے بدن کو ٹھنڈے پانی میں ڈبو رہا ہو گا۔

بعض گرہیں ایسی ہوتی ہیں جو بندھ کر انسان کو کھول دیتی ہیں۔ کئی ایسی بھی ہوتی ہیں جو کھل کر انسان کو چاروں طرف سے باندھ دیتی ہیں۔ بیڈشیٹ کی گرہ بھی اُن میں سے ایک تھی جس نے کھل کر دونوں کے لب سی کر رکھ دیے تھے۔ باتوں کے نہ ختم ہونے والے سلسلوں کو آنِ واحد میں ختم کر دیا تھا۔ ڈاکٹر اشولال کے پہنچنے تک دونوں ایک دوسرے سے نظریں چراتے رہے، کن انکھیوں سے دیکھتے رہے اور بیگانوں کی طرح باتیں کرتے رہے۔

سہ پہر کے قریب پانی کے رُخ پر متوازی چلتی ہوئی دو کشتیاں دکھائی دیں۔ پروفیسر بھاگ کر عرشے پر آیا۔ ہاتھ کا چھجا بنا کر آنکھوں پر رکھا اور غور سے دیکھنے لگا۔ اُس کے چہرے پر عجیب سے دو رُخے تاثرات ثبت تھے۔ کسی ایک آدمی کو جنت میں داخل ہونے پر پیچ پا ہونے والے ونیم بزدار کو مہمانوں کے وفد کو خوش آمدید کہنا پڑ رہا تھا جو اُس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔

ایک کشتی پر سفید رنگ کا بڑا سا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ لہراتے ہوئے کپڑے پر نیلے رنگ کا بڑا سا مونوگرام بھی دکھائی دے رہا تھا۔ کسی این جی او نے کشتی کرایہ پر حاصل کی تھی۔ سیلاب کی تباہ کاریوں میں پہلی مرتبہ پروفیسر نے کسی این جی او کو امدادی کارروائیوں کے سلسلے میں سرگرمِ عمل دیکھا تھا۔ چند ہی منٹوں میں دونوں کشتیاں جنت کے قریب آ گئیں۔ سفید جھنڈے والی کشتی کا ملاح زور سے چیخا ”کیا تمہارے پاس رسا ہے؟“

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ بھاگ کر اسٹور میں گیا۔ بڑا سا رسا اُٹھایا اور ریلنگ کے قریب کھڑے ہو کر اُس کا ایک سرا ملاح کی طرف اُچھال دیا۔ ملاح نے جلدی سے اُسے کشتی کے کڑے میں ڈال کر باندھا۔ پروفیسر نے اس کا دوسرا سرا استون کے ہک کے ساتھ باندھ دیا۔ دوسری کشتی کو بھی اسی طرح جنت سے باندھ دیا گیا۔ پروفیسر نے دیکھا کہ جھنڈے والی کشتی میں تین مرد اور دو عورتیں موجود تھیں جن کے سینوں پر نیلے مونوگرام والے شناختی بیج آویزاں تھے۔ کشتی میں چھوٹے چھوٹے پیکٹوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ یہ خوراک کا امدادی پیکیج تھا۔

دوسری نسبتاً چھوٹی کشتی میں ملاح کے ساتھ چار آدمی اور بھی سوار تھے۔ ڈاکٹر اشولال کو وہ ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ افتخار بیگ اور مظہر عباس بھی اجنبی نہیں تھے لیکن چوتھے کو وہ نہیں پہچان پایا۔ شاید اُسے پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ پروفیسر کا سہارا لے کر ملاحوں کے علاوہ سبھی جنت میں سوار ہو گئے۔ سب سے آخر میں پروفیسر نے ڈاکٹر اشو سے معانقہ کیا۔ کافی دیر تک اُس کے سینے سے لگا خاموش کھڑا رہا۔ سبھی نے بہ طور خاص پروفیسر کی غیر معمولی عقیدت کو نوٹ کیا۔ پھر اُسے بڑے ہی احترام سے لے کر عرشے پر آ گیا۔ کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”مُرشد! تشریف رکھو۔ میں افتخار کے ساتھ جا کر سامان اُٹھا لاؤں۔“

سموں اس دوران بیڈروم میں ہی رہی۔ وہ پروفیسر کی اجازت کے بغیر باہر نہیں آنا چاہتی تھی۔

افتخار اور پروفیسر نے ملاحوں کی مدد سے بجلی کا سامان اور جملہ برقی آلات اُتارے اور جنت پر لے آئے۔ اُسے ڈاکٹر کا یوں این جی او والوں کو اپنے ساتھ لے کر آنا کچھ ناگوار گزرا تھا مگر وہ فی الحال شکوہ کرنے کی حالت میں نہیں تھا۔ کرسیاں کم تھیں، اس لیے وہ اسٹور سے دو فولڈنگ چارپائیاں اُٹھا لایا۔ سبھی بیٹھ چکے تو افتخار نے ہنس کر کہا۔ ”سرا آج آپ کی جنت کی رونق دوچند ہو گئی ہے۔“

پروفیسر نے ڈاکٹر اشولال کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ ”آج مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں نے بہتے ہوئے پانی میں مکان نہیں، جنت بنائی ہے۔“

پروفیسر بیڈروم میں آیا۔ سموں تقریباً سیلن زدہ کپڑے پہن چکی تھی لہٰذا وہ ساتھ لے کر ڈاکٹر اشولال کے پاس آیا، اسٹیل پائپ کے پائیوں والے اسٹول پر بٹھا کر ڈاکٹر سے مخاطب ہوا ”مرشد! یہ میرا مہمان ہے، اس سے پوچھ تاچھ کر کے اپنے شبہات رفع کر لو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے دل میں کوئی بدگمانی جاگزیں رہے۔ میں اس دوران میں اپنے پیارے مہمانوں کے لیے چائے بنا کر لاتا ہوں۔“

ڈاکٹر نے مسکرا کر این جی او کی ایک اہلکار سے کہا۔ ”فائزہ بیٹا! انکل کے ساتھ کچن میں جاؤ اور اُن کا ہاتھ بٹاؤ۔ جب تک کھانے میں کسی عورت کے ہاتھ کی لذت شامل نہ ہو، وہ اچھا نہیں لگتا۔“

لانبے قد والی سانولی سی لڑکی، جسے ڈاکٹر نے فائزہ کہہ کر مخاطب کیا تھا، اُٹھی اور سفید دوپٹا درست کرتے ہوئے پروفیسر کے پیچھے چل پڑی۔ کچن میں پہنچی تو تعجب بھری نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولی ”واؤ...... میں زندگی میں اتنی حیران پہلے کبھی نہیں ہوئی جتنی اس کشتی کو دیکھ کر ہو رہی ہوں۔“

”اوں ہوں......“ پروفیسر نے پُرزور مزاحمت کی۔ ”یہ کشتی نہیں...... جنت ہے۔“

”ایک ہی بات ہے انکل!“ وہ ہونٹ سکیڑ کر بولی۔ ”آپ نے واقعی کمال کر دکھایا ہے۔“

دونوں نے مل کر چائے بنائی۔ ٹرے میں رکھی۔ چند پلیٹوں میں لوازمات سجائے اور آگے پیچھے چلتے ہوئے عرشے پر سجی محفل میں آ گئے۔ پروفیسر نے دیکھا کہ انتہائی مختصر وقت میں ڈاکٹر اشو اور سموں آپس میں بے حد گھل مل گئے تھے۔ ڈاکٹر نے چہک کر کہا۔ ”دیکھا پروفیسر! میں نے کہا تھا ناں کہ خیر نہیں ہے۔ سموں جان بچانے کے لیے جنت میں نہیں پہنچی بلکہ اپنے سیمو کو ڈھونڈتی ہوئی اِدھر آ نکلی ہے مگر بے چاری کو یہ علم نہیں تھا کہ اُس کا سیمو پڑھ لکھ کر دُنیا سے عشق کا سبق بھول گیا تھا، بغاوت کے نصاب میں بھٹکنے لگا تھا۔ پتا ہوتا تو کسی کیکر کے کانٹوں میں اُلجھ کر جان دے دیتی، یہاں نہ آتی۔“

سبھی نے کھل کر قہقہہ لگایا۔ دریا کا مخصوص شور دب گیا۔ پروفیسر کو یوں لگا جیسے اُس کے تمام تر نظریات اپنی وقعت کھو چکے ہیں۔ جنت، پہلے بھی ایسی ہی تھی، اَب بھی ویسی ہی ہے مگر من چاہے مہمانوں کے آنے پر اس کی رونق میں اضافہ ہو گیا ہے۔ دِل پر کافی دِنوں سے پڑنے والا بوجھ شاید ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔ چائے کے دوران اُس کی استفہامیہ نظروں کا مفہوم بھانپ کر ڈاکٹر اشولال نے اپنے ساتھی کا تعارف کرایا۔ ”پروفیسر! جیسے میں نے اپنی زندگی سندھو سائیں کی بقا، اس کے رکھوالے مور، کیمبل اور مہمانوں کی فلاح اور سندھ وادی کی قدیم ثقافت و روایات کے فطری ارتقا میں حائل رکاوٹیں دور کرنے پر صرف کر ڈالی ہے اور چاہا ہے کہ اس کے مہمان پرندوں کو وہی اعتبار ملنا چاہیے۔

وہی تحفظ ملنا چاہیے جس کی کشش اُنہیں ہزاروں میل دور سے یہاں آنے پر مجبور کردیتی تھی، ایسے ہی میرا...... یہ ناتواں وجود، یہ سادہ لوح مگر اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان ...... مزار خان، اپنے ریگستان اور اُس کی عہدِ قدیم سے وابستہ روایات اور جڑی بوٹیوں کو بچانے کے لیے ہمہ جہت سرگرداں ہے۔ میں سرکار کی نوکری کرتا ہوں، یہ نوکری چھوڑ کر ریگزار کی نوکری کرنے لگا ہے۔ بہت عظیم انسان ہے۔''

مزار خان نے جھینپ کر کہا۔ ''مرشد! اتنا بھی شرمسار نہ کرو کہ میں یہاں بیٹھ ہی نہ سکوں۔''

''اور ہاں! یہ این جی او جس کے لڑکے لڑکیاں یہاں امدادی سامان بانٹتے پھرتے ہیں، یہ اِسی کی قائم کردہ ہے۔ سیلابی علاقے اِس کے دائرہ عمل میں نہیں آتے لیکن یہ کہتا ہے کہ انسان جہاں بھی تکلیف میں ہو، وہاں پہنچنا چاہیے اور مقدور بھر مدد ضرور کرنی چاہیے۔ یہ اِس تکلف میں نہیں پڑتا کہ فنڈ تھوڑے ہیں، سامان کم ہے، شرمساری ہوگی ...... نہیں بلکہ اللہ کی آس پر چل پڑتا ہے۔''

اُشو، مزار خان اور پروفیسر گفتگو میں محو ہوگئے۔ مظہر عباس اور افتخار بیگ اپنے آلات سنبھال کر کنکریٹ کے ستون پر چڑھ گئے۔ این جی او کے کارکن سموں کے ساتھ جنت کا گھوم پھر کر جائزہ لینے لگے۔ سموں جتنا جانتی تھی، بتاتی جاتی تھی۔ باتوں کے دوران ہی اُشولال کو ملاحوں کا خیال آیا۔ اُنہیں ہاتھ کے اشارے سے جنت میں بلا لیا۔ کسی کو بالخصوص مخاطب کیے بغیر بولا۔ ''ہم اِسی رویے کے مخالف ہیں جو ہم کافی دیر سے اِن مہمانوں (ملاحوں) سے روا رکھے بیٹھے ہیں۔ وہ اِس قابل ہیں کہ اُنہیں ہم اپنے پاس بیٹھائیں، باتیں کریں اور جنت کا نظام دکھائیں۔''

مزار خان نے بھرپور تائید کی۔ پروفیسر کو نازک اور نفیس وجود والا مزار خان بہت اچھا لگا۔ بات کرتے ہوئے، چپ رہتے ہوئے، ہر کیفیت میں وہ پُرکشش انسان تھا۔ اُنہوں نے سیر حاصل باتیں کیں۔ باتوں میں شام ڈھل گئی۔ چاند کی تعارفی کرنوں کے ساتھ ہی ستون پر لگا ہوا بڑا مرکری بلب آن ہوگیا اور ماحول روشنی میں نہا گیا۔ چند ہی منٹوں کے بعد واٹر پمپ گھر گھر کی مخصوص آواز سے چلنے لگا۔ ڈاکٹر اُشولال کو بھوک کا احساس ہوا تو اُس نے مزار خان کے کان میں کھسر پھسر کی۔ اُس نے فائزہ کو قریب بلایا، اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا! کیا فائدہ کہ دو بیٹیوں کی موجودگی میں ہم بوڑھوں کو ایک لمبے اور گرم دن کی مشقت کے بعد بھوک کا عذاب بھی کاٹنا پڑ جائے؟ کشتی میں پکڑی ہوئی مچھلیاں بناؤ اور تل کر خود بھی کھاؤ، ہمیں بھی کھلاؤ۔ میں نے سنا ہے کہ پروفیسر صاحب نے یہاں تمام بندوبست کر رکھا ہے۔ تمہیں کچن میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔''

وہ ہنستی ہوئی ملاحوں کی طرف متوجہ ہوئیں جو مزار خان کی بات سنتے ہی مچھلیاں اُٹھالانے کے لیے کرسیاں چھوڑ چکے تھے۔ جونہی ملاحوں کی مدد سے وہ مچھلیوں کا گوشت بنا چکیں، جنت اچانک بقعہ نور بن گئی۔ افتخار بیگ اور مظہر عباس کھانا تیار ہونے تک کنٹرول روم میں ہی مصروف کار رہے۔ پُرلذت کھانے سے فراغت پاتے ہی ڈاکٹر اُشولال نے جانے کی رَٹ پکڑ لی۔ پروفیسر وسیم اُشولال کو اپنے ہاں رات ٹھہرانا چاہتا تھا مگر مزار خان کے ساتھ آنے والی لڑکیوں کی وجہ سے مجبوراً جانے کی اجازت دینا پڑی۔ پروفیسر کی جنت کا تفصیلی دورہ کرنے اور دل کھول کر تعریف کرنے کے بعد کشتیاں آباد ہونے لگیں۔ آخر میں اُشو عرشے پر رہ گیا۔ پروفیسر نے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑے، چومے اور آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولا۔ ''مرشد! سموں کا بیٹا بوسن روڈ کالج ملتان میں پڑھتا ہے۔ بیٹی ضلعی شہر میں نرسنگ کر رہی ہے۔ تم اِسے اِس کی بیٹی یا بیٹے کے پاس پہنچا دو۔''

وہ بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ جھٹ سے بولی۔ ''بہتر ہوگا کہ آپ اُنہیں میرے یہاں ہونے کی اطلاع کردیں تاکہ وہ فکرمند نہ ہوں، جب پانی اُترے گا، میں خود اُن کے پاس چلی جاؤں گی۔''

ڈاکٹر نے چونک کر پروفیسر کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ سمجھانے کی کوشش کی، وہ نہیں سمجھا تو دھیمے لہجے میں بولا۔ ''محبت قسمت کی طرح ہوتی ہے۔ ایک بار دستک ضرور دیتی ہے، مایوس ہو جائے تو کبھی لوٹ کر نہیں آتی۔''

''نہیں مرشد! مجھے کسی سے محبت نہیں ہے اور نہ ہی میں اِس کے سحر میں اُلجھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یہ ...... یہ جنت اول و آخر میری ہے۔ اِس میں کسی وجود کی شراکت میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔'' پروفیسر نے حتمی لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر نے ایک نظر سموں کے مایوس چہرے پر ڈالی۔ سر پر ہاتھ رکھا۔ گہرا سانس حلق میں اُتار کر بولا۔ ''چلو! تمہیں تمہارے پیاروں تک پہنچا دوں۔ وقت کی طرح تمہارا سیمو بدل چکا ہے۔ اِس کا دِل ہر احساس سے عاری ہو چکا ہے اور ایسے دِلوں میں محبت کبھی ڈیرا نہیں ڈالتی۔ لیٹ اَس گو!''

ڈاکٹر اُشولال نے پروفیسر کو گلے لگایا، الوداعی سلام پیش کیا اور کشتی میں اُتر گیا۔

سموں پروفیسر کے سپاٹ چہرے پر نظریں جمائے امید و یاس میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بولی۔ ''کیا میں بھی جاؤں؟''

پروفیسر کے چہرے پر ہیجان کے آثار نمودار ہوئے۔ ایسے جانے والوں کو دُنیا جانے نہیں دیتی مگر وہ دُنیا سے قطع تعلق کر چکا تھا۔ دُنیا والوں کے چلن پر بھی چار حرف بھیج چکا تھا۔ پیٹھ موڑ کر کھڑا ہوگیا۔ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''ہاں سموں! کندن اور شگفتہ تمہاری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ تمہیں موت کے ٹل جانے پر اُن کے پاس ہونا چاہیے۔ یہاں کیا رکھا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ مرشد نے ٹھیک کہا ہے کہ میں سیمو نہیں، پروفیسر وسیم بزدار ہوں، جس کا دُنیا میں کوئی نہیں ...... میرا خدا، تمہارا بھگوان تمہاری رکھشا کرے......''

وہ پہلو سے نکل کر مقابل آگئی۔ چہرے پر مرکری بلب کی روشنی براہِ راست پڑ رہی تھی اور اُس کی آنکھوں سے رِسنے والے آنسو چمک رہے تھے۔ وہ اپنے آنسو پونچھے بغیر پروفیسر کے بے جان بدن سے لپٹ گئی۔ ہچکیوں کے درمیان بولنے لگی۔ ''تم ...... میں ...... خود کو تم پر مسلط نہیں کرنا چاہتی تھی، میں خود کو اپنے بچوں کی نظر میں گرانا بھی نہیں چاہتی تھی مگر ساتھ ہی اُس ادھورے پیار کو بھی مکمل کرنا چاہتی تھی جس کی پاداش میں ہم دونوں کو گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ اَب سمجھ آرہا ہے کہ جب سیمو ہی نہیں رہا تو نگوڑی سموں کی تشنگی عمر بھر میں بجھنے والی نہیں رہی ...... مجھے جانا ہی ہوگا۔ کبھی لوٹ کر نہ آنے کے لیے جانا ہوگا۔ میرے سیمو! تمہیں تمہاری سورگ مبارک ہو، مجھے پاپی سوچوں کا دوزخ قبول ہے......''

بہ وقت تمام جدا ہوئی۔ ملاح کا سہارا لے کر کشتی میں اُتری۔ ایک کشتی کی گرہ کھل گئی تھی۔ دوسری کی گرہ کھلنے لگی۔ پانی سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے۔ دونوں کشتیاں آگے پیچھے بہنے لگیں۔ ایک مایوس، نقاہت بھرا ہاتھ کافی دیر تک پچھلی کشتی میں لہراتا رہا، جنت کے اکلوتے رکھوالے کی نظروں کے دھندلے شیشے پر بغیر ربر والے وائپر کی طرح خراشیں ڈالتا رہا، دھندلاتا رہا پھر اندھیرے میں گم ہوگیا۔ پروفیسر وسیم نے سختی سے ریلنگ کے گول پائپ کو تھام رکھا تھا۔ ہتھیلیاں پسینے سے تر ہوگئیں تو گرفت دَم توڑنے لگی۔ وہ وہیں بیٹھ گیا۔ اُسے دھیان بھی نہیں رہا کہ اُس کا پورا بدن پسینے سے تر ہو چکا تھا۔

شاید جنت پر روشن ہونے والے تمام برقی قمقموں نے بہت زیادہ حدت پیدا کردی تھی۔

❁ ❁ ❁

وہ اپنے باپ کے برعکس صحت مند ذہنیت رکھتا تھا۔ پہلی مرتبہ جرم کا مرتکب ہونے چلا تھا۔ اِس لیے ضمیر مسلسل دل کو کچوکے لگا رہا تھا۔ سمجھا رہا تھا کہ وہ جس طریقے سے مصباح پر اپنی ملکیت قائم کرنا چاہتا ہے وہ مناسب نہیں ہے۔ محبت جیسے پاکیزہ رَبط میں کہیں بھی جرم، گناہ یا غیر اخلاقی صورتِ حال پیدا ہو جائے، سب کچھ تلپٹ ہو جاتا ہے۔ وہ عجیب سی ذہنی کشمکش میں کروٹیں بدل بدل کر رات گزار رہا تھا۔

ایسے میں فرخ نے فون پر رابطہ کرلیا۔ اپنے پورے پروگرام کے بارے میں خاصی تفصیل سے آگاہ کیا۔ شہاب نے بھی مصباح سے ہونے والی گفتگو کے متعلقہ حصے اس کے گوش گزار کردیے۔ دیر گئے تک فون پر اپنے پروگرام کو حتمی شکل دیتے رہنے کے دوران بارہا شہاب نے اُسے تاکید کی کہ مصباح پر کوئی آنچ نہ آئے حالانکہ صرف سچ کو آنچ نہیں ہوتی، جھوٹ تو بذاتِ خود آنچ کا سبب ہے۔

ایک ہی وقت میں تین انسانی کھوپڑیاں سلگ رہی تھیں۔ شہاب اور فرخ اپنی بساط بچھائے بیٹھے تھے۔ شہاب کو یہ خبر نہیں تھی کہ فرسٹ فلور پر واقع بابا جان کے کمرے میں بھی ایک بساط بچھائی جارہی ہے۔ شہاب اپنی محبت کے حصول کے لیے جائز و ناجائز کے تکلف میں نہیں پڑ رہا تھا تو اُس کا باپ اُس سے بھی چار ہاتھ آگے نکل کر اپنی جائداد کے اکلوتے وارث کو مٹھی میں جکڑنے کا سامان کر رہا تھا۔

صبح دم جاگا تو اُس پر کسل مندی سوار تھی۔ رت جگے کے اثرات کم کرنے کے لیے کافی دیر تک باتھ روم میں گھسا رہا۔ بہ خوبی تیار ہو کر اپنی گاڑی تک آیا۔ رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ نہایت آسانی سے وہ وقت مقررہ پر کالج کے گیٹ تک پہنچ سکتا تھا جہاں ٹھہر کر اُسے مصباح کا انتظار کرنا تھا۔ گاڑی میں بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ باپ پر نظر پڑ گئی۔ سلام کیا۔ باپ نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر پوچھا۔ ''کسی سے ملنے کے لیے جارہے ہو؟''

اُس نے عام سے انداز میں جواب دیا ''ہاں بابا! دوستوں کے ساتھ کہیں جانے کا پروگرام ہے۔''

''وِش یو گڈ لک ڈیئر!'' باپ نے حسبِ عادت کلف شدہ مونچھوں کو ہونٹوں میں دباتے ہوئے کہا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا جہاں باوردی ڈرائیور ہمیشہ کی طرح اُس کا منتظر کھڑا تھا۔

شہاب گاڑی نکال کر سڑک پر آیا۔ فون کا بزر بجنے لگا۔ اُس نے فون کی ڈبلے اسکرین میں جھانکا۔ لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ مصباح فون کر رہی تھی۔ اُس نے کال ریسیو کی، فون کان سے لگایا اور بولا۔ ''ہائے! میری جان مجھے بے تابی سے پکار رہی ہے، کسی کو اگر میری خوش بختی پر رشک ہو تو آئے اور

اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔''

وہ بولی۔ ''زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ میں گھر سے نکل پڑی ہوں، تم بھی جلدی سے کالج کے گیٹ پر پہنچ جاؤ۔''

وہ کچھ اور کہنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر مصباح نے کال منقطع کردی۔ شہاب نے گاڑی کی رفتار قدرے کم کردی کیونکہ اُسے علم تھا کہ مصباح جتنی بھی جلدی کرے، نصف گھنٹے سے پہلے نہیں پہنچ سکتی جبکہ شہاب گاڑی میں بیٹھ کر پانچ منٹ میں وہاں پہنچ سکتا تھا۔

اپنے لحہ بہ لحہ تجاوز کرتے اضطراب پر قابو پانے کے لیے راستے میں ایک کولڈ ڈرنک کارنر پر رُک گیا۔ سگریٹ خریدا، سلگایا اور کار کی ڈکی کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ دس پندرہ منٹ بعد کالج کی طرف چل پڑا۔

پھر وہ دکھائی دے گئی۔ قدم قدم اُدا سے چلتی ہوئی گاڑی تک آئی۔ جھک کر گاڑی کے اندر جھانکتے ہوئے بولی۔ ''کیا ہم اُبھی جا رہے ہیں؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ نقاب سے جھانکتی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ دل کو تھوڑا سا دُکھ ہوا۔ اعتبار کرنے والی کو دھوکا دیتے ہوئے دِل ملامت کرنے لگا۔ دل کی ماننا تو فوراً تھم جاتا، دماغ کی مان کر آنکھیں جھکا کر سوچ رہا تھا۔ ''اِن آنکھوں کی مستی کے مَے خانے کو ہمیشہ کے لیے اپنانے کی خاطر جرم کر رہا ہوں، زیادتی کر رہا ہوں مگر تب یہ جرم بے تعزیر ہوجائے گا جب مدعی بانہوں میں آنکھیں موندے جرم کا تذکرہ کرنے کے بجائے دُنیا جہان کی باتیں کر رہی ہوگی۔''

وہ اگلا دروازہ کھول کر اُس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''تم پریشان دکھائی دیتے ہو، کیا بات ہے؟''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''پریشانی اور حیرت میں امتیاز نہیں کرسکتی ہو کیا؟''

''حیرت؟ کس بات پر حیران ہو رہے ہو؟''

''تمہیں دیکھ کر......''

''کیا میرے سر پر سینگ دکھائی دینے لگے ہیں؟''

شہاب نے ہنس کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ موبائل فون کی میموری میں پہلے سے فیڈ شدہ پیغام نکالا اور خرم کو بھیج دیا۔ پیغام کے ذریعے اُس نے خرم اور بابر کو مطلع کردیا تھا کہ وہ روانہ ہوگئے ہیں۔ شہر سے نکل کر تحصیل ہیڈکوارٹر کی طرف جانے والی سڑک پر گاڑی ڈالتے ہوئے شہاب نے کہا۔ ''کیا پہلے اِس طرف کبھی آئی ہو؟''

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ بولی۔ ''ایسا سفر زندگی میں ایک بار کیا جاتا ہے، اَب تمہارے ساتھ کر رہی ہوں۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

''میں نے نہ سمجھ آنے والی بات نہیں کی۔'' وہ بولی۔ ''اگر ہوسکے تو ڈرائیونگ کرنے کے ساتھ ساتھ میرے ساتھ باتیں کرتے رہو۔ میں نروس ہو رہی ہوں۔''

وہ خود بھی اپنی توجہ بٹانا چاہتا تھا کیونکہ ہر گزرتے لمحے میں وہ کمزور پڑتا جا رہا تھا۔ بولا۔ ''ہماری حویلی سے دریائے سندھ محض دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر بہتا ہے۔ چند دِن پہلے بہت اونچے درجے کا سیلاب آیا تھا۔ بستیاں برباد ہوکر رہ گئی تھیں، موقع ملا تو تمہیں دریا پر لے جاؤں گا، کیا دلچسپی رکھتی ہو؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پروفیسر وسیم بزدار کی جنت کا خیال پَل بھر کے لیے ذہن میں آیا، پھر معدوم ہوگیا۔ اُسے اپنی جنت کی فکر تھی، پروفیسر کی جنت سے اُس نے کیا لینا دینا تھا؟ وہ بڑی دلچسپی سے شیشے کے پار کھیتوں کو دیکھ رہی تھی۔ دھڑکتے دِل سے پوچھنے لگی۔ ''کتنا سفر رہ گیا ہے؟''

''نصف طے ہوگیا، نصف رہ گیا ہے۔'' شہاب نے دلاسا دیا۔

شہاب نے گاڑی کی رفتار آہستہ کی۔ بائیں طرف نکلتی لنک روڈ پر اُترتے ہی نیلی بتی والی لینڈ کروزر کھڑی دکھائی دی۔ گاڑی کے قریب ہی سڑک کے بیچوں بیچ عجیب سی یونیفارم والے تین اونچے لانبے جوان کھڑے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں خوفناک گنیں صاف نظر آ رہی تھیں جن کا رُخ شہاب کی کار کی طرف ہی تھا۔ مصباح کے منہ سے دبی دبی چیخ نکل گئی۔ شہاب نے گھبرا کر جلدی سے بریک لگائے۔ گاڑی رُکتے ہی دو آدمی اُن کے سروں پر پہنچ گئے۔ شہاب کے پاس آنے والے نے گن کے اشارے سے شیشہ اُتارنے کا حکم دیا۔ شہاب نے شیشہ اُتارا۔ پوچھا۔ ''کیا بات ہے سر؟''

''باہر نکل آؤ، ہری اَپ!'' اُس نے ڈپٹ کر کہا۔

اُس کے بالوں کی مخصوص کٹنگ دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ کسی حساس ادارے سے تعلق رکھتا ہے۔ شہاب ایک نظر مصباح پر ڈال کر نیچے اُترا۔ گن بردار نے اُس کے سینے پر گن رکھ کر ہینڈز اَپ کرا دیا۔ اُس کے ساتھی نے مصباح کی طرف کا دروازہ کھولا۔ ڈپٹ کر بولا۔ ''کون ہو تم لوگ؟''

''وہ...... مم...... مجھے نہیں پتا!'' مصباح بری طرح گھبرا گئی تھی۔

گن بردار نے گاڑی کے قریب کھڑے وردی پوش کی طرف منہ کرکے کہا۔ ''سر! یہ واقعی مشکوک لوگ ہیں، اِنہیں ہیڈ کوارٹر لے کر جانا ہوگا۔ مجھے دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔''

شہاب نے ہونٹ بھینچ کر سخت لہجے میں کہا۔ ''کیا تم لوگ اپنا تعارف کرانا پسند کروگے؟''

''ہاں میرے لعل! تمہارا یہ شوق بھی پورا کردیتے ہیں۔'' نیلی بتی والی گاڑی کے بڈ سے ٹیک لگائے کھڑے آفیسر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تمہیں اگر ہماری یونیفارم اور گاڑی کو دیکھ کر بھی کچھ پتا نہیں چل رہا تو تمہاری اطلاع کے لیے عرض کرتا ہوں کہ ہمارا تعلق آئی بی سے ہے اور ہم یہاں تمہارے جیسے عیاش امیرزادوں کے انتظار میں اپنے فرائض منصبی سرانجام دے رہے ہیں۔ اَب تم بھی پھوٹ پڑو، کون ہو، یہ لڑکی کون ہے اور اِدھر ویران علاقے میں کیا کرنے کے لیے اتنے اہتمام سے قدم رنجہ فرمایا ہے آپ نے؟''

اُس کے لہجے میں پنہاں کاٹ اور طنز نے مصباح کو زمین میں گاڑ دیا۔ شہاب نے کہا۔ ''ہم اپنے گھر جا رہے ہیں۔ یہاں سے آٹھ دس کلومیٹر کے فاصلے پر ہماری زمینیں اور حویلی موجود ہے۔''

''کہاں؟''

شہاب نے گاؤں کا نام بتایا۔ اُس نے کن اکھیوں سے مصباح کو دیکھ کر پوچھا۔ ''یہ عورت کون ہے؟''

شہاب نے جلدی سے کہا۔ ''یہ میری بیوی ہے؟''

''اوہ!'' آفیسر نے یوں کہا جیسے اُسے یہ سن کر بے حد مایوسی ہوئی ہو۔ ''جوانو! اِسے جانے دو۔ یہ تو میاں بیوی نکلے۔''

شہاب نے عافیت کا سانس لیا، ہاتھ نیچے کیے اور گاڑی میں بیٹھنے لگا۔ اُس کے سر پر کھڑے گن بردار نے اُسے زوردار گالی دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کس نے کار میں بیٹھنے کی اجازت دی ہے؟ چل باہر نکل اور اپنا نکاح نامہ دکھا۔'' پھر اپنے آفیسر کی جانب متوجہ ہوکر بولا۔ ''سرجی! جان چھڑانے کے لیے لوگ یہی جھوٹ بولتے ہیں۔ اَبھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجاتا ہے۔''

شہاب کا رنگ متغیر ہوگیا۔ اُس کا جھوٹ نبھ نہیں سکا تھا۔ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''نکاح نامہ کوئی ایسی چیز تو نہیں جسے ہر وقت اپنے پاس رکھنا ضروری ہو، وہ گھر میں پڑا ہے۔''

اُسی اہلکار نے مصباح کے قریب آکر پوچھا۔ ''کیوں جی! کیا آپ اِس کی بیوی ہیں؟''

مصباح کا حلق سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔ آج تک ایسی صورتِ حال سے دوچار نہیں ہوئی تھی۔ زور زور سے اثبات میں سر ہلانے لگی۔ شہاب نے اِسی دوران جرأت پکڑی اور غصے سے کہا۔ ''شاید تم لوگ مجھے جانتے نہیں ہو، میں ضلع ناظم سردار ارباب خان کا بیٹا ہوں، کھڑے پیر تمہاری وردیاں اُتروا سکتا ہوں۔ سمجھے؟''

آفیسر نے استہزائیہ لہجے میں اُس کی نقل اُتاری۔ ''کھڑے پیر تمہاری وردیاں اُتروا سکتا ہوں...... ارے واہ! کیا اختیارات ہیں جناب کے! کیا تم واقعی ضلع ناظم کے بیٹے ہو؟''

''ہاں......''

''تو پھر یہ عورت ضلع ناظم کی بہورانی ہوگی؟''

مصباح کو آفیسر کا لہجہ اور انداز بہت ناگوار گزر رہا تھا مگر بے بسی سے سوائے آنسو بہانے کے کچھ نہیں کرسکتی تھی۔

''ہاں۔ آخر تم لوگ ہمارے ساتھ ایسا نازیبا رویہ کیوں رکھے ہوئے ہو؟ کیا ہم نے کوئی واردات کر ڈالی ہے؟'' شہاب نے تنگ آکر کہا۔

''وقت آنے پر یہ بھی بتا دوں گا۔ تمہاری بیوی کا نام کیا ہے؟''

شہاب کا چہرہ فرطِ غیظ سے سرخ ہوگیا۔ بولا۔ ''ہم شرفا ہیں، اپنی بہو بیٹیوں کے نام کسی کو بتایا نہیں کرتے۔''

یہ کہنا قیامت ثابت ہوا۔ شہاب خان کے سامنے کھڑے چوڑے چکلے سینے والے گن بردار نے پوری قوت سے گن کی نال اُس کی پسلیوں میں چبھو دی۔ وہ دھکا کھا کر پیچھے ہٹا۔ سڑک سطحِ زمین سے دو تین فٹ اونچی تھی، اِس لیے وہ لڑکھڑا کر عقب میں کھیت میں جا گرا۔ بہ دقّت تمام اُٹھا اور دھمکیاں دیتا ہوں گاڑی کے قریب آیا۔ گن بردار نے دانت پیس کر کہا۔ ''سرجی نے جو پوچھا ہے، شرافت سے بتاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔ گولی کسی ضلع ناظم کے بیٹے کو پہچان کر معاف نہیں کرتی۔ سمجھے یا پھر سمجھاؤں؟''

وہ ہونٹ کاٹتا رہا مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔ مصباح نے جلدی سے اپنے قریب کھڑے اہلکار سے کہا۔ ''میرا نام مصباح ہے۔ پلیز! ہمیں جانے دو۔ تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے، ہم کوئی مجرم نہیں ہیں۔''

اہلکار نے اپنے آفیسر کو مصباح کے نام سے آگاہ کیا۔ اُس نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور سیٹی بجانے کے سے انداز میں ہونٹ سکیڑ کر زیرِلب ''مصباح'' کہا۔ پھر گاڑی سے ایک پاکٹ نوٹ بک اور پنسل نکالی۔ کچھ لکھ کر مصباح کے قریب آیا اور اُس کے ہاتھ میں نوٹ بک اور پنسل تھماتے ہوئے سخت لہجے میں بولا۔ ''اِس میں چند سوالات لکھے ہیں، اُن کے جواب لکھو، دیکھو! غلطی کرنے اور عدم تعاون کی صورت میں بہت بڑے نقصان سے دوچار ہوجاؤ گی۔

تعاون کرو گی تو ممکن ہے جان چھوٹ جائے، وگرنہ آئی بی کے ہاتھ لگنے والے مجرموں کی آنے والی سات نسلیں بھی آئی بی کے نام سے خوفزدہ رہتی ہیں۔''

مصباح نے کانپتے ہاتھوں سے نوٹ بک تھامی۔ کن اکھیوں سے شہاب کی طرف دیکھا جس کی حالت خاصی غیر ہو چکی تھی۔ مصباح کے سامنے تین سوال درج تھے۔

''شادی کس تاریخ کو سرانجام پائی؟''

''تمہاری ساس کا نام کیا ہے؟''

''حق مہر کتنا طے پایا تھا؟''

مصباح کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اُسے دماغ نے سمجھا دیا تھا کہ انہی سوالوں کے جوابات شہاب سے بھی طلب کیے جائیں گے۔ غلط ہونے کی صورت میں اُنہیں مجرم قرار دے دیا جائے گا۔ جگ ہنسائی...... ذلت...... تماشا! کئی سوالیہ نشان اُس کی نگاہوں میں ایستادہ ہو گئے۔ اُس نے مدد طلب نگاہوں سے شہاب کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہونقوں کی طرح کبھی اُسے اور کبھی آفیسر کی طرف دیکھنے لگا۔

آفیسر نے جھڑک کر کہا۔ ''میں نے ایٹم بم بنانے کی ترکیب نہیں پوچھی، جلدی جواب دو۔''

وہ کچھ نہ لکھ پائی۔ مجبوراً رُندھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں کچھ نہیں جانتی۔ پلیز! ہمیں جانے دو۔''

''کیوں بے ناظم کے پتر! کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ لڑکی تمہاری بیوی ہے؟''

شہاب نے تذبذب کے عالم میں کہا۔ ''ہا...... ہاں...... میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ تم اپنے حق میں اچھا نہیں کر رہے ہو۔ میں تمہاری شکایت بہت اوپر تک پہنچاؤں گا۔''

اُس کے دھمکی آمیز لہجے کا آفیسر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اُس نے پیشانی پر بل چڑھا کر اپنے ماتحت سے کہا۔ ''اوئے گرمانی! تمہارے پاس ضلع ناظم کا سیلولر نمبر ہوگا، دیکھو تو...... اُسے فون کرو اور پوچھو کہ تمہاری بہو ویران علاقے میں ایک اوباش جوان کے ساتھ گھوم پھر رہی ہے، کیا اُس اوباش کو تمہارا بیٹا مان لیا جائے؟''

مصباح کو کور کیے کھڑے اہلکار نے ہپ پاکٹ سے موبائل فون نکالا۔ چند لمحے رابطہ کرنے میں لگے۔ رابطہ ہونے پر اُس نے وائڈ اسپیکر آن کرتے ہوئے پوچھا۔

''سردار ارباب خان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں...... سردار ارباب خان، بات کر رہا ہوں۔ تم کون ہو؟'' شہاب کو جھٹکا سا لگا۔ مصباح کو شہاب کا ردِعمل دیکھ کر یقین ہو گیا کہ موبائل فون سے نکلنے والی آواز اُس کے باپ کی ہی تھی۔

''میں ایک ذمّے دار آفیسر بول رہا ہوں۔ ہم نے ایک مشکوک جوڑے کو رنگ رلیاں مناتے ہوئے گرفتار کیا ہے۔ لڑکی آپ کی بہو ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔'' آفیسر نے کہا۔

''واٹ اے نان سینس!'' سردار ارباب خان نے چنگھاڑ کر کہا۔ ''میرا ایک ہی بیٹا ہے اور اس کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔ یہ لڑکی جو کوئی بھی ہے، اِسے الٹا لٹکا دو، ٹارچر سیل میں ڈال دو یا کچھ بھی کرو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

اس کے ساتھ ہی ضلع ناظم نے فون بند کر دیا۔ مصباح اور شہاب کی حالت خاصی دگرگوں ہو گئی۔ مصباح کا چہرہ یوں پیلا پڑ گیا تھا جیسے جسم سے خون کی ایک ایک بوند نچوڑ لی گئی ہو۔ تصدیق کا مرحلہ تمام ہوتے ہی آفیسر کے حکم پر دونوں اہلکاروں نے دونوں مجرموں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ چہروں پر خاص انداز میں کپڑے کے تیار کردہ سیاہ ماسک چڑھا دیے اور لبوں پر ٹیپ لگا کر نیلی بتی والی لینڈ کروزر کے پچھلے حصے میں دھکیل دیا گیا۔ دوسرا اُس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

لینڈ کروزر کے شیشوں پر گہرے رنگ کا گلاس پیپر چسپاں تھا جس کی وجہ سے غور کرنے پر بھی گاڑی کے اندر کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پشت پر ہتھ کڑیوں میں ہاتھ بندھے ہونے کی بدولت دونوں اپنی مرضی سے حرکت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ گاڑی کے روانہ ہونے کے ساتھ ہی مصباح بے جان انداز میں شہاب پر گر گئی۔ اچانک دَرپیش آنے والی غیر متوقع صورتِ حال اُس کے ناتواں اعصاب کو توڑنے پھوڑنے کے لیے کافی ثابت ہوئی تھی۔

زندگی کا چلن کبھی کبھی ناقابلِ حد تک عجیب ہو جاتا ہے۔ مصباح نے جس شخص کو بھری دُنیا میں اپنا محافظ چنا تھا، جس وجود کو خوشیوں کا خزینہ قرار دے کر ہر چیز پر ترجیح دے ڈالی تھی، وہی اُس کی شخصیت اور اُس کی زندگی کے تمام تر وقار پر سیاہ دھبا بن گیا تھا۔ ایسے میں یہ کہنا کتنا بڑا صدق ہوگا کہ محبت اور خودغرضی ایک ہی کھوپڑی میں پرورش پانے والے دو خوابیدہ ناگ ہیں جن میں سے کوئی ایک یا دونوں کسی بھی لمحے میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتے ہیں اور زندگی کی رگ رگ میں اپنا زہر بھر دیتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

پانی کی سطح مسلسل گر رہی تھی۔ سیلابی ریلے نے پروفیسر کے کئی دِنوں کے سکون کو غارت کر دیا تھا۔ سموں کا یوں لہروں کے دوش پر زندگی موت کا کھیل کھیلتے ہوئے اس کی جنت میں اُترنا اور پھر مایوس چلے جانا، پسلیوں کے نیچے ایک نئی کسک کو جگا گیا تھا۔ اُسے بچپن یاد دلا کر جانے والی ابھی تک اُس کی چشمِ تصور میں بسی ہوئی تھی۔

وہ سموں کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ فون کا بزر بجنے کے ساتھ ننھی سی اسکرین پر افتخار کا نام چمکنے لگا۔ اُس نے کال ریسیو کی، فون کان سے لگایا اور بولا۔ ''افتخار بیگ! کیسے ہو؟''

''میں بالکل اچھا نہیں ہوں۔ آپ کی طرح تنہائی کی تلاش میں ویرانوں کی طرف نکلنا چاہتا ہوں۔'' افتخار کا یہ انداز پروفیسر کے لیے یکسر اجنبی تھا۔

''کیا ہوا بیٹے؟'' پروفیسر نے چونک کر پوچھا۔

''وہ ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' افتخار نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔ ''میں چند دِن آپ کی جنت میں گزارنا چاہتا ہوں۔ پلیز سر! مجھے مایوس نہ کیجیے گا، میں پہلے ہی ٹھکرائے جانے کے کرب سے گزر رہا ہوں۔''

''اگر ایسا ہے تو بلا جھجک میرے پاس چلے آؤ۔ میری جنت کے دروازے تمہارے لیے روزِ اول سے کھلے ہیں بیٹا!'' پروفیسر نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ غالباً اس دوران وہ اُسے اجازت دینے یا نہ دینے کے بارے میں غور کرتا رہا تھا۔ افتخار بیگ نے شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا۔

وہ کافی دیر تک پوری توجہ سے افتخار بیگ کے انداز میں واقع ہونے والی غیر معمولی تبدیلی کے بارے میں سوچتا رہا پھر سر جھٹک کر بیڈ روم سے نکل آیا۔ ریلنگ کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا سیڑھی تک آیا۔ ستون پر چڑھ کر جنریٹر کے پَروں کو برابر رفتار سے گھومتا دیکھنے لگا۔ دُنیا بھی ایسے ہی ایک ہی رُخ پر گھومے جا رہی ہے۔ کوئی رُکاوٹ نہیں، کوئی تغیر نہیں۔ جنریٹر کے پَروں کی رفتار کا انحصار دریا کے پانی کے بہاؤ پر ہے اور زمانے کے تغیر کا دارومدار انسانی ذہن کے تناؤ پر ہے۔

وہ اپنا کھانا تیار کر رہا تھا کہ اُس کے موبائل پر افتخار بیگ کی کال موصول ہوئی۔ اُس نے پوچھا۔ ''ہاں بھئی انجینئر! کہاں ہو؟''

''سر جی! میں بڑی مشکل سے پکی سڑک پر پہنچا ہوں۔ آگے پانی ہی پانی ہے۔ آپ تک پہنچنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' افتخار کی آواز سنائی دی۔

وہ کچن سے نکل کر جلدی سے عرشے پر آیا۔ دیکھا۔ افتخار کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ بولا۔ ''کیا تم پتن والی جگہ پر نہیں پہنچ سکتے؟''

''یہاں سے جنت تک پانی ہی پانی ہے، پتن دکھائی نہیں دیتا۔''

''سڑک پر پانی ہے؟''

''جی! سڑک کے اوپر سے پانی بہہ رہا ہے۔''

''یہاں تک کیسے پہنچے ہو؟''

''ایک ٹریکٹر والا چھوڑ کر گیا ہے۔''

پروفیسر گہری تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ افتخار کو کیسے جنت میں لے کر آئے؟ اُس کی ریموٹ کنٹرول بوٹ پتن تک جا سکتی تھی۔ اُس سے آگے اُس کے پھنس جانے کا خطرہ تھا۔ خطرہ مول لینا پڑ رہا تھا۔ وہ فون میں بولا۔ ''تم وہیں کھڑے رہو، دھیان کرنا کہ پانی میں سانپ بچھو نہ کاٹ لے، میں بوٹ لے کر آ رہا ہوں۔''

افتخار بیگ نے فون بند کر دیا۔ پروفیسر نے بوٹ کی ٹینکی میں پیٹرول کی دو بوتلیں ڈالیں، ستون کے ساتھ لٹکتا ہوا بانس تھاما اور بوٹ اسٹارٹ کر کے کھلے پانی میں آ گیا۔ اُس کا رُخ ٹاہلی کے بڑے درخت کی طرف تھا۔ یہ درخت پتن پر ایستادہ تھا۔ پانی کے تیز بہاؤ نے اُس کی کمر کو بھی خمیدہ کر دیا تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے بوٹ کو ڈرائیو کرتا ہوا درخت تک پہنچا۔ یہاں سے عام دِنوں میں جو سڑک دکھائی دیتی تھی۔ اَب وہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ البتہ سڑک پر بانہیں اُٹھا کر صدائیں دیتا ہوا افتخار بیگ نظر آ گیا۔ بوٹ جھکے ہوئے درخت کی شاخوں میں ٹکائی، بانس کی چوبھ سے پانی کی گہرائی کا اندازہ کیا اور بوٹ کو آگے بڑھا دیا۔ ایسے ہی پانی کو ماپ ماپ کر وہ نصف فاصلہ نہایت سست رَوی سے طے کرنے میں کامیاب ہوا۔ پانی کے غیر متوازن بہاؤ کی وجہ سے سیدھ میں چلنا ممکن نہیں تھا۔

سڑک سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر پہنچ کر بوٹ پر سفر جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔ پانی کی گہرائی بہت کم ہو گئی تھی۔ اُس نے بیری کے ایک درخت کے ساتھ بوٹ کو باندھا اور پانی میں اُتر آیا۔ یہاں پانی گھٹنوں تک گہرا تھا۔ البتہ اُس کا بہاؤ غیر معمولی حد تک تیز اور خطرناک تھا۔ پیر چکنی دلدلی مٹی میں دھنس رہے تھے۔ بانس کی مدد سے وہ نصف گھنٹے میں افتخار تک پہنچا اور ہاتھ ملا کر ہانپنے لگا۔

چند منٹ سستانے کے بعد واپسی کا قصد کیا جو نسبتاً سہل ثابت ہوا۔ کیونکہ قدموں نے راستہ بھانپ رکھا تھا۔ جنت میں قدم رکھتے ہی افتخار بیگ نے عافیت بھرا سانس لیا، ٹھٹکا اور بولا۔ ''سر جی! آپ کے احترام میں آج تک خاموش رہا مگر دِل ہی دِل میں حالات سے آپ کے فرار کو بے جا قرار دیتا رہا۔ آج دل سے قائل ہو کر کہتا ہوں کہ آپ واقعی بہت

عظیم ہیں۔ دُنیا عظیم نہیں ہے۔''

پروفیسر نے سر جھٹکا اور بغیر جواب دیے کچن کا رُخ کیا۔ کھانا تیار کرنے کے بعد ٹیبل پر سجا دیا۔ افتخار بیگ نے اس دوران منہ ہاتھ دھولیا تھا۔ دونوں نے خاموشی سے شکم سیر کیا اور چائے پینے کے دوران پروفیسر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم مناسب سمجھو تو اپنے فرار کا سبب بتا دو۔ ممکن ہے کہ تمہارا فیصلہ سرے سے غلط ہو جسے تم اپنی اُبالی فطرت میں درست قرار دے کر انتہائی قدم اُٹھانے پر مجبور ہو گئے ہو۔''

افتخار کے بدن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ کرسی کی پشت چھوڑ کر سیدھا ہو بیٹھا۔ ٹیبل پر پڑے پروفیسر کے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔ محبوب کے پہلے بوسے کی طرح سگریٹ کا پہلا کش بدن کے نظام کو تہس نہس کر دیتا ہے۔ اُسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ کھانستے کھانستے بے حال ہونے لگا مگر کش پر کش لیتا رہا۔ آنکھوں میں فرطِ جذب سے آنسو آ گئے۔ جدائی کے دُکھ کی آمیزش نے آنسوؤں کو چھلکا دیا۔ چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔ پروفیسر نے اُس کا کندھا تھپتھپایا، طعنہ زن ہوا۔ ''بیٹا! مرد رونے کے لیے نہیں، آنسو پونچھنے کے لیے بنے ہیں۔ آنسوؤں کو لگام دو، روتے ہوئے تم ہرگز اچھے نہیں لگ رہے ہو۔''

افتخار نے ہاتھ ہٹائے اور شکوہ آمیز لہجے میں بولا۔ ''سچ کہیں سر! آپ کبھی نہیں روئے؟''

پروفیسر نے نفی میں سر ہلایا، پھر خیال آیا کہ بے مقصد جھوٹ بول کر وہ گناہ گار ہو رہا ہے، اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مگر میں کسی کے سامنے آج تک نہیں رویا۔''

''مجھ سے یہ منافقت بھی نہیں ہو پا رہی سر جی!'' افتخار کا لہجہ بھرایا ہوا تھا۔

پروفیسر نے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ تم کسی ہیجان انگیز واقعے کے عینی شاہد بن کر آ رہے ہو۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ انسان کو کوئی ایک واقعہ، کوئی ایک انسان یا کوئی ایک جذبہ اتنا تغیر فراہم کر دیتا ہے کہ اُسے خود پر بھی اختیار نہیں رہتا۔ کیا تم محبت کی پاداش میں روئے ہو؟''

وہ خاموش رہا۔ خاموشی کو اقرار سمجھنے میں پروفیسر نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔

''وہ کہاں ہے؟'' پروفیسر نے سوال داغا۔

''وہ کون؟'' افتخار کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''وہ، جس نے تمہیں یہاں بھیجا ہے۔''

ایک ہی لمحے پر جیسے وقت رُک گیا ہو، افتخار بیگ کی سانس ٹھہر گئی ہو، دل نے دھڑکنا بند کر دیا ہو۔ بولا۔ ''مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا سوائے جنت کی پُرسکون تنہائی کے۔ میں زمانے کی ناانصافی کا شکار ہو گیا ہوں سر جی! جس وجود کو اپنی ذات کے فلک پر چاند کی طرح بچپن سے آج تک سجائے رکھا، وہی دولت اور اختیارات کی خیرہ کن چمک پر للچا کر ضلع ناظم کے بیٹے کی گود میں اُتر چکی ہے۔ یوں کہ اُس نے اپنے اُجلے ہالے کی شکستگی پر بھی دھیان نہیں ڈالا۔ خاندان کی بدنامی اور میری آزردگی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے وہ سردار شہاب خان کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے۔ اس کے باوجود کہ اُس کے باپ نے اُسے شہاب خان سے شادی کی اجازت دے رکھی تھی......''

پروفیسر کو اُس کی لو اسٹوری کا علم نہیں تھا مگر حالات جان کر سُن رہ گیا۔ بہ وقت تمام گویا ہوا۔ ''ذرا تفصیل سے بتاؤ۔''

''بتانے کا کچھ فائدہ نہیں مگر آپ جیسے مہربان استاد سے کچھ چھپانا خیانت کے مترادف ہوگا۔ سنیے!'' افتخار نے کہا اور سر جھکا کر اپنا غبارِ دل ہلکا کرنے لگا۔ پروفیسر کا انہماک قابلِ دید تھا۔ شاید مصباح کے ذکر میں اُسے مریم اور رُباب کی شباہتیں نظر آ رہی تھیں۔

کہانی ختم ہوئی تو وہ اُٹھا اور افتخار کے نہایت قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے ہاتھوں سے اُس کے آنسو پونچھتے ہوئے بھرائے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔ ''دُنیا کے فلسفیوں نے، شاعروں اور اَدیبوں نے نہایت غلط نظریہ اتنے تواتر سے پیش کیا کہ آج کا ہر مرد یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ عورت کی معیت کے بغیر وہ نامکمل اور اَدھورا ہے۔ اسی خام نظریے نے محبت اور عشق جیسی خرافات پیدا کر دی ہیں جنہوں نے مرد کو آہنی شکل سے پگھلا کر موم میں ڈھال دیا ہے۔ بدنی اور معاشرتی ضرورت کو اَن گنت شاعرانہ نام دے کر اس کی اہمیت کو دوچند کر دیا ہے۔ عورت کے حسن پر بہت کچھ لکھا گیا۔ فطری کمزوریوں کے سبب پیدا ہونے والی نرمی اور گداز کو حسن کا استعارہ بنا کر عورت کی اہمیت کو خاصا بڑھا دیا۔ تم بھی اِسی عقیدے کی بھینٹ چڑھ گئے ہو۔''

افتخار کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ جانے والی سمجھ لینے کی تمام تر صلاحیتیں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے لفظ لفظ کرید کر بولتے ہوئے پروفیسر کو دیکھتا رہا۔ پروفیسر اپنی ہی رو میں بھٹکتا جا رہا تھا۔ ''افتخار! تم نے کوئی جرم نہیں کیا، کوئی غلطی نہیں کی۔ ایسی صورت میں رونا تمہارا مقدر نہیں ہونا چاہیے بلکہ اُس بدصورت اور اَدھوری عورت کو رونا چاہیے، پچھتانا چاہیے جو تمہارے وجود پر کسی اور کو ترجیح دے کر تمہیں

توڑنے کے جرم کا ارتکاب کر چکی ہے۔ میں یہی کہتا ہوں کہ عورت وجۂ فساد ہے، وجہ انتشار ہے۔ قریب ہو تو جذبات میں ہر دم انتشار پیدا کرتی رہتی ہے۔ دور ہو تو قریب بلانے کے لیے لالچ دیتی رہتی ہے۔ ضلع ناظم کا بیٹا اُسے بھگا کر لے گیا، میرے خیال میں اُس کے لیے یہی سزا کافی ہوگی کہ اُسے تمہاری محبوبہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ عرصہ تک رہنے دیا جائے۔ اگر تمہیں اپنے ذہن پر اختیار حاصل ہے تو اُٹھو، جشن مناؤ، خوشیاں مناؤ کہ تم ایک بہت بڑے سانحے سے بچ گئے ہو۔ لیٹ اُس انجوائے دِس مومنٹ ڈیئر!''

پروفیسر نے اُس کا ہاتھ تھاما اور کھینچتے ہوئے اسٹڈی روم میں لے گیا۔ وہ بادلِ ناخواستہ اُس کے ساتھ گھسٹ رہا تھا۔ پروفیسر نے کمپیوٹر آن کیا۔ ایک جذبات انگیز ویب سائٹ کھولتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو جوان! یہ سب دُنیا کے مختلف معاشروں کی عورتیں ہیں جنہیں ماڈل بنا کر مردوں کی نظروں میں پیش کیا جاتا ہے۔ دیکھو! اِن برہنہ قیامتوں کو دیکھو۔ کیا یہ مردوں کو پھانسنے کے اشتہار نہیں ہیں؟ یہی وہ فلسفہ ہے جسے سمجھنا بہت مفید اور نہ سمجھنا قیامت خیز ثابت ہوتا ہے۔ یہی وہ وجود ہے جس کے گداز اور کشش پر مختلف زبانوں کے شاعروں نے اَن گنت کتابیں لکھ چھوڑی ہیں مگر یہ ہے کیا؟ بہ غور دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم انجینئر ہو۔ قدرت کی انجینئرنگ کو ملاحظہ کرو گے تو فوراً سمجھ جاؤ گے کہ یہ سب ایک جیسی ہیں۔ ہیں ناں؟ کوئی فرق نہیں ہے۔ پھر جب یہی فزی بیلٹی ہماری معاشرتی اقدار کے پروردہ اسرار میں لپٹ جاتی ہے تو اشتہا انگیز تفنن بن جاتی ہے جس کے بارے میں یہ پتا نہیں ہوتا کہ اِس میں موجود لنچ کا مینو کیا ہے؟ وہ بھی ایسی ہی ہے...... سب کے جیسی۔ بس تمہاری نظر اور ذہن میں اُترنے والی بار بار کی فیڈنگ نے تمہیں جذباتی بنا دیا اور تم نے یہ سوچا کہ مصباح نہیں تو دُنیا میں کچھ بھی نہیں...... میں غلط نہیں کہتا، درست کہتا ہوں۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو گے تو یہ اسرار قبل از وقت کھل جانے والے گفٹ پیک کی طرح بے وقعت ہو جائے گا۔''

افتخار کا جیسے سانس سینے میں کہیں اَٹک کر رہ گیا تھا۔ ہوش رُبا قیامتیں دیکھ کر کن اکھیوں سے پروفیسر کے چہرے کو دیکھا جہاں سوائے سنجیدگی کے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ ایک لڑکی کے فوٹوگراف پر ماؤس کا پوائنٹر روکتے ہوئے پروفیسر نے کہا۔ ''اِسے دیکھو بیٹا! یہ یورپین لڑکی ہے۔ اِس کے بالوں کی شائننگ دیکھو کہ ہر آنکھ تھم تھم کر دیکھنے پر مجبور ہو جائے، اِس کی پلکوں کا خم دیکھو کہ چنگیزی تلوار کی کاٹ یاد آ جائے،

مسکا ڈش

سب سے پہلے حسد کی آگ سے چولہا جلائیں، اب چولہے پر خواہش کی ہانڈی رکھ کر مکھن سے تڑکا لگائیں۔ پھر حسبِ ذائقہ غیبت کا نمک، رقابت کی مرچ اور انتقام کا سفوف ڈالیں۔ تھوڑی دیر بعد فکر، پریشانی، مایوسی، حسرتیں اور آہیں ڈال کر شوہر کا دل اچھی طرح بھون ڈالیں۔ اس کے بعد جلے ہوئے ارمان اور دم توڑتی آرزوئیں ڈال کر خوب پکائیں۔

اور جب شوہر کا دل و دماغ اچھی طرح پک جائے تو پیار کی دو بوند ڈال کر ہلکا سا شوربا کر لیں۔ دھیمی دھیمی کشش کی آنچ پر پکائیں۔ کچھ دیر انتظار کریں۔ جب دیکھیں کہ شوہر کی قوتِ برداشت جواب دے گئی ہے تو زبان کے نشتر ختم کر کے چولہا بند کر دیں۔ پھر اس کو مسکا کی ڈش میں ڈال کر نفرت اور محبت کا بگھار دیں، پھر ٹھنڈا ہونے کے لیے دماغ کے ڈیپ فریزر میں رکھ دیں۔ ٹھنڈا ہونے کے بعد خواہش کی پلیٹ میں نکال کر کامیابی کے چمچے سے نوش فرمائیں۔ اب آپ کے شوہر آپ کی ہر خواہش پوری کرنے کے موڈ میں نظر آ رہے ہیں۔

اس کے کندھوں کی ملائم جلد کی چمک دیکھو کہ نظر ٹکنے کا نام نہیں لیتی، اِس کے بھرے بھرے سرخ ہونٹوں کی عمودی لکیروں پر توجہ دو تو توجہ ہٹنے کا نام ہی نہیں لے گی، اس کا بے سلوٹ، آنکھوں کو خیرہ کرنے والا وجود ملاحظہ کرو اور دل ہی دل میں موازنہ کرو کہ کیا تمہاری مصباح اِس سے زیادہ خوبصورت ہے؟ میں جانتا ہوں کہ تم طرف داری کرو گے اور تمہاری سوئی ہمیشہ مصباح پر اَٹکی رہے گی کیونکہ یہ یورپین لڑکی پوری کی پوری تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے جبکہ اُس نے چہرے کے بعد آج تک کچھ بھی نہیں دکھایا۔ یہی اسرار کہ وہ کیسی ہوگی، تمہیں اُس کا دیوانہ بنائے رکھے گا۔ میں تمہیں دوشی نہیں ٹھہراتا کیونکہ تم نے مذہب کے بعد اِسی عقیدے کو اَن گنت زاویوں سے پڑھ رکھا ہے۔ اتنی مرتبہ کہ وہ تمہارے لاشعور میں جاگزیں ہو گیا ہے جو کسی صورت جان نہیں چھوڑتا۔ میں چھت پر جا رہا ہوں، تم اِس اسرار سے جان چھڑانے کی عملی کوشش کرو۔''

پروفیسر سانس لینے کو رُکا، پھر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مضبوط لہجے میں بولا۔ ''مجھے یقین ہے کہ غور کرنے پر تم میرے ہم خیال بن جاؤ گے۔ آئی کیئر اباؤٹ یو مائی سن!''

پروفیسر نے ماؤس پر سے ہاتھ اُٹھا لیا اور بلا جواز ہاتھ جھاڑ کر اسٹڈی روم سے نکل کر چھت پر جانے کے لیے

سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ڈھلتی سہ پہر کی دھوپ میں غیر معمولی تپش تھی۔ دریا سے اُٹھنے والی ہوا میں نمناک ٹھنڈک تھی۔ زندگی ایسے ہی امتزاج کا نام ہے۔ اوپر سے گرم گرم، نیچے تہ میں فریب آگیں یخ بستگی لیے ایک دم موت کی طرح ساکت وسرد۔

❁ ❁ ❁

شہاب کی برتھ ڈے پارٹی میں شمولیت کی غرض سے گھر سے نکلنے والی گھر گھراتے پنکھے تلے پختہ فرش پر آڑھی ترچھی لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کی بے ہوشی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے شہاب اپنے ساتھیوں کے ساتھ موبائل فون پر مشاورت کررہا تھا۔ اُنہیں سمجھا رہا تھا کہ آگے کیا کرنا ہے...... خود سمجھ رہا تھا کہ لوہے کو موڑنے کے لیے کس حد تک گرم کرنا چاہیے۔

ایسے میں بے ہوش پڑی مصباح کا بدن کسمسانے لگا۔ شہاب بغیر کوئی لمحہ ضائع کیے اُٹھا اور اُس نے موبائل فون بند کیے بغیر دروازے اور فرش کے درمیانی خلا سے باہر کھسکا دیا۔ پلٹ کر مصباح کے قریب آکر اکڑوں بیٹھ گیا اور اُس کے لبوں پر چپکی ہوئی ٹیپ اُتارنے لگا۔ ٹیپ کی گم کے ساتھ لبوں کے اطراف کی باریک لوئیں کھنچنے لگیں۔ تکلیف کے مارے وہ سسکاری بھر کر اُٹھ بیٹھی۔ بے اختیار اپنے دونوں ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ ہتھکڑی دکھائی نہیں دی۔

پھر اپنے محبوب کو دیکھا۔ پریشانی کے عالم میں اُس سے چمٹ گئی۔ سسکیاں لے کر رونے لگی۔ اپنے انجام کے بارے میں دریافت کرنے لگی۔ شہاب نے مایوس لہجے میں بتایا کہ وہ ابھی تک سرکاری اہلکاروں کی گرفت میں ہیں۔ اُس نے تشویشناک انداز میں یہ بھی بتایا کہ وہ ایک پوشیدہ کمرے میں عارضی طور پر بند کیے گئے ہیں۔ مصباح یہ سُن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پرس کو ڈھونڈا مگر دکھائی نہیں دیا تو آنسوؤں کے گرنے کی رفتار میں اضافہ ہوگیا۔ پرس کے ساتھ اُس میں رکھا ہوا موبائل فون بھی غائب ہو چکا تھا۔ وہ کسی کے ساتھ رابطہ نہیں کرسکتی تھی۔ شہاب نے مایوسی کے عالم میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اُن کمینوں نے میرا موبائل بھی چھین لیا ہے۔ افسوس! اَب میں کسی سے رابطہ نہیں کرسکوں گا۔“

مصباح اُس کے سینے سے لگی رو رہی تھی۔ روتے روتے کہہ رہی تھی۔ ”مجھے نہیں پتا تھا کہ تم ضلع ناظم کے بیٹے ہو، تم نے کبھی بتایا ہی نہیں۔ تمہارے باپ نے تم پر آئی ہوئی مصیبت کے بارے میں سُنا اور کچھ نہیں کیا، مجھے حیرت ہے۔“

شہاب نے باپ کی صفائی پیش کی۔ ”بابا کو میں نے تمہارے نام سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ اَب غلطی کا احساس ہوتا ہے مگر کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے یقین ہے کہ جب بابا کو میرے غیاب کا پتا چلے گا، تب وہ زمین آسمان ایک کردیں گے اور میری مدد کے لیے پہنچ جائیں گے۔“

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ لگتا ہے ہماری مدد کے لیے کوئی پہنچ ہی نہ پائے اور اور...... ہائے اللہ! میں اور میرا خاندان تباہ ہوگیا۔ اگر جلدی رہائی نہ ملی تو ہر کوئی ہمارے خاندان پر تھوتھو کرے گا۔ مجھے گھر سے بھاگی ہوئی قرار دے کر میری ماما اور پاپا کا جینا حرام کردے گا...... ہائے! یہ کیا ہوگیا شہاب! کچھ کرو ورنہ میرے بھائی پاگل ہوجائیں گے...... وہ اتنی بڑی بے عزتی برداشت نہیں کر پائیں گے۔ میں نے بڑی غلطی کی جو تمہارے ساتھ چلی آئی......“

دونوں کی کلائیاں خالی کردی گئی تھیں۔ اُنہیں وقت کا بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر سے یہاں موجود ہیں۔ شہاب کا خیال تھا کہ اُنہیں لاک اَپ میں پڑے دو گھنٹے گزر چکے ہیں۔ اِس کا مطلب تھا کہ مصباح کو بے ہوش ہوئے ڈھائی گھنٹے یا اِس سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔

اچانک دروازے کے باہر قدموں کی چاپ اُبھری۔ آنے والے ایک سے زیادہ تھے۔ لاک کھلنے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھلا۔ دونوں ایک ہی وقت میں کھڑے ہوئے اور دروازے کے بیچ ریوالور تھامے کھڑے آفیسر کو سراسیمہ نگاہوں سے گھورنے لگے۔ آفیسر کے عقب میں وہی دونوں اہلکار خونخوار نظروں سے اُنہیں دیکھ رہے تھے۔

مصباح ڈر کر غیر ارادی طور پر شہاب کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔ آفیسر نے غرا کر کہا۔ ”سامنے کھڑی رہو ورنہ گولی ماردوں گا۔“

شہاب نے مزاحمت دکھائی۔ ”مگر آفیسر ہمیں ہمارا قصور تو بتادو۔ ہم دونوں شریف خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے یوں اغوا نما غیاب سے ہماری خاندانی ساکھ تباہ وبرباد ہوجائے گی۔“

آفیسر کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ تیرنے لگی۔ ”تم دونوں کو ہم نے نازیبا حرکات کرتے ہوئے علاقے کے معززین کی موجودگی میں عین موقعے پر پکڑا ہے۔ دو تین دنوں کے ریمانڈ کے بعد تمہیں کورٹ میں پیش کیا جائے گا۔ میڈیا کو دعوت دی جائے گی۔ بتایا جائے گا کہ نام نہاد شریف خاندانوں کے لڑکے اور لڑکیاں کیا گل کھلاتے پھر رہے ہیں۔“

مصباح کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ شہاب نے جلدی سے کہا۔ ”ہم نے کوئی نازیبا حرکت نہیں کی اور نہ ہی کسی معزز آدمی کی موجودگی میں تم نے ہمیں پکڑا ہے۔“

”معصوم بچے! ایسے اَن گنت معززین ہر وقت ہماری جیب میں پڑے اینڈتے رہتے ہیں۔ اُن کی فکر نہ کرو، اپنی فکر کرو۔“

”مگر اِس سے تمہیں کیا حاصل ہوگا؟“ شہاب نے مصباح کو غیر محسوس انداز میں پکڑ کر اپنے پیچھے کرتے ہوئے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔

”پیسا!“ وہ کراہت آمیز ہنسی ہنسا۔ ”تمہارے باپ کے سیاسی مخالفین دونوں ہاتھوں میں نوٹوں بھرے بریف کیس پکڑ کر ہمارے آگے پیچھے پھر رہے ہیں...... ہاہ! کتنا مزہ آئے گا جب لیلیٰ مجنوں کی جوڑی اخباروں اور چینلز کے کیمروں کے سامنے کھڑی ہوگی اور پورا ملک دیکھ رہا ہوگا۔“

”تمہیں کتنا پیسا چاہیے؟“ شہاب نے بے بسی سے کہا۔

”دو کروڑ روپے!“ آفیسر نے عجیب سے انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ ”کیا تمہاری اتنی اوقات ہے؟“

”یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔“ شہاب کے منہ سے نکلا۔

”اتنی بڑی بھی نہیں کہ تمہارے باپ کے سیاسی دشمن مل کر ادا نہ کرسکیں۔“ آفیسر نے ریوالور والا ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ ”ہم ڈیوٹی پر جارہے ہیں۔ رات کو کسی پہر میں ہماری واپسی ہوگی۔ تمہیں بن نکاح کے سہاگ رات منانے کی اجازت ہوگی، پھر شاید موقع نہیں ملے گا۔ کل ملیں گے، تب تک کے لیے گڈ بائی!“

شہاب کے روکنے اور مصباح کی منت سماجت کرنے کے باوجود آکر ڈرانے دھمکانے والے دروازہ مقفل کرکے چلے گئے۔ وہ زیر لب گالیاں دیتے ہوئے دروازہ پیٹنے لگا۔ تھک کر بے دم ہوگیا تو دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ دل ہی دل میں شکر کررہا تھا کہ اُس کے ساتھیوں نے اُنہیں اِس کمرے میں قید کیا تھا۔ پوری حویلی میں اٹیچڈ باتھ والا یہی اکلوتا کمرا تھا۔ کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا پھر اُٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ وہ دل ہی دل میں فرخ اور بابر کے فول پروف انتظامات کو سراہ رہا تھا۔ اُنہوں نے عام سی حویلی کے ایک کمرے کو آئی بی کے ہیڈ کوارٹر کا کمرا ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ مصباح کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ کسی سرکاری عمارت کے بجائے فرخ کے زرعی فارم کے عین وسط میں واقع حویلی کے ایک کمرے میں مقید ہے۔ وہ زیر لب مسکرایا۔

اولڈ از گولڈ

لوگوں نے اتنا ڈرا رکھا تھا کہ میں جھجکتا ہوا آغا کے کمرے میں داخل ہوا۔ یہ ایک چھوٹا سا نیم تاریک کمرا تھا جس کے دروازے کی تنگی سے معا خیال گزرا کہ غالباً پہلے موروثی مسہری اور دوسری بھاری بھرکم چیزیں خوب ٹھسا ٹھس جما دی گئیں، اس کے بعد دیواریں اٹھائی گئی ہوں گی۔ میں نے کمال احتیاط سے اپنے آپ کو ایک کونے میں پارک کرکے کمرے کا جائزہ لیا۔ سامنے دیوار پر آغا کی ربع صدی پرانی تصویر آویزاں تھی۔ جس میں وہ سیاہ گاؤن پہنے، ڈگری ہاتھ میں لیے، مسکرا رہے تھے۔ اس کے عین مقابل، دروازے کے اوپر دادا جان کے وقتوں کی ایک کاواک گھڑی ٹنگی ہوئی تھی جو چوبیس گھنٹے میں صرف دو دفعہ صحیح وقت بتاتی تھی۔ (یہ پندرہ سال سے سوا دو بجا رہی تھی)

آغا کہتے تھے کہ اس گئی گزری حالت میں بھی یہ ان ”ماڈرن“ گھڑیوں سے بدرجہا بہتر ہے جو چلتی تو چوبیس گھنٹے ہیں مگر ایک دفعہ بھی ٹھیک وقت نہیں بتاتیں۔ جب دیکھو ایک منٹ آگے ہوں گی یا ایک منٹ پیچھے۔

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب ”چراغ تلے“ سے اقتباس

اندازے کے مطابق دوپہر ہو چکی تھی۔ مصباح اتنی زیادہ پریشان تھی کہ اُسے بھوک کا بھی قطعی احساس نہیں رہا تھا۔ اُسے رہ رہ کر اپنی غلطی پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔ اُسے یوں منہ اُٹھا کر شہاب کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ پکڑ کر قید کرنے والوں کی دھمکی سیدھی دل پر اثر کررہی تھی اور ندامت کے ہتھوڑوں سے مسلسل ضربیں لگا رہی تھی۔

جب اُسے ایک مجرمہ کی حیثیت سے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے گا، میڈیا کے لوگ طرح طرح کے سوال پوچھیں گے اور اُس کے والدین اور بھائی ندامت سے عدالت کے فرش میں گڑے جائیں گے تب کیا وہ زندہ رہ پائے گی؟ اُس نے اپنی زندگی میں کبھی ایسی ذلت کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اُس نے ماما کو بتایا تھا کہ وہ دوپہر تک لوٹ آئے گی۔ دوپہر ہو چکی تھی مگر واپسی کی ہر راہ مسدود دکھائی دے رہی تھی۔

ایسے میں صرف شہاب ہی بچاؤ کی کوئی صورت نکال سکتا تھا مگر وہ دیکھ رہی تھی کہ شہاب کی حالت اُس سے بھی زیادہ دگرگوں ہو گئی تھی۔ ایسی کیفیت میں رہ کر وہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں تھا۔ مصباح کی آنکھیں اور ذہن اپنی پوری رفتار سے کام کررہا تھا مگر نہ ہی اشک تھمتے تھے، نہ ہی کوئی

ترکیب سجھائی دے رہی تھی۔ ایسے میں پھر دروازے پر قدموں کی آہٹ اُبھری۔ دونوں تن کر بیٹھ گئے۔ قفل کھول کر کمرے میں داخل ہونے والا اکیلا تھا۔ وہ ایک خاص یونیفارم میں ملبوس تھا جبکہ اُس کے ہاتھ میں گن کے بجائے چھوٹا سا پستول دبا ہوا تھا۔

اُس نے اپنے عقب میں دروازہ بند کیا، احتیاط سے اُن کے قریب آیا اور بولا۔ ''مجھے افسوس ہے شہاب خان کہ محکمے نے تمہاری حیثیت کو مدنظر نہ رکھتے ہوئے اِس صورتِ حال سے دوچار کردیا۔ میں تمہارے باپ کا نمک خوار ہوں مگر سردار سائیں کے دیرینہ مخالف چوہدری امتیاز رفیق نے اتنا مضبوط ہاتھ ڈالا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں کرسکتا۔''

شہاب نے چونک کر اُسے دیکھا، بولا۔ ''تم کون ہو؟''

''میرا نام صادق حسین ہے۔ اِسی علاقے کا رہنے والا ہوں۔ تمہیں اور اِس لڑکی کو گرفتار کرنے اور مقدمہ بنا کر عدالت میں پیش کرنے کے احکامات اوپر سے جاری کیے گئے ہیں اِس لیے یہاں کی تمام انتظامیہ بے بس ہے۔ کاش! میں تمہارے لیے کچھ کرسکتا۔'' صادق حسین نامی باریش اہلکار نے مایوسی سے کہا۔

مصباح نے اُس کے لہجے میں خلوص اور ہمدردی کو محسوس کرتے ہوئے منت آمیز لہجے میں کہا۔ ''انکل! خدا کے لیے کچھ کیجیے ورنہ میں جیتے جی مرجاؤں گی۔ میرے گھر والے بھی زندہ نہیں رہ پائیں گے۔''

صادق حسین نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ ''یہاں سے نکلنے کی کوئی ترکیب نہیں ہے۔ سیکیورٹی خاصی سخت ہے۔ پرندہ بھی پر مارنے کی غلطی کرتا ہے تو اُس کی گردن ماردی جاتی ہے۔ تمہیں اگر کمرے سے نکال بھی دوں تو تم دونوں گولیوں کا نشانہ بن جاؤ گے۔'' وہ اُن کے قریب ہی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اپنی ڈاڑھی میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ مصباح نے دیکھا کہ وہ واقعی اُن کے لیے خاصا پریشان تھا۔

شہابؔ چوہدری امتیاز رفیق کی اِس سازش کے بارے میں اُسے کریدتا رہا مگر صادق حسین کو محض اتنا ہی معلوم تھا جتنا وہ پہلے ہی بتا چکا تھا۔ تینوں سر جوڑ کر باہر نکلنے کی ترکیب سوچنے لگے۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایسے میں صادق حسین کے چہرے پر خوشی کا عکس لہرایا اور اُس نے دبے دبے جوش میں کہا۔ ''ایک زبردست آئیڈیا سوجھا ہے۔ نہ جانے تم لوگ اس پر عمل پیرا ہوگے یا نہیں۔''

مصباح نے جلدی سے پوچھا۔ ''وہ کیا؟''

''تم پر جو کیس بنایا جارہا ہے اُس کا ایک ہی جواب ہوسکتا ہے کہ تم دونوں اپنا نکاح نامہ پیش کردو۔ چونکہ تمہاری اُبھی تک شادی نہیں ہوئی، اِس لیے تم ایسا نہیں کرسکو گے اور قانونی موشگافیوں میں اُلجھتے چلے جاؤ گے۔ میں نے یہ ترکیب سوچی ہے کہ آفیسر اور اُس کے ساتھیوں کے آنے سے پہلے پہلے اگر تم لوگوں کا نکاح ہوجائے، رجسٹر میں اندراج ہوجائے تو تمہاری جان چھوٹ سکتی ہے۔ نکاح نامے کی کاپی دیکھ کر وہ تمہیں عدالت میں لے کر جانے کی غلطی نہیں کریں گے۔'' صادق حسین نے شہاب خان کے کانوں کے قریب کھسر پھسر کی۔ آواز اتنی بلند تھی کہ مصباح بھی بہ آسانی سن رہی تھی۔ شہاب نے حیرت سے پوچھا۔

''نکاح کیسے ہوسکتا ہے۔ اتنی سی دیر میں؟''

صادق حسین نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے انگلی پر انگوٹھے کی مخصوص حرکت سے واضح کیا کہ پیسا ہر مرض کی دوا ہوتا ہے۔ شہاب نے دریافت کیا۔ ''کتنے پیسوں سے کام چل جائے گا؟''

''پانچ دس ہزار روپے تو نکاح رجسٹرار بٹور لے گا۔ یہاں موجود عملے کا منہ بھی بند کرنا ہوگا۔ میری خیر ہے، میں تو تمہارے خاندان کا پرانا نمک خوار ہوں اور سردار ارباب خان نے آج تک میرا حق نہیں رکھا بلکہ میری سوچ سے زیادہ دیا ہے۔'' صادق حسین کے لہجے میں خاصی پختگی تھی۔ ''ہیڈکوارٹر کی عمارت کے عقب میں ایک بوڑھا نکاح رجسٹرار رہتا ہے۔ کہو تو اُسے بلا لیتا ہوں۔ وہ اپنے رجسٹر سمیت یہاں آئے گا اور تم دونوں کا نکاح پڑھا دے گا۔ میں باہر جا کر چند معزز لوگوں کی گواہی ڈال کر کام پکا کردوں گا۔ اُن کے آنے سے پہلے تمہارے ہاتھ میں نکاح فارم کا ایک پرت موجود ہوگا جو ہیڈکوارٹر سے باعزت نکلنے کا پروانہ ثابت ہوگا۔ میں دس پندرہ منٹ کے بعد آتا ہوں، تم دونوں صلاح و مشورہ کرلو۔ بعد میں نہ کہنا کہ صادق حسین نے کوئی مدد نہیں کی۔''

وہ اُنہیں سمجھاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ جاتے ہوئے کمرے کو مقفل کرنا نہیں بھولا تھا۔ شہاب نے شرمساری سے مصباح کی طرف دیکھا۔ کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ مصباح بولی۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟ جو بھی کرنا ہے، جلد کرو اور یہاں سے نکلو ورنہ میں پاگل ہوجاؤں گی۔''

شہاب نے کچھ کہنے میں تامل کیا تو وہ بہ مشکل خود پر قابو پا کر بولی۔ ''کیا اُس نے جو کچھ کہا ہے، وہ قابلِ عمل ہے؟''

''قابلِ عمل تو ہے مگر......''

''اگر مگر نہ کرو کیونکہ ہمارے پاس کرگزرنے کا وقت کم ہے۔ اُس کی بات مانو اور یہاں سے نکلنے کی سوچو۔'' مصباح نے جلدی سے کہا۔

''مگر مصباح! یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم اتنے اچھے کام کو یوں چوروں کی طرح سرانجام دیں۔ نکاح بچوں کا کھیل نہیں ہے۔'' شہاب نے تذبذب آمیز لہجے میں کہا۔

''تو کیا خود کو تماشا بنانے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' مصباح نے تلخی سے کہا۔ ''تم مرد ہو، تمہارے بدن پر بدنامی گرد کی طرح پڑے گی۔ میرے بدن پر زخم کے نشان کی طرح ہمیشہ کے لیے چپک جائے گی۔ تمہیں اگر اِس طرح میرے ساتھ نکاح پڑھوانے پر اعتراض ہے تو خوشی مجھے بھی نہیں ہے۔ بے شک یہاں سے نکلتے ہی طلاق دے دینا، مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔'' مصباح کا پارہ چڑھنے لگا تھا۔ اُسے یہاں سے نکلنے کا ایک راستہ سجھائی دیا تھا، بھلے وہ راستہ موت کی کھائی سے گزر کر ہی باہر نکلتا، وہ کود جانا چاہتی تھی۔

شہاب نے بے بسی سے کندھے اُچکائے، بولا۔ ''تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں ورنہ......''

مصباح نے اُسے تند نگاہوں سے گھورا تو وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ چند منٹوں کے بعد صادق حسین نے قفل کھول کر اندر جھانکا، سوالیہ نگاہوں سے پوچھا۔ شہاب نے کہا۔ ''تم اُس نکاح رجسٹرار کو یہاں لے آؤ۔ کوئی قانونی سقم نہیں رہنا چاہیے اور ہاں! سردست میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔ باہر نکلتے ہی تمہارا منہ نوٹوں سے بھر دوں گا۔ کیا مجھ پر اعتماد کرتے ہو؟''

اُس نے باچھیں چیر کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم بیٹوں کے برابر ہو، باپ برابر شخص کو دھوکا دے کر کہاں تک جا سکو گے؟ میں نے تمہیں بتایا ناں کہ تمہارے باپ کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں، مجھے پیسوں کی فکر نہیں ہے، تمہارے مستقبل کی فکر ہے۔''

وہ دروازہ مقفل کرکے چلا گیا۔ شہاب نے آہ بھر کر مصباح کی طرف دیکھا۔ بڑبڑایا۔ ''ہمارا نکاح یوں ہوگا، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ میں تو چاہتا تھا کہ ہم جب ایک لڑی میں دو موتیوں کی طرح پروئے جائیں تو دُنیا اُس خوبصورت لمحے کا نظارہ کرے اور ہر وجود رقص کی تال پر تھرکتا ہوا پاگل ہونے کو آجائے۔ مبارک باد کے شور میں، میں تمہیں اپنے دل میں ہمیشہ کے لیے بسالوں...... آہ! نہ جانے قسمت نے یہ کھیل کیونکر میرے ساتھ کھیلا؟''

مصباح نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ سر جھکا کر بیٹھی رہی۔

نصف گھنٹے کے بعد صادق حسین بوڑھے نکاح رجسٹرار کو لے کر آگیا۔ دونوں کا نکاح پڑھانے اور دستخط لینے کے بعد اپنا رجسٹر سمیٹ کر رخصت ہوگیا۔ اُس کے جانے کے بعد دونوں ایک دوسرے سے آنکھیں چراتے رہے، کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہتے رہے پھر جب گواہوں اور وکیلوں کے دستخطوں سمیت نکاح نامہ اُن تک پہنچا تو دونوں کے اندیشوں بھرے دلوں کو یقین آگیا کہ وہ اَب دو الگ وجود نہیں رہے، ایک ہوگئے ہیں۔ دُنیا ایسی ہی ہے۔ اگر کوئی جدائی پر خوش ہو تو اُسے تکلیف دہ وصال کا تحفہ دیتی ہے۔ اگر کوئی وصال کی خواہش میں تڑپنے لگے تو اُسے فراق کا لمبا چغہ اوڑھا دیتی ہے۔ یہ سوچنا بھی بڑا عجیب لگتا ہے کہ دُنیا کی بے ثباتی نے اُنہیں ایک وجود میں ڈھال دیا ہے۔

مصباح نے روتے ہوئے کہا۔ ''قسمت پھوٹ جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ تمہاری مرضی پر اپنا آپ دکھانے کے لیے تمہارے ساتھ آئی تھی، اپنی مرضی کے بغیر اپنا آپ گنوا بیٹھی ہوں۔ کیا شادیاں ایسے بھی ہوتی ہیں؟''

شہاب نے آنکھیں چُرالیں۔ دل میں تاسف بھر گیا۔ جس ہستی کو زندگی کے پل پل میں آسودہ رکھنے کا عزم رکھتا تھا، اُس کی زندگی میں ہمیشہ چبھنے والا نیزہ اُسی کے ہاتھوں نے رکھ دیا تھا۔ سر جھکا کر بولا۔ ''کاش! یہ سب کچھ کسی اور انداز میں سرانجام پاتا۔''

مصباح نے کانپتے ہاتھوں میں تھاما ہوا نکاح نامہ اُس کی جھولی میں پھینکتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری ضد نے مجھے اِس عذاب سے گزارا ہے۔ میں شاید کبھی اِس نکاح کو قبول نہ کرپاؤں کیونکہ اِس پر نہ تو میرے کسی بھائی کے دستخط ہیں اور نہ پاپا کے۔ میری مما نے اجازت نہیں دی، یہ بوگس ہے...... یہ محض مجبوری کا سودا ہے جو اِس بدنامی کے چنگل سے نکلنے کے لیے طے پایا ہے۔ میں یہ اُمید رکھتی ہوں کہ یہاں سے نکلنے کے بعد تم اِس معاہدے کو بھول جاؤ گے۔''

شہاب نے چونک کر اُسے دیکھا۔ وہ جو کہہ رہی تھی، اُس کے چہرے سے بھی وہی کچھ عیاں تھا۔ اپنی محنت کو اکارت جاتے دیکھ کر وہ پچھتانے لگا۔ یہی بات فرخ نے اُسے قبل از وقت کہی تھی۔ سب کچھ پا کر بھی خالی دامن رہنا بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے، کچھ ایسا ہی احساس شہاب کو ہورہا تھا۔ معاملے کی سنگینی دور کرنے کے لیے بولا ''تم جو بھی کہو گی، مانوں گا، مگر پلیز! یہاں سے نکلنے تک کوئی فیصلہ مت کرو۔''

''شہاب! کیا تم......''

اچانک فائر کی دہشت ناک آواز گونجی۔ فائر کہیں قریب

میں ہی ہوا تھا۔ فائر کے ساتھ ہی انسانی چیخ نے دونوں کے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ اُبھی وہ دہشت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے کہ ایک زوردار آواز کے ساتھ دروازہ کھلا۔ دونوں گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کھلے دروازے میں تین ہٹے کٹے افراد ہاتھوں میں کلاشن کوفیں تھامے کھڑے تھے۔ اُن کے چہرے کپڑے کے روایتی ڈھاٹے میں چھپے ہوئے تھے جبکہ خون آشام نگاہیں اُن پر جمی ہوئی تھیں۔ مصباح کے حلق سے چیخ برآمد ہوئی اور وہ شہاب سے لپٹ کر کانپنے لگی۔ شہاب کا ساکت بدن بے سانس ہوا جا رہا تھا۔ موقعے کی نزاکت کو پوری طرح نہ سمجھ پانے کے باوجود بہت کچھ سمجھ رہا تھا۔ آنے والے کسی اچھے ارادے سے نہیں آئے تھے۔ کھلے دروازے سے اُن تینوں کے عقب میں کئی افراد کھڑے دکھائی دیے۔ حلیوں سے وہ اُنہی کے ساتھی معلوم ہوتے تھے۔

دو ڈھاٹا پوشوں نے شہاب کو کھینچ کر علیحدہ کر لیا اور اُس پر ٹھڈوں اور لاتوں کی بارش کر دی، جبکہ تیسرے نے لرزتی کانپتی مصباح کا ہاتھ تھاما اور اُسے گھسیٹتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ اتنی ڈر گئی تھی کہ اُس کے منہ سے کوشش کے باوجود کوئی آواز برآمد نہیں ہو رہی تھی۔ بری طرح گھسٹتی ہوئی کمرے سے نکلی تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ چند ہی لمحوں میں اُس کے دل پر عجیب سی کیفیت بیت گئی۔ یہ کوئی سرکاری عمارت نہیں تھی بلکہ عام سی حویلی تھی۔ ایسی اَن گنت حویلیاں زرعی علاقوں میں جابجا دیکھی جاسکتی تھیں۔ آن کی آن میں وہ سمجھ گئی کہ اُسے کسی سرکاری ادارے نے نہیں، شہاب کے دوستوں یا دشمنوں نے اغوا کیا تھا۔

ہاتھ سختی سے پکڑ کر گھسیٹنے والا اُسے حویلی سے باہر لے جا رہا تھا مگر وہ بغیر کسی مزاحمت کے گردن موڑے حویلی کو دیکھ رہی تھی۔ اچانک جیسے ذہن نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ صحن کے عین وسط میں صادق حسین کی خون سے تر لاش پڑی تھی۔ اُس کی ڈاڑھی اُس کی لاش سے چند فٹ کے فاصلے پر زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ آنِ واحد میں مصباح پر عقدہ کھل گیا کہ صادق حسین نے دھوکا دینے کے لیے اپنے کلین شیو چہرے پر مصنوعی ڈاڑھی بڑی مہارت سے چپکا رکھی تھی۔

وہ حلق کے بل پوری قوت سے چیخی۔ چہرے پر پڑنے والے زوردار تھپڑ نے اُس کا منہ بند کر دیا۔ بری طرح لہرائی اور گرفت میں جکڑے ہونے کے باوجود زمیں بوس ہو گئی۔ ڈھاٹا پوش کا پستہ قامت ساتھی بھاگ کر قریب آیا۔ دونوں نے مل کر اُسے اُٹھایا اور حویلی کے دروازے پر کھڑی بغیر نمبر پلیٹ والی فور ویل جیپ کی پچھلی نشست پر ڈال دیا۔ ایک ڈھاٹا پوش اُس کے ساتھ سیٹ پر بیٹھ گیا جبکہ دوسرا تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا حویلی کے اندر چلا گیا۔ چند ہی منٹوں کے بعد سبھی دوڑتے ہوئے باہر آئے اور بڑی مستعدی سے جیپ میں سوار ہو کر جس طرف سے آئے تھے، اُس طرف روانہ ہو گئے۔

اٹیچڈ باتھ والے کمرے کے فرش پر شہاب زخمی حالت میں آڑا ترچھا بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اُس کے ترتیب دیے گئے بے داغ منصوبے کا انجام اِس قدر بھیانک اور خون آلود بھی ہو سکتا ہے۔

✿✿✿

مقدر سو جائے تو انسان کا جاگنا یا سونا ایک برابر ہوتا ہے۔ وہ جانے کب تک بے ہوشی کی نیند سوئی رہی، جاگی تو خود کو کمرے میں اکلوتی بان کی چارپائی پر بندھی ہوئی حالت میں پایا۔ وہ گردن گھما کر ارد گرد دیکھ سکتی تھی مگر اُسے جس کمرے میں رکھا گیا تھا اُس میں سوائے ایک کھلی کھڑکی اور بند دروازے کے، کچھ تھا ہی نہیں جسے وہ لالٹین کی زرد بیمار روشنی میں دیکھتی۔ کھڑکی کی فولادی سلاخوں کے باہر اندھیرے کی سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ پُرمصائب حالات کا شکار ہونے کے سبب اُس کے اعصاب مکمل طور پر جواب دے چکے تھے۔ بہت دیر سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا جس وجہ سے جسم پر نقاہت طاری تھی۔ سر کو دائیں بائیں حرکت دینے پر سر میں اُٹھنے والی درد کی ٹیسوں نے اُسے کراہنے پر مجبور کر دیا۔

غیر اختیاری طور پر اُس نے رسی کی بندشوں سے آزاد ہونے کی کوشش کی۔ ناکامی پر جھنجلانے کے بجائے مایوس ہو کر رونے لگی۔ رفتہ رفتہ یاد آنے لگا۔ وہ جن حالات سے گزر کر یہاں تک پہنچی تھی، وہ ہر پہلو سے تکلیف دہ تھے۔ خود پر لعنت ملامت کرنے لگی۔ اُس نے شہاب کو سمجھنے میں بہت بھیانک غلطی کر لی تھی۔

اُسے احساس ہو چکا تھا کہ اُس کے خاندان کا وقار خاک میں مل چکا ہے۔ اُس کی محبت نے اُس کے بھائیوں کی گردن میں سے اکڑ نکال دی تھی۔ نہ جانے پاپا اور ماما کس حال میں ہوں گے؟ وہ ایک طویل آہ بھر کر یہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچنے لگی۔ اُسے یہ اندازہ تو تھا کہ جن لوگوں نے صادق حسین کو قتل کرنے اور شہاب کو بے دریغ مارنے پیٹنے کے بعد اٹھا کر اُسے یہاں پہنچایا تھا، اُسے یوں مہارت سے باندھا تھا، وہ اُسے بہ آسانی یہاں سے جانے نہیں دیں

گے۔ وہ تعلیم یافتہ تھی، نادان نہیں تھی کہ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی خوبصورت اور جوان لڑکی کے اغوا کا سبب نہ جان پاتی...... سوائے اُس کی جوانی سے حظ اُٹھانے کے یوں سفاکانہ انداز میں اغوا کے پیچھے کوئی مقصد کارفرما نہیں تھا۔

کافی دیر گزر گئی۔ پیاس کے مارے بُرا حال ہو گیا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمنے لگیں۔ حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔ بے بسی سے لکڑیوں کی بنی چھت کو گھورتے ہوئے خدا سے مدد مانگتی رہی۔ اپنی غلطی کی معافی مانگتی رہی۔ مدد نہیں آئی، روم روم سے جان نکالنے والے ڈراؤنی شکلوں والے شیطان آن وارد ہوئے۔ وہ تعداد میں تین تھے۔ اُنہیں دیکھ کر مصباح کے حلق سے دہشت کے مارے چیخ نکل گئی۔ وہ سہمی ہوئی نگاہوں سے اُنہیں دیکھتے ہوئے کانپتی رہی۔ تینوں کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ دیہاتی طرز کے تہبند اور بنیان پہنے ہوئے انسان نہیں، دیو دکھائی دے رہے تھے۔ ایک نے آگے بڑھ کر اُس کی رسیاں کھولیں، دوسرے نے کوئی مہلت دیے بغیر اُسے دبوچ لیا۔ آن کی آن میں اُس کے بدن کو چھپانے والا لباس تار تار ہو گیا۔ پہلے اُس کی زبان گنگ رہی، پھر وہ چیخ پڑی۔ منت ساجت، اللہ نبی کے واسطے، رحم کی التجائیں، سب کچھ اکارت گیا۔ جوانی بھرا اپنے ایک ایک عضو کو غیر معمولی نفاست سے سنبھال کر رکھنے والی درندوں کے پنجوں اور نوکیلے دانتوں کی زد میں کٹ چھل رہی تھی، تڑپ رہی تھی، مچل رہی تھی مگر......

بے ہوش ہوئی تو اُس پر پانی کا جگ انڈیل کر ہوش میں کھینچ لایا گیا۔ کچھ پانی بدن پر پڑا، کچھ چہرے پر اور کچھ منہ میں ٹپکا۔ سیاہ فام اور بدہیئت درندے نے جگ اُس کے منہ سے لگا دیا۔ وہ بچا کھچا پانی پاگلوں کی طرح غٹا غٹ پی گئی۔ پانی بدن میں پہنچ کر تیزاب کی طرح کاٹنے لگا، باہر گستاخ اور ہوس آلود ہاتھ انگاروں کی طرح بدن داغنے لگے۔ قیامت بن کر گزرنے والے ایک گھنٹے میں وہ نہ جانے کتنی بار بے ہوش ہوئی، کتنی بار ہوش میں لائی گئی۔ پھر قیامت کی آگ ایک لمحے پر آ کر ٹھہر گئی۔

وہ چلے گئے۔ دو اور آ گئے۔ اُن میں سے ایک کو چنگیزی ترس آیا۔ اُس نے باسی روٹی اور ٹھنڈا سالن لا کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔ توے کی پھولوں والی روٹی پر ناک بھوں چڑھانے والی ندیدوں کی طرح کچی پکی روٹی پر جھپٹ پڑی۔ ایک لقمہ اندر پہنچا، یوں لگا جیسے دم باہر نکلنے کو حدیں پھاڑنے پر تل گیا ہو۔ اُسے بہت زور کی کھانسی آئی۔ جو کھایا تھا، قے کے ساتھ نکل گیا۔ ترس کھانے والے کو اپنے کیے پر ندامت ہوئی۔ پانی کی بالٹی بھر کر لایا۔ اُس کے کٹے پھٹے بدن اور چارپائی کے بان کو قے کی غلاظت سے صاف کرنے لگا۔ پھر اُسے کچھ یاد نہیں رہا...... ایک بھیانک خواب کی طرح کتے اُسے بھنبھوڑتے رہے، بدن پر بے داغ جلد تلاش کرتے رہے، خون آلود دانتوں سے کاٹتے رہے۔ وہ خواب میں ہی چیختی رہی، مدد کے لیے پکارتی رہی مگر اِس ویرانے میں اُس کی مدد کے لیے کوئی پہنچنے والا نہیں تھا۔

ایسی رات کو صبح کا اجالا نصیب نہیں ہوتا مگر اُس کی پھیلی پھیلی بے جان آنکھیں کھڑکی سے جھانکتی کرنوں کو دیکھ رہی تھیں۔ ذہن بالکل خالی تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ زندہ نہیں ہے، اُس کا کوئی احساس بھی زندہ نہیں ہے اور جو کچھ ہے وہ بھی حقیقت میں عدم ہے......

اُس نے کہنیوں کے بل اُٹھنا چاہا۔ اُٹھ نہ پائی۔ عضو عضو پھوڑا بنا ہوا تھا۔ اُس کے منہ سے غیر ارادی طور پر ایک تسلسل سے کراہیں خارج ہو رہی تھیں حالانکہ وہ خاموش رہنا چاہتی تھی۔ ایسے میں سینے پر کہیں ٹیس جاگی۔ اُس نے داہنا ہاتھ سینے پر رکھا۔ عریانی کے احساس نے جگر کاٹ کر رکھ دیا۔ ہاتھ تھکے ہارے جواری کی طرح ہر روندی ہوئی جگہ کو ٹٹول کر محسوس کرتا رہا، آنکھ ہر تباہی پر اشک بہاتی رہی اور دماغ قسمت کی لکیروں پر بیٹھ کر سینہ کوبی کرتا رہا۔

چوپٹ کھلے دروازے کے باہر صحن میں کئی مرد متحرک تھے۔ کوئی گن صاف کر رہا تھا، کوئی کپڑے دھونے میں مصروف تھا تو کوئی چولھے پر بیٹھا ہوا تھا۔ جابجا مختلف نوعیت کا اسلحہ پڑا دکھائی دے رہا تھا۔ صحن کے پار، کچی دیوار کے اوپر درختوں کی جھالر دکھائی دے رہی تھی اور فضا میں عجیب نامانوس سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ سمجھ میں نہ آنے والا شور بھی سماعت پر گراں گزر رہا تھا۔ اُسے کچھ بجھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کس جہنم کدے میں بیٹھی اپنی تضحیک کا ماتم کر رہی ہے۔

کمرے میں مچھروں کی بھی بہتات تھی جنہوں نے اُس کے برہنہ بدن پر جابجا بیٹھ کر فراغت سے اپنی پیاس بجھائی تھی۔ جانے پھر کیا ہوا کہ اُس کی آنکھیں پتھرا سی گئیں، جسم سُن ہو گیا اور یوں لگا جیسے وہ بے بدن، بے وزن ہواؤں میں اڑتی پھرتی ہے۔ وہ اُٹھی۔ کئی مردوں کی موجودگی میں ننگے پنڈے دیوار کا سہارا لیتے ہوئے کھلے صحن میں آئی۔ آخری گوشے میں بنے ناپختہ ٹوائلٹ تک گئی۔ نکلنے لگی تو لہرا کر گر گئی۔ ایک درندہ لپک کر قریب آیا۔ بانہوں میں بھر کر ٹکلے تک لایا۔ بچپن میں ماں نہلایا کرتی تھی، جوانی میں کتوں کے خونی پنجے غسل دے رہے تھے۔ اُس کی چیخیں

بے آواز تھیں۔ ''ہائے آسمان! تو ٹوٹ کر اس دھرتی کے جیالوں پر گر کیوں نہیں جاتا؟...... اے زمین! تو پھٹ کر انسانیت کو نگل کیوں نہیں جاتی؟...... یا میں، بھاگوں جلی مر کیوں نہیں جاتی؟''

گرمیوں کے لمبے دن کی طویل قیامت گزرنے پر اُس کا چہرہ بھیانک ہوگیا۔ ڈراؤنا ہوگیا۔ اگر ایسی حالت میں آئینہ دیکھتی تو یقیناً پاگل ہوجاتی۔ مچھروں کے کاٹے نے اپنا کام دکھانا شروع کردیا تھا۔ دُنیا کے ہر ذائقے کو بھول جانے والا منہ کڑوا ہونے لگا۔ جسم میں بھری جانے والی آگ بھی اپنا کام دکھانے لگی۔ بدن چولھا بن گیا۔ لالٹین روشن ہونے تک اُس کی حالت خاصی خراب ہوگئی تھی۔ سانسیں تنور سے نکلتی تپش زدہ ہواؤں کے تھپیڑے بن گئیں۔ کون نوچ رہا ہے، کون توڑ رہا ہے، وہ ہر فکر سے لحہ بہ لحہ غافل ہوتی جاتی تھی۔ ایسے میں ڈاکوؤں کے سردار کو اُس پر رحم آگیا۔ اُس کی کلائی پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''اَبے جاہلو! اِسے تو بہت تیز بخار چڑھا ہوا ہے۔''

ایک دیو پھنکارا۔ ''تو ہم کیا کریں؟ کیا ہم نے ڈاکٹری کی دکان کھول رکھی ہے جو اس کا علاج معالجہ شروع کردیں۔''

''یہ مرجائے گی۔''

کمرے کے باہر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ کسی نے پاٹ دار آواز میں کہا۔ ''مرنے والی ہوتی تو صبح ہونے سے پہلے ہی مرجاتی۔ جو اتنے مردوں میں ایک دِن اور ایک رات گزار چکی ہے اور اَبھی تک مری نہیں، وہ کبھی نہیں مرے گی۔ تم لوگ فکر نہ کرو۔''

کئی قہقہوں نے اُس کی بات کی تائید کی۔ وہ پاگلوں کی طرح کئی ہنستے چہروں کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگی۔ لبوں کے گوشوں سے رال بہنے لگی، آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں مگر کوئی اشک رخساروں تک نہیں پہنچا۔

سردار نے ڈپٹ کر سب کو چپ کرایا۔ اُس کے چہرے پر چند لمحے نظریں جمائے کھڑا رہا پھر بولا۔ ''اِسے مٹھوں کا جوس پلاؤ، بچ جائے تو ٹھیک ورنہ ساگر میں پھینک دینا۔ اور ہاں خبردار! اَب کوئی اِس کے نزدیک نہ جائے۔''

باہر سے کسی نے قہقہہ لگا کر مقامی زبان میں کہا۔ ''شیرے گرمانی نے اسے پہچان لیا ہے۔ لگے ہاتھوں ہم غریبوں کو بھی بتادے سردار! یہ تمہاری کیا لگتی ہے؟''

''بکواس بند کرو ورنہ سینے میں گولی اُتار دوں گا۔'' سردار نے غرا کر کہا اور ہاتھ تنبیہی انداز میں اُٹھا کر اکڑتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

وہ چارپائی میں بیٹھی خالی الذہنی کی کیفیت میں ڈوب کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ قدرت نے اُس کے گالوں میں دو ننھے ننھے گڑھے بنائے تھے جنہیں دیکھ کر ہر نظر ٹھٹک کر اُن میں گرنے کو لپکتی تھی۔ درندوں نے جابہ جا گڑھے کھود ڈالے تھے جن کی موجودگی کا احساس بذاتِ خود مصباح کے لیے کراہت کا باعث بن گیا تھا۔

❁ ❁ ❁

اختیار والوں کی دُنیا کا چلن مختلف ہوتا ہے۔ وہ بھی اختیار والا تھا۔ دراز دست ہر وقت ضلعی بساط پر اپنی دسترس قائم رکھتے تھے۔ اُس کے لمبے ہاتھوں نے دور تک پھیلی فساد کی جڑ کو کھینچ کر اُس تک پہنچا دیا تھا۔ مہروں کو پٹنے کے لیے تھانے کی حوالات میں قید کردیا تھا۔ مرکزی تھانے کا ایس ایچ او اپنی فورس کے ساتھ دریائے سندھ کے قریب واقع حویلی سے صادق حسین کی لاش اُٹھا لایا تھا۔ شہاب کو بھی اُسی گاڑی میں لایا گیا تھا جبکہ فرخ اور بابر کو جعلی وردیوں سمیت پولیس کی دوسری ٹیم نے گرفتار کیا تھا جو اِس وقت تھانے کی حوالات میں اپنے ساتھی رضی الدین، جس پر اُنہوں نے صادق حسین کا عارضی لیبل چسپاں کیا تھا، کے قتل کے الزام میں تفتیش کا عذاب بھگت رہے تھے۔ شہاب اپنی خواب گاہ میں فیملی ڈاکٹر کے زیرِ علاج پڑا تھا۔ قانون کی نظر میں وہ معصوم تھا۔

ہوش میں آتے ہی اُٹھ کر اردگرد دیکھنے لگا۔ پریشان ہوگیا، کہاں تھا، کہاں آگیا تھا؟ سوچنے پر سر میں درد ہونے لگا۔ بیڈ سے اُترنا چاہا تو نگہداشت پر مامور ملازمین نے سمجھا دیا کہ وہ اپنے گھر میں ہونے کے باوجود قید میں ہے۔ صرف اپنے باپ کی اجازت سے کمرے سے نکل سکتا ہے۔ ملازمین باہر جاتے تو دروازے کو باہر سے مقفل کردیتے۔ وہ گھبرا گیا۔ جونہی پوری طرح بیتے لمحات کی سنگینی کھلی تو کمرے کی فضا میں آکسیجن کم ہوتی محسوس ہونے لگی۔ اُس نے کھڑکی کھولی۔ وہ سیکنڈ فلور پر کھڑا تھا۔ نیچے چھلانگ لگانے کا مطلب بخوبی جانتا تھا مگر وہ رہ نہ سکا اور کھڑکی سے مرمریں فرش پر کود گیا۔

چھلانگ لگانے کا پہلا تجربہ ہی بھیانک ثابت ہوا۔ کودنے کے فوری بعد اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور کولہے کے بل فرش پر آن گرا۔ حلق سے تیز چیخ برآمد ہوئی اور وہ دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا نہ ہوسکا۔ ملازمین بھاگ کر اُس تک پہنچے۔ سنبھالا، اُٹھایا، دیکھا تو ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ آن کی آن میں گھر میں شور بپا ہوگیا۔ سردار ارباب خان کو

مطلع کیا گیا۔ ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر اسپتال کی ایمبولینس سردار کے پہنچنے سے پہلے پہنچ گئی۔ اُسے فوری طور پر اسپتال شفٹ کیا گیا جہاں ابتدائی طبی امداد دینے کے بعد اُسی ایمبولینس میں ملتان روانہ کردیا گیا۔ شام کو ہوش آیا، باپ کو دیکھ کر منہ پھیر کر بولا۔ ''بابا! آپ نے اچھا نہیں کیا؟''

''اللہ کا شکر ہے بیٹا! تمہیں ہوش آگیا۔ تمہاری ہڈی بھی بالکل ٹھیک جڑ گئی ہے۔'' سردار نے اُس کی بات کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر کہتے ہیں کہ یہ پلاسٹر ڈیڑھ ماہ کے بعد جب کاٹا جائے گا تو تمہاری ٹانگ بالکل ٹھیک ہوچکی ہوگی۔''

وہ بولا۔ ''مجھے اپنی ٹانگ کی پروا نہیں، مصباح اور میرے دوست کہاں ہیں؟''

باپ نے نظریں چرا لیں۔ پیٹھ کرکے کھڑا ہوگیا۔ ''تم اُن لوگوں کو یاد نہ کرو تو بہتر ہے۔ سنا ہے کہ فرخ اور بابر نے اپنے دوست رضی الدین کو قتل کردیا ہے۔ رضی کے گھر میں قیامت اُتری ہوئی ہے، دونوں قاتلوں کے گھروں کا چولھا بھی بجھا ہوا ہے۔''

وہ بے یقینی سے باپ کو دیکھنے لگا۔ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اُس کا باپ اُسے کیا کہہ رہا تھا۔ سردار پلٹ کر اُس کے قریب آگیا۔ بازو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''تم اپنی بے وقوفی کے باعث بہت بڑی مصیبت میں پھنس چکے تھے۔ اگر میں فوری طور پر معاملے کو سنبھال نہ لیتا تو تم بہت بری طرح قانون کی گرفت میں آجاتے۔ مصباح کا بھائی اور اُس کے تین چار کزنز کتوں کی طرح تمہاری بُو سونگھتے پھرتے ہیں۔ تمہیں رضی الدین کی لاش پر سے اُٹھایا گیا تھا۔ تم پر براہِ راست قتل کا مقدمہ بن جاتا۔''

''رضی کو کس نے قتل کیا؟'' یہ سن کر اُس کا دماغ پھٹنے کو تھا۔

''یہ تو تمہیں علم ہونا چاہیے، میں کیا کہہ سکتا ہوں؟'' سردار نے بے پروائی سے کہا۔ ''پولیس نے ایف آئی آر میں رضی کا قتل تمہارے دونوں دوستوں کے کھاتے میں ڈال دیا ہے۔ تفتیش میں پتھر بھی بول پڑتے ہیں، وہ بھی بول پڑیں گے۔ تمہارا نام بار بار لیں گے، تھانیدار بار بار تمہارے نام کو ہوا میں تحلیل کرتا رہے گا، لاکھوں روپے ڈکارتا رہے گا۔ تم نے اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی پھنسا دیا ہے بے وقوف لڑکے!''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے سخت لہجے میں بولا۔ ''بابر اور فرخ اُسے قتل نہیں کرسکتے بابا!''

بابا نے کندھے اُچکائے۔ ''یہ پولیس کا دردِ سر ہے، میرا یا تمہارا نہیں۔''

''مصباح کہاں ہے؟''

''میں نے کہا ناں کہ اِن باتوں کا مجھے کوئی علم نہیں، صرف تمہیں علم ہے اور میں پوچھنا ضروری خیال نہیں کرتا۔''

شہاب نے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ لہجے میں سانپ کی پھنکار اُبھر آئی۔ ''بابا! میں نے ایک کھیل کھیلا تھا۔ جونہی اپنے کھیل میں کامیاب ہوا، آپ کے کھلاڑی میدان میں اُتر آئے۔ مجھے مار پیٹ کر بے ہوش کرنے کے بعد وہ مصباح کو اُٹھا کر لے گئے، ممکن ہے جاتے ہوئے رضی کو بھی قتل کرگئے ہوں۔ اُس وقت بابر اقبال اور فرخ حویلی میں موجود نہیں تھے۔ پولیس نے اُنہیں کہاں سے گرفتار کیا؟ یہ آپ جانتے ہیں۔ مصباح کہاں ہے؟ آپ جانتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ مجھے فوراً مصباح تک پہنچا دیں یا اُسے یہاں لے آئیں، بابر اور فرخ کو رہائی دلوا دیں وگرنہ......''

''وگرنہ کیا؟'' بابا کی پیشانی پر اَن گنت بل پڑ گئے۔

''وہ ہوگا جو آپ نے زندگی بھر نہیں سوچا ہوگا۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔ ''مصباح میری محبوبہ نہیں رہی، میری بیوی بن چکی ہے، آپ کی بہو، جسے آپ نے کتوں کے آگے نچڑنے کے لیے پھینک دیا۔ کیا غیرت......''

بابا نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اردگرد دیکھا۔ اسپتال کے عملے کا کوئی بھی فرد موجود نہیں تھا۔ ملازمین ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ اُن کا ہونا یا نہ ہونا ایک برابر تھا۔ وہ بیڈ پر چاروں شانے چت لیٹے ہوئے جوان بیٹے کے کان پر جھکا، سلگتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں سمجھا رہا ہوں کہ اپنی زبان بند رکھو۔ میں نہیں جانتا کہ کون لوگ مصباح کو اُٹھا کر لے گئے ہیں۔ یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ زندہ ہے یا مرچکی ہے، ویسے بھی اغوا ہوجانے والی لڑکی سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں، تمہیں بھی نہیں ہونی چاہیے۔ تمہاری زبان پر آئندہ اُس کا نام نہیں آنا چاہیے ورنہ ہمارا پورا خاندان بدنامی کی لپیٹ میں آجائے گا۔ خاموش رہو گے تو تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔''

باپ ڈرا دھمکا کر چلا گیا۔ اسپتال کا پرائیویٹ روم اُس کے لیے قید خانہ بن گیا۔ اگلی صبح اُسے پتا چلا کہ اُسے لگنے والی چوٹ اُس کے باپ کے لیے رحمت ثابت ہوئی تھی۔ اُس نے سرٹیفکیٹ بنوا لیے جو کسی بھی عدالت میں بہ آسانی ثابت کرسکتے تھے کہ مصباح کے غیاب سے دو دِن پہلے اُس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹی تھی۔ سماج کی ہر نگاہ کو ماننا پڑے گا کہ ٹوٹی

If you want to download Urdu novels,Imran series, Monthly Digests,Shuaa,Kiran,Khwateen Digest,Suspense digest, Vist www.paksociety.com
if site is not opening send complaint at admin@paksociety.com
or at
0336-5557121

ہوئی ٹانگ کے ساتھ وہ کسی لڑکی کو اغوا نہیں کرسکتا تھا۔ مصباح کے بھائی وجدان نے اُس کے خلاف تھانے میں مصباح کے اغوا کی ایف آئی آر درج کرادی تھی۔ ملازمین نے بتایا کہ وجدان، مصباح کی تلاش میں پاگل ہوتا جارہا ہے اور کوئی بعید نہیں کہ سامنا ہونے پر اُسے گولی مارنے سے بھی دریغ نہ کرے۔

اُسے گولی کی پروا نہیں تھی، اُسے فرخ اور بابر کی بھی کچھ زیادہ پروا نہیں تھی، مگر مصباح کے لیے بے حد پریشان تھا۔ جب یاد آتی تو پھر جانے کا نام ہی نہ لیتی۔ اُسے گھسیٹ کر باہر لے جانے والے ڈھاٹا پوش کی شبیہہ اُس کے لاشعور میں ثبت ہوگئی تھی۔ اُسے کامل یقین تھا کہ حویلی میں اُن پر حملہ آور ہونے والے، مصباح کو اغوا کرنے اور رضی کو قتل کرنے والوں کا تعلق اُس کے بابا سے ہے۔ اُسے اپنے باپ کی ذہنیت پر افسوس ہونے لگا۔ اپنی ضد کو منوانے کے لیے اُس نے تین چار گھروں کو برباد کرڈالا تھا۔ اپنی بہو کو درندوں کے حوالے کردیا تھا۔ مصباح کے انجام کا سوچا تو دل بیٹھنے لگا۔ فرار کی کوشش میں ناکامی نے اُسے ہلنے جلنے سے قاصر کردیا تھا۔

بہت تیزی سے سوچنے کے باوجود یہاں سے نکلنے اور اپنے ساتھیوں سے رابطہ کرنے کی کوئی ترکیب سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ کسی ڈاکٹر یا عملے کے بندے کو اپنی مدد کے لیے آمادہ نہیں کرسکتا تھا کیونکہ اُس کے باپ کے زرخرید چوبیس گھنٹے چھوٹے سے پرائیویٹ روم میں موجود رہتے تھے۔ ویسے بھی کوئی دہکتی ہوئی آگ میں کودنا پسند نہیں کرتا۔ بابر، فرخ اور رضی جیسے لوگ ہی اُس کی خاطر آگ کے الاؤ میں کودنے پر تیار ہوگئے تھے۔ وہ باپ کی خودساختہ جنت میں قید ہوگیا، وہ دہکتے ہوئے تنور میں پھینک دیے گئے۔ رضی کی موت پر وہ کئی بار اشکبار ہوا تھا۔ اُس نے ایک دو مرتبہ اپنے ملازموں سے موبائل فون طلب کیا تھا جس پر معمر ملازم نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”چھوٹے مالک! ہم مجبور ہیں۔ آپ کے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔ سردار صاحب نے ہمیں سختی سے منع کررکھا ہے۔“

اُس کا دماغ پھٹنے کو آ گیا مگر کوئی کلید ہاتھ نہیں لگی۔ سردار ارباب خان نے ڈاکٹرز سے مشورہ کرنے کے بعد اُسے ملتان والی کوٹھی میں منتقل کردیا۔ انسانوں کی بھری دُنیا کے بیچ رہتے ہوئے اُسے بڑی مہارت سے تنہا کردیا گیا۔ اُس کا جسمانی علاج ہورہا تھا، ذہنی تناؤ سے صرفِ نظر برتا جارہا تھا۔ چند ہی دِنوں میں اُسے یقین ہوگیا کہ وہ اپنے بااختیار باپ کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ بے بسی کے مارے دل بھر آیا اور وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر عورتوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ چیخنے لگا۔ ”ہائے میری مصباح! تم کہاں ہو؟ دُنیا میں ایسا نکاح شاید کبھی نہ پڑھایا گیا ہوگا جس کا پرت ہاتھ میں آتے ہی دُلہن ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے اوجھل ہوجاتی ہو۔ اپنے پیروں پر چلنے کے قابل ہوجاؤں تو پلک جھپکتے میں تم تک پہنچ جاؤں گا، تب تک تم میرے پاس آنے کی کوشش کرو...... مجھے معاف کردو، میرے پاس چلی آؤ...... تمہارے بدن پر لگی ڈاکوؤں کے ہاتھوں کی میل کو اشکوں سے دھوڈالوں گا۔ ازالہ کردوں گا۔“

وہ شاید نہیں جانتا تھا کہ محبت میں روا رکھی گئی بربریت کا ازالہ زندگی نثار کردینے سے بھی نہیں ہوتا۔ اُس نے پوری قوت سے دائیں جانب والی دیوار پر مکا دے مارا۔ ہاتھ کو تکلیف نہیں ہوئی، ٹانگ میں درد کی ٹیس جاگ پڑی۔ وہ کراہا۔ دانت پیس کر پھر دیوار پر حملہ آور ہوگیا۔ چند ہی لمحوں میں پوری کوٹھی اُس کی چیخوں سے گونج اٹھی۔ ملازموں کے دوڑتے قدموں کی آوازوں نے ماحول کے تناؤ میں بے حد اضافہ کردیا۔

❁❁❁

بخار کسی بھی عمر میں چڑھے، بدن کو توڑ پھوڑ دیتا ہے۔ بدن توڑنے والا طبیعت پر ناگوار گزرتا ہے مگر اُس پر رحمت بن کر اُترا تھا۔ شام سے نصف رات تک وہ بخار کی حدت میں پھنکتی رہی اور کوئی اُس کے قریب نہیں آیا۔ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ اچھوت ہوگئی ہو۔ چارپائی سے اُترنے کی سکت بدن میں نہیں تھی۔ پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپتی رہی، سر پٹختے ہوئے کراہتی رہی مگر سننے والوں نے شاید کانوں میں روئی کے پھائے ٹھونس رکھے تھے۔

مسلسل سولی پر ٹنگے رہنے کے سبب وہ نڈھال تو پہلے ہی تھی، بخار نے غشی طاری کردی۔ سردار نے دروازے میں کھڑے ہوکر اُس کی حالت زار دیکھی۔ لالٹین کی زرد روشنی میں اُس کے چہرے پر چھائی ہوئی موت کی پیلاہٹ کو دیکھ کر اپنے ایک توانا اور جسیم ساتھی کو ہاتھ کے اشارے سے پاس بلایا۔ قریب آیا تو قدرے نیچی آواز میں بولا۔ ”مولا داد! اِسے اُٹھا کر ساگر میں پھینک دے۔ یہ مرنے والی ہے۔“

مولا داد نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ واپس گیا۔ لانگ شوز پہن کر کمرے میں آ گیا۔ سیلاب کے بعد جابجا سانپ دکھائی دینے لگتے تھے۔ رات کے اندھیرے میں چھپے ہوئے ناگ بہت خطرناک ثابت ہوتے تھے۔ مصباح کے عریاں وجود کو

بانہوں میں بھر کر اُٹھایا اور کندھے پر لاد لیا۔ اُس کی دونوں بانہیں اُس کے عقب میں بے جان انداز میں لہرانے لگیں۔

کمرے سے نکل کر سردار سے مخاطب ہوا ”سردار! پورے بدن سے آگ نکل رہی ہے۔“

”تبھی تو اِسے ٹھنڈا کرنے کے لیے دریا میں پھینکنے کا حکم دے رہا ہوں۔“

”سردار! یہ تو ظلم ہے۔“

”ہم لوگوں نے اَب تک اُس کے ساتھ جو کچھ کیا، وہ ظلم نہیں تھا؟“ سردار کے لہجے میں درشتی شامل ہوگئی۔

مولا داد نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ دیوار کے ساتھ پڑی کانٹے دار جھاڑیوں سے بچتا بچاتا ڈیرے سے باہر آگیا۔ کیچڑ اور گندے پانی کو عبور کرتے ہوئے اُسے دریا تک پہنچنے کے لیے ایک میل کا سفر طے کرنا تھا۔ اُس کی رفتار خاصی سست تھی۔ تھوڑی سی غلطی اُسے کسی بھی دلدلی گڑھے میں پھینک سکتی تھی۔ چونکہ بہت سالوں سے یہاں کی خاک چھانتا آیا تھا، اس لیے کہیں ٹھوکر کھا کر گرے بغیر گھنٹا بھر میں مطلوبہ جگہ کنارے پر پہنچ گیا۔

سفر طے ہوگیا تو کندھے پر لدے بوجھ کی جانب توجہ گئی۔ تپش خواہ جوانی کی ہو یا بخار کی، بے چین کرنے لگتی ہے۔ وہ بھی بے چینی محسوس کرنے لگا۔ اُسے کندھے سے اُتار کر ٹیلا نما ابھری ہوئی جگہ پر جال کے درخت کے نیچے ڈالا۔ یہاں کے باسیوں کا خیال ہے کہ جال کا درخت، درویش ہوتا ہے تبھی اِس کی افزائش مزاروں اور درگاہوں میں نسبتاً اچھی ہوتی ہے۔ وہ بھی توہم پرست انسان تھا۔ نظر اُٹھا کر جال کی خالی ٹہنیوں کو دیکھا۔ مولا داد کی نظریں جھک کر قدموں میں پڑی ہوئی مسلی کچلی ہوئی پتیوں پر پڑی تو اچانک سانس تیز ہونے لگا۔ وہ موت کے گھاٹ اترنے والی تھی مگر ہوش مند نہیں تھی۔ چند لمحے تک اُسے جھنجوڑتا رہا۔

وہ اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ اَب تب میں فنا ہونے والی کو دیکھ کر رال ٹپکنے لگی تھی۔ دماغ نے کہا ”بیمار ہے، مرنے والی ہے، جانے دو۔“

وہ بے دھیانی سے سر کو سہلانے لگا، سمجھانے لگا۔ ”برسوں کے بعد ایک عورت ہاتھ لگی تھی۔ پھر جانے زندگی کب تک تشنہ رہتی۔ وہ ہتھیلیوں کے بَل پر اُٹھ کر اُس پر جھک گیا۔ خدا کے دیکھنے کا ڈر نہیں تھا، سردار ایک میل پیچھے رہ گیا تھا جس کا دل کو ڈر تھا۔ مصباح نے ایک بار چند لمحوں کے لیے آنکھیں کھولیں۔ سر کو دائیں بائیں پٹخا، پھر گہری غشی میں چلی گئی۔ مصباح کے بے روح بدن کو کسی بھی استحصال کا اندیشہ نہیں رہا تھا۔

ایسے میں جال کے تنے سے لپٹا ہوا کالا ناگ زمین پر اُترا۔ کیچڑ زدہ زمین پر لہراتا ہوا خاموشی سے مولا داد کی طرف بڑھا۔ مولا داد اپنے قدموں پر کھڑا ہوتا تو شاید ناگ کے وار سے بچ جاتا۔ اِس حالت میں بچ نہ پایا اور اُس کے حلق سے سسکاری نکل گئی۔ جھٹکے سے اُٹھا اور پلٹ کر سانپ کو تیزی سے جھاڑیوں کی طرف جاتے دیکھ کر سن رہ گیا۔ گھٹنے سے ایک آدھا انچ اوپر ران پر ڈنک زدہ جلد پر ہاتھ ٹک گیا۔ ایک ٹانگ پر چھلانگ لگا کر چند قدم دور ہٹ گیا۔ چند لمحے سنبھلنے میں لگے۔ ایک زوردار ٹھوکر مصباح کی پسلیوں میں ماری۔ وہ ایک فٹ اوپر اُچھلی اور دوبارہ پہلو کے بل گر کر ساکت ہوگئی۔ مولا داد نے اُسے دو چار غلیظ گالیاں دیں اور پاؤں سے دھکیلتا ہوا عین کنارے پر لے گیا۔ جب مصباح کی زندگی محض ایک ٹھوکر کی زَد میں آخری سانسیں لے رہی تھی، تب ساگر کی لہریں مچلنے لگیں اور دونوں بانہیں کھول کر اُسے بلانے لگیں۔

مولا داد نے دانت پیستے ہوئے اُس کی کمر پر زوردار لات جمائی۔ وہ لڑھک کر پانی میں جا گری۔ یوں لگا جیسے چولھے پر بیٹھی ہوئی کسی خاتون نے اَدھ جلی لکڑی اُٹھا کر پانی بھری پرات میں ڈال دی ہو۔ چھپاک کی آواز کے ساتھ ہی اُس کے بدن میں لگی ہوئی آگ بجھ گئی، دہکتا ہوا جہنم دم توڑ گیا اور وہ چند ہی لمحوں میں مولا داد کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ ساگر کی گود میں بڑی گہرائی ہوتی ہے۔

مولا داد جانتا تھا کہ چند ہی منٹوں میں اُس پر زہر کا غلبہ طاری ہونے لگے گا۔ اُس نے جلدی سے اپنے تہبند کی کناری پھاڑ کر رسّی بنائی اور زخم سے کچھ اوپر سختی سے باندھ دی۔ جلن میں کمی نہیں ہوئی، دل کو تسلی ہوگئی کہ اَب زہر اوپر سرایت نہیں کرے گا۔

نصف میل تک وہ اپنے حواس میں تھا۔ اچانک پاؤں پھسلا اور لہرا کر گرا تو پھر اُٹھ نہ سکا۔ چند ہی لمحوں میں ذہن میں غنودگی بھر گئی۔ روٹھ کر جاتی ہوئی زندگی کو ایک مرتبہ بدن نے کھینچ کر چھاتی سے لگانے کی کوشش کی تو وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھا۔ خالی خالی نظروں سے دائیں بائیں دیکھا۔ ہر درخت کے ساتھ مصباح کی اَن گنت برہنہ نعشیں لٹکی دکھائی دیں۔ زمین پر ہر طرف سانپ ہی سانپ دکھائی دیے۔ اُس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا، چھاتی کو جھٹکا سا لگا اور منہ خون سے بھر گیا۔ وہ پیچھے کی طرف گر پڑا۔ ایسے میں بدن پیچھے رہ گیا، روح آگے نکل گئی۔

❀❀❀

”افتخار بیٹا! کیا تمہارے گھر والوں کو علم ہے کہ تم میرے پاس ہو؟“ پروفیسر نے اپنے سامنے بیٹھے افتخار سے دریافت کیا۔ دونوں چائے پی رہے تھے۔

وہ چونک پڑا۔ ”نہیں سر! میں نے کسی کو نہیں بتایا۔“

”گھر میں سے کسی نے تمہارے فون پر رابطہ نہیں کیا، کیا وجہ ہے؟“ پروفیسر کا لہجہ استعجاب آمیز تھا۔

”میں نے یہاں پہنچتے ہی فون پاورڈ آف کر دیا تھا۔“

”کیوں؟“

”میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔“

”کیا ایک لڑکی کی خاطر تم اِس حد سے گزر گئے ہو؟“

”سر جی! وہ محض ایک لڑکی نہیں تھی۔ اُس کے یوں جانے پر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا وجود دُنیا پر بوجھ بن گیا ہو۔ ایک طرف اپنے ٹھکرائے جانے کا غم، دوسری طرف یہ ندامت کہ میں کتنی غیر ذمے دار اور خود غرض لڑکی کو آج تک چاہتا رہا ہوں، مجھے چین نہیں لینے دیتی۔“ افتخار کی آواز میں تھکاوٹ اُتر آئی۔

”کیا یہ طے ہے کہ وہ اپنی مرضی سے شہاب کے ساتھ گئی ہے؟“

افتخار نے مخصوص انداز میں ہونٹ سکیڑے جیسے کہہ رہا ہو کہ اِس کے علاوہ کوئی صورت بنتی دکھائی نہیں دیتی۔

”یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اُس کے ساتھ کوئی بہت بڑا دھوکا ہوا ہو۔“

اُس نے جواباً نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں سر جی! وہ اتنی بھی بے وقوف اور کم عمر نہیں ہے۔“

پروفیسر نے کندھے اُچکائے، دِل ہی دِل میں اُس کی حماقت پر اُسے ملامت کی، کہا۔ ”تمہیں اُس کے بعد کسی دوسری لڑکی کا انتظار کرنا چاہیے تھا، یہاں جنت میں کوئی لڑکی نہیں آئے گی، اپنی دُنیا میں لوٹ جاؤ۔“

”آپ نے تین عورتوں کا چلن دیکھا، اَشولال نے ایک عورت سے محبت کرنے کا جُرم کیا، میں نے بھی۔ کیا یہی تجربات کافی نہیں ہیں؟“

پروفیسر ہنسا۔ ”بے وقوف ہو تم! عورت سے پہلے مرد جنت کا پکھو (پرندہ) ہوا کرتا تھا۔ کوثر کی فضا میں اُڑانیں بھرتا تھا۔ خدا نے مَرد کو جنت سے نکالنے کے لیے عورت کے فریب کو ذریعہ بنایا۔ مَرد اگر دوسروں کے تجربے سے سیکھنے والا ہوتا تو دُنیا عورت کے وجود سے کب کی خالی ہو کر پھر سے جنت بن چکی ہوتی۔“

افتخار کا جھکا ہوا سر بتا رہا تھا کہ اُسے پروفیسر کی باتوں سے اتفاق نہیں ہے۔ پروفیسر نے اُسے فون آن کرنے کا حکم دیا۔ اُس نے طوعاً و کرہاً فون آن کر دیا۔ کوئی جیسے اِسی انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ فوراً ہی بزر بجنے لگا۔ افتخار نے شکوہ کناں نگاہوں سے پروفیسر کی طرف دیکھا اور فون آن کر کے کان سے لگا لیا۔ پروفیسر نے اُس کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ دوسری طرف وجدان بول رہا ہے۔ فون بند ہونے تک افتخار کی حالت خاصی خراب ہوگئی تھی۔ پروفیسر نے اُس کی اُڑی اُڑی رنگت کو دیکھ کر دریافت کیا۔ ”کیا بات ہے افتخار؟“

وہ ایک طویل سانس لے کر کھڑا ہوگیا۔ چند لمحوں تک عرشے پر اِدھر اُدھر ٹہل کر اپنے اضطراب پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ پروفیسر نے سگریٹ سلگا لیا۔ اپنی توجہ بٹانے کے لیے لمبے لمبے کش لیتے ہوئے افتخار کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ بولا تو اُس کی جذباتی کیفیت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ انداز خود کلامی ایسا تھا۔ ”وجدان نے بتایا ہے کہ میرے گھر والے بہت زیادہ پریشان ہیں، سارے خاندان کا یہی خیال ہے کہ میں مصباح کی تلاش میں نکلا ہوا ہوں۔ اُس نے یہ بھی بتایا ہے کہ شہاب، مصباح کے غائب ہونے سے پہلے کار کے ایک حادثے میں ٹانگ تڑوا کر ہاسپٹلائزڈ ہو چکا ہے۔ وجدان نے چھپ کر اُس کی حالتِ زار دیکھی ہے اور اُسے یقین ہے کہ مصباح کے اغوا میں اُس کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ شہاب کے دو قریبی دوست جو اُس کی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ بتانے کے اہل ٹھہرتے ہیں، وہ ایک جھگڑے میں اپنے دوست رضی الدین کو قتل کر کے حوالات میں پہنچ چکے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے، اگر شہاب کو مصباح کی خبر نہیں تو وہ کہاں گئی؟“

پروفیسر کی پیشانی پر فکر و تردد کی غماز لکیروں کا جال تن گیا۔ وجدان سے ہونے والی گفتگو کا لفظ لفظ سن کر بھی وہ کوئی رائے قائم کرنے کے قابل نہیں تھا۔ متفکر لہجے میں گویا ہوا۔ ”تم نے یہاں آنے کی حماقت نہ کی ہوتی تو مجھے یقین ہے کہ تم نے کوئی نہ کوئی کھوج اَب تک نکال لیا ہوتا۔“

”جو ہونا تھا، ہوگیا، اَب آگے رہنمائی کریں سر!“ افتخار کے لہجے میں بیزاری تھی۔ اچانک ٹھٹک گیا۔ متردد انداز میں بولا۔ ”کہیں ایسا نہ ہو کہ وجدان مجھے ڈاج دے رہا ہو، شہاب ہم سب کو بہکانے کے لیے ناٹک کھیل رہا ہو یا مصباح ہی گیم کھیل رہی ہو؟“

پروفیسر نے ہاتھ اُٹھا کر روک دیا۔ اُس کے چہرے سے خفگی عیاں ہونے لگی۔ افتخار کا یوں سوچنا اُسے اچھا نہیں لگا

تھا۔اس نے کہا۔ ”بوٹ کا ریموٹ کنٹرول اُٹھا لاؤ۔“

افتخار پروفیسر وسیم کے اچانک بدلنے والے رویے پر حیران ہوا مگر کوئی ردِعمل ظاہر کیے بغیر ریموٹ کنٹرول اُٹھا لایا، ٹیبل پر رکھا اور سر جھکا کر بوٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اُس کے ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے۔

بوٹ، ریموٹ سے نکلتی لہروں سے بندھ کر واپس آ گئی تو پروفیسر وسیم اپنا سر جھٹک کر کمپیوٹر کے سامنے آن بیٹھا۔ سہ پہر تک انٹرنیٹ پر اپنی پسندیدہ ویب سائٹس کھولے بیٹھا رہا۔ آج کوئی آگ اُگلتا ہوا بدن توجہ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا، کوئی اَدبی شہ پارہ اپنی ٹرانس میں نہیں لا سکا تھا اور نہ ہی دریا کے لمحہ لمحہ اُترتے پانی کو دیکھتے رہنے پر طبیعت مائل ہو رہی تھی۔ وہ سوچتے سوچتے تھک کر سب لوگوں کو کوسنے لگا۔ لعن طعن کرنے لگا جنہوں نے اُس کی جنت میں اَپنے دُکھ اُتار دیے تھے۔

ایسے میں ایک دو مرتبہ اُس کا جی چاہا کہ افتخار سے رابطہ کر کے موجودہ صورتِ حال سے آگہی حاصل کرے پھر خود ہی اپنی خواہش کا گلا دَبا دیا۔ اِنہی ناانصافیوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے اُس نے سندھ کی لہر دَر لہر سطح پر پناہ حاصل کی تھی۔ شام کو اَشولال نے دو مرتبہ اور افتخار بیگ نے متعدد مرتبہ فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر پروفیسر نے کال او کے نہیں کی۔ وہ اپنے خول میں سمٹ کر بیٹھا تھا۔

وقت سے پہلے کھانا کھا کر چھت پر آ گیا۔ مچھر دانی میں گھس کر لیٹ گیا۔ چند ہی لمحوں میں اُس پر نیند اپنا غلبہ اُتارنے لگی۔ نہ جانے رات کے کس پہر میں اُس کی آنکھ کھل گئی۔ بیداری کا سبب پیاس کی شدت تھی۔ اُس نے چارپائی کے نیچے پڑی ہوئی پانی کی بوتل اُٹھائی۔ ہاتھ کے لمس نے بتا دیا کہ پانی گرم ہو چکا ہے۔ بادلِ ناخواستہ چھت سے اُترا اور فریج کی طرف بڑھا۔ پانی کی بوتل نکال کر منہ سے لگائی۔

عرشے پر آ کر آسمان کی جانب دیکھ کر وقت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ جی چاہا کہ رات کے اِس پہر میں پانی کی ٹھنڈک کو بدن میں اُتارا جائے۔ جنت کی بغلی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ گھٹنوں تک ٹانگیں پانی میں بھیگ گئیں۔ اُسے رات کے اِس پہر میں کسی بھی سانپ کا خوف لاحق نہیں تھا۔ ٹھنڈے پانی نے چند ہی منٹوں میں اُسے پرسکون کر دیا۔ وقت گزرتا رہا۔ سگریٹ کی طلب ہوئی تو اُس نے سگریٹ سلگا لی۔ پانی کی سطح پر پھیلی ہوئی چاندنی عجیب نظارہ پیش کر رہی تھی۔ اُس پر جذب کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ آنکھیں موند کر بڑی آہستگی سے خود کلامی کرنے لگا ”اے سندھو سائیں! تو رات کے ہر پہر میں جاگتا ہے۔ ہر پہر میں تیری جولانی الگ ہوتی ہے...... مگر تو مہربان کیوں نہیں؟ تجھے اپنے غریب ساتھیوں کو نگل لینے میں کیا لطف آتا ہے؟“

سطحِ آب پر کہیں کہیں مچھلیاں اُبھر کر چھلانگیں لگاتیں، پھر پانی میں گم ہو جاتیں۔ اُس نے سیڑھی کی بغلی ریلنگ کے ساتھ سر ٹکا دیا۔ اُسے افسوس ہونے لگا تھا کہ وہ رات کے اِس پہر کے چاند سے اَب تک کیوں نہیں ملا تھا۔

جنت کے مخصوص ہچکولوں میں ایک ناشناسا جھٹکا بہت بُرا محسوس ہوا۔ اُس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور اردگرد دیکھا۔ کچھ دکھائی نہیں دیا۔ وہ ہتھیلیوں کے بَل اُٹھ کر اوپر والی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ اچانک جنریٹر کے گھومتے ہوئے پَر کے قریب پانی میں غیر معمولی حرکت دکھائی دی۔ اُس نے چونک کر غور سے دیکھا۔ ایک گٹھڑی سی پَروں سے ٹکرائی تھی یا ٹکرانے والی تھی۔ اچانک گٹھڑی کھل گئی۔ اَب وہ اُس کی نگاہوں کے عین سامنے تھی۔ چاند کی روشنی میں اُس نے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی کہ پانی میں لوٹ پوٹ ہوتا وجود کسی عورت کا تھا۔ وہ چونک گیا۔ یہ تعین کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ پانی میں بہہ کر یہاں تک پہنچنے والا یہ برہنہ وجود زندگی کی حرارت رکھتا ہے یا ساگر کے پانی کی طرح ٹھنڈا ٹھار ہو چکا ہے۔

بہہ کر آتی ہوئی عورت کے ہاتھوں میں اچانک حرکت پیدا ہوئی۔ شڑاپ کی آواز نے اُس کے زندہ ہونے کا ثبوت پیش کیا تو وہ بری طرح نروس ہو گیا۔ عورت کا چہرہ نظر نہیں آتا تھا بلکہ پانی کی سطح پر بال ہی بال پھیلے ہوئے تھے جنہوں نے چہرہ اور نچلا وجود چھپا رکھا تھا۔ اچانک بالوں کے نیچے سے ایک ہاتھ نکلا، سطحِ آب پر پھیلے ہوئے بالوں میں چہرے کے آثار دکھائی دیے تو وہ غیر ارادی طور پر مزید ایک سیڑھی اوپر چڑھ گیا۔ عورت کا ہاتھ ہوا میں لہرایا اور برق رفتاری سے سیڑھیوں کی گول پائپ والی ریلنگ پر پڑا اور چمٹ گیا۔ پروفیسر نے اُسے غور سے دیکھا۔ اُس نے اپنے بائیں پیر کو بڑھایا اور ریلنگ پر عورت کے ٹکے ہوئے ہاتھ کو پرے کھسکا دیا۔ ہاتھ کی گرفت دَم توڑ گئی اور وہ ”ڈب“ کی آواز کے ساتھ پانی کے اندر چلی گئی۔ چند لمحوں کے بعد سطحِ آب پر اُبھری اور اُس نے پھر ہاتھ بڑھا کر ریلنگ تھام لی۔

پروفیسر نے پھر پاؤں کی مدد سے اُس کا ہاتھ چھڑا دیا۔

تیسری مرتبہ اُس کی گرفت کو چھڑانے کے لیے پروفیسر کو اپنی پوری قوت صرف کرنا پڑی۔ دانت پیس کر بڑبڑایا۔ ”زندگی شے ہی ایسی ہے، جانے لگتی ہے تو انسان اتنی مضبوطی

سے پکڑتا ہے کہ خدا کے علاوہ کوئی اپنی جانب کھینچ نہیں سکتا...... تم مرنے والی ہو، تڑپ تڑپ کر مرو گی تو سندھو سائیں کو قرار آ جائے گا۔“

اُسے عجیب لگا تھا کہ تینوں مرتبہ اُسے موت کے منہ میں دھکیلنے پر اُس نے چیخ پکار نہیں کی تھی، کوئی واویلا یا مدد کی پکار اُس کے حلق سے برآمد نہیں ہوئی تھی اور یہ نہایت غیر فطری بات تھی۔ چوتھی مرتبہ جب اُس نے ریلنگ کو دائیں ہاتھ سے پکڑا تو پروفیسر نے اپنا پاؤں پیچھے کھینچ لیا اور انہماک سے اُس کی زندگی بچانے کی جدوجہد کو دیکھنے لگا۔

وہ کئی منٹوں تک ساکت رہی۔ اُس کا وجود گردن تک پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ لمبے بالوں کو پانی بہا کر ایک طرف لے جا رہا تھا جس کی وجہ سے اُس کا آدھا چہرہ چاند کی روشنی میں دکھائی دینے لگا تھا۔ پروفیسر کو جھرجھری سی آئی۔ وہ یقیناً خاصی ڈراؤنی تھی۔

اُس کی آنکھوں میں زندگی کی رمق پیدا ہوئی۔ بولنے کے لیے منہ کھولا تو منہ سے پانی کا فوارا اُبل پڑا۔ پانی خاصی مقدار میں پیٹ میں جمع ہو چکا تھا۔ پروفیسر نے چہرے سے نظریں ہٹا لیں، ریلنگ تھامے بازو کو دیکھا۔ عجیب سا لگا۔ چہرہ ڈراؤنا تھا، بازو اور ہاتھ کی انگلیاں پُرکشش تھیں۔ اچانک انگلیاں ریلنگ پر سے پھسلنے لگیں۔ یقیناً وہ اپنی زندگی پر سے گرفت کھونے لگی تھی۔ پروفیسر کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ مگر اُس کی مدد کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ عورت نے کچھ دیر تک ساکت رہ کر اپنے پانی زدہ پھیپھڑوں میں ہوا اُتاری، دَم لیا اور بولنے کی کوشش کی۔ ناکام ہو کر پھٹی پھٹی نگاہوں سے پروفیسر کو دیکھنے لگی۔ وہ دانستہ ڈوب کر اُبھرنے والی آنکھوں میں جھانکنے سے گریز کر رہا تھا کیونکہ اُن آنکھوں سے مترشح زندگی کی فریاد اُس کے ارادے کو متزلزل کر سکتی تھی۔ وہ بڑی بے رحمی سے اُس کی جدوجہد کو مزید کچھ دیر تک دیکھنا چاہتا تھا۔

پروفیسر کو شائبہ ہوا کہ اُس کے کانوں میں ”بچاؤ“ کی آواز پڑی ہو۔ پروفیسر کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی تو اُس کی آنکھوں میں مایوسی بھر گئی۔ اُس نے یکبارگی اپنے بدن کی پوری قوت صرف کی اور پانی میں خاصی بلندی تک اُٹھ آئی۔ پروفیسر کو اُس کا عریاں بدن دیکھ کر ایک جھٹکا سا لگا۔ منہ پھیر کر جلدی جلدی سگریٹ کے کش لینے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ چند لمحوں میں ہی ڈھیر سارا دھواں حلق سے اُتار کر بدن میں بھرنا چاہتا ہو۔ پھر اچانک گردن موڑ کر بولا ”اے! تم کون ہو؟“

ایک مدھم سی آواز سنائی دی۔ ”بچاؤ!“

”میں نے جو پوچھا ہے، اُس کا جواب دو۔“ وہ غرّایا۔

”بب...... بچا......“

وہ حلق کے بَل چیخا۔ ”میں پوچھتا ہوں، کون ہو تم؟“

”خدا...... خدا...... کک...... بچ......“

وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا۔ فلٹر تک جل جانے والا سگریٹ اُس پر اچھال دیا اور مجنونانہ انداز میں قہقہے عرشے پر چڑھ گیا۔ رُک کر چند لمحے اُسے دیکھتا رہا پھر پیچھے مُڑ کر دیکھے بغیر تیزی سے چھت پر چڑھ کر ریلنگ پر جھک گیا۔ دونوں ہاتھ ریلنگ پر ٹکائے کچھ دیر تک پھیلے بالوں کا سیاہ دھبا دیکھتا رہا، پھر بڑبڑاتے ہوئے چارپائی پر لیٹ گیا۔ اُسے یقین تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں عورت کی سکت جواب دے جائے گی اور وہ ساگر کے خاموش پانی میں ڈوب جائے گی۔ اِنہی خیالات کی یورش میں سونے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ ایسے میں اُس کا دھیان جنت کے ہچکولوں میں کمی کی طرف گیا۔ شاید زندگی اور موت کی جنگ میں زندگی نے سپر ڈال دی تھی اور ریلنگ اُس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

وہ حلق کے بَل چیخا۔ ”سندھو سئیں! آج تو نے کمال کر دکھایا۔ مَرد کو جنت سے نکلوانے والے ایک وجود کو بے وجود کر دیا۔ ہاہ! اَن گنت مَردوں پر اپنے بدن کی بجلیاں گرانے والی تیرے تل میں پہنچ کر خاکستر ہو گئی۔ تو نے بہت اچھا کیا۔ تو نے بہت اچھا کیا۔“

وہ چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ دیوانوں کی طرح قہقہے لگاتے ہوئے چیخنے لگا۔ ”اے سندھو! غریبوں کے مشقت زدہ جسموں کو نگلتے نگلتے تجھے اُن کا گوشت کھانے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ آج تو نے ایک امیر زادی کے گداز بدن کو چکھ لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آئندہ تو کسی غریب کے جھریوں بھرے، بوڑھے اصیل مرغ کے پھیپھڑوں جیسے بدن پر اپنی آنکھیں نہیں گاڑے گا۔ یہی امیر لوگ تیرے فطری بہاؤ کے دُشمن ہیں۔“

بے ارادہ چھت سے اُتر آیا۔ کنٹرول روم میں گیا اور جنت کی تمام لائٹس آن کر دیں۔ آہستہ رَوی سے چلتے ہوئے سیڑھیوں تک آیا۔ ریلنگ پر ہاتھ دکھائی نہیں دیا تو عافیت کا سانس حلق سے خارج ہوا۔ ایک ننھی سی کسک دِل میں جاگ پڑی۔ ضمیر نے مُردہ دِلی سے کہا۔ ”تمہیں ایک انسان کی جان بچانے کے قابل کیا گیا تھا، تم نے اپنی قابلیت کو ضائع کر دیا۔“

سیڑھیوں پر قدم رکھا تو اُسے دوسری ریلنگ کے ساتھ

چمٹے ہوئے دیکھا۔ وہ سانس لے رہی تھی مگر اُس کے بدن میں کوئی حرکت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ایسے میں اُس کا دِل پسیج گیا۔ زندگی بہت پیاری ہوتی ہے۔ اپنی زندگی کو بچانے کے لیے ہاتھ پیر مارتی عورت پر اُسے رحم آ گیا۔ اُس نے جھک کر اُس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔ اپنی پوری قوت صرف کر کے اُسے اوپر کی طرف کھینچنے لگا۔ پانی نے بھی اُس کی مدد کی، اُسے کچھ اچھالا دیا۔ چند لمحوں بعد وہ عرشے پر اُس کے پیروں میں چاروں شانے چت پڑی تھی۔ اُس کی بے تاثر آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جن میں زندگی کی رمق ابھی باقی تھی۔ روشنی اُس کے بدن پر پڑ رہی تھی۔ پروفیسر نے بہ غور دیکھ کر زیرلب کہا۔ ''اتنی بھی عمر گزری نہیں، نہ جانے کن حالات کی ماری ہوئی ہے؟''

وہ ہوش میں ہوتے ہوئے بھی بے ہوش تھی۔ پروفیسر اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ نبض اور دل کی دھڑکن چیک کرنے پر اُس کی خستہ حالی کا شدت سے احساس ہوا۔ اُس کا پیٹ دَبا کر پانی نکالا تو وہ کراہنے لگی۔ پروفیسر نے تیز روشنی میں اُس کے تمام تر برہنہ وجود پر جابہ جا تشدد کی علامتیں دیکھیں اور اُسے یقین ہوگیا کہ زندگی کی جنگ بہ دقت تمام جیتنے والی لڑکی عصمت کی بازی پوری طرح ہار کر پانی میں اُتری تھی۔ چھوٹے چھوٹے اَن گنت زخموں کو دریائی پانی نے سوزش زدہ کر دیا تھا۔ جابہ جا نیل دکھائی دے رہے تھے اور...... یہ دیکھ کر اُسے جھرجھری سی آ گئی کہ اُس کے نازک اندام بدن پر دست درازوں کی انگلیوں تک کے نشان ثبت تھے۔

اسی اثنا میں لڑکی کا بدن کپکپانے لگا۔ پروفیسر نے اُسے اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور بیڈروم میں لے آیا۔ کمرے کی فضا اُس کے لیے نسبتاً بہتر تھی۔ گردن تک چادر اوڑھادی اور طبی مدد دینے کا اہتمام کرنے لگا۔ اُس نے جنت میں آنے سے پہلے ابتدائی طبی امداد پہنچانے کی تربیت حاصل کی تھی۔ اُس ٹریننگ کو آزمانے کا بھرپور موقع آج کی شب اسے ملا تھا۔

نصف گھنٹے میں اُس نے تین انجکشن لگائے۔ اُس کے منہ میں دوا کے قطرے ٹپکائے اور جب پوری طرح مطمئن ہوگیا تو بیڈروم سے باہر نکل آیا۔ سموں نے اُسے آزمائش میں ڈالا تھا، وہ کامیاب رہا تھا۔ آج اِس نووارد نے اُس کی آنکھوں اور بدن کو تشویش ناک امتحان میں ڈال دیا تھا مگر اُس نے اپنی جذباتی کیفیت کو کسی لمحے میں بھی خود پر حاوی ہونے نہیں دیا تھا۔ ایک مرتبہ پھر وہ عورت کی ضرورت کے فلسفے کو عملی طور پر جھٹلانے میں کامیاب رہا تھا۔

عرشے پر ریلنگ سے کمر ٹکائے وہ کافی دیر تک بیٹھا سوچتا رہا۔ اُس کی جنت میں ایک بار پھر سموں اپنا رُوپ بدل کر قدم رکھ چکی تھی۔ جونہی سگریٹ سلگایا، ہاتھوں کی انگلیاں کپکپانے لگیں اور آگ کی اِک عجیب دوشاخہ لپٹ نے اُسے اپنے حصار میں لے لیا۔ بہت پہلے چھوڑ جانے والی مریم کا مرمریں بدن آنکھوں میں لہرا گیا۔ بے سبب چھوڑ جانے والی رُباب کا عضو عضو یاد آنے لگا جو اُس کی تنہائی میں بولنے لگتا تھا اور مدہوشی طاری کرنے والا نغمہ بن کر اُسے اپنی جانب کھینچنے لگتا تھا۔ اُس نے سر جھٹکا۔ دانت پیس کر بڑبڑایا۔ ''میں اُن کم ذاتوں کو کیوں یاد کر رہا ہوں؟ کیا میرے وجود پر اِس عورت کے بدن کا لمس اپنی تاثراتی آلائشیں چپکانے میں کامیاب ہوگیا ہے؟''

اُس نے دائیں ہاتھ کا مکا بنایا اور پوری قوت سے فرشی تختے پر دے مارا۔ چوٹ لگی مگر اُس چوٹ کی کسک کو دبا نہ سکی جو اُس کے شعور میں جاگزیں ہو چکی تھی۔

❁ ❁ ❁

وجدان اور افتخار بیگ ضلع ناظم کے ایما پر شہاب سے مل کر واپس آئے تو اُن کی مایوسی میں بے حد اضافہ ہو چکا تھا۔ شہاب نے محض اپنی صفائی پیش کی تھی اور مصباح کے وجود سے کامل لاعلمی کا یقین دلایا تھا۔ اُس کی حالتِ زار اور لہجے کے تیقن نے دونوں کے شکوک و شبہات کو ماند کر دیا تھا۔

وجدان کے لیے گھر اور گھر سے باہر کی فضائیں ایک جیسی ہی تھیں۔ گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا، گھر سے باہر کی دُنیا اُسے طعنہ بار نگاہوں سے چھلنی کر دیتی۔ ماما اور پاپا کی اُمید بھری نگاہیں ہر وقت ایک ہی سوال کرتی رہتی تھیں۔ ''مصباح مل گئی؟''

مصباح کو زمین نگل گئی تھی یا آسمان نے اپنی آغوش میں لے لیا تھا؟ خبر نہیں تھی۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا کہ وجدان کے پاپا سلطان علی کے درشت حکم کی اطاعت میں گھر کے کسی فرد نے بھی عمران کو اِس جانکاہ واقعے کی اطلاع نہیں دی تھی۔ پکے ہوئے پھل کو کپڑے کی تھیلی چڑھا کر نوکیلی چونچوں سے بچانا بہتر حکمت عملی کہلاتا ہے۔ وہ کھوکھلی جڑوں کی بقا میں سرگرداں رہتے ہوئے بھی اپنے پھل کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

وجدان سے علیحدہ ہو کر افتخار بیگ پولیس اسٹیشن چلا گیا جہاں حوالات میں شہاب کے دونوں دوست بابر اقبال اور فرخ قید تھے۔ تھانے میں ہی دونوں کے والدین سے اُس کی ملاقات ہوئی جنہوں نے اپنے بیٹوں کی بے گناہی کا واویلا مچا رکھا تھا۔ وہ قفل پر نوٹوں کی چابی رکھ کر حوالات کی سلاخوں کے پار کھڑے فرخ اور بابر تک پہنچنے میں کامیاب

ہوگیا۔ اپنا تعارف کرانے کے بعد منت آمیز لہجے میں پوچھنے لگا۔ ''پھیلا ہوا دستِ سوال خالی لوٹاتے ہوئے یہ سوچنا کہ تم دونوں بھی بہنوں والے ہو۔''

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، فرخ نے حیرانی سے پوچھا۔ ''میں کچھ نہیں سمجھا، تم کھل کر بات کرو۔''

افتخار بیگ نے دیکھا کہ دونوں کی حالت خاصی دگرگوں تھی۔ سرکاری مہمانوں سے ایسا ہی سلوک رَوا رکھا جاتا ہے، یہ سوچ کر سر جھٹکتے ہوئے آہستہ سے بولا۔ ''اگر تم دونوں کو علم ہے کہ مصباح کہاں ہے تو خدارا مجھے بتا دو۔ ہمارے خاندان کی عزت داؤ پر لگ چکی ہے، یہی سوچ کر تمہارے پاس آیا ہوں۔''

بابر نے جلدی سے کہا۔ ''مگر ہم تو مصباح کو جانتے تک نہیں ہیں، تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں؟''

افتخار بیگ کے حلق میں گولی سی پھنس گئی، بدقت تمام بولا۔ ''تمہارا دوست شہاب اور میری کزن مصباح، دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ شاید دونوں شادی کا ارادہ بھی رکھتے تھے، تبھی دونوں سے مصباح غائب ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تم دونوں بھی قتل کے کیس میں اندر پڑے ہو، شہاب بھی ایک حادثے میں ٹانگ تڑوا کر ملتان میں زیر علاج ہے، یہ سب کیا ہے؟''

دونوں اُلجھ گئے۔ واقعے کی تمام تر نوعیت سے آگاہ تھے۔ مخمصے میں پڑے ہوئے تھے کہ افتخار کو کیا بتائیں، کیا نہ بتائیں؟ کیا بتانا اُن کے اپنے فائدے میں جائے گیا اور کون سی خبر اُن کے لیے مزید آزار کا باعث بن جائے گی...... شاید دونوں یا صرف فرخ اِس نکتے پر پہنچا کہ اُسے کچھ بھی نہیں بتانا چاہیے، پُریقین لہجے میں بولا۔ ''افتخار صاحب! ہم دونوں کو بے گناہ پولیس نے قتل کے الزام میں پھنسا دیا ہے۔ دیکھیں! ہمارا انجام کیا ہوتا ہے؟ اگر چھوٹ گئے تو آپ کے ساتھ مصباح کی تلاش کے لیے ضرور نکلیں گے اور کیس کے طول پکڑنے پر اگر ہم حوالات سے جیل بھجوا دیے گئے تو پھر دعا کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکیں گے۔''

افتخار بیگ کے ذہن میں بہت سارے اُلجھاوے تھے۔ ایک ایک کر کے گتھیاں سامنے رکھ رہا تھا۔ ''رضی الدین کی لاش کہاں سے ملی تھی؟''

بابر نے حویلی کا پتا بتانے کے لیے منہ کھولا مگر فرخ نے تیز نظروں سے گھور کر خاموش کرا دیا اور جلدی سے بولا۔ ''ہمیں تو یہ بھی پتا نہیں ہے افتخار صاحب! میرا خیال ہے کہ اُس کی لاش اُس کے گھر سے ملی ہے۔''

افتخار کی آنکھیں سلگ اُٹھیں۔ یہیں کہیں اُلجھے ہوئے دھاگے کا ایک سرا چھپا ہوا تھا جسے پکڑ کر وہ دوسرے سرے تک پہنچ سکتا تھا۔ فرخ کی گھورتی ہوئی آنکھوں نے اُسے شکوک و شبہات میں ڈال دیا۔ وہ کافی دیر تک اُن کے ساتھ مغز ماری کرتا رہا مگر وہ دونوں محتاط ہو کر معصومیت اور لاعلمی کے خول میں بند ہو چکے تھے۔

تھانے سے نکلتے ہی اُس نے اپنے دوست مظہر عباس کو فون کر کے وجدان کے گھر پہنچنے کی استدعا کی۔ گھر پہنچ کر آنٹی کو چائے بنانے کا کہا اور وجدان کے ساتھ ڈرائنگ میں آ کر مظہر کا انتظار کرنے لگا۔ اُس کے پہنچنے پر اُس نے اَب تک درپیش آنے والے واقعات سے آگاہ کیا۔ شہاب اور اُس کے دونوں دوستوں سے ملاقات کا احوال تفصیل سے اُن کے گوش گزار کر کے تشویش زدہ لہجے میں بولا۔ ''مظہر! میرا ذہن کہتا ہے کہ شہاب کی ٹانگ کا ٹوٹنا، رضی الدین کا قتل اور فرخ اور بابر پر اس کے قتل کا الزام آنا، ایک ہی سلسلے کی کڑیاں؟ اور سردار اَرباب خان ہمیں اُلجھا کر مصباح سے دور کرتا جا رہا ہے۔ تم اِس بارے میں کیا کہتے ہو؟''

ماما چائے دینے کے لیے ڈرائنگ روم میں آگئیں۔ تنے ہوئے کے بجھے ہوئے سروں کو دیکھ کر طنزیہ لہجے میں بولیں۔ ''اگر میرا عمران یہاں ہوتا تو ایک گھنٹے میں اپنی مصباح کو ڈھونڈ نکالتا خواہ اپنی جان گنوا بیٹھتا۔ تم سوائے باتیں کرنے اور اندازے لگانے کے کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں ہو۔''

وجدان اور افتخار کا سر شرم سے جھک گیا۔ مظہر نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''آنٹی! ہمیں عمران سمجھ کر دعا دیجیے، ہمیں بھی اپنی جان اتنی پیاری نہیں ہے جتنی آپ سمجھ رہی ہیں۔''

ماما نے ٹرے ٹیبل پر رکھی۔ وہیں قالین پر بیٹھ گئیں۔ ٹیبل پر سر رکھ کر ہچکیاں لے لے کر رونے لگیں۔ ''ہائے میری مصباح! نہ جانے کن ظالموں نے اُسے مجھ سے دور کر رکھا ہے۔ سچے پروردگار! ماں کی خالی جھولی کی فریاد سن لے اور اُن فرعونوں کو تباہ کر دے، برباد کر دے۔''

وجدان اُٹھ کر ماما کے پاس آیا۔ انہیں اُٹھا کر اندر کی طرف لے جاتے ہوئے بولا۔ ''ماما! ہمارا حال آپ سے مختلف نہیں ہے، آپ رو کر دل کا غبار نکال لیتی ہیں اور ہم یہ بھی نہیں کر سکتے۔ بس اپنے آپ میں ہر وقت کڑھتے رہتے ہیں، خون جلاتے رہتے ہیں۔''

مظہر نے چائے کا کپ اُٹھایا، لبوں سے لگا کر پھر واپس رکھ دیا، بولا۔ ''افتخار! ہمیں اُس جگہ پر پہنچنا ہے جہاں رضی الدین کی لاش کو پولیس نے اپنی تحویل میں لیا

تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہیں سے مصباح کا سراغ ملے گا۔“

”مگر اُس جگہ کا پتا کیسے چلے گا؟“ افتخار نے اپنی بڑھی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بے بسی سے کہا۔

”تم نے مصباح کے اغوا کو اپنے اعصاب پر سوار کرلیا ہے تبھی تو تم لوگوں کو کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ بھلے آدمی! ابھی پولیس اسٹیشن چلتے ہیں، لاش اُٹھا کر لانے والوں میں سے کسی ایک کو علیحدگی میں لے جا کر پوچھتے ہیں، وہ بتا دے گا۔“

”اگر اُس نے نہ بتایا تو؟“

مظہر نے عجیب سی نگاہ اُس پر ڈالی، چائے کا گھونٹ حلق میں اُتارا اور انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے ایک مخصوص اشارہ کرتے ہوئے سمجھایا کہ پیسا گونگے کو بھی زبان کھولنے پر مجبور کردیتا ہے۔

❁ ❁ ❁

پروفیسر وسیم کے سامنے گیس والے چولھے پر چائے کی کیتلی میں پانی کھول رہا تھا۔ کھولتے ہوئے پانی میں کبھی اپنا عکس نظر نہیں آتا، دنیا کی بے ثباتی عیاں ہونے لگتی ہے۔ پانی میں بہہ کر آنے والی عورت پر توڑے جانے والے مظالم کو سوچ رہا تھا اور غم زدہ ہو رہا تھا۔ دُنیا ظالم ہے، وہ جانتا تھا مگر اُسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اتنی ظالم بھی ہوسکتی ہے؟

افتخار بیگ نے بعد میں کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ افتخار کی باتیں بڑبڑانے کے سے انداز میں دہرانے لگا۔ اس دوران خودکار انداز میں اُس کے ہاتھ حرکت کرتے رہے۔ بریڈ کو گرم کرنے کے بعد چھری کی مدد سے اس پر مکھن کی تہ جمائی اور چائے تھرماس میں انڈیل کر ٹرے میں رکھی۔ ٹرے اُٹھائے چھت پر آیا تو سانس کے ردھم پر اوپر نیچے ہوتی چادر کو دیکھ کر اُس کا منہ بن گیا۔ وہ اتنی چمکدار دھوپ میں اُبھی تک سو رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اُسے مریم یاد آگئی۔ وہ ہر چھٹی کے دِن اِسی طرح دوپہر تک سوئی رہتی تھی اور پروفیسر کو ناشتا تیار کر کے اُسے جگانا پڑتا۔

ٹرے چھت کے ایک گوشے میں فرش پر رکھ دی اور خود مچھردانی کو سمیٹنے لگا۔ اُسے حیرانی ہوئی کہ اُس نے ٹیکے لگانے کے بعد اُسے جس طرح سلایا تھا، وہ اُبھی تک اُسی انداز میں پڑی ہوئی تھی۔ چادر کی ترتیب بھی بتا رہی تھی کہ اُس نے اُبھی تک کروٹ نہیں بدلی۔

رات میں بدصورت دکھائی دینے والی اپنی جون بدل چکی تھی۔ اُس کے چہرے پر جابہ جا زلفیں چمٹی ہوئی تھیں اور چہرہ خاصی پیلاہٹ پکڑ چکا تھا۔ شاید رات کو بلبوں کی روشنی نے اُس کے چہرے کی اصل رنگت کو چھپا لیا تھا۔ پروفیسر نے اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ چونک پڑا۔ وہ بخار میں پھنک رہی تھی۔ اتنی دھوپ میں اُسے اصولی طور پر پسینے میں شرابور ہوجانا چاہیے تھا مگر وہ بالکل خشک تھی۔ پروفیسر نے اُسے ہلایا جلایا، آوازیں دیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے چھت سے نیچے اُترا اور فریج میں سے ٹھنڈا پانی اور رومال اُٹھا لایا۔ رومال بھگو کر اُس کی پیشانی پر رکھا۔ وہ کسمسائی اور گردن ایک طرف ڈال کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ وہ رومال ٹھنڈے پانی میں بھگوتا رہا، پیشانی پر رکھتا رہا تاوقتیکہ اُس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ کئی منٹوں تک آنکھوں کو جھپکے بغیر اُسے دیکھتی رہی پھر آنکھیں بند کر کے کراہنے لگی۔ پروفیسر نے کہا۔ ”تم نے زندگی کی جنگ جیت لی ہے، اَب بیماری سے جیتنے کی کوشش کرو اور اُٹھ کر بیٹھ جاؤ۔“

وہ شاید اس کی بات سمجھی ہی نہیں تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے پھر اُسے دیکھنے لگی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کا ذہن ہر احساس سے عاری ہوچکا ہو۔ یکبارگی اُس کی آنکھوں کے تاثرات بدلنے لگے۔ اُسے یاد آنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دہشت سے تھرتھر کانپنے لگی۔ لکنت زدہ لہجے میں پوچھنے لگی۔ ”میں کہاں ہوں؟“

”جہاں بھی ہو، خیریت سے ہو۔ چلو شاباش! اَب اٹھ کر بیٹھ جاؤ اور ناشتا کرو۔“ پروفیسر نے پچکار کر کہا۔

وہ اردگرد دیکھنے لگی۔ جنت کی چھت پر لیٹ کر اطراف میں دیکھنے سے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے انسان خلا میں چارپائی بچھائے لیٹا ہوا ہے۔ وہ پریشانی سے بولی ”میں کہاں ہوں؟“

”تم محفوظ جگہ پر ہو۔“

”تم کون ہو؟“ اُس کی آنکھوں میں تشویش اور دہشت بھری ہوئی تھی۔

”تمہیں سب کچھ پتا چل جائے گا۔ چلو اُٹھو!“ پروفیسر نے کہا اور چھت کے اُس گوشے کی طرف چل دیا جہاں اُس نے ناشتے کی ٹرے رکھ چھوڑی تھی۔ ٹرے اُٹھائی اور چارپائی کے قریب آ گیا۔ وہ خوف سے اُبھی تک لرز رہی تھی اور چادر اُس کی کپکپاہٹ کو چھپانے میں ناکام ہو رہی تھی۔ پروفیسر نے ڈپٹ کر کہا۔ ”اُٹھو اور ناشتا کرو۔ میں تمہارے باپ کا نوکر نہیں ہوں کہ ٹرے اُٹھائے کھڑا رہوں۔“

اُس نے اُٹھنا چاہا مگر اُٹھ نہ پائی اور بے بسی اور خوف کے ملے جلے تاثرات لیے اُسے دیکھنے لگی۔ اُس نے ٹرے ایک ہاتھ میں پکڑی اور دوسرے ہاتھ کو گردن تلے رکھ کر سہارا دیا۔ وہ بدقت تمام اُٹھی۔ کراہتے ہوئے چارپائی کی بانہوں کو مضبوطی سے تھام کر بیٹھ گئی اور اُس سے نظریں چُرانے لگی۔ ایسے میں اچانک اُسے اپنی برہنگی کا احساس ہوا۔ اُس کے بدن نے ایک واضح جھٹکا لیا اور وہ سمٹ کر اپنی ننگی کمر کو چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ پروفیسر نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم فضول کوشش کر رہی ہو، میں نے تمہارے پورے بدن پر سکاٹرن پاؤڈر اور بام لگائی ہے۔ بینڈیج کرنے کے بعد ہی یہ چادر اوڑھائی ہے۔ تمہارے پاس چھپانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے لڑکی! خاموشی سے ناشتا کرو۔“

پروفیسر نے دانستہ اُس کی آنکھوں میں دیکھنے سے گریز کیا اور ٹرے اُس کے سامنے رکھ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ رُک کر پلٹے بغیر بولا۔ ”ناشتا کرنے کے بعد یہی چادر لپیٹ کر نیچے اُتر آنا۔“

وہ نیچے اُتر آیا اور ناشتا کرنے میں مشغول ہوگیا۔ پیٹ پوجا سے فراغت پانے کے بعد کافی دیر تک بے سبب کچن میں ہی مصروف رہا۔ اچانک ایک نامانوس سی آواز سن کر چونک گیا۔ یوں لگا جیسے چھت پر کوئی بھاری بھرکم شے گری ہو۔ وہ سرعت سے چھت پر پہنچا۔ توقع کے عین مطابق اُس کی بن بلائی مہمان چارپائی سے چند قدموں کے فاصلے پر اوندھے منہ پڑی کراہ رہی تھی۔ وہ چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ اُس نے سہارا دے کر اُٹھایا۔ وہ ہونٹ بھینچ کر ہولے سے بولی۔ ”میں کھڑی نہیں ہوسکتی۔“

وہ اُسے قدم قدم چلاتے ہوئے سیڑھیوں تک لایا۔ کمر میں بازو حمائل کر کے ایک ایک سیڑھی اُتارتا گیا۔ بیڈروم میں لا کر لٹانے کے بعد اُس نے پردے برابر کیے۔ دروازہ بند کیا اور فریج بند کر کے ائرکنڈیشنر آن کردیا۔ اُس کے حلق سے نکلنے والی کراہیں سننا پروفیسر کی سماعت پر گراں گزر رہا تھا۔ وہ چھت پر سے برتن اُٹھا لایا۔ اپنی ڈسپنسری سے اَدویات نکال کر اُن کا جائزہ لینے لگا۔ ساتھ ساتھ تعین کرتا گیا کہ اُسے کون سی دوائیں کھلانی ہیں۔

میڈیکل کٹ اُٹھائے بیڈروم میں آیا۔ اُس کے چہرے کی طرف دیکھے بغیر اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ جسم پر چپکے ہوئے سکاٹرن پاؤڈر نے اپنا رنگ بدل لیا تھا۔ وہ پاؤڈر کے کھرنڈ اکھاڑ کر بام لگانے لگا۔ گزشتہ رات بام لگانے کے دوران اُس کے جسم نے مہین سی حرکت بھی نہیں کی تھی، اَب تکلیف محسوس کرتے ہوئے ہل جل رہی تھی۔ پروفیسر نے جہاں تک ممکن تھی، ڈریسنگ کی، چہرے کے زخموں کا معائنہ کیا پھر بولا۔ ”کوشش کرو کہ بقیہ زخموں پر خود دوا لگا لو۔ میں باہر جا رہا ہوں۔“

اُس کی آنکھوں میں پہلی مرتبہ تشکر کا احساس اُبھرا تھا۔

پروفیسر باہر آ کر حسبِ عادت اپنی جنت کا جائزہ لینے لگا۔

نصف گھنٹے کے بعد وہ پانی کی ٹھنڈی بوتل اُٹھائے بیڈروم میں داخل ہوا۔ وہ آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی ہوئی تھی۔ پروفیسر نے دیکھا کہ اُس کے میلے وجود کے لمس سے بیڈ کی چادر خاصی میلی ہوگئی تھی۔ جی ہی جی میں پچھتایا مگر جو ہونا تھا، ہو چکا تھا۔ کندھے اُچکا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اُسے متوجہ کرنے کے لیے کھنکارا، بولا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

اُس کا بازو نہایت آہستگی سے آنکھوں پر سے ڈھلک گیا۔ پھیلی پھیلی نظریں اُس پر گاڑتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگی مگر لب محض کپکپا کر رہ گئے۔ پروفیسر نے دلاسا دیا۔ ”ڈرو مت، تم بالکل محفوظ ہو۔ یہاں تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ پروفیسر نے اُسے رونے کا موقع دیا۔ غبارِ دل نکل رہا تھا۔ کچھ توقف کے بعد اُس نے پانی پلایا۔ سہارا دے کر اُٹھایا اور بیڈ پر بٹھا دیا۔ وہ ممنونیت سے بولی۔ ”مم...... میرا...... سر بہت درد......“

پروفیسر نے شکر کیا کہ وہ بولنے کے قابل تو ہوگئی ہے۔ بولا۔ ”دوا کھاؤ گی تو بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔“

وہ ایک بار پھر خاموش ہوگئی اور گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگی۔ پروفیسر نے اُس کی کمر سے چپکے ہوئے بال علیحدہ کرنا شروع کردیے۔ جو بال کسی زخم کے کھرنڈ میں پھنسے ہوتے، اُنہیں کھینچنے پر اُس کے منہ سے سسکی نکل آتی۔ چند ہی منٹوں میں وہ اپنے کام سے فارغ ہوگیا اور اُسے آرام کرنے کا حکم دے کر بیڈروم سے نکل آیا۔ اُبھی اُسے اپنے معمول کے بہت سے کام کرنا تھے جنہیں وہ بے حد ضروری خیال کرتا تھا۔ اُس نے گہری نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا۔

ایسے میں اُس کی نگاہ مغربی جانب بیلے کی طرف اُٹھی۔ کوئی کھڑا دکھائی دیا۔ وہ فوراً اسٹور کی طرف لپکا اور دوربین اُٹھا لایا۔ دیکھنے پر پتا چلا کہ شیرا گرمانی ملنے کے لیے آیا تھا۔ اُس نے فوراً فون پر رابطہ کیا ”کیا بات ہے شیرے؟“

”بیمار ہوں، دِل بوجھل ہے، ملنے کے لیے آیا ہوں۔ مجھے اپنی جنت میں بلا لیجیے پروفیسر صاحب!“ اُس کے لہجے میں التجا تھی۔

پروفیسر نے فون بند کیا۔ اُلٹے پیروں پھر اسٹور میں گیا اور ریموٹ کنٹرولر نکال لایا۔ لاک ہٹایا اور بوٹ کو شیرے کی

جانب روانہ کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد شیرا اُس کے سامنے کرسی پر براجمان تھا۔ اُس کا چہرہ بجھا بجھا سا تھا۔ پروفیسر کے دریافت کرنے پر بولا۔ ''میرا بہت قریبی دوست مولا داد سانپ کے ڈسنے سے مر گیا۔ مجھے بخار نے آن دبوچا اور آپ جانتے ہی ہیں کہ یہاں دوا دارو کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔ کاڑھا بنا کر پیا مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ ڈسپرین اور پیراسیٹامول کی گولیاں بھی اتفاق سے ختم ہو چکی ہیں۔ آپ کے پاس ہیں تو دو چار عنایت کر دیجیے۔''

پروفیسر نے اُسے پیراسیٹامول کا پتّا اور پانی کا گلاس تھمایا۔ وہ دو گولیاں حلق میں اُتارتے ہوئے بولا۔ ''سارا بدن ٹوٹ رہا ہے پروفیسر صاحب! میرے تمام ساتھیوں کی لگ بھگ یہی کیفیت ہے۔''

''کوئی بڑی واردات کی ہے تم لوگوں نے؟'' پروفیسر نے مسکرا کر پوچھا۔

اُس کا سر جھک گیا۔ چہرے پر ندامت کے آثار اُبھر آئے۔ پروفیسر کو اُس کا ردِعمل عجیب سا لگا۔ کریدنے پر اُس نے تاسف آمیز لہجے میں کہا۔ ''ہم پارسا لوگ نہیں، اَن گنت قتل اور ڈکیتیاں ہمارے نامۂ اعمال کو پُر کرتی ہیں مگر ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اِدھر بندے کا دَم باہر، اُدھر بات آئی گئی مگر ایک کام ایسا کر بیٹھا ہوں جو رات بھر جگائے رکھتا ہے۔ بے چین کیے رکھتا ہے۔''

''ایسا کیا کام کر بیٹھے ہو جس نے تمہارے سنگی دِل کو دہلا دیا ہے؟'' پروفیسر نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہمارے بھاگ وَند نے ہمیں ایک لڑکی کو اغوا کرنے کا حکم دیا تھا۔ لڑکی کو اغوا کرنے کے دوران ایک بندہ مولا داد کے ہاتھوں پھڑک گیا۔ یہاں تک تو خیر رہی، لڑکی کو اُٹھا کر اپنے ڈیرے پر بہ عافیت پہنچنے کے بعد جو کچھ ہوا، اُسے نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میرے سمیت تمام بندے سالوں سے پیاسے تھے، ہم نے جی بھر کر پیاس بجھائی مگر اِس دوران لڑکی کی حالت بہت خراب ہو گئی۔''

پروفیسر حیرت سے گنگ اُس کی شکل دیکھے جا رہا تھا۔ وہ سانس لے کر بولا۔ ''پروفیسر صاحب! ہم نے اُسے کاڑھا وغیرہ پلایا، گولیاں بھی کھلائیں مگر وہ نازونعم کی پلی لڑکی ہر آنے والے پَل میں موت کی جانب بڑھتی جاتی تھی۔ مجھ سے اُس کی حالت دیکھی نہیں گئی تو میں نے اُسے دریا میں پھینکنے کا حکم دے دیا۔''

پروفیسر کے ہونٹ بھنچ گئے۔ آنکھوں میں خشونت اُبھری مگر شیرے گرمانی کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ پروفیسر کے دِل کی دُنیا اتھل پتھل ہوتی دیکھ نہیں پایا، بولا۔ ''اور مولا داد اُسے دریا میں پھینکنے کے لیے گیا۔ میں نے جا کر کچے پتن کو غور سے دیکھا۔ یوں لگتا ہے جیسے مولا داد نے اُسے دریا میں پھینکنے سے قبل پھر اپنا منہ کالا کیا تھا۔ وہیں اُسے جال کے درخت کے نیچے کسی بہت زہریلے سانپ نے ڈس لیا اور وہ ڈیرے پر پہنچنے سے قبل ہی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ہائے! مولا داد بڑا دلیر سنگی تھا، موت کے منہ میں یوں ہاتھ ڈال دیتا تھا جیسے بکرا گندم کی بوری میں منہ ڈالتا ہے۔''

اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پروفیسر نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''تم مولا داد کی موت پر غم زدہ ہو یا اُس لڑکی پر توڑے جانے والے ظلم پر شرمسار ہو؟''

شیرے نے چونک کر پروفیسر کو دیکھا۔ لہجہ عجیب سا لگا، بولا۔ ''موت ہمارے ساتھ ساتھ چلتی ہے پروفیسر صاحب! مولا داد کی لکھی ایسے ہی تھی، مر گیا، غم نہیں۔ ہم سب کو ایک نہ ایک دِن مر جانا ہے مگر اُس لڑکی کی شکل میری نگاہوں میں ثبت ہے۔ سونے کے لیے لیٹتا ہوں تو کانوں میں اُس کی چیخیں گونجنے لگتی ہیں۔ بیٹھتا ہوں تو آنکھوں کے سامنے ہر جانب اُس کا چہرہ لہرانے لگتا ہے۔ مجھ سے بہت بڑا ظلم سرزد ہو گیا۔ لگتا ہے کہ خدا بھی مجھ سے ناراض ہو گیا ہے پروفیسر صاحب!''

پروفیسر کو اُس کا رویہ بڑا غیر حقیقی سا محسوس ہو رہا تھا۔ شیرا اُس قبیل سے تعلق رکھتا تھا جہاں یہ معمول کی بات تھی، پوچھا۔ ''شیرے! کیا تم نے پہلی مرتبہ کسی لڑکی کو اغوا کیا ہے؟''

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں، بلکہ اَن گنت لڑکیوں کو اپنے بڑوں کے حکم پر برباد کر چکا ہوں۔''

''پھر اِس لڑکی نے تمہارے ضمیر کو کیوں کر جگا دیا ہے؟''

''یہی بات تو میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ کاش! میں نے اُسے اُٹھانے کے بعد اتنی پستی میں نہ پھینک دیا ہوتا، اُسے قید رکھتا، اُسے مارتا پیٹتا، کچھ بھی کرتا مگر جو میرے ساتھیوں نے کیا، وہ اُس سلوک کے لائق نہیں تھی۔ اوہ ہاں پروفیسر صاحب! کیا آپ نے اُس لڑکی کی لاش کو دریا میں بہتے ہوئے دیکھا ہے؟''

پھر پروفیسر کے بولنے سے پہلے خود ہی بول پڑا۔ ''مگر آپ کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ اُسے آدھی رات کو مولا داد پھینکنے کے لیے گیا تھا۔ اُس وقت آپ یقیناً گہری نیند سو رہے ہوں گے۔''

پروفیسر نے اثبات میں سر ہلایا، پوچھا۔ ''اُسے تم نے کہاں سے، کب اور کیوں اُٹھایا تھا؟ مجھے تفصیل سے بتاؤ۔''

''یہ لمبی کہانی ہے، آپ نہیں سمجھیں گے، بہرحال بتائے دیتا ہوں۔'' شیرے کا لہجہ خاصا شکست خوردہ تھا۔ ''ہماری پشت پناہی بڑے لوگ کرتے ہیں۔ ہم اُن کے اَٹکے ہوئے کام نکالتے ہیں۔ یہ بھی ایک بڑے کا اَٹکا ہوا کام تھا۔ اُس کا بیٹا لڑکی کو جھانسا دے کر اپنی حویلی میں لایا تھا اور اُس سے شادی کر کے اپنے باپ کا شملہ زمیں بوس کرنا چاہتا تھا۔ باپ بیٹے کو کسی ہم پلہ خاندان میں بیاہنا چاہتا تھا۔ ایسے میں ایک ہی حل سامنے آیا کہ فساد کو جڑ سے ہی اکھاڑ پھینکا جائے اور یہ کام ہم نے کر دیا۔''

بات خاصی لمبی تھی۔ شیرا گرمانی نہ جانے کس کیفیت سے گزر رہا تھا کہ اُس نے مِن وعَن تمام واقعہ تفصیل سے پروفیسر کے گوش گزار دیا۔ کچھ بھی نہیں چھپایا۔ بات ختم کرتے ہوئے بولا۔ ''میں چلتا ہوں پروفیسر صاحب! دل کا غبار کچھ ہلکا ہو گیا ہے۔ دعا کیجیے گا۔''

''اگر مانو تو مشورہ دیتا ہوں کہ آئندہ ایسا کام نہ کرنا جو تمہاری مردانگی کو داغدار کر دے۔ چلو، تمہیں پتن پر پہنچائے دیتا ہوں۔'' پروفیسر نے اُٹھتے ہوئے کہا اور ریموٹ کنٹرولر اُٹھا کر بوٹ کی طرف بڑھ گیا۔ شیرے گرمانی نے کانوں کی لوؤں کو ہاتھ لگایا، سست رَوی سے پروفیسر کی تقلید میں چلتے ہوئے بوٹ تک آیا اور گیراج سے نکل کر بیلے والے پتن کی طرف عازمِ سفر ہو گیا۔

باتوں میں غایت درجہ انہماک کے سبب دونوں کو احساس تک نہیں ہوا تھا کہ بیڈ روم کی کھڑکی کو تھوڑا سا کھول کر مصباح اُن کے مابین ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ سُن چکی تھی۔ شہاب کی طرف سے پہلے دِل بدگمان تھا، اَب شدید نوعیت کی نفرت رَگ وپے میں اُتر کر سب کچھ جلائے دے رہی تھی۔

اُس نے سُنی ہوئی باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ پروفیسر وسیم کی اُسی جنت میں پہنچ چکی ہے جس کی نزدیک سے ایک جھلک دیکھنے کے لیے وجدان، افتخار بیگ کی منت سماجت کرتا رہتا تھا۔ وجدان یاد آیا تو پھر اُس کی آنکھوں میں کئی چہرے جھلملانے لگے، آنسوؤں کی نمی میں دھندلانے لگے لیکن اُن کے نقوش صاف دکھائی دیتے رہے۔

کہنے والے نے سچ کہا ہے کہ خونی رشتے حادثات کی گہری دُھند میں بھی دھندلایا نہیں کرتے۔

❁ ❁ ❁

تیز آندھی میں افتخار اور وجدان، مظہر عباس کی گاڑی میں شہاب خان کے دوست کی حویلی میں پہنچے۔ گاڑی سے اُترے تو خاک آلود ہوا کے تھپیڑوں نے استقبال کیا اور آنکھیں مٹی سے بھر دیں۔ پھڑ پھڑاتے کپڑوں کے جلو میں حویلی میں داخل ہوئے۔ مزارعین نے استقبال کیا۔ مظہر نے اپنا تعارف کراتے ہوئے خود کو شہاب کا دوست ظاہر کیا۔ لسی کا ایک ایک گلاس پینے کے بعد اُنہوں نے اپنے کام کا آغاز کیا۔

اُنہیں وہ جگہ دکھائی گئی جہاں پر رضی الدین کی لاش پڑی ملی تھی۔ وہاں اَب کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک بوڑھے مزارع نے بتایا کہ اُس نے کسی کی مدد سے خون اُٹھا لیا تھا اور اُس جگہ پر نئی مٹی ڈال دی تھی۔ قسمت اُن کا ساتھ دے رہی تھی۔ جونہی کمروں کو بہ نظرِ غائر دیکھتے ہوئے وہ اُس کمرے میں پہنچے جہاں شہاب اور مصباح کو قید کیا گیا تھا تو اُن کی نگاہ دیوار کی جڑ کے ساتھ پڑی چند ٹوٹی چوڑیوں پر پڑی۔ وجدان نے چونک کر چند ٹکڑے اُٹھا لیے اور افتخار سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''بھائی! یہ چوڑیاں یقیناً مصباح کی ہیں۔ وہ اِس رنگ کی چوڑیاں بڑے شوق سے پہنتی تھی۔''

افتخار نے بھی چوڑیوں کے چند ٹکڑے اُٹھا لیے۔ عجیب سی کیفیت ہونے لگی۔ پوری قوت سے مٹھی بھینچی تو کانچ کے ٹکڑے ہتھیلی میں چبھ گئے۔ وہ ہونٹ بھینچ کر بولا۔ ''یہ کسی اور کی بھی ہو سکتی ہیں۔''

مظہر نے مزارع کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا، پوچھا۔ ''یہاں خواتین بھی رہتی ہیں؟''

اُس نے نفی میں سر ہلایا اور مقامی زبان میں بتایا۔ ''نہیں پتر! یہاں سب چھڑے چھانٹ رہتے ہیں۔''

وجدان نے چوڑیوں کے ٹکڑے اُس کو دکھائے۔ ''یہ کس کی چوڑیاں ہیں؟''

اُس نے کندھے اُچکائے اور کہا۔ ''مجھے علم نہیں۔''

مظہر نے بوڑھے کو کریدا۔ نصف گھنٹے کی محنت کا ثمر یہی رہا کہ اُسے اور اُس کے ساتھیوں کو کسی بات کی خبر نہیں تھی۔ جب رضی الدین کے قتل کا خونی واقعہ پیش آیا، وہ چند میل دور زمین پر کام کر رہے تھے۔

وہ حویلی سے نکل کر اطراف کے ڈیروں پر گئے۔ کوئی سراغ ہاتھ نہیں لگا۔ ایک آدمی نے اُنہیں بتایا کہ اِس علاقے میں شیرے گرمانی کی بدمعاشی چلتی ہے۔ وہ مویشی اُٹھانے سے لے کر قتل تک، ہر واردات کر سکتا ہے۔ مظہر کے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ شیرا اپنے گروہ کے ساتھ دریا کے پار بیلے میں سے نکلتا ہے اور تہس نہس کر کے پھر وہیں چھپ جاتا ہے۔ ایک اور آدمی نے اپنی بھڑاس نکالی۔ ''او بھائی جی! کیا

پوچھتے ہو؟ یہاں اندھیر نگری ہے اور سردار صاحب کا راج ہے جو صرف چوپٹ کرتا ہے۔"

افتخار نے چونک کر پوچھا۔ "کون سردار صاحب؟"

اُس نے سردار اَرباب خان کا نام لیا۔ تینوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور واپسی کا قصد کیا۔ کافی دیر تک تینوں نے درپیش صورتِ حال پر بحث کی اور اِس نکتے پر اتفاق کیا کہ رضی الدین کے قتل اور مصباح کے اغوا میں سردار اَرباب خان اور اُس کے بدمعاشوں کا ہی ہاتھ ہے۔ اُنہوں نے شدّت سے محسوس کیا تھا کہ حویلی میں موجود تمام مزارعین بہت سی باتیں چھپا گئے تھے اور اُنہوں نے شہاب خان اور مصباح کی حویلی میں آمد کے موضوع پر یکسر لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ مظہر نے بالخصوص کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا۔ "بڑی عجیب بات ہے۔ شہاب کے بغیر اُس کے تینوں دوستوں کا اِس حویلی میں آنا بے معنی نظر آتا ہے۔ فرخ اور بابر دونوں تعلیم یافتہ ہیں۔ رضی کو کسی وجہ سے مارنا ہی اگر چاہتے تھے تو اِس بھونڈے انداز میں قتل نہ کرتے۔ اپنے نقش پا چھوڑتے ہوئے گولی ہی مارنی تھی تو اُسے شہر سے اتنی دور لانے کی کیا ضرورت تھی۔ شہاب نے تم دونوں کو بے وقوف بنایا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مصباح کہاں ہے۔"

تینوں تھانے پہنچے۔ اپنے کیس کی پیش رفت نہ دیکھ کر برہم ہو گئے۔ تھانے کا انچارج کہیں گیا ہوا تھا، ایک سب انسپکٹر اُس کی نشست پر براجمان تھا۔ سمجھانے کے سے انداز میں بولا۔ "تم لوگ سمجھتے ہو کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ پوری کوشش کے باوجود لڑکی کا کوئی سراغ نہیں مل رہا۔ ہمارے پاس الٰہ دین کا چراغ نہیں کہ اُسے رگڑ کر جن سے پوچھ لیں کہ وہ کہاں ہے۔ جونہی کوئی پتا خبر ملے گی، ہم کوئی وقت ضائع کیے بغیر ریڈ کریں گے۔"

مظہر نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "انور صاحب! کیا آپ کو یقین ہے کہ شہاب اور اُس کے دونوں گرفتار ساتھیوں کو مصباح کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں؟"

اُس نے پورے وثوق سے کہا۔ "اُن کا اِس اغوا سے کوئی تعلق نہیں۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"میں نے اِن دونوں کو بتایا تھا، پھر بتائے دیتا ہوں کہ جس دِن آپ کی بچی گھر سے غائب ہوئی اُس سے دو دِن پہلے شہاب صاحب حادثے کا شکار ہو کر ہاسپٹلائز ہو چکے تھے۔ میں نے آپ کے دونوں ساتھیوں کو اسپتال کی رپورٹیں بھی دکھائی تھیں۔ اگلے دِن رضی الدین کو فرخ اور بابر نے قتل کر دیا۔ وہ تب سے حوالات میں پڑے ہیں۔ اَب آپ ہی بتائیں کہ اُن تینوں کا اِس واقعے سے کوئی تعلق بنتا ہے؟" سب انسپکٹر نے مظہر کو مخاطب کر کے تفصیل سے بتایا۔

مظہر نے فائل میں رکھے مختلف کاغذات دیکھے۔ اسپتال کی جملہ رپورٹس اور قتل کی ایف آئی آر سب انسپکٹر کے بیان کی تصدیق کر رہی تھیں۔ اُسے دِل ہی دِل میں تسلیم کرنا پڑا کہ سردار اَرباب خان نے اپنے بیٹے کو صاف بچانے کے لیے کاغذات کی لاٹھی سے عدالتی جنگ، چھڑنے سے قبل ہی جیت لی تھی۔ اُس نے کہا "آپ بطورِ احتیاط تینوں کو زیرِ تفتیش رکھ لیں تو ممکن ہے......"

سب انسپکٹر نے نیم درشتی سے مظہر کی بات کاٹ دی۔ "قانون ثبوت دیکھتا ہے۔ ثبوت دکھاتے ہیں کہ تینوں کا لڑکی کے اغوا میں کوئی کردار نہیں ہے۔ پھر وہ کوئی معمولی ہستی والے لوگ نہیں ہیں، اُن پر کچا ہاتھ ڈالیں گے تو ہاتھ سلامت نہیں رہے گا۔ آپ اُسے تلاش کرنے کی کوشش کریں، ہم بھی کر رہے ہیں۔ اللہ چنگی کرے گا۔"

مظہر علی نے چوڑیوں کی طرف اُس کی توجہ مبذول کرائی تو اُس نے ذرہ بھر بھی اہمیت نہیں دی بلکہ صاف جھٹلا دیا کہ چوڑیاں کسی کی بھی ہو سکتی ہیں، اِن پر مصباح کا نام لکھا ہوا نہیں ہے۔

تینوں گھر پہنچے تو اُن کے چہروں سے ہی مایوسی جھلک رہی تھی۔ سلطان علی اور اُس کی بیوی نے اُنہیں دیکھا اور کچھ پوچھے بغیر منہ پھیر لیا۔ وجدان نے صوفے میں گرتے ہوئے کہا۔ "ماما! نہ جانے اُسے زمین نگل گئی یا آسمان......"

ماما نے ہاتھ اُٹھا کر روک دیا، بولیں۔ "چپ رہو وجدان! میرا دِل اَبھی تک دھڑک رہا ہے تو اِس کا مطلب ہے کہ میری بیٹی زندہ ہے۔ تم اپنے بھائی کو فون کرو اور اُسے فوری طور پر یہاں پہنچنے کی تاکید کرو۔ مجھے یقین ہے کہ اُس کے آنے پر میری مصباح مجھے مل جائے گی۔ اُٹھو شاباش!"

سلطان علی نے خالی خالی نگاہوں سے اپنی بیوی اور جوان بیٹے کو دیکھا اور اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

"ماما! بھائی کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔"

"کیا اُس کا مستقبل میری بیٹی کی عزت اور جان سے زیادہ قیمتی ہے؟" ماما نے چیخ کر کہا اور پھر اُن کے منہ میں جو آیا، مظہر کی موجودگی کا خیال کیے بغیر تند آواز میں کہتی چلی گئیں۔

❁ ❁ ❁

شام تک مصباح کی حالت خاصی بہتر ہو چکی تھی۔ بخار کی شدّت میں بھی کمی واقع ہو گئی تھی۔ وہ پروفیسر کے سہارے کے بغیر آہستہ آہستہ چلنے کے قابل ہو گئی تو پروفیسر نے اُسے وارڈ روب سے اپنا ایک لباس نکال کر دیا اور باتھ روم کا راستہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "خیال کرنا، پانی بہت ٹھنڈا ہے۔ پہلے بازوؤں اور ٹانگوں پر پانی ڈالنا پھر سر پر ڈالنا ورنہ بخار دماغ اور حرام مغز کو متاثر کرے گا۔"

وہ اُسے تشکر بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ پروفیسر اُسے قدم قدم چلتے ہوئے دیکھتا رہا اور جب باتھ روم کا دروازہ بند ہو گیا تو پلٹ کر کچن میں آ گیا۔ اُس نے دوپہر میں کانٹے کی مدد سے ڈیڑھ دو کلو وزنی ڈنبھرا پکڑی تھی جو اُس کی اشتہا کو تسلسل سے مہمیز کر رہی تھی۔

مصباح، باتھ روم سے نکل کر، کچن کی المونیم کی چوڑی پٹی والی دہلیز کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کھڑی ہوئی تو پروفیسر کو اُس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ پلٹ کر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ دُنیا کو بدلتے دیکھا تھا مگر کسی دُنیا والے کو یوں چند منٹوں میں اُس نے بدلتے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ وہ نقاہت کے مارے دروازے میں چپکی کھڑی تھی۔ وہ فرطِ استعجاب سے اُسے مردانہ سوٹ میں ملبوس، ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ وہ خفت زدہ ہو کر کچن کے دروازے سے ہٹ گئی۔ قدموں کی چاپ سے پروفیسر نے اندازہ لگایا کہ وہ بیڈ روم میں گھس گئی تھی۔ اُسے اپنی نگاہ کی بے حجابی اور دیدہ دلیری پر ندامت سی ہونے لگی۔ اپنا ندیدہ پن اُسے بُری طرح کھلنے لگا۔ خود کو کھانا تیار کرنے میں مشغول کرتے ہوئے کچن کے دروازے میں ٹھہرے ہوئے عکس کو محو کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ناکام ہوا تو سر جھٹکتے ہوئے سوچنے لگا۔ "سموں کے آتش فشاں وجود کو دیکھ کر میں اپنی نظر پر اختیار رکھتا تھا، اَب اتنا بے اختیار کیوں ہو رہا ہوں؟"

فرائنگ پین میں چمچ ہلاتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ "مصباح کے برہنہ وجود کی ایک ایک جولانی کو دیکھتے وقت احساسات میرے قابو میں تھے پھر یہ کیا ہوا کہ اُس کے چھپنے پر دل کی دنیا زیر و زبر ہونے لگی ہے۔ سموں میرے جذبات میں یہ ہلچل نہیں مچا سکی تھی حالانکہ اُس سے ایک کٹے ہوئے ربط کا ناتا قائم تھا۔ یہ اجنبی ہے اپنا آپ گنوا کر آئی ہے۔"

اچانک جیسے ہوا کے کسی سرپھرے جھونکے نے ذہن کی تختی صاف کر دی ہو۔ وہ خود کو ملامت کرنے لگا۔ سمجھانے لگا کہ اُس کی نظر اُسے شکست دلانے کا اہتمام کر رہی ہے، اِسے انتشار سے بچانا ہوگا۔ سمجھ آنے لگا کہ کیسے عورت کا وجود دُنیا فتح کرنے کی ترغیب دیتا ہے؟

جب وہ بڑی سی ٹرے میں کھانے کے تمام تر لوازمات سجائے بیڈ روم میں داخل ہوا تو اُسے صوفے پر براجمان پایا، بولا۔ "کیا تم خود کو بہتر محسوس کر رہی ہو؟"

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پروفیسر نے کہا۔ "اِدھر آ جاؤ، کھانا کھاؤ، جسم میں توانائی بھرے گی تو مزید بہتر محسوس کرنے لگو گی۔"

وہ اُٹھ کر بیڈ پر آ گئی۔ پروفیسر نے ریگزین کا دسترخوان بیڈ پر بچھایا اور کھانا چننے کے بعد خود سرہانے کی جانب آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ سمٹ کر سامنے بیٹھ گئی۔ پروفیسر نے اُسے ناقدانہ نگاہوں سے دیکھا۔ چہرہ چھوٹے چھوٹے اَن گنت سیاہ کھرنڈ سے بھرا ہوا تھا۔ میل، خون اور پاؤڈر اُتر چکا تھا اور نیچے سے ملیح جلد نکل آئی تھی۔ ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیص بھی اُس کے تن پر سج رہی تھی۔ مصباح نے اُس کے انہماک کو تاڑ لیا اور جھینپ گئی۔ سر جھکا کر نوالہ توڑنے لگی۔ مچھلی دیکھ کر ڈر گئی، بولی۔ "اِس میں کانٹے ہوں گے۔"

پروفیسر نے کندھے اُچکا کر کہا۔ "وہ تو ہوں گے ہی!"

وہ بڑی آہستگی سے ایک ٹکڑا اُٹھا کر کانٹے چننے لگی۔

پروفیسر نے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

اُس نے چونک کر سر اوپر اُٹھایا پھر جھک گئی، بولی۔ "آپ جانتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" پروفیسر بھونچکا رہ گیا۔

لہجہ مزید دھیما ہو گیا۔ "آپ ڈاکو کے منہ سے پوری تفصیل سن چکے ہیں۔ میں مصباح ہی ہوں۔ افتخار بیگ کی کزن، وجدان کی بہن۔"

پروفیسر کے منہ سے "اوہ" کی لمبی سی آواز نکلی، بولا۔ "تو تم نے ساری باتیں سن لی تھیں؟"

"جی......" مصباح نے کہا اور کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ "اُس نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ میرے ساتھ بہت بُرا ہوا ہے اور شاید میں ہی قصوروار ٹھہرتی ہوں۔ اِس سے کہیں بہتر تھا کہ مجھے موت آ جاتی مگر میں اتنی خوش بخت واقع نہیں ہوئی۔"

"کھانے سے ہاتھ مت روکو، ہم یہ باتیں کسی اور وقت پر ٹال دیتے ہیں۔" پروفیسر نے جلدی سے کہا اور اپنی پسندیدہ مچھلی کا ایک تلا ہوا ٹکڑا چبانے لگا۔

مصباح نے کھانا کم کھایا۔ وہ کم کھانے کی عادی تھی۔ نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی۔ "کیا یہاں ٹیلی فون موجود ہے؟"

پروفیسر نے استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا، پوچھا۔

"کہاں فون کرنا چاہتی ہو؟"

"اپنے گھر والوں کو یہاں کا پتا دینا چاہتی ہوں تا کہ وہ آ کر مجھے لے جائیں۔" مصباح نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"کیوں؟ کیا میں تمہیں گھر پہنچانے کی طاقت نہیں رکھتا؟"

"نن...... نہیں سر! ایسی بات نہیں ہے۔ آپ کو تکلیف ہوگی۔" وہ سہم گئی۔

"کیا اب تک تم مجھے راحت دیتی رہی ہو؟" پروفیسر کے لہجے میں تلخی گھل گئی۔ "جب سے آئی ہو، تم نے مجھے ایک پل کو چین نہیں لینے دیا۔ اب اگر باتیں کرنے کے قابل ہو ہی گئی ہو تو جانے کی فکر میں ہلکان ہو رہی ہو۔ انسان کو اتنا بھی خودغرض نہیں ہونا چاہیے۔ اگر مر جاتیں تو کیا تمہارے گھر والے تمہاری لاش اُٹھانے یہاں آتے؟"

وہ سہمی سہمی نگاہوں سے پروفیسر کو دیکھنے لگی۔ اُس کے پاس ضد کا اختیار نہیں تھا۔ سمجھ گئی کہ پروفیسر کو اُس کی بات بے محل اور ناگوار لگی ہے، بولی۔ "میں معافی چاہتی ہوں سر! دراصل...... وہ...... میرے لیے بہت پریشان ہوں گے۔ مجھے کافی دن ہو گئے......"

"تم فکر نہ کرو۔ آرام سے رہو، جب مناسب سمجھوں گا، تمہیں گھر پہنچا دوں گا۔" پروفیسر نے کھانا سمیٹتے ہوئے حتمی انداز میں کہا۔ "ویسے میرے پاس سیلولر فون موجود ہے، جب چاہو رابطہ کر کے اپنی خیریت کی خبر دے سکتی ہو۔ یہ مت بتانا کہ تم پروفیسر وسیم کی جنت میں موجود ہو۔"

اُس کا ذہن پروفیسر کے اِس رویے کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ بڑے دِنوں کے بعد پیٹ بھر کر اچھا کھانا کھایا تھا۔ ہضم نہیں ہو پا رہا تھا۔ پروفیسر سے معدے اور سینے میں جلن کی شکایت کی تو اُس نے کہا "بیڈروم سے نکل کر عرشے پر گھومو پھرو، اپنے جسم کو حرکت دو، نظامِ ہضم درست ہو جائے گا۔ میرے ساتھ آؤ، تمہیں جڑی بوٹیوں کی بنی پھکی دیتا ہوں، گیس اور سینے کی جلن کو فوراً ٹھیک کر دیتی ہے۔"

وہ پروفیسر کے پیچھے چلتے ہوئے ڈسپنسری تک آئی۔ پروفیسر نے پھکی کی بھری ہوئی چمچ اُس کی کھلی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے پانی کے ساتھ نگل لینے کا مشورہ دیا۔ وہ پلٹ کر بیڈروم میں آ گئی اور پانی کے بھرے جگ کی طرف بڑھ گئی۔ ایسے میں سوچ رہی تھی کہ وہ سونے سے پہلے وجدان کو فون کر کے اپنے محفوظ ہونے کی خبر سنا دے گی۔ ایسے میں اچانک دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ حلق میں اُترتا پانی تھم گیا، بڑبڑائی۔ "مگر میرے پاس تو کسی کا نمبر ہی موجود نہیں ہے، فون کس کو کروں گی؟"

اُسے سوائے اپنے نمبر کے کوئی نمبر یاد نہیں رہتا تھا، اِس لیے اُس نے تمام فون نمبر اپنے موبائل فون میں فیڈ کر رکھے تھے۔ فون گم ہونے کے ساتھ ساتھ سبھی رابطے گم ہو گئے۔ عرشے پر آئی، پروفیسر کے قریب ہو کر بولی۔ "سر! ایک پرابلم ہے۔ میرے پاس کسی کا نمبر موجود نہیں ہے۔"

پروفیسر نے مسکراتی نظروں سے اُسے دیکھا، دل میں عافیت جاگ پڑی، بولا۔ "پھر کیا ہوا؟ تم بالکل تندرست ہو جاؤ، تمہیں گھر پہنچا دوں گا۔"

اُسے یقین نہیں آیا۔ تشکیک آنکھوں سے جھلکنے لگی۔ پروفیسر نے گھور کر دیکھا۔ "کیا تمہیں میری بات پر یقین نہیں آ رہا ہے؟"

وہ گومگو کی حالت میں تھم گئی۔ آنکھیں بولنے لگیں۔ "شہاب کے بعد مجھے کسی پر یقین نہیں رہا، وہ بُرا ہے، دُنیا اُس سے بھی زیادہ بُری ہے۔"

پروفیسر نے اُس کے گال پر چپت لگائی۔ "تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، اُسے بھول جانے میں ہی عافیت ہے۔ کم آن! تمہیں جنت کی سیر کراؤں، عام حالات میں شاید تمہیں یہاں قدم رکھنے کی بھی اجازت نہ ملتی۔"

وہ پروفیسر کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ اُس وقت کو جی ہی جی میں کوسنے لگی جب وہ شہاب کی گاڑی میں بیٹھ کر اُس کی ماں سے ملنے کے لیے چل پڑی تھی۔ کاش! گزرا ہوا وقت لوٹ کر آتا ہو۔ سامنے کی تمام لائٹس پر پروانوں کی یلغار ہو گئی تھی۔ عقبی حصے کی روشنیاں گل تھیں۔ پروفیسر اُسی سمت کی سیڑھیوں پر پانی میں پیر ڈال کر بیٹھ گیا۔ وہ ریلنگ کو تھام کر کھڑی رہی۔ سوچنے لگی۔ "اتنے گہرے پانی میں گرنے کے بعد میں زندہ کیسے بچ گئی؟"

بے دھیانی میں پوچھ بیٹھی۔ "سر! پانی کتنا گہرا ہے؟"

"یہی کوئی دس بارہ فٹ...... کیا نہانے کا ارادہ ہے؟" پروفیسر کا لہجہ غیر متوقع طور پر شگفتہ ہو گیا تھا۔

اُس نے خوف کے مارے جھرجھری لی، بولی۔ "ڈوب جاؤں گی۔"

"دو ڈھائی کلومیٹر دور سے بہتی آئی ہو، ڈوب مرنے سے بچ گئی ہو، اَب مرنے والی نہیں ہو۔" پروفیسر نے کہا اور اپنی عادت کے مطابق دونوں ہاتھوں کی کھلی ہتھیلیاں زور سے پانی کی سطح پر ماریں۔ "چھپاک" کی زوردار آواز پیدا ہوئی۔ پھر یہ آواز مسلسل پیدا ہونے لگی۔

وہ شام کو چائے پینے کی عادی تھی۔ ماما بغیر تقاضے کے

چائے کا کپ اُس کے کمرے میں پہنچا دیتی تھیں۔ اَب دل چاہ رہا تھا مگر کہنے سے ہچکچا رہی تھی۔ ڈرتے ڈرتے بولی۔ "سر! کیا آپ کے لیے چائے بنا لاؤں؟"

پروفیسر نے چونک کر اُسے دیکھا اور کندھے اُچکا کر بولا۔ "اگر تم خود کو بالکل فٹ محسوس کرتی ہو تو کچن سنبھال سکتی ہو۔"

اُسے اجازت درکار تھی۔ فوراً کچن کی طرف بڑھ گئی۔ دس پندرہ منٹ کے بعد چائے کے دو کپ چھوٹی سی ٹرے میں رکھے عقبی سیڑھیوں پر آ گئی۔ پروفیسر کو چائے پیش کرنے کے بعد ریلنگ کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور چائے پینے لگی۔ پروفیسر کی آواز کانوں میں پڑی۔ "مصباح! تم اپنے دوست شہاب کے بارے میں کیا کہتی ہو؟"

اُس کے ہونٹ نفرت سے بھنچ گئے، بولی۔ "وہ بہت بُرا نکلا۔"

"اور اُس کا باپ؟"

"اُس سے بھی کہیں زیادہ بُرا۔"

"افتخار کو سوچتی ہو؟"

"نہیں۔ میں اُس کے قابل نہیں رہی۔" مصباح کے لہجے میں یاس شامل ہو گئی۔

"کیا کھو گیا ہے تمہارا جو اِس انداز سے سوچنے لگی ہو؟"

"بچا ہی کیا ہے جس کے برتے پر افتخار کے سامنے جاؤں گی۔"

"کیا یہ حادثہ تمہاری مرضی سے پیش آیا ہے؟"

"نہیں تو...... کون قیامت کو گلے لگاتا ہے۔" وہ چائے کا کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے مایوسی سے بولی۔

"روڈ ایکسیڈنٹ انسان کی مرضی کے بغیر ہو جاتا ہے، بالکل ایسے ہی تمہارے ساتھ بھی حادثہ پیش آ گیا۔ تم مجرم نہیں، بدقسمت ہو۔" پروفیسر نے چائے کا کپ پانی میں دھونے کے بعد اُسے تھما دیا۔

"عورت کے پاس کچھ نہ ہونے کے باوجود بہت کچھ ہوتا ہے، وہ بھی نہ رہے تو اُس کی قیمت دو ٹکے بھی نہیں رہتی۔"

"کیا بکنے والی چیز اپنا مول آپ طے کرتی ہے؟"

"طے یقیناً نہیں کرتی مگر بتاتی ضرور ہے۔" مصباح نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میں بدنام ہو چکی ہوں۔ اب ہر کسی کو میرا روندا ہوا جسم دکھائی دینے لگے گا۔"

"میرا خیال ہے افتخار تمہیں اُسی محبت سے قبول کر لے گا جس محبت کی تم حقدار ہو۔" پروفیسر نے پُریقین لہجے میں کہا۔

"یہ اُس کے ظرف پر منحصر ہو گا مگر میں شرم سے نظریں جھکا کر زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکوں گی۔ میں محبت کے تمام تر حقوق گنوا بیٹھی ہوں۔"

"یعنی تم اُس سے شادی نہیں کرو گی؟"

"یقیناً نہیں۔" اُس کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"او کے!" پروفیسر نے پانی کے ساتھ کھیلتے ہوئے کہا۔ "شیرے نے تمہیں اغوا کیا، مجھے تفصیل بتا دی۔ اُس سے پہلے کیا ہوا تھا؟ صرف تم ہی جانتی ہو، اگر بتا دو تو میری بے چینی دور ہو جائے گی۔"

دونوں اِس انداز سے بیٹھے تھے کہ باتیں کرتے ہوئے آنکھیں چار نہیں کر سکتے تھے۔ اندھیرا بھی طاری تھا۔ تبھی مصباح بہ آسانی بولے جا رہی تھی۔ اپنے پیروں کے ناخنوں سے کھیلتے ہوئے بتانے لگی کہ کیسے وہ شہاب کی ماں سے ملنے کے لیے شہاب کے ساتھ شہر سے نکلی اور کیسے پولیس والوں نے اُنہیں گرفتار کر کے اُس حویلی میں پہنچایا جہاں سے شیرے گرمانی نے اُسے اُٹھا لیا۔ بتاتے بتاتے اُس کو ازخود سمجھ آنے لگی کہ پولیس والے جعلی تھے، ساری کارروائی شہاب کا ترتیب دیا ہوا منصوبہ تھا اور نکاح اِس تمام تر ڈرامے کا ڈراپ سین تھا۔

پروفیسر کو جمائیاں آنے لگیں۔ مسلسل بے آرامی کے باعث مضمحل دکھائی دے رہا تھا۔ اسٹور سے فولڈنگ چارپائی اٹھا کر چھت پر لے آیا۔ مچھردانی بڑے سائز کی تھی مگر دو چارپائیوں پر اِس صورت میں پوری ہو سکتی تھی کہ دونوں چارپائیوں کے مابین فاصلہ نہ رکھا جائے۔ پروفیسر کے ذہن پر غنودگی سوار ہو ہی رہی تھی کہ موبائل فون پر پہلے افتخار بیگ کی کال آئی، پھر ڈاکٹر اَشو لال کی۔ اُس نے یکے بعد دیگرے دونوں کینسل کر دیں اور پھر فون کو بند کر کے سرہانے رکھ لیا۔

❁ ❁ ❁

سردار اَرباب خان کی کھوپڑی میں ابلیس کا ذہن پرورش پا چکا تھا۔ ایک کڑی کو دوسری کڑی سے اِس طرح سے ملاتا تھا کہ انسانی ہاتھوں سے کبھی نہ ٹوٹ پانے والی زنجیر بن جاتی تھی۔ اُس نے بڑی چالاکی سے نہ صرف مصباح سے جان چھڑالی تھی بلکہ اپنا اور شہاب خان کا لباس بھی چھینٹوں سے بچا لیا تھا۔ ایسے میں بھول گیا کہ ہر زنجیر کا دوسرا سرا قسمت اپنی گرفت میں سنبھالے رکھتی ہے۔ دستِ قدرت کی خفیف سی حرکت قیامت برپا کر دیتی ہے۔

ہر صبح کا سورج ڈوبنے کے لیے اُبھرتا ہے۔ ڈوب کر پھر اُبھرتا ہے۔ ایسے ہی سیاست کا سورج کبھی ٹھہرا نہیں، جلتے پیروں چلتا رہتا ہے۔ سردار اَرباب خان فتوحات کے

نشے میں سرپٹ دوڑتا ہوا ٹھٹک کر رُک گیا۔ وہ عوام کا منتخب نمائندہ ہوتا تو کوئی اُس کے پایۂ اقتدار کو جھنجوڑنے کی جرأت نہ کرتا مگر وہ شارٹ کٹ اختیار کر کے نظامت کی مسند پر بیٹھا تھا۔ بیٹھانے والوں کو اُس کی کوئی اَدا ناگوار گزری تو اُس سے استعفیٰ طلب کرلیا گیا۔ مہلت بہت کم دی گئی تھی۔ اُس کا دَم رُکنے لگا۔ جانتا تھا کہ اُس نے ضلعی بساط پر اپنے مہروں کو اتنا پھیلا رکھا تھا کہ اُنہیں سمیٹتے سمیٹتے دو تین مہینوں کی مہلت درکار تھی۔ اپنے آقاؤں کے در پر سجدہ ریز ہوا مگر قبولیت کی گھڑی اُس کی جھولی میں نہ گری اور اقتدار کا ہُما اُس کے سر سے اُڑ کر مخالف سیاستدان کے سر پر جا بیٹھا۔ اپنی محل نما کوٹھی میں پہنچنے سے پہلے پورے ضلع کی عوام تک اُس کی بے دست و پائی کی خبر پہنچ گئی۔ مبارک باد دینے کے لیے اِس محل کے دروازے پر ہر کوئی آیا تھا، افسوس کرنے کے لیے وہی چند لوگ پہنچے تھے جو سیاست کے پَل پَل بدلتے موسموں سے بہ خوبی آگاہ تھے۔ جانتے تھے کہ آج دارالحکومت سے چہرے پر شگفتگی کی تحریر سجا کر آنے والا کل ڈھول کی تاپ پر شہر میں داخل ہوگا۔

مخالف دھڑا شاید اِسی تاک میں بیٹھا تھا۔ کرسی نشین بدلنے کے ساتھ ہی گلی کوچوں میں اَن گنت کھمبیاں اُگ آئیں۔ ایسے میں نئے ناظم چوہدری امتیاز رفیق کی نظر التفاف مصباح کے غیاب پر جا لگی۔ سردار اَرباب خان کے حلق میں ہڈی پھنس گئی۔ سوچتا تھا کہ جونہی مصباح کا معاملہ سرد پڑا، کیس کی ریڑھ کو کمزور کروا کر بیٹے کے دوستوں کو باہر نکلوا لے گا مگر ایس ایچ او نے فوراً آنکھیں پھیرتے ہوئے کہا۔ ”سردار صاحب! چوہدری صاحب اِس کیس پر خصوصی توجہ دے رہے ہیں، میں اُن کی مرضی کے بغیر کوئی قدم اُٹھاؤں گا تو میرا انجام بہت بُرا ہوگا۔“

”تم میرا کام کرو، میں تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔“ سردار اَرباب خان نے کڑک دار لہجے میں کہا۔

ایس ایچ او نے ”میں کوشش کروں گا“ کہہ کر ٹال دیا۔ اُس نے یقیناً دل میں کہا ہوگا۔ ”خود پر آنے والی آنچ کو ٹال نہیں پائے، میری کیا مدد کرو گے؟“

ایسی باتیں کہنے کے لیے نہیں ہوتیں، خاموش رہ کر سمجھانے والی ہوتی ہیں۔ جو سمجھ جاتا ہے، وہ بچ جاتا ہے اور جو آنکھوں کے ساتھ ذہن کے دریچے بند کرلیتا ہے وہ تباہی سے دوچار ہوجاتا ہے۔ اَرباب خان سمجھانے سے بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔ دل کو یک گونہ تسلی تھی کہ اُس نے مصباح کے کیس کو بے جان کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ چوہدری امتیاز رفیق لاکھ کوشش کرے، کچھ بگاڑ نہیں سکے گا۔

اُس کے گلے میں اٹکنے کے لیے وین ژو سے ہڈی سر کے بل دوڑتی ہوئی آچکی تھی۔ عمران نے آرام کیے بغیر مصباح کی تلاش شروع کردی۔ چوہدری امتیاز رفیق کا بیٹا اعجاز رفیق اُس کا کلاس فیلو تھا۔ دونوں تیسری جماعت سے ایف ایس سی تک اکٹھے پڑھتے رہے تھے۔ اُن کی دوستی کو دیکھ کر بھی رشک کرتے تھے۔ اعجاز اُسے لے کر اپنے باپ کے کمرے میں پہنچ گیا۔ چوہدری امتیاز نے بڑی توجہ سے اُسے سنا۔ سر ہلاتے ہوئے گہری سوچ میں پڑ گیا۔ خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ ”سردار اَرباب کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے۔ سدھانے کے چکر میں پڑنے والے کو سو بل پڑ جاتے ہیں۔ بہرحال! تم اعجاز کے دوست ہو، میرے بیٹے ہو، تمہاری مدد ضرور کروں گا۔“

اُس نے متعلقہ تھانے میں فون کیا۔ ایس ایچ او سے مصباح کے کیس کی تفصیل طلب کی۔ ایس ایچ او نے اُس سے کافی دیر تک نہ جانے کیا کچھ کہا، سُن کر چوہدری امتیاز کے لبوں پر زہرخند مسکراہٹ تیرنے لگی، بولا۔ ”جو کچھ کر چکے ہو، ٹھیک کر چکے ہو۔ اَب مزید ٹھیک کرنے کی تدبیر سوچو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ مصباح کے ملنے پر تمہارا منہ موتیوں سے بھر دوں گا۔“

ٹیلی فونک گفتگو خاصی طویل رہی۔ رابطہ منقطع ہونے پر چوہدری امتیاز نے اپنی سفید ڈاڑھی میں خلال کرتے ہوئے کہا۔ ”عمران پتر! کام اَوکھ میں پڑ گیا ہے۔ تمہاری بہن سردار اَرباب کے پالتو کتوں کے نرغے میں قید ہے۔ رَب جانے، زندہ ہے، مرگئی ہے......“

عمران کے بدن کو جھٹکا سا لگا۔ فرطِ غیظ سے منہ سِل گیا۔ اعجاز نے کندھے پر ہاتھ مار کر دلاسا دیا۔ ”عمران! فکر نہ کرو۔ پاپا نے کہا ہے کہ وہ تمہاری مدد کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ پاپا مصباح کو ڈھونڈ نکالیں گے۔“

چوہدری امتیاز نے کن اکھیوں سے سینہ پھلا کر بڑا بنتے بیٹے کو دیکھا اور کہا۔ ”اعجاز کو شاید اِس معاملے کی سنگینی کا احساس نہیں ہے۔ دریائی بیلے کے خونی درندوں کے پنجوں سے اُسے نکال لانا آسان نہیں ہے مگر اِس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہم کچھ نہیں کرسکتے۔“

چوہدری کو بات کرنے کے دوران میں کچھ یاد آ گیا۔ فون اُٹھا کر کسی کا نمبر ملانے لگا۔ رابطہ ہونے پر بولا۔ ”چوہدری! شیرے گرمانی سے تم رابطے میں رہتے ہو، کیا

اُس سے کچھ منوا سکتے ہو؟“

دوسری جانب کی بات سُن کر بولا۔ ”ہاں یار! میں جانتا ہوں کہ اُس پر میرا عہدہ بالکل بے اثر ہے۔ وہ جو بھی مانگے گا، اُسے مل جائے گا۔“

عمران یک ٹک اُس کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کو دیکھ رہا تھا۔ وہ فون پر کہہ رہا تھا۔ ”لڑکی ہے۔ نام مصباح ہے۔ اُسے سردار اَرباب کے کہنے پر شیرے گرمانی نے کچے کی ایک حویلی سے اُٹھایا تھا۔ تم اُس سے رابطہ کرو اور لڑکی کی رہائی کے عوض جو بھی مانگے، مجھے آگاہ کرو۔“

فون بند ہوگیا۔ لمبی آہ بھر کر چوہدری نے کہا۔ ”دعا کرو کہ تمہاری بہن زندہ ہو۔“ اُس کا کہنے کا انداز یوں تھا جیسے کہہ رہا ہوں کہ ”سلامت تو خیر اُسے کیا رہنا ہے، خدا کرے کہ زندہ ہو۔“

اعجاز نے پوچھا۔ ”پاپا! آپ نے کس کو فون کیا ہے؟“

”تمہارے چچا، چوہدری عنایت اللہ کو۔ شیرا گرمانی اُس کا پرانا یار ہے۔ بہت مانتا ہے اُس کی۔“ چوہدری امتیاز رفیق نے کہا۔ اعجاز نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ جانتا تھا کہ چوہدری عنایت اللہ رشتے میں اُس کے باپ کا دور پار کا کزن ہے۔ سیاسی بساط پر چوہدری امتیاز رفیق کو فتح یاب کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتا رہا ہے۔

ایک مرتبہ پھر فون کا بزر بجا۔ اسکرین پر نمبر دیکھ کر چوہدری نے کہا ”لو! تمہارے چچا کا فون بھی آ گیا۔“

فون آن کیا، کان سے لگایا اور بولا۔ ”ہاں بھئی چوہدری! کیا رہا؟“

دوسری طرف کی بات سننے کے بعد اُس کے چہرے پر اندھیرا چھا گیا۔ آنکھیں موند کر دُکھ زدہ لہجے میں بولا۔ ”تمہیں یقین ہے کہ اُس نے جھوٹ نہیں بولا؟“

دوسری طرف کی بات سُن کر بولا۔ ”کب اور کیوں؟“

چوہدری عنایت اللہ کی آواز بھنبھناہٹ بن کر فون کے اسپیکر سے نکل کر اعجاز اور عمران کے کانوں تک پہنچ رہی تھی مگر بات کی سمجھ بالکل نہیں آ رہی تھی۔ دونوں اُمید بھری نگاہوں سے فون سننے میں منہمک چوہدری امتیاز رفیق کو دیکھتے رہے۔ رابطہ منقطع ہونے پر اُس نے دونوں کو باری باری دیکھا، سر جھکا لیا اور ڈوبے ڈوبے لہجے میں بولا۔ ”آہ! تمہاری بہن اَب اِس دُنیا میں نہیں رہی۔ اُن کم بختوں نے اُسے دریائے سندھ میں پھینک دیا ہے۔ چوہدری عنایت اللہ نے کہا ہے کہ اگر وہ دریا میں نہ بھی پھینکتے تو بھی وہ مر چکی ہوتی۔“

عمران کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ آنکھوں کی پتلیاں ٹھہر گئیں اور چند ہی لمحوں میں چہرہ لال بھبوکا ہوگیا۔ اعجاز فوری طور پر اُس کی بدلتی ہوئی کیفیت کو بھانپ گیا اور پانی کا گلاس اُس کے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولا۔ ”صبر کرو میرے دوست! ہماری بہن دُنیا میں نہیں رہی، شاید ہم بھی دُنیا میں نہیں رہے......“

عمران نے پانی نہیں پیا۔ نچلے ہونٹ کو دانتوں میں اِس زور سے بھینچا کہ دانت ہونٹوں میں کھب گئے۔ اعجاز کا رنگ اُڑ گیا، پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ اُسے یوں لگا جیسے کمرے کی ہر چیز عمران کے لب و لہجے میں بول اُٹھی ہو۔ ”ہائے میری مصباح! میری بہن! تمہیں اِس بے بسی کی موت سے دوچار کرنے والوں کو چُن چُن کر قتل کروں گا۔ اُن کے ناپاک لہو کو نالیوں میں بہاؤں گا، تم نہیں تو دُنیا میں کوئی نہیں...... میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا......“

دریا میں پھینکے جانے سے پہلے جو کچھ مصباح کے ساتھ ہوا تھا، اُس کے بھائی کو بتانے کی چنداں ضرورت نہیں تھی، وہ سمجھ گیا تھا۔

❀ ❀ ❀

دوپہر خاصی برہم تھی۔ وہ پروفیسر کا حکم مان کر سونے کے لیے لیٹی تو بہ صد کوشش نیند نہ آئی۔ بیڈ پر کروٹ بدلی۔ پروفیسر عین آنکھوں کے سامنے چوبی فرش پر بچھے نرم قالین پر تکیہ سر تلے دبائے پہلو کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اُس کے نتھنوں سے خراٹوں کی مدھم مدھم آوازیں خارج ہو رہی تھیں۔ وہ کافی دیر تک اُسے پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتی رہی۔ اُس کے خال وخد کو اَزبر کرتی رہی۔ سوچتی رہی۔ ”دُنیا کتنی مختلف ہے۔ ایک ہی وقت میں مَرد درندہ دکھائی دیتا ہے، مَرد ہی محافظ دکھائی دیتا ہے۔ مجھے چیر نے پھاڑنے والوں نے کتنا بڑا خطرہ مول لے کر مجھے اُٹھایا تھا۔ جس کے ہاتھ میں مفت کا مال بن کر لگی ہوں، وہ میری طرف آنکھیں بھر کر دیکھنے کا روادار بھی نہیں ہے۔ وائے حیرت! یہ کیا ماجرا ہے، وہ ہونٹ کیا تھے جن کی تشنگی سیراب ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی، یہ ہونٹ کیا ہوئے جن پر تشنہ مسکراہٹ دیکھنے کو بھی ترس گئی ہوں؟“

بنیان اور ٹراؤزر سے جھانکتا ہوا پروفیسر کا گٹھا ہوا مضبوط وجود بڑا پُرکشش دکھائی دے رہا تھا۔ بالوں کی قدرتی چمک اور عین سر پر لگے ائرکنڈیشنر کی ہوا میں بالوں کی فطری لرزش اُسے بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ جب سے آئی تھی، یہ پہلا موقع تھا جب وہ اپنے اور اپنے خاندان کے بارے میں نہیں سوچ رہی تھی بلکہ سامنے لیٹے ہوئے اَدھیڑ عمر مَرد کی شخصیت میں اُلجھ رہی تھی۔ اچانک دماغ پلٹ گیا۔

آنکھوں میں لاج بھر گئی۔ جسے انہماک سے دیکھ رہی تھی، اُس نے اُس کے پورے بدن کی عمارت کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ اس کی مرمت بھی کی تھی۔ یوں لگا جیسے اَبھی اُس کے ہاتھوں کی انگلیاں اُس کے جسم پر متحرک رہی ہوں۔ چہرہ گلنار ہوگیا اور آنکھوں پر بازو نے چھایا کردی۔

وہ اُٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ پردہ سرکا کر عرشے پر دیکھا۔ چمکتی دھوپ میں کسی شے پر بھی نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ آہستہ سے بیڈ سے اُتری، دَبے پاؤں کمرے سے نکلی اور عرشے پر آگئی۔ سائے سے نکل کر دھوپ میں آئی تو پیر جلنے لگے۔ فرش خاصا گرم تھا۔ وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے سیڑھیاں اُتری اور بھاگتے ہوئے ستون پر چڑھ گئی۔ ستون کی ریلنگ کو تھام کر نیچے کی طرف دیکھا تو دِل دھک سے رہ گیا۔ ستون کے عین وسط میں بنے ہوئے بڑے سوراخ کو دیکھا تو اُس کی ضرورت کے بارے میں سوچنے لگی۔

جنت پر ہچکولے محسوس ہوتے تھے۔ ستون ساکت تھا۔ وہ کئی منٹوں تک وہیں کھڑی رہی پھر یکا یک اُس کے دل کی کیفیت میں عجیب سا تغیر پیدا ہوگیا۔ اُس نے دونوں بانہیں پوری وسعت میں کھول دیں۔ چہرہ سوئے فلک اُٹھا لیا۔ ٹھنڈی آبی ہوا بدن میں سکون بھرنے لگی، سر پر قہر برساتا سورج اپنی حدت کا احساس دلانے لگا۔ کافی دیر گزر گئی۔ خالی الذہنی کی کیفیت میں اطراف میں کسی انسان کی موجودگی کو کھوجتی رہی۔ کوئی دکھائی نہیں دیا تو سوچ میں پڑ گئی۔ ”یہ میں کس جگہ آ گئی ہوں جہاں پروفیسر کے علاوہ کوئی انسان دکھائی نہیں دیتا۔“

دِل نے کسمسا کر دَبے لفظوں میں سمجھایا۔ ”اے پگلی! جنت میں کوئی کوئی ہوتا ہے، ہر کوئی نہیں ہوتا۔ پروفیسر جہاں موجود ہو، وہاں کسی اور کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔“

وہ ستون سے اُتر کر عرشے پر آ گئی اور ریلنگ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پانی میں ڈوبتی ابھرتی سیڑھیوں پر پروفیسر کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔ شلوار کے پائنچے اوپر کیے کافی دیر تک پانی میں بیٹھی رہی۔ نہ جانے کیا ہوا تھا کہ جلد از جلد گھر پہنچنے کی فکر کو نیند سی آ گئی تھی، شاید دِل کو قرار سا آ گیا تھا۔ وہ جانا چاہتی تھی مگر اَب اُسے پہلے جیسی جلدی نہیں رہی تھی۔

پھر اُسے اپنے تن پر اجنبی لباس کا خیال آ گیا۔ وہ کسی کی اُترن پہننے کی عادی نہیں تھی۔ قسمت پر شاکی ہونے لگی۔ اچھی خاصی مطمئن اور آسودہ زندگی میں یہ چند دِن نہ آتے تو کتنا اچھا تھا۔ اِن چند دِنوں میں اُس نے کیا کچھ نہیں دیکھ لیا تھا۔ سوچ سوچ کر دِل پر بوجھ پڑنے لگا۔ ریلنگ پر بازو رکھا، بازو پر پیشانی ٹکائی اور رونے بیٹھ گئی۔ اب یہ رونا عمر بھر کا تھا۔

وہ پروفیسر کو سوتے چھوڑ کر آئی تھی۔ اُسے یہ گمان تک نہیں ہوا تھا کہ پروفیسر اُسے سلانے کے لیے سونے کی اداکاری کر رہا تھا۔ اُس نے کن اکھیوں سے اُسے باہر جاتے دیکھا۔ دِل میں اندیشہ سرسرایا، کہیں وہ بوٹ میں بیٹھ کر بھاگنے کی کوشش نہ کرے، کہیں وہ کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھے، پھر کروٹ بدل کر لیٹ گیا اور ذہن کو توجیہہ پیش کرنے لگا۔ ”کوئی جیسے آتا ہے، ویسے ہی اُسے جانا پڑتا ہے۔ وہ میری مرضی کے بغیر جنت میں داخل ہوئی، میری مرضی کے بغیر یہاں سے چلی گئی تو کیا ہوگا؟ کچھ بھی تو نہیں۔ ویسے بھی وہ ٹھیک ہوچکی ہے، اُسے چلے جانا ہی چاہیے۔“

اِس بہلاوے نے زیادہ تقویت نہیں دی تو پریشان ہوگیا۔ سموں کی موجودگی اُس پر گراں گزر رہی تھی، یہ الگ بات تھی کہ اُس نے ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔ مصباح کی موجودگی اُسے ناگوار نہیں گزر رہی تھی اور یہ بہت غلط بات تھی۔ اُس نے سوچا۔ ”میں بدل رہا ہوں، میرا دِل بدل رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے گرد عورت ذات کا تشخص اپنا حصار باندھنے لگا ہے؟“

اِنہی سوچوں نے اُسے ڈھیلے ڈھالے لباس میں چھپے بدن کی قیامتوں کی طرف دھکیل دیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ایسے میں چشمِ تصور میں وہی کٹا پھٹا بدن لہرانے لگا۔ ڈبھرا کا وجود کیا چمکدار ہوگا، بٹی کے بدن میں کیا لچک ہوگی، ملمی کے ماس میں کیا گداز ہوگا، سب کچھ تو اُسی بدن نے اپنے پاس رکھ چھوڑا تھا جو اپنی توانائیاں کہیں گنوا کر اُس کی پناہ میں آیا تھا۔ جب چھوڑ رہا تھا، تب کچھ بھی نہیں تھا۔ اَب سوچ رہا تھا تو پورا بدن پسینے میں شرابور ہوا جا رہا تھا۔ ائرکنڈیشنر کی غیر معمولی ٹھنڈک بھی رائگاں جاتی دکھائی دی تو قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ دفعتاً یوں لگا جیسے مصباح کی موجودگی اُس کے لیے ناگزیر ہوگئی ہے۔ اُس نے دانت بھینچ کر پوری سختی سے سر کو دائیں بائیں نفی کے سے انداز میں حرکت دی جیسے وہ اپنی تمام تر توانائیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اِس خیال کو جھٹلا رہا ہو۔

اسے یاد آیا۔ ایک بار ڈاکٹر اشولال نے کہا تھا۔ ”دُنیا بہت خوبصورت ہے مگر عورت دُنیا سے کہیں زیادہ خوبصورت واقع ہوئی ہے۔“

پروفیسر نے اُس کی بات سُن کر قہقہہ لگایا تھا، استہزائیہ

انداز میں جھٹلایا تھا اور کہا تھا۔ ”مریم اور رُباب کو یکے بعد دیگرے میں نے بھی خوبصورت قرار دیا تھا۔ دونوں نے اپنے حسن میں چھپے زہر کو مجھ پر انڈیلتے ہوئے ثابت کیا تھا کہ حسن موت کا دوسرا نام ہے، موت عورت کا کریہہ روپ ہے......“

اپنا کہا نا معتبر نہیں ہوتا مگر اُسے اپنے شبدوں پر بھی شاید اعتبار نہیں رہا تھا۔ سر تھام کر بیٹھ گیا۔ دِل نے سمجھایا۔ ”کب تک خود کو جھٹلاتے رہو گے، انسان بنو اور انسان کی فطری حسن پرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جنت کو حور کے وجود سے پُر کردو۔“ اسے اچانک ایک جھٹکا لگا۔

”افتخار بیگ!“ اُس نے زیرِ لب کہا۔ یوں لگا جیسے کسی نے کھوپڑی کے عقب میں پوری قوت سے ہتھوڑا دے مارا ہو۔ وہ مصباح کو چاہتا تھا۔ چاہت بھی ایسی جس پر قربان جانے کو جی چاہتا تھا۔ ضمیر نے کچوکا دیا۔ ”پروفیسر وسیم! تم کیسے احسان فراموش انسان ثابت ہورہے ہو؟ افتخار بیگ نے تم پر کیا، کیا احسانات نہیں کیے، تمہارے خواب کو تمہاری ہتھیلی پر سجا کر رکھتے ہوئے اُس نے کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا۔ مہینوں سر کھپانے اور مصروف رہنے کی کوئی اجرت نہیں مانگی۔ اُس نے تمہیں اپنی محبت سے آگاہ بھی کردیا، پھر تم اتنے گھٹیا کیوں نکلے، اپنے محسن پر شب خون مارتے ہوئے تمہارے خون تک نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ تم دُنیا کو ترک کرنے کے بنیادی سبب کو گنوا چکے ہو، دُنیا اور جنت کے مابین حائل عظیم فرق کو ملیامیٹ کرچکے ہو، آہ! لعنت ہے تم پر!“

اُس کا سر دُکھنے لگا۔ اُٹھا اور بے اختیار مصباح کے تعاقب میں بیڈروم سے نکالا۔ اَدھ کھلے دروازے کو تھام کر تھم گیا۔ مصباح کے پیچھے لپکنا معیوب لگا۔ وہ جوانی کی سرحد عبور کرچکا تھا۔ جوانی کے تقاضوں کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ دروازہ بند کر کے بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔ سر جھکا ہوا تھا اور پیشانی سے پسینے کے ننھے ننھے قطرے ٹپک رہے تھے جو اُس کے جذباتی خلفشار کو عیاں کر رہے تھے۔ ایسے میں اُسے مریم یاد آ گئی۔ اُس کی نظروں میں رُباب لہرا گئی۔ جنہیں دِل بھولنا چاہے، وہ بے اختیار یاد آنے لگے۔ خود کو یادوں کے عذاب سے بچانے کے لیے اُس نے ایف ایم ریڈیو آن کردیا۔ سرائیکی گیتوں کا فرمائشی پروگرام چل رہا تھا۔ میزبان کی باتوں نے اُس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتے ہوئے اُسے سابقہ کیفیت سے نکال لیا۔

کافی دیر گزر گئی۔ مصباح نے بیڈروم میں جھانکا۔ اُسے گہری نیند میں مستغرق دیکھ کر دروازہ بند کردیا اور کچن کا رُخ کیا۔ پروفیسر کے جاگنے سے پہلے ہی اُس نے شام کا کھانا تیار کرلیا۔ وہ پکانے میں اتنی ماہر نہیں تھی۔ ماما کی نصیحتوں کو ایک کان سے سُن کر دوسرے سے نکالتی رہتی تھی۔ پاپا اُس کی حمایت میں کہہ دیتے ”اگلے گھر جائے گی تو یہ مصیبتیں خود بخود گلے پڑ جائیں گی، اَبھی تو اِس کے ہاتھ خراب نہ کرو۔“

پاپا کی شہ پر دلیر ہوجاتی اور کچن سے دور ہی رہتی۔ ماما کو پکاتے دیکھتی رہتی۔ وہی دیکھا کام آرہا تھا۔ پروفیسر نے اپنے کچن میں غیر معمولی انتظامات کر رکھے تھے۔ اُسے کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

پروفیسر جب آنکھیں ملتے ہوئے بیڈ روم سے نکلا تو جنت کی تمام لائٹس کو روشن پا کر تعجب سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ مصباح کو تلاش کر رہا تھا۔ برتنوں کی کھنک نے مصباح کا سراغ دیا۔ وہ سگریٹ کیس اور لائٹر ہاتھ میں پکڑے کچن میں گھس گیا۔ اُسے پسینے میں شرابور دیکھا، پوچھا۔ ”کیا کررہی ہو؟“

”آپ سو رہے تھے، جگانا مناسب نہیں سمجھا اور خود کو مصروف رکھنے کے لیے کچن میں آ گئی۔ میں نے کھانا تیار کردیا ہے۔“ مصباح نے بتایا۔

”لائٹس تم نے روشن کی ہیں؟“

”جی!“

پروفیسر کی حیرت دیدنی تھی۔ وہ اُس کے ردِعمل کو بھانپ کر بولی۔ ”میں نے کنٹرول روم میں آپ کو بٹن دباتے ہوئے دیکھا تھا۔“

اُس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ وہ اُس کی اجازت کے بغیر ہی جنت کے معاملات میں انوالو ہوچکی تھی۔ اچنبھا ہوا، بولا۔ ”یوں لگتا ہے جیسے تم جنت کو ٹھونک بجا کر دیکھ چکی ہو۔“

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پروفیسر پلٹ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ غسل کر کے باہر آیا اور حسبِ عادت جنت کا چکر کاٹ کر عرشے پر آ گیا۔ اِسی دوران میں مصباح نے ٹیبل پر کھانا چن دیا تھا۔ دورانِ طعام دونوں ایک دوسرے سے لاتعلق سے رہے۔ چائے پیتے ہوئے مصباح نے کہا۔ ”سر! میرے لیے کیا حکم ہے؟“

پروفیسر کو اُس کا مؤدبانہ اور ملتجیانہ لہجہ بہت اچھا لگا، بولا ”تم کیا چاہتی ہو؟“

”میں گھر جانا چاہتی ہوں۔“ مصباح نے نظریں جھکا لیں۔

”وہاں جا کر کیا کرو گی؟“

”گھر میں کیا، کیا جاتا ہے؟“ وہ پُر استعجاب انداز میں دیکھنے لگی۔

If you want to download Urdu novels,Imran series, Monthly Digests,Shuaa,Kiran,Khwateen Digest,Suspense digest, Vist www.paksociety.com if site is not opening send complaint at admin@paksociety.com or at 0336-5557121

پروفیسر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خود ہی بول پڑی۔
''میں جانتی ہوں کہ وہاں میرا استقبال کس انداز میں ہوگا مگر جانا تو ہے ناں! آپ پر کب تک بوجھ بنی رہوں گی۔''

پروفیسر کے حلق سے کراہ نکلی۔ ''تم مجھ پر بوجھ نہیں ہو مصباح!''

اُس نے چونک کر پروفیسر کو دیکھا۔ تبدیلی کا احساس ہوا مگر سمجھ نہ پائی، بولی۔ ''پھر بھی سر! مجھے جانا ہوگا۔''

''کس کے لیے؟ شہاب یا افتخار بیگ کے لیے جانا چاہتی ہو؟''

''نہیں...... اپنے ماما پاپا کے لیے، اپنے بھائیوں کے لیے۔''

''ہوں!'' پروفیسر کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ سوچ میں پڑ گیا۔ حقیقت کو تہ دل سے قبول کرلیا کرتا تھا۔ جانے والی کو جانا ہی تھا مگر نہ جانے دل کیوں قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا، بولا۔ ''ٹھیک ہے مصباح! میں کل کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ اپنے کسی دوست کو تکلیف دوں گا، وہ میرا نمبر تمہارے گھر پہنچا دے گا۔ تمہاری بات کروا دوں گا۔ پھر اُن پر منحصر ہوگا کہ وہ کب رابطہ کریں گے۔''

اُس نے شکریہ ادا کیا۔ کچھ یاد آنے پر چونک کر بولی۔
''سر! آپ سو رہے تھے، میں سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ ایک کشتی میں سوار کچھ لوگ یہاں سے گزر رہے تھے۔ اُنہوں نے مجھے دیکھا تھا اور مجھ سے کچھ پوچھا تھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اُٹھ کر اندر چلی گئی تھی۔''

پروفیسر نے اُس سے کشتی کی گزرگاہ کے بارے میں چند سوالات کیے پھر مطمئن ہو کر بولا۔ ''مچھوارے کسی کام سے نکلے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مچھلیاں پکڑنے والے ٹھیکیدار مال کا جائزہ لے رہے ہوں۔ بہر حال! تمہیں فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

آٹھ بجے کے قریب مصباح کو اُس نے سیر کرانے کی غرض سے بوٹ میں بٹھایا اور کھلے پانی میں آ گیا۔ چھوٹی سی بوٹ مصباح کے ہلنے پر ہچکولے لیتی تو یوں لگتا جیسے وہ بچپن کی طرف پلٹ گئی ہو جہاں لوری سناتی ماما اُسے گود میں بھر کر گھٹنوں سے جھلا رہی ہوں۔ پروفیسر زیادہ دور نہیں گیا بلکہ جہاں تک جنت کی روشنیوں کا عمل دخل تھا، وہیں تک محدود رہا۔ دو تین چکر کاٹنے کے بعد واپس آ گیا۔ مصباح نے کہا۔
''سر! میرے کزن نے ٹھیک ہی کہا تھا۔''

''کیا کہا تھا اُس نے؟'' پروفیسر نے جھٹ سے پوچھا۔
''اُس نے مجھے اور میرے بھائی وجدان کو بتایا تھا کہ پروفیسر کی جنت میں جانے والا دُنیا کو بھول جاتا ہے۔ یہ کہنے کو کشتی ہے، رہنے کو مکمل گھر ہے۔ وجدان کہتا تھا کہ جتنی رقم اس پر خرچ ہوئی ہے، اتنی رقم میں کسی اچھے علاقے میں بہترین مکان بنایا جاسکتا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ مکان جتنا بھی خوبصورت ہو، اِس سے بہتر اور آرام دہ نہیں ہوسکتا۔''

پروفیسر کو ماننا پڑا کہ وہ بہت روانی سے گفتگو کرنے پر ملکہ رکھتی تھی۔ وہ اُسے بڑی لگن سے دیکھے گیا۔

ہوا خاصی تیز ہوگئی تھی۔ ہوا میں خنکی بھی غیر معمولی حد تک بڑھ چکی تھی۔ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ مصباح دریا کی طرف پشت کر کے ریلنگ کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کھڑی باتیں کر رہی تھی۔ اُس کے تن پر سجا ڈھیلا ڈھالا لباس تیز ہوا سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر ستون پر لگے بڑے مرکری بلب کی تیز روشنی پڑ رہی تھی جبکہ پروفیسر کا چہرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ پیچھے سے پڑتی ہوئی روشنی میں اُس کے بال چمک رہے تھے۔ مصباح بولی۔ ''سر! ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھو!'' پروفیسر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے فراخدلی سے کہا۔

''آپ کے بیوی بچے کہاں ہیں؟''
پروفیسر کا دَم گھٹنے لگا، بولا۔ ''میرا کوئی نہیں ہے۔''
''یہ کیسے ممکن ہے؟'' وہ بھوچکی رہ گئی۔
''جیسے تم اس وقت لاوارث ہو، تمہارا ابھی یہاں کوئی نہیں ہے، ایسے ہی میرا دُنیا میں کوئی نہیں ہے۔''

مصباح کے دِل پر گھونسا پڑا۔ تڑپ کر بولی۔ ''میرے تو سبھی ہیں، ماما، پاپا، بھائی......''

''یہاں تمہارا کوئی بھی نہیں ہے مصباح!'' پروفیسر نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''یہاں آپ ہیں اور آپ بھی تو میرے اپنے ہی ہیں ناں۔'' وہ روانی میں کہہ گئی۔ پھر چونک کر اُسے دیکھنے لگی مگر سگریٹ کے ننھے سے انگارے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا تو جھجک کر مرکری بلب کی طرف دیکھنے لگی۔ ستون پر چڑھے سورج نے اُس کے چہرے کو جگمگاتا ہوا چاند بنا ڈالا تھا۔

پروفیسر کا رواں رواں بے اختیار ہونے لگا۔
''میں تمہارا کچھ بھی نہیں ہوں۔''

وہ محض کندھے اُچکا کر رہ گئی۔ پروفیسر نے ایک لمبا کش پھیپھڑوں میں اُتارا اور نسبتاً بلند آواز میں بولا۔ ''میں پروفیسر وسیم بُزدار...... اصلاً سیمو مہانہ...... گھر سے نکلا اور محبت کی لال بتی کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اِس جنت تک آن پہنچا۔ زوال سے شروع ہونے والی کہانی کو عروج پر ختم ہونا تھا،

ہوگئی۔ میں نے دو شادیاں کیں۔ مریم مجھے بہت پیاری تھی۔ رُباب مجھے بہت پیار کرتی تھی۔ دونوں جیسے میری زندگی میں داخل ہوئی تھیں، ویسے ہی رخصت ہوگئیں۔ گھاؤ دے گئیں جو کبھی بھرنے والا نہیں ہے۔ تمہارا جسم زخم زخم ہوا ہے جو دِنوں میں بھر گیا ہے۔ میری روح زخمی ہے جو عمر بھر آسودہ نہیں ہو سکے گی۔ تم کیا پوچھتی ہو، تم کیا کہتی ہو، یہ سب افسانوی اور کتابی باتیں ہیں۔ تم نے پڑھا ہے، میں نے دیکھا ہے۔ دُنیا اَشو لال کی ہے، دُنیا مزار خان کی ہے، دُنیا شہاب خان کی ہے...... میری نہیں ہے، میرے جیسے کسی بھی کمین کی نہیں، کسی لنگر، مُہانے، گھاڑو یا لوری کی نہیں...... یہ محض سرداروں، جاگیرداروں اور فرعونوں کی ہوس کا پیٹ بھرنے کے لیے بنائی گئی ہے۔''

وہ یک ٹک پروفیسر کو دیکھ رہی تھی، توجہ سے سُن رہی تھی مگر کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ مزاحمتی لہجے میں بولی۔ ''لوگ آپ سے محبت کرتے ہیں، آپ کا احترام کرتے ہیں، پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں یہ دُنیا آپ کی نہیں ہے؟''

''کوئی محبت نہیں کرتا، سب دکھاوا کرتے ہیں۔ مجھے بہلاتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ میں بھی اُن کی طرح اِس جہنم کا ایندھن بنا سلگتا رہوں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔'' پروفیسر کی آواز مزید بلند ہوگئی۔ ''دیکھو مصباح! تم کیا ہو؟ تمہارے پاس کیا بچا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں...... دُنیا کہتی ہے کہ عورت کا دِل عزت و عفت کی پسلیوں میں زندہ رہتا ہے۔ تمہاری پسلیاں ٹوٹی ہوئی ہیں مگر تمہارا دِل دھڑک رہا ہے۔ یہاں سے جاؤ گی تو کچھ عرصہ تک تمہارے دماغ میں اِن ایام کا دُکھ احساسِ کمتری بن کر جاگتا رہے گا پھر کبھی نہ ٹوٹنے والی نیند بن جائے گا۔ تمہیں یاد بھی نہیں رہے گا کہ شیرے گرمانی کے گرگوں نے تمہارے ساتھ کیا، کیا تھا۔ تمہاری نظروں سے شہاب خان کا چہرہ تک محو ہو جائے گا۔ تمہیں پروفیسر وسیم بزدار بھول جائے گا۔ تم پھر کسی سے محبت کرنے کے لیے نکل کھڑی ہوگی۔ یہی ناانصافی ہے۔ یہی انیائے ہے۔ تمہارا بدن کچا ہے، ہر تحریر ایک مخصوص وقت کے گزرنے پر مٹ جاتی ہے۔ تمہاری روح مچھلی کی طرح پھسلواں ہے۔ ہر شے پانی کی طرح پھسل جاتی ہے۔ مرد ایسا نہیں ہوتا۔ مرد بھولنے والا نہیں ہوتا۔ مردوں کا معاشرہ عورتوں کا طرف دار ہے، عورت کو باوفا کہتا ہے، خود کو بے وفا کہتا ہے۔ عورت چالاک ہے، خود کو وفا کی دیوی قرار دیتی ہے، مرد کو بے وفا اور ظالم کہہ کر اپنی مظلومیت کی جھوٹی داستان کو معاشرتی دستاویز بنا کر رکھ دیتی ہے۔ ہمدردیاں سمیٹنے کے لیے آنسو بن جاتی ہے۔ میں اِس معاشرے کو جھٹلا چکا ہوں۔ تم بھی اُنہی میں سے ہو، آئی ڈِس لائک دیم...... آئی ہیٹ یو......''

پروفیسر کے حلق سے اُبلتا لاوہ اُس کی سماعت میں اُتر رہا تھا اور وہ ہونق بنی اُسے یک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ پروفیسر کی کیفیت اُسے دہلا رہی تھی۔ بدن غیر محسوس انداز میں لرزنے لگا۔

چند لمبے لمبے سانس لینے کے بعد پروفیسر نے چیختے ہوئے کہا ''اے کم ذات لوگو! میں مُہانہ ہوں، تمہاری نظر میں کمین ہوں، تحریر کر کے اپنے گریبان میں لٹکا لو کہ تمہارے نچلے پن کو سنبھالے بیٹھا ہوں۔ تمہیں آئینہ دکھا رہا ہوں۔ تم عورت کو رنگ برنگے ملبوسات میں سجا کر کہتے ہو کہ عورت نمائش کی دلدادہ ہے، زیورات سے لاد کر کہتے ہو کہ زیور عورت کی کمزوری ہے، اِس کے ناپختہ اور بچوں جیسے نازک بدن کو اِس کی عصمت گاہ قرار دے کر درندوں کی طرح نوچتے ہو، اِسے ماہتائی جذبے سونپ کر بلیک میل کرتے ہو اور تماشا بنا کے ایک طرف رکھ دیتے ہو۔ یہی تمہاری بڑائی ہے۔ یہی تمہارا ظرف ہے۔ تم سے اچھا میں، ایک مُہانہ، ایک کمین کہ تمہارے ہاتھوں لٹی پٹی لڑکی کو پناہ دیے بیٹھا ہوں۔ اپنے ظلم کے نتائج کو ملاحظہ کرنے کے لیے آ سکتے ہو تو آ جاؤ، دیکھو کہ تم نے اِس کے عقائد اتنے راسخ کر دیے ہیں کہ یہ اپنے پناہ گیر سے بھاگ کر پھر تمہارے چنگل میں پھنسنے کے لیے بے چین ہے۔ آ...... او...... آؤ...... اِس کی بے قراری کو سمیٹنے کے لیے آ جاؤ۔ جو مرنا چاہے، اُس کا مر جانا ہی عافیت قرار پاتا ہے۔''

وہ یقیناً اپنے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ مصباح نے ڈر کر پیچھے ہٹنا چاہا تو کمر سے نچلا حصہ ریلنگ سے ٹکرا گیا۔ تھم گئی اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے پروفیسر کو دیکھنے لگی۔ پروفیسر نے یکبارگی سگریٹ کا آدھ جلا ٹکڑا پانی میں اچھالتے ہوئے اُسے شانوں سے پکڑ لیا۔ اُس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ انگلیاں ماس میں پیوست ہوتی محسوس ہونے لگیں۔ پروفیسر چند لمحوں تک اُس کے چہرے پر نظریں گاڑے کھڑا رہا، پھر اُس کے لبوں پر جھک گیا۔ چند ہی لمحوں میں اُس کی جنونی کیفیت نے دونوں کو توڑ کر رکھ دیا۔ اُس نے مصباح کے بازو چھوڑ کر اُسے چھاتی سے لگا کر اتنی زور سے بھینچا کہ اُس کی پسلیاں کڑکڑا کر رہ گئیں اور حلق سے چیخ نما عجیب سی آواز برآمد ہوئی۔ وہ بے دَم ہو کر پروفیسر کے قدموں میں گر کر ہانپنے لگی۔

پروفیسر یک دَم سنبھل گیا۔ تیز قدموں سے چلتا ہوا ٹیبل تک آیا۔ موبائل فون اور سگریٹ کیس وغیرہ ٹیبل پر رکھ دیے اور پلٹ کر ریلنگ کی طرف بھاگا۔ قریب پہنچ کر وہ دونوں پیروں پر اُچھلا اور قلابازی لگا کر پانی میں کود گیا۔ جنت کو ایک جھٹکا سا لگا۔ مصباح کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر سمجھ کچھ نہیں آ رہا تھا کہ پروفیسر کیا کر رہا ہے۔ اُس کا سینہ دھونکنی بنا ہوا تھا۔ کوشش کے باوجود تنفس معتدل نہیں ہوا۔

پروفیسر پانی میں بہت دُور تک چلا گیا۔ بازو تھک گئے۔ جنوں ٹھہر گیا تو پلٹا اور عقبی سیڑھیوں کی طرف تیرنے لگا۔ سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنی کیفیت کو سوچنے لگا۔ وہ ایسا تو کبھی نہیں رہا تھا۔ عورت اُس کے لیے اَن دیکھا کھلونا نہیں تھی۔ اُسے یہ بھی اعتراف تھا کہ مریم اور رُباب دونوں مصباح سے کہیں زیادہ خوبصورت تھیں۔ شاید اُنہیں دیکھنے والی آنکھوں میں جوانی بھری ہوئی تھی۔ مصباح کو دیکھنے والی آنکھ اَدھیڑ عمری کی بازگشت بنی ہوئی تھی۔ اُس نے دائیں ہاتھ کا مکا بنایا اور پوری قوت سے ریلنگ پر دے مارا۔ تکلیف سے بلبلا اُٹھا۔ منہ سے سسکی نکلی۔ اِس عمل میں روانی آ گئی۔ وہ خود کو ایذا پہنچاتے ہوئے نارمل بالکل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

شاید ایک گھنٹا گزر گیا تھا جب پروفیسر ریلنگ کا سہارا لے کر کھڑا ہوا۔ گیلے ہاتھوں کو آنکھوں پر پھیرتے ہوئے عرشے پر آیا۔ مصباح کو دیکھا اور نظر چراتے ہوئے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اُس نے مصباح کو ساتھ لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ائرکنڈیشنر آن کرنے لگا تو مصباح کا خیال آیا۔ جلدی سے باہر نکلا۔ مصباح تک پہنچا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ رُک گیا اور نرم لہجے میں بولا۔ ''کیا تم بالکل ٹھیک ہو؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سر جھکا لیا۔

پروفیسر بولا۔ ''وہ زخم جو مجھے دکھائی نہیں دیتے، ٹھیک ہو گئے ہیں؟''

وہ بولی ''جی سر!''

''کیا اپنے گھر تک جا سکتی ہو؟''

اُس نے پھر اثبات میں سر ہلا یا۔

پروفیسر چند لمحوں تک کھڑا اُسے دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ''تم دُنیا کو جنت پر ترجیح دے رہی ہو، کیا ایسا ہی ہے؟''

وہ اپنا دفاع کرنے لگی۔ ''نہیں سر! جنت جیسی پُرسکون جگہ کہیں بھی نہیں ہے۔''

''پھر گھر کیوں جانا چاہتی ہو؟''

وہ کوئی جواب نہ دے پائی۔ پروفیسر نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا، دونوں ہاتھ آگے بڑھائے اور اُس کے سینے پر رکھ کر بولا۔ ''تم بیمار اور بے ہوش تھیں جب میرے پاس پہنچی تھیں۔ اَب تم بالکل فِٹ ہو، مجھے یقین ہے کہ اپنے گھر بہ آسانی پہنچ جاؤ گی۔ میرا کردار تمام ہوا۔ اَب میں تمہارا سفر کھوٹا نہیں کروں گا۔ خدا حافظ میری جان!''

اُس نے مصباح کے سینے پر دھرے ہاتھوں کو حرکت دی، زوردار دھکا دے کر اُسے سر کے بَل پانی میں گرا دیا۔ ایک بھیانک چیخ پھر چھپاک کی تیز آواز رات کے سناٹے میں بہت دُور تک گئی۔ پسینے سے شرابور پروفیسر ریلنگ کو تھام کر جھکا اور ڈوب کر اُبھرتی مصباح کو دیکھنے لگا۔ اُس نے جنت کی فاؤنڈیشن پر ہاتھ جمانے کی کوشش کی مگر جنت کے نیچے سے نکلتے ہوئے تیز پانی کے دھارے نے اُسے کئی گز پرے دھکیل دیا۔ وہ ہاتھ پیر مارتے ہوئے پروفیسر کو مدد کے لیے پکار رہی تھی۔

عورت ایسی ہی ہوتی ہے۔ جو دُکھ دیتا ہے، اُسے ہی مسیحا سمجھ کر پکارنے لگتی ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ جس سے ڈوبتے میں زندگی کا سہارا طلب کر رہی ہے، وہ اپنی پسلیوں میں موجود دھڑکتے ہوئے لوتھڑے کو پتھرا چکا ہے۔

پروفیسر کے دیکھتے دیکھتے وہ ہاتھ پاؤں مارتی ہوئی اندھیرے اور گہرے پانی میں چھپ کر نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ اندھیرا اور پانی پروفیسر کی آنکھوں میں بھی رَچ گیا۔ اُس نے دایاں ہاتھ اُٹھایا، دائیں بائیں لہراتے ہوئے رُندھی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تم ہی میری مریم ہو، میری رُباب ہو مگر دُنیا نے تمہیں مصباح کا لباس پہنا کر مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی ہے۔ تم نے ٹھہر جانے کی ضد کی، میں نے پہچان لیا۔ خدا حافظ میری جان!''

❁ ❁ ❁

سبھی بضد تھے کہ مصباح مر چکی ہے اور اُس کی لاش کو تلاش کرنا چاہیے۔ ماما دِل پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہی تھیں۔ ''نہیں۔ میری مصباح مر نہیں سکتی۔ جب تک میرا دِل دھڑکنا بند نہیں ہوتا، مجھے یقین رہے گا کہ وہ زندہ ہے۔ تم سب لوگ ناکارہ ہو۔ ایک ماں کی جھولی کو آباد کرنے کے قابل نہیں ہو۔ دو پہاڑ جیسے بیٹے جن کر بھی میں اکیلی ہوں۔ کوئی میرا نہیں ہے۔ ہائے! کوئی تو ہو جو میرا درد سمجھے، کوئی تو ہو جو میری مصباح کی خاطر زمین کی گہرائی میں اُتر کر اُسے تلاش کرے۔''

عمران کا سر جھک گیا۔ آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ ماما نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تمہارا پَل پَل گن کر انتظار کیا۔ سوچا، آؤ گے تو میری مصباح کو ڈھونڈ کر میری جھولی میں لا پھینکو گے۔ غلط سوچا تھا۔ تم بھی اپنے باپ اور بھائی کی طرح

بُزدل انسان ہو۔''

اُس کا سر مزید جھک گیا۔ شرمساری کا بوجھ کندھے اُٹھانے سے انکاری ہوگئے تھے۔ اُٹھ گیا۔ بیرونی دروازے میں آ کر ٹھہر گیا۔ پلٹ کر نہ دکھائی دینے والی ماما سے مخاطب ہوکر بڑبڑایا۔ ''ماما! آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ میں بُزدل ہوں۔ میں کسی کام کا نہیں ہوں۔ میرا جینا اور مر جانا ایک برابر ہے۔ گھر سے نکلتے وقت عہد کرتا ہوں کہ مصباح کو، وہ جس حال میں بھی ہے، لے کر ہی پلٹوں گا ورنہ اپنی شکل دُنیا کے ہجوم میں گم کردوں گا۔''

دور تک پیدل چلتا گیا۔ ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے۔ نظر کسی شے پر ٹھہرنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ سارا دن چلتا رہا۔ دفتر دفتر چھانتا رہا۔ کسی نے اُس کی مشکل سنی ہی نہیں۔ مصباح کی لاش کو تلاش کرنے کے لیے کوئی بھی اُس کے ساتھ دریائے سندھ پر جانے کو تیار نہیں تھا۔ کوئی محکمہ بھی ایسا نہیں تھا جو اُس کی معاونت کرتا۔ پولیس والوں نے بھی ٹکا سا جواب دے دیا۔

وہ تھانے سے باہر نکلا۔ ایک اجنبی نے روک لیا، بولا۔ ''تمہارے مسئلے کا حل حکومت کے پاس نہیں ہے دوست! تم کسی این جی او سے رابطہ کرو۔''

وہ چونک کر رُک گیا، بولا۔ ''میں کسی این جی او سے واقف نہیں ہوں، راہ نمائی کر کے احسان کردو۔''

وہ نہ جانے کون تھا۔ دل میں انسانی درد سنبھال کر رکھتا تھا۔ اُسے لے کر ایک این جی او کے دفتر میں پہنچ گیا۔ اُس کا مسئلہ بیان کرنے کے بعد این جی او کے سوشل آرگنائزر سے مخاطب ہوا ''دوست! میں اِسے نہیں جانتا۔ ڈوبنے والی کو نہیں جانتا۔ یہ جانتا ہوں کہ جب میری بیٹی ڈوب کر میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تھی اور مجھے پتا چل گیا تھا کہ اَب وہ دُنیا میں نہیں رہی تو میرے دِل پر کیا گزری تھی۔ مجھے اپنی بیٹی کی گم شدہ لاش نے آج تک چین سے سونے نہیں دیا۔ کئی سال گزرنے پر بھی میں اُس کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہوں۔''

عمران پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

وہ دل گیر لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''دوست! تم 'ساگر فاؤنڈیشن' کے آرگنائزر ہو۔ سیکڑوں سیلاب زدگان کی مدد کرچکے ہو۔ لاکھوں کروڑوں کے فنڈز اپنے غیر ملکی ڈونرز سے لے کر خرچ کرچکے ہو۔ اِس بے چارے کی غم گساری پر کچھ خرچ کردو گے تو پوری انسانیت پر احسان ہوگا۔''

عمران نے جلدی سے کہا۔ ''میں اِس کام پر اُٹھنے والے اخراجات خود ادا کروں گا۔''

ساگر فاؤنڈیشن بنیادی طور پر دریائے سندھ سے منسلک لوگوں کو سیلاب سے بچاؤ کے طریقے بتانے، فصلوں کا انتخاب کرنے اور دورانِ سیلاب امداد بہم پہنچانے کے لیے بہت فعال مانی جاتی تھی۔ کچھ پیش و پس کے بعد این جی او نے عمران کے دُکھ کو اپنانے کا فیصلہ کرتے ہوئے کمر باندھ لی اور اُس شام کو ہی گاڑیوں میں بیٹھ کر نکل کھڑے ہوئے۔ عمران کے راہنما نے اُس پر ترحم آمیز نگاہ ڈالی اور آہ بھر کر رخصت ہوگیا۔ اُس نے کوئی دعا، کوئی دلاسا، کوئی امید...... کچھ بھی تو نہیں دیا تھا۔

عمران نے افتخار بیگ اور مظہر عباس کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ مشاورت کے بعد یہ طے پایا کہ کھوج کا آغاز دریا کے اُس پتن سے کیا جانا چاہیے جو بیلے کے قریب واقع ہے۔ جب گاڑیوں میں بیٹھ کر این جی او کی ٹیم کے ہمراہ وہ پتن پر پہنچے، رات کا اندھیرا ہر سو پھیل چکا تھا۔ ساگر فاؤنڈیشن کے ماہر جوانوں نے نصف گھنٹے میں ہی دریا سے کچھ فاصلے پر خیمے نصب کیے اور صبح کے انتظار میں شب بسری کا اہتمام کرنے لگے۔ چند لڑکے مُہانوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اُنہیں ملاحوں سمیت دو عدد کشتیاں درکار تھیں جو دریا کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہیڈ ورکس تک کا سفر کرسکیں۔ وہ جب رات کو اپنے تمام ضروری امور نمٹا کر خیموں میں آئے تو عمران اور افتخار بیگ کو بیدار پایا۔

✿ ✿ ✿

وہ شب بھر سو نہیں سکا تھا۔ مصباح کو دریا میں پھینک دینے کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ بالکل شانت ہو جاتا جیسے غموں کے چلے جانے پر اُسے سکون میسر آیا تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔ اُسے کسی پل قرار نہیں آیا تھا۔ جانے والی اُس کے چین کو پلو میں باندھ کر لے گئی تھی۔

وہ ٹہلتا رہا، آنکھیں ملتا رہا۔ شب گزر گئی مگر داستان تمام نہیں ہوئی۔ اُس نے اَن گنت مرتبہ چائے بنائی۔ پیتے ہوئے مصباح کی کمی کو شدت سے محسوس کیا۔ بے اختیار جنت کے عقبی گوشے میں آ کر کھڑا ہوگیا۔ نظریں اُسی سمت میں گڑی ہوئی تھیں جس سمت میں مصباح کو بہتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ سندھو سَیں نے اَن گنت بستیاں اپنے معدے میں ہضم کر ڈالی تھیں۔ وہ دھان پان سی لڑکی سندھو کی غضبناک لہروں کے آگے کیا وجود رکھتی تھی۔

اُسے بیلے والے پتن پر نقل و حرکت کا شبہ ہوا۔ بھاگ کر اسٹور میں گیا اور اپنی طاقت ور دور بین اُٹھا لایا۔ دیکھنے پر پتا

چلا کہ شیرا اگرمانی بڑے مضطرب انداز میں اُس کی سمت ہاتھ لہراتے ہوئے بھاگا آرہا تھا۔ وہ بار بار پیچھے مُڑ کر بھی دیکھ رہا تھا۔ پروفیسر کو شک گزرا کہ اُس کے پیچھے پولیس لگی ہے یا کوئی مخالف گروہ اُس کی جان کے درپے ہے۔ اُس نے جلدی سے فون پر اُس کا نمبر ملایا۔ بیل پاس ہوئی مگر کسی نے آن نہیں کیا۔ اُس نے ایک مرتبہ پھر دور بین آنکھوں سے لگائی۔ وہ کنارے پر کھڑا ہو کر ہاتھ ہلا رہا تھا اور چیخ رہا تھا۔ اُس کی آواز سنائی دیتی تھی مگر الفاظ کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ پروفیسر نے کوئی وقت ضائع کیے بغیر بوٹ پتن کی طرف بھیج دی۔ ریموٹ کنٹرولر ہاتھ میں لے کر شیرے کو دیکھنے لگا۔ بوٹ کو آتا دیکھ کر وہ اُلٹے قدموں جنگل کی طرف بھاگا۔ نظروں سے چند لمحوں کے لیے اوجھل ہوا۔ لوٹا تو اُس کے کندھوں پر کوئی لدا ہوا تھا۔ پروفیسر کو اَچنبھا ہوا۔ وہ کسے اُٹھائے بھاگا آرہا تھا؟ اچانک آنکھوں کے سامنے برق کوند گئی۔ اُس نے اپنے لباس کو دیکھ کر پہچان لیا تھا کہ شیرے گرمانی کے کندھے پر مصباح لدی ہوئی تھی۔

شیرے گرمانی نے بوٹ کے پہنچنے پر اُسے بوٹ میں ڈھیر کردیا اور ہاتھ لہراتا ہوا بیلے کی طرف بگٹٹ بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس کے بھاگنے کا انداز خاصا مضحکہ خیز تھا۔ چند ہی لمحوں میں وہ درختوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ پروفیسر نے بوٹ کو جنت کی طرف موڑ دیا۔ پانچ سات منٹوں کے بعد وہ اُس کی نظروں کے سامنے بیڈ پر پڑی ہوئی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ پروفیسر نے فوری طور پر اُسے بخوبی ٹٹول کر اندازہ کرلیا کہ اُس کے جسم پر کوئی گھاؤ نہیں تھا۔ وہ دہشت اور خوف کی وجہ سے بے ہوش تھی۔ اُس نے اُس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے، جھنجوڑا۔ وہ ہوش میں آتے ہی چلانے لگی۔ پروفیسر نے بھانپ لیا کہ وہ ڈاکوؤں کے خوف سے بے ہوش ہوئی تھی تبھی ہوش میں آتے ہی ڈر کے مارے چیخنے چلانے لگی تھی۔

جب اُس نے چلانا بند کیا، اردگرد دیکھا تو فرطِ استعجاب سے گنگ ہوگئی۔ پروفیسر پر نظر پڑی تو آنکھیں پھیل سی گئیں۔ ہونٹ یکبارگی کانپے ''سس ...... سر! وہ......وہ ڈاکو...... ظالم......''

پروفیسر نے بڑی آہستگی سے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''فکر نہ کرو۔ وہ تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے۔''

دل میں بولا۔ ''اُن کا سردار تمہیں یہاں چھوڑ گیا ہے، پھر کس کی مجال ہے کہ وہ تمہارے تعاقب میں یہاں تک پہنچے۔''

پروفیسر نے اُسے پانی کا گلاس تھمایا۔ وہ ایک ہی سانس میں حلق سے اُتار گئی۔ پروفیسر نے اُس کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اندازہ کیا کہ کہیں اُس کا پیٹ پانی سے بھرا ہوا نہ ہو۔ وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھی۔ اُس کا ردِعمل پروفیسر کو بڑا عجیب اور غیر فطری لگا، بولا۔ ''کیا بات ہے؟ کس بات کا ڈر ہے تمہیں؟''

وہ کچھ نہیں بولی بلکہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رونے کے درمیان خود کو بدقسمت قرار دیتے ہوئے اپنے نصیب کو کوسنے لگی۔ ایسے ہی وقت میں پروفیسر کے فون پر شیرا اگرمانی مخاطب ہوگیا۔ ''پروفیسر صاحب! میرے پاس مہلت بہت کم ہے، میرے ساتھی میرے دُشمن بن گئے ہیں۔ جتنا جلد ہو، اِسے اِس کے گھر پہنچا دیجیے۔''

اُس نے پوچھا۔ ''یہ پھر تم لوگوں کے ہاتھ کیسے لگ گئی؟''

''ایک واردات سے واپسی پر میرے ساتھیوں کی نظروں میں آگئی۔ یہ ساگر کنارے جال کے بڑے درخت کے ساتھ اُٹکی ہوئی تھی۔ وہ اُٹھا کر یہاں لے آئے۔ میں نے اُنہیں اُن کے ارادے سے باز رکھنے کی بہتیری کوشش کی مگر وہ بغاوت پر اُتر آئے۔ اِس لیے میں اِسے اُٹھا کر آپ کے پاس چھوڑ آیا ہوں۔ اَب اُن کے تیور مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے، سن رہے ہیں ناں آپ؟'' شیرا اگرمانی کی آواز اُس کے اضطراب اور خوف کی عکاس بنی ہوئی تھی۔

پروفیسر نے اُسے یقین دلایا کہ مصباح بہ خیر و عافیت اپنے گھر پہنچ جائے گی۔ رابطہ منقطع ہونے پر اُس نے مصباح کو دیکھا جو فرطِ دہشت سے پیلی پڑ گئی تھی۔ پروفیسر اسٹول کھینچ کر اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس کا ہاتھ تھام کر سہلانے لگا۔ بازو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خوف کی کیفیت سے باہر کھینچنے لگا۔ وہ عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی، بولی۔ ''میرا قصور کیا ہے سر!''

پروفیسر نے اُلجھی ہوئی نظروں سے دیکھا، پوچھا۔ ''کیا مطلب؟''

اُس نے نقاہت سے آنکھیں بند کرلیں۔ دو ننھی ننھی لکیریں اُس کی آنکھوں کے گوشوں سے برآمد ہوگئیں۔ ہونٹ کانپتے ہوئے بولی۔ ''مجھے دریا میں دھکا دے کر آپ نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا تھا ناں! ایک بے بس لڑکی کو اپنی تشدد پسندی پر قربان کر کے بڑے مطمئن ہوگئے ہوں گے۔ کیا اِس سے بہتر یہ نہیں تھا کہ مجھے گلا گھونٹ کر مار دیتے، پھر پانی میں بہا دیتے۔ کون پوچھنے والا تھا؟ کس کا ڈر تھا؟''

پروفیسر کے پاس کوئی جواب موجود نہیں تھا۔ خاموشی سے اپنا کام کرنے لگا۔ وہ بول رہی تھی۔ ''دُنیا والوں نے چیر پھاڑ کر جنت میں بھیج دیا۔ جنت والے نے دھکا دے کر پھر درندوں کے حوالے کردیا۔ آہ! میں پیدا ہی کیوں ہوئی

تھی۔ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے جو ہر کوئی مجھ پر چاقو تانے کھڑا ہے؟"

وہ نڈھال سی ہوگئی۔ ہونٹ بھینچ کر سسکنے لگی۔ پروفیسر نے پوچھا "تم کب بے ہوش ہوئیں؟"

وہ خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ آہستہ سے بولی۔ "آپ نے دھکا دیا، مجھے ہوش تھا۔ پانی کے نیچے گئی، ہوش نہیں تھا۔ پھر جب آنکھ کھلی تو وہی بھیڑیے دکھائی دیے۔ میرے حلق سے ایک چیخ نکلی اور پھر مجھے کچھ یاد نہیں۔ ایک مرتبہ پھر آنکھ کھلی، میں کسی آدمی کے کندھوں پر سوار تھی اور وہ بھاگ رہا تھا۔ وہ ٹھوکر کھا کر گرا، میرے سر میں کوئی پتھر یا اینٹ لگی، میں بے ہوش ہوگئی۔ پھر ہوش آیا تو آپ دکھائی دیے۔"

پروفیسر نے بے ساختگی سے اُس کا سر ٹٹول کر دیکھا۔ ماتھے سے کچھ اوپر بڑا سا گومڑ محسوس ہوا۔ بالوں کو ہٹا کر دیکھا۔ زخم نہیں تھا۔ پیار سے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا لگا۔ "تمہیں پانی میں پھینکنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کا ارتکاب کر بیٹھا ہوں۔ نہ جانے کیوں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے تمہارے وجود کے بغیر جنت بے معانی ہو کر رہ گئی ہے۔ شاید میں تمہارے وجود میں اپنی مریم کو دیکھنے لگا تھا۔ شاید تمہاری صورت میں مجھے اپنی رُباب کی صورت دکھائی دینے لگی تھی۔ بہر حال! تمہیں قسمت پھر میرے پاس کھینچ لائی ہے۔ اَب تمہیں کوئی دُکھ نہیں دُوں گا۔ مجھے معاف کر دو۔"

اُسے یقین نہیں آیا۔ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ پروفیسر کا ہاتھ پکڑ کر دیوانہ وار چومنے لگی۔ آنسوؤں کی نمی سے تر کرنے لگی۔ پروفیسر نے اُس کا سر اپنی چھاتی سے لگا لیا، بولا۔ "میں ٹوٹ پھوٹ گیا ہوں۔ میں وہ نہیں رہا، جو تھا اور اَب جو کچھ ہوں، ایسا زندگی میں کبھی نہیں رہا۔ میں نے دُنیا کو ترک کیا، تمہیں دُنیا نے ٹھکرا دیا، ہم دونوں ایک دوسرے کے دُکھ کو سمجھ سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کو اَپنا سکتے ہیں۔ کیا تم میری محبت کو قبول کرنے کا حوصلہ رکھتی ہو؟"

وہ گم صم بیٹھی اُسے یک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ وہ کرب اور مسلسل جنگ کی اس کیفیت میں تھی کہ کوئی بھی صحت مند فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ سوچ میں پڑ گئی۔ انکار کر دے؟ پروفیسر بُرا منائے گا اور پھر اُسے دریا میں پھینک دے گا۔ اقرار کر لے؟...... اپنے دیے ہوئے قول پر قائم رہتے ہوئے کیا وہ دُنیا کو چھوڑ دے گی اور جیتے جی جنت کی حور بن کر سندھو سٹیں کا حصہ بن جائے گی۔ اُس کے تذبذب کو دیکھ کر مایوسی کا سایہ پروفیسر کے چہرے پر لہرایا اور وہ اُسے چھوڑ کر چند قدم دور جا کھڑا ہوا۔ تھکے تھکے لہجے میں بولا۔ "شاید میں اپنی سطح سے نیچے گر چکا ہوں۔ مجھے اپنی بے بسی اور تھکاوٹ کا اظہار تمہارے سامنے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تم دُنیا دار ہو۔ تمہارے دِل میں انہی لوگوں کی محبت کا بیج نمو پا رہا ہے جن لوگوں نے تمہیں اِس حال تک پہنچایا ہے۔ ویری سوری مصباح! شاید میں نارمل نہیں رہا۔"

اُسے پروفیسر کی مایوسی کو دیکھ کر ملال ہوا۔ اُٹھ کر قریب آ گئی۔ بازو سے چمٹ کر بولی۔ "ایسی بات نہیں ہے سر! آپ بہت عظیم انسان ہیں۔"

پروفیسر کے دِل پر بوجھ سوا ہو گیا تو وہ اُس کی کمر میں بازو حمائل کیے بیڈ روم سے نکل کر عرشے پر آ گیا۔ اُسے چھوڑ کر ہاتھ کمر پر باندھ کر ٹہلنے لگا۔ پیتل کا سورج مشرقی سمت میں کنی نکالے کھڑا تھا۔ ریلنگ کے ساتھ آ کر کھڑا ہو گیا اور جھک کر جزیٹر کے پَروں کی مسلسل حرکت کو دیکھنے لگا۔ اچانک مُڑا اور قریب کھڑی مصباح کو شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے بولا۔ "کیا تم خود کو بالکل فٹ محسوس کرتی ہو؟"

اُس کا رنگ اُڑ گیا۔ چہرہ فرطِ خوف سے پیلا پڑ گیا۔ جواب دینے کے بجائے پوری قوت سے پروفیسر کے ہاتھوں کو جھٹک کر اُس کے پیروں میں بیٹھ گئی۔ مضبوطی سے پیر تھام لیے اور سسکنے لگی۔ "میں بالکل ٹھیک نہیں ہوں، مجھے دریا میں مت پھینکیں۔ میں مزید مصیبتیں جھیلنے کے قابل نہیں ہوں سر! مجھے مت دھکا دیجیے...... آپ جو کہیں گے، میں مان لوں گی۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں، آپ کی جنت میں اپنی عمر پوری کر دوں گی مگر خدارا! مجھے دریا میں نہ پھینکیں۔"

وہ گڑگڑا رہی تھی۔ زندگی کی بھیک مانگتے ہوئے اُس کے کھلے کشکول میں محبت کی شراب انڈیل رہی تھی۔ وہ آہستہ سے نیچے بیٹھ گیا۔ اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولا۔ "تم شاید موت کے خوف سے محبت کا اظہار کر رہی ہو؟"

وہ جلدی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "نہیں۔ مجھے موت کا کوئی خوف نہیں۔ گزشتہ کئی دِنوں سے زندگی اور موت کے کھیل کا حصہ بنی ہوئی اِدھر اُدھر لڑھک رہی ہوں۔ کیا زندگی، کیا موت؟ میں آپ سے محبت کرتی ہوں، میں آپ کی ہوں...... جو چاہے، میرے ساتھ کیجیے مگر مجھے درندوں کے حوالے نہ کیجیے۔ وہ بہت ظالم ہیں۔"

پروفیسر کی آنکھوں میں وحشت بھر گئی۔ مٹھیاں بھنچ

گئیں۔ دِل کے اضطراب نے پہلو بدل کر نئی صورت اختیار کر لی تھی۔ پہلی مرتبہ اُسے اپنی شکست پر تاؤ آنے لگا تھا۔ وہ، عورت کو وجۂ فساد قرار دے کر زلفوں کے پیچ و خم سے ہمیشہ کے لیے نکل آنے والا، اُسی وجود کے حصار میں پور پور محصور ہو چکا تھا۔ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ٹیبل تک آیا۔ ٹیبل پر دونوں ہاتھ رکھے کافی دیر تک سوچ بچار کرتا رہا پھر مصباح کو بیڈ روم میں بھیج کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔ اُسے اپنے اور مصباح کے لیے ناشتا تیار کرنا تھا۔

اُس نے الماری کی طرف، کچھ نکالنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ بیلے کی طرف سے فائر کی آواز سنائی دی۔ وہ جلدی سے باہر آ گیا۔ سوائے درختوں کی ہریالی کے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر اچانک جیسے کئی گنوں کی نالیاں اُبل پڑی ہوں۔ چند ہی لمحوں میں بیلا شدید نوعیت کی فائرنگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ مختلف قسم کی گنیں چل رہی تھیں۔ پروفیسر کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ شیرے گرمانی کے گروپ میں پھوٹ پڑ چکی ہے اور خون کا بازار گرم ہو گیا ہے۔ اُسے اپنی پشت پر مصباح کے لمس کا احساس ہوا۔ گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ ڈر کے مارے کمرے سے نکل کر اُس سے چمٹی کھڑی تھی۔ پروفیسر نے کہا۔ "گھبراؤ مت، ڈاکوؤں کا گروہ آپس میں لڑ رہا ہے۔ کچھ مر جائیں گے۔ کچھ بچ جائیں گے۔ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔"

"وہ یہاں آ گئے تو کیا ہوگا؟"

پروفیسر نے عام سے لہجے میں کہا۔ "تو یہاں بھی گولیاں چلنے لگیں گی اور خون خرابا شروع ہو جائے گا، پہلے معرکے میں بچ جانے والے دوسرے ہلے میں مارے جائیں گے۔"

وہ مزید ڈر گئی۔ پروفیسر نے اُسے بیڈ روم میں دھکیلا اور اسٹور میں چلا گیا۔ اگر شیرا گرمانی کا باغی گروپ فتح یاب ہو گیا تو وہ لازمی طور پر مصباح کی تلاش میں جنت کا رُخ کرے گا۔ پروفیسر نے ان کے استقبال کے لیے خود کو چند منٹوں میں ہی پوری طرح تیار کر لیا۔ دونوں گنیں اور اچھی خاصی تعداد میں گولیاں ستون والے بنکر میں پہنچا دیں۔ پستول ہاتھ میں پکڑ لیا۔ جونہی فائرنگ رُکی، وہ مصباح کو کھینچتے ہوئے ستون پر چڑھ گیا۔ اُسے بنکر میں کھڑا کرنے کے بعد خود بھی سمٹ کر بنکر میں کھڑا ہو گیا۔ جگہ تنگ تھی۔ دونوں ایک دوسرے میں کھب سے گئے تھے۔ پروفیسر نے کہا۔ "اگر وہ اِس طرف آئے تو اُن میں سے ایک بھی زندہ واپس نہیں جائے گا۔"

اُس نے زیر لب کہا۔ "اللہ کرے!"

پروفیسر کو بخوبی اندازہ تھا کہ اُس کا مقابلہ عام لوگوں سے نہیں، نہایت تربیت یافتہ اور مار دھاڑ کے شوقین لوگوں سے پڑنے والا ہے۔ اچانک اُس کے اعصاب تن گئے۔ شمالی جانب سے دریا کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ آتی ہوئی دو کشتیاں دیکھ کر اُس کے لبوں پر سفاک مسکراہٹ تیر گئی۔ باغی گروپ بجائے خشکی کے راستے حملہ کرنے کے، کشتیوں کے ذریعے اپنی طاقت کے زعم پر آن دھمکا تھا۔ اُس نے گن اُٹھائی۔ بیلٹ چڑھایا۔ دوسری گن میں میگزین فٹ کیا۔ پستول پہلے ہی لوڈڈ تھا۔ مطمئن ہو کر کشتیوں کے رینج میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔ مصباح کو اُس نے مزید نیچے کر دیا تھا۔ ایسے میں اچانک اُس کی نگاہ بیلے کی طرف اُٹھی۔ جنگل سے نکل کر چند آدمی دیوانہ وار دریا کے کنارے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اُنہوں نے بندوقیں اُٹھا رکھی تھیں۔ پروفیسر اُن پر گولی چلانے ہی لگا تھا کہ اچانک خیال آ گیا، کہیں یہ شیرا گرمانی ہی نہ ہو جو اپنے باقی ماندہ بندوں کے ہمراہ پناہ ڈھونڈتا اِدھر آن نکلا ہو۔ اُسے افسوس ہوا کہ اُس نے بنکر میں آتے ہوئے موبائل فون اور دوربین کمرے میں ہی رکھ چھوڑی تھی۔

مصباح ایک سوراخ سے نظریں ٹکائے پروفیسر کی مخالف سمت میں دیکھ رہی تھی۔ اچانک پلٹ کر بول پڑی۔ "سر! اُدھر پتن پر کوئی ہے جو ہاتھ لہرا رہا ہے۔"

پروفیسر نے فوراً پہلو بدلا۔ دونوں ایک ہی وقت میں رُخ بدل کر آمنے سامنے ہوئے تھے۔ غلطی کا احساس ہوا مگر یہ وقت اِن نزاکتوں کو ملحوظ رکھنے کا نہیں تھا۔ براہِ راست سینے سے لگی مصباح کے ہونٹوں کو مسکرا کر چوما اور اُس کا سر ایک جانب ہٹا کر سوراخ سے جھانکا۔ دو آدمی پتن پر کھڑے دکھائی دیے۔ وہ ہاتھوں میں پکڑے ہوئے صافوں کو ہوا میں لہرا کر متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دوری کے باعث پروفیسر باوجودِ سعی اُن کو پہچان نہیں پایا۔

خاموشی طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ پروفیسر نے اُنہیں بے ضرر قرار دے کر اپنی توجہ کشتیوں اور کنارے پر کھڑے گن برداروں کی طرف مبذول کر لی۔ وہ اُنہیں اُس وقت تک چھیڑنا نہیں چاہتا تھا جب تک وہ دریا میں نہیں اُتر جاتے۔ کشتیوں میں سوار ہو کر آنے والوں سے پہلے نمٹنا ضروری تھا کیونکہ اُن کی پوزیشن گن برداروں سے کہیں زیادہ مضبوط دکھائی دیتی تھی۔

پھر دریا کے مغربی کنارے والی کشتی گن کی رینج میں آ گئی۔ اُس میں بیٹھے ہوئے افراد بھی دکھائی دینے لگے۔ اُس

نے گن کی نال کا رُخ اُس سمت میں کیا۔ نشانہ باندھ کر ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا۔ جو انگلیاں تمام عمر لفظوں سے کھیلتی آئی تھیں، وہ آگ برسانے میں بھی خاصی طاق ہو چکی تھیں۔

❁ ❁ ❁

دونوں کار سے اُترے۔ دیکھا، کیچڑ کی وجہ سے کار آگے نہیں جا سکتی تھی۔ پیدل ہی پتن کی طرف چل پڑے۔ ڈاکٹر اَشولال کہہ رہا تھا۔ ''مجھے شاید آج یہاں نہیں آنا چاہیے تھا مگر دل اتنی قوت سے پروفیسر سے ملنے کے لیے مچلا کہ میں خود کو روک نہ پایا۔''

''اس میں بھی کوئی مصلحت پوشیدہ ہوگی۔'' مزار خان نے سرائیکی میں تائید کی۔ ڈاکٹر کے لبوں پر بے تاثر سی مسکراہٹ تیر گئی۔

دونوں آگے پیچھے چلتے، باتیں کرتے پتن پر پہنچے۔ ڈاکٹر تھک کر بیٹھ گیا۔ مزار خان نے طنز کیا۔ ''بڑھاپا اُتر آیا مُرشد؟''

''یہ بدبخت کہاں جان چھوڑتا ہے، بن بلائے آ جاتا ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''فون پر پروفیسر سے رابطہ کرو۔ وہ اپنی ریموٹ کنٹرولڈ بوٹ پتن پر بھیج دے۔''

مزار خان فون نکال کر نمبر ملانے لگا۔ ایسے میں چونک گیا۔ 'جنت' پر دو ہیولے دکھائی دیے تھے۔ ایک ہیولا یقیناً پروفیسر وسیم کا تھا۔ اس کے ساتھ کون تھا؟...... حیرانی کی بات تھی۔

ایک دوسرے کو دیکھ کر دونوں پھر 'جنت' کی طرف متوجہ ہوئے۔ چند ثانیوں بعد پروفیسر اور اُس کا ساتھی دونوں غائب ہو گئے۔ بہ غور دیکھنے پر بھی نظر نہیں آئے تو ڈاکٹر نے اپنا صافہ گلے سے نکالا اور زور زور سے ہلانا شروع کر دیا۔ اُس کی تقلید میں مزار خان بھی ایسا ہی کرنے لگا مگر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔

''وہ دیکھو مُرشد! وہ کشتی 'جنت' کی طرف جا رہی ہے۔'' مزار خان نے چیختی ہوئی آواز میں کہا۔

ڈاکٹر نے دیکھا۔ مسکرا کر کہا۔ ''ایک کشتی اِدھر بھی دکھائی دے رہی ہے۔ شاید پروفیسر نے کشتیوں کو اپنی جنت کے لیے خطرہ قرار دیا ہے اس لیے مورچہ زن ہو گیا ہے۔''

مزار خان آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنا کر بڑی احتیاط سے کچھ دیکھ رہا تھا، بولا۔ ''مجھے بھی خطرے کی بو آ رہی ہے مُرشد! پروفیسر کا نمبر ٹرائی کر رہا ہوں مگر رابطہ نہیں ہو رہا۔''

اچانک ٹھائیں کی زوردار آواز نے ماحول میں دہشت طاری کر دی۔ پھر فائرنگ کا نہ رُکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔

مزار خان نے ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑا اور جھک کر سرکنڈوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ کیچڑ سے لتھڑے گڑھے میں ڈُبک کر مزار خان نے پھولی ہوئی سانسوں میں کہا۔ ''سئیں میڈا! گولی اندھی ہوتی ہے، دُشمن سجن کی پہچان نہیں رکھتی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ ہو کیا رہا ہے؟'' ڈاکٹر اَشولال نے اُلجھن زدہ لہجے میں کہا۔

مزار خان کیا کہہ سکتا تھا، خاموش رہا۔ مزار خان سرکنڈوں کو ہاتھ سے ہٹا کر ایک روزن بنائے 'جنت' کو دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر اَشولال نے بھی اپنا چہرہ اُسی روزن میں گھسا دیا۔ 'جنت' پر کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ روزن میں سے کوئی بھی کشتی دکھائی نہیں دے رہی تھی بلکہ 'جنت' کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کون حملہ آور تھا، کون اپنے دفاع میں بارود پھونک رہا تھا، پتا نہیں چل رہا تھا۔

❁ ❁ ❁

پروفیسر کی چلائی ہوئی گولی نے کشتی کی پیش قدمی کو روک دیا۔ پروفیسر نے دیکھا کہ کشتی پر بیٹھے افراد میں ہڑبونگ مچ گئی تھی۔ اچانک اُس کے فائر کا جواب فضا میں گونج اُٹھا۔ فائر مغربی کنارے سے ہوا تھا۔ اُس نے کھلے پتن کی طرف دیکھا۔ حملہ آور زمین پر لیٹ چکے تھے اور گنوں کا رُخ جنت کی طرف تھا۔ وہ تعداد میں پانچ تھے۔ پروفیسر نے ایک کا نشانہ لیا، گولی چلی، نشانہ خطا گیا۔ دوسری گولی نے اپنے شکار کو جا لیا۔ ہٹ ہونے والے کے ساتھیوں نے اُس کی ستون میں موجودگی کو بھانپ لیا تھا۔ اُنہوں نے بے دریغ فائرنگ شروع کر دی۔ گولیاں کنکریٹ کے ستون پر زوردار آواز کے ساتھ ٹکراتیں اور پانی میں گر جاتیں۔ پروفیسر خود کو بچاتے ہوئے جوابی فائر داغتا رہا۔

اُس نے محسوس کر لیا تھا کہ دور ٹھہری ہوئی کشتیوں سے اُس پر ایک بھی فائر نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی کشتیوں میں دُبکے ہوئے افراد نے چھلانگیں لگانے کی کوشش کی تھی۔

نصف گھنٹے کی دوطرفہ فائرنگ کے نتیجے میں تین حملہ آور موت کا شکار ہو چکے تھے یا اس حد تک زخمی ہو گئے تھے کہ اُن میں گن اُٹھانے اور فائر کرنے کی سکت باقی نہیں تھی۔ باقی دو کے پاس شاید گولیاں ختم ہو گئی تھیں، وہ اچانک زگ زیگ کے انداز میں بھاگتے ہوئے جنگل میں گھس گئے۔ پروفیسر نے بہت جلد بازی کا مظاہرہ کیا تھا مگر اُنہیں ہٹ کرنے میں ناکام رہا۔

خاموشی طاری ہو گئی۔ بنکر میں بارود کی بُو پھیل چکی تھی۔ دونوں ناک پر ہاتھ رکھے چپ کھڑے تھے۔ مصباح نے اُس

کے کندھے پر اپنا سر ٹکا دیا، بولی۔ ''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

پروفیسر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو کھانسی آ گئی۔ ہاتھ سے بارود کا دھواں اُڑاتے ہوئے بدقّت تمام بولا۔ ''یہ خاموشی موت کی نہیں، زندگی کی ہے۔ ڈرو مت، حوصلہ رکھو۔ اَبھی ہمارے کچھ دُشمن موجود ہیں۔''

اُس نے جھک کر سوراخ میں سے کشتی کو دیکھا۔ اُس پر سفید رنگ کا کپڑا لہرا رہا تھا۔ دوسری کشتی پر بھی کپڑا لہراتا نظر آیا۔ پروفیسر نے بڑبڑا کر کہا۔ ''کہیں بے غیرت کوئی چال تو نہیں چل رہے ہمارے ساتھ؟''

کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''تم مشرقی پتن کی طرف دیکھو۔ کیا وہ دونوں کھڑے ہیں؟''

مصباح نے پروفیسر کے بدن سے رگڑ کھاتے ہوئے پہلو بدلا۔ سوراخ میں جھانک کر دیکھا، بولی۔ ''یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔''

''وہ فائرنگ کے ڈر سے چھپ گئے ہوں گے۔'' پروفیسر نے خیال آرائی کی۔ پھر کشتیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تجرباتی طور پر دو تین فائر کیے۔ اُس نے کشتی کا نشانہ نہیں لیا تھا۔ ردِعمل ظاہر ہوا۔ کشتی میں موجود تمام لوگ ہاتھ اوپر اُٹھائے کھڑے ہو گئے اور چیخ چیخ کر کچھ کہنے لگے۔ پروفیسر کو یقین ہو گیا کہ وہ نہتے ہیں اور لڑنے کے لیے نہیں آئے۔ وہ بڑبڑایا۔ ''یہ غالباً ڈاکوؤں کے ساتھی نہیں ہیں۔''

وہ کہنیوں کے بَل اوپر اُٹھا۔ مصباح پلٹ کر چمٹ گئی۔ چیختے ہوئے بولی۔ ''آپ باہر نہ جائیں، مجھے ڈر لگتا ہے۔''

وہ آدھا بنکر کے باہر تھا۔ آدھا مصباح کی گرفت میں تھا۔ چھڑانا چاہتا تھا مگر اچانک ذہن باغی ہو گیا۔ اُس کے لبوں پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ تیر گئی، بولا۔ ''کاش! تم ایسے ہی مجھے ہمیشہ تھامے رکھو، میں آدھا زندہ رہوں، آدھا ساکت رہوں، زندگی کا مزہ آ جائے۔''

اُس نے جلدی سے اُسے چھوڑ دیا۔ وہ ہنس کر بنکر سے باہر آ گیا۔ پتن پر پڑے ہوؤں کو بہ غور دیکھا۔ کوئی جنبش نہ پا کر کشتی کی طرف رُخ کر کے ہاتھ کے اشارے سے قریب بلانے لگا۔ کچھ دیر کے بعد کشتی چل پڑی۔ اُس کی رفتار خاصی سست تھی۔ مہانوں نے چپو پانی میں کھڑے رُخ روک رکھے تھے۔ ایسا کرنے سے پانی کے بہاؤ سے بھی کم رفتار میں کشتی بہا کرتی ہے۔

کشتی قریب آئی تو پروفیسر نے ہاتھ کے اشارے سے رُکنے کا حکم دیا۔ مہانوں نے کشتی کو کنارے لگا دیا۔ دوسری کشتی اپنی جگہ پر رُکی کھڑی تھی۔ پروفیسر نے چیخ کر کہا۔

''اے! تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟''

کسی نے تیز آواز میں جواب دیا۔ ''ہم ساگر فاؤنڈیشن والے ہیں، ایک لاش کو ڈھونڈنے نکلے ہیں۔ یہاں فائرنگ کیوں ہو رہی ہے؟''

پروفیسر نے اُسے زیرِ لب گالی دی اور کہا۔ ''دوسری کشتی میں کون ہے؟''

''وہ بھی ہمارے ساتھی ہیں۔'' جواب آیا۔

پروفیسر کی تسلی ہو گئی۔ چیخ کر بولا۔ ''کنارے کنارے کشتی کھیتے ہوئے یہاں سے دَفع ہو جاؤ ورنہ مارے جاؤ گے۔ اپنے ساتھیوں کو بھی لنگر کھولنے کا اشارہ کر دو۔ وقت ضائع نہ کرو...... ہری اَپ......''

''تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' ایک اور تیز آواز سنائی دی۔

''میں تمہارا باپ ہوں، تم سب کا! بکواس نہ کرو اور جتنی جلدی ہو، یہاں سے بھاگ جاؤ۔'' پروفیسر کا لہجہ غیظ سے معمور ہو گیا اور اُس نے بنکر میں منہ اُٹھائے کھڑی مصباح کا ہاتھ تھاما اور اُسے باہر کھینچ لیا۔

پروفیسر نے اُسے باہر کھڑا کیا۔ اپنا اسلحہ سمیٹا۔ کچھ خود تھاما، کچھ مصباح کو تھمایا اور اسٹور کی طرف بڑھ گیا۔ مصباح کو کچن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''فرسٹ کلاس چائے بناؤ، میں اَبھی آتا ہوں۔''

دوربین اُٹھا کر پستول لہراتے ہوئے مغربی جانب والی ریلنگ پر آیا۔ دراز ہونے والوں کا جائزہ لیتا رہا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ وہ مر چکے ہیں۔ اسی دوران کشتی اُس کے اور پتن کے بیچ حائل ہو گئی۔ اُس نے دوربین کی مدد سے کشتی کے اندر بیٹھے ہوؤں کو دیکھا۔ وہ واقعی این جی او کے کارکن تھے۔ سبھی ڈرے ڈرے انداز میں اُس کی جنت کو دیکھ رہے تھے۔

پلٹ کر دیکھا۔ دوسری کشتی بھی چل پڑی تھی۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اُنہیں رفتار تیز کرنے کا حکم دیا۔ بجائے رفتار تیز کرنے کے مہانوں نے کشتی کا رُخ جنت کی طرف کر دیا۔ پروفیسر نے چیخ کر کہا۔ ''اَبے اُلو کے پٹھو! زندگی سے دشمنی نہ کرو، یہاں سے بھاگ جاؤ۔''

ایک آدمی کشتی کے تکونی عرشے پر کھڑا ہو کر ہاتھ لہرانے لگا۔ پروفیسر نے دوربین کے لینز کو اُس کے چہرے پر فوکس کیا تو چونک پڑا۔ وہ افتخار بیگ تھا۔ پروفیسر کی گدی میں سرسراہٹ ہونے لگی۔ وہ یہاں کیوں آیا تھا؟ ساگر فاؤنڈیشن کے ساتھ یہاں آنے کا کیا مقصد ہو سکتا تھا؟ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کشتی قریب آئی تو اُس نے چیخ کر دریافت

کیا۔ ''تم کیا کر رہے ہو؟''
''سر جی! ہم مصباح کی لاش کو تلاش کر رہے ہیں؟''
پروفیسر نے تعجب سے پوچھا۔ ''تمہیں کس نے کہا ہے کہ وہ مر چکی ہے؟''
''قریب آنے دیں سر! میں آپ کو پوری تفصیل بتاتا ہوں۔'' افتخار نے کہا۔ کچن میں کھڑی مصباح کے کانوں میں افتخار کی آواز پڑ چکی تھی۔ وہ دوڑ کر باہر آئی۔ پروفیسر نے اُسے یوں آتے دیکھ کر دانت پیسے اور پستول کا رُخ اُس کی جانب کر دیا، غرا کر بولا۔ ''کچن میں واپس چلی جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔''
اُس کے لہجے میں موت کی سی سنگینی تھی۔ مصباح ٹھٹک کر رُک گئی۔ کبھی افتخار کی کشتی کو دیکھتی، کبھی پروفیسر کے ہاتھ میں دبے ہوئے پستول کو دیکھتی، اچانک شکست خوردہ انداز میں سر جھکا کر کچن میں گھس گئی۔ پروفیسر نے پستول والا ہاتھ کشتی کی طرف بڑھا دیا۔ چیخ کر بولا۔ ''جو کر رہے ہو، کرتے رہو۔ اِدھر آنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ سب لوگوں کو بھون ڈالوں گا۔''
افتخار کی نظر مصباح پر شاید نہیں پڑی تھی۔ اگر اُس نے دیکھا بھی تھا تو یہی سمجھا ہوگا کہ وہ پروفیسر کا کوئی دوست ہے کیونکہ مصباح مردانہ لباس میں تھی۔
افتخار نے اپنی درخواست دہرائی مگر پروفیسر ٹس سے مس نہ ہوا۔ افتخار نے ملاحوں کو کشتی کا رُخ پھیرنے کا اشارہ کیا۔ ایسے میں پتن پر چھپ جانے والے دونوں آدمی دکھائی دیے۔ پروفیسر نے پوچھا ''اے! کیا وہ لوگ بھی تمہارے ساتھ ہیں؟''
افتخار نے اُدھر دیکھا۔ وہ پروفیسر اور پتن پر کھڑے ہوؤں کے وسط میں کھڑا تھا۔ پہچان کر جنت کی طرف منہ کر کے بولا۔ ''وہ تو ڈاکٹر اشولال کھڑے ہیں، شاید آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔''
پروفیسر کے منہ سے دانتوں کی کڑکڑاہٹ کی آواز برآمد ہوئی۔ کرخت لہجے میں بولا۔ ''میں اُن سے مل لیتا ہوں، تم نکل جاؤ۔''
کشتی آگے بڑھنے کے بجائے پتن کی طرف کھسکنے لگی۔ افتخار بیگ آگے جانے کے بجائے اشولال کی طرف بڑھنے لگا۔ پروفیسر نے دانت کچکچائے اور اُسے دھمکیاں دیں مگر اُس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اشولال اور اُس کا ساتھی دونوں پانی کے بہاؤ کے رُخ پر جنوب کی طرف چلنے لگے۔
پروفیسر پستول ہاتھ میں پکڑے کچن میں آیا۔ مصباح چائے کے بھرے دو کپ ٹرے میں رکھے کچن کی عقبی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ وہ خاموشی سے رو رہی تھی۔ پروفیسر اُس کے قریب آیا۔ پستول کی نال اُس کے ماتھے پر دونوں اَبروؤں کے درمیان رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم اپنی زندگی مجھے دان کر چکی ہو۔ مجھے چھوڑ کر جاؤ گی تو خون میں نہلا دوں گا۔ تمہاری لاش کا کوئی بھی وارث بن جائے، مجھے دُکھ نہیں۔ تمہارے حرارت بھرے بدن پر کوئی اپنی ملکیت کو ظاہر کرنے والی نیم پلیٹ لگائے، یہ ممکن نہیں۔''
''مجھے ایک بار افتخار سے ملنے دیں، وہ مجھے تلاش کر رہے ہیں۔''
''تمہیں نہیں، تمہاری لاش کو......''
''ایسے ہی سہی، وہ میری لاش کو ہی تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ پلیز سر!'' وہ ملتجیانہ لہجے میں بولی۔
''تم مجھے چھوڑ جاؤ گی۔'' پروفیسر کی آنکھوں سے وحشت مترشح تھی۔
''میں کہیں نہیں جاؤں گی، مجھ پر اعتبار کیجیے۔'' اُس نے ٹرے رکھ کر ہاتھ جوڑ دیے ''خدا کے لیے مجھے ایک بار ملنے دیجیے۔ میں اُن کے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گی۔''
پروفیسر نے اُس کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو ایک جھٹکے سے علیحدہ کر دیا اور درشت لہجے میں کہا۔ ''میں پہلے دو مرتبہ اعتبار کا زہر اپنی روح میں اُتار چکا ہوں۔ اَب نہیں۔ میں فون پر تمہاری بات تمہارے گھر والوں سے کروا دوں گا۔''
وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو مجھ پر بھروسا کیوں نہیں ہے آخر؟ کہہ تو رہی ہوں کہ کہیں نہیں جاؤں گی۔''
اُس کے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ اُبھری۔ چائے کا ایک کپ اُٹھا کر ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولا ''چائے اُٹھاؤ، بیڈ روم میں چلو۔ باہر نکلنے کی کوشش کرو گی تو گولی تمہاری کھوپڑی میں اُتر جائے گی۔ چلو شاباش!''
وہ سہمی سہمی سی چائے اُٹھائے بیڈ روم میں چلی گئی۔ پروفیسر نے دروازہ لاک کر دیا۔ فون، پستول اور چائے اُٹھا کر عرشے پر آ گیا۔ فون کی اسکرین پر اجنبی نمبر دیکھا۔ اُس کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ یہ نمبر کس کا تھا کہ اُسی نمبر سے کال آ گئی۔ کال ریسیو کی۔ پوچھا ''کون؟''
''پیارا سئیں! میں اشولال فقیر بول رہا ہوں، تم سے ملنے کے لیے میں اور مزار خان صبح سے پتن پر کھڑے ہیں۔ بھلے آدمی! اتنا بھی کوئی انتظار کرواتا ہے کیا؟''
''مرشد! تم لوگ یہاں کیا کرنے آئے ہو؟'' پروفیسر کا لہجہ غیر متوقع طور پر درشت تھا۔

''تمہیں ملنے اور دیکھنے کے لیے آئے ہیں، اپنی بوٹ بھیج دو۔''
''نہیں مرشد!'' پروفیسر نے کٹیلے لہجے میں کہا۔ ''تم واپس چلے جاؤ۔ پھر آنا۔ بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ ناراض بھی نہ ہونا۔''
اشولال کی آواز خاموش ہو گئی۔ اُسے شاید پروفیسر کے اس رویے کی کبھی توقع نہیں رہی تھی۔ فون کے اسپیکر سے کئی آوازیں سنائی دے رہی تھیں مگر اُن کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد کال منقطع کر دی گئی۔ پروفیسر نے چائے کا گھونٹ حلق میں اُتارا اور کپ ٹیبل پر رکھ کر سگریٹ سلگانے لگا۔ کشتی پتن پر ٹھہری دکھائی دے رہی تھی۔ نہ جانے سب لوگ نیچے اُتر کر کیا باتیں کر رہے تھے۔ پروفیسر کو تشویش لاحق ہوئی۔ ڈاکٹر اشو کے فون پر کال بیک کی۔ رابطہ ہونے پر بولا۔ ''مرشد! ساگر فاؤنڈیشن والے یہاں کیوں ٹھہرے ہوئے ہیں؟''
اشولال کے لہجے میں ناراضی کا عنصر نمایاں تھا۔ ''تمہیں اس سے کیا سئیں! تم اپنی جنت میں خوش رہو، یہ اپنی جہنم میں جلتے ہوئے یہاں سے گزر جائیں گے۔''
''تم نے انہیں بتایا نہیں مرشد کہ سندھو سئیں کبھی اپنے تل سے چمٹے ہوؤں کو لوٹاتا نہیں ہے۔ یہ کیوں اپنا وقت برباد کر رہے ہیں۔'' اُس کے لہجے میں زہر ہی زہر بھرا ہوا تھا۔ ایسے ہی وقت میں بیڈ روم کی کھڑکی سے مصباح کی آواز سنائی دی۔ ''سر پلیز! مجھ پر اعتبار کریں۔ میں آپ کی ہوں، جہاں بھی گئی، پلٹ کر آپ کے پاس ہی آؤں گی۔ مجھے افتخار سے ملنے دیجیے۔ میں خدا کا واسطہ دیتی ہوں......''
اُس نے گھور کر کھڑکی میں دیکھا اور پستول لہرا کر اُسے خاموش کرا دیا۔ اشولال نے فون پر پوچھا۔ ''تمہاری جنت میں تمہارے علاوہ اور کون موجود ہے؟''
وہ حلق کے بل چیخا۔ ''جو کوئی بھی ہے، تمہیں اس سے کیا؟''
''میں نے مصباح کی آواز پہچان لی ہے سئیں!'' اشولال کے لہجے سے برہمی چھلک رہی تھی۔ ''تمہارے پاس کوئی اور نہیں، یقیناً مصباح ہی ہے۔ ہمیں جنت میں آنے دو ورنہ معاملہ بہت بگڑ جائے گا۔''
پروفیسر بولا۔ ''یہاں کوئی مصباح وصباح موجود نہیں ہے، معاملہ خراب کرنا چاہتے ہو تو جی بھر کر بگاڑ لو۔ مجھے کسی کا خوف نہیں ہے۔''
یہ کہہ کر اشولال کی بات سنے بغیر اُس نے کال منقطع

چھینک

میں الحمد للہ اور جدید سائنس

پروفیسر نصر اللہ خان صدر شعبۂ اسلامیات، اسلامیہ کالج لاہور فرماتے ہیں کہ انگریز ڈاکٹر نے جب یہ حدیث پڑھی کہ مسلمانوں کے پیغمبر حضرت محمد ﷺ نے فرمایا کہ جو مسلمان چھینکے وہ الحمد للہ کہے، جو مسلمان پاس بیٹھا ہو وہ یرحمک اللہ کہے اور پھر چھینکنے والا جواب میں یہدیکم اللہ کہے تو اس نے سوچا کہ ایک معمولی سے کام پر اتنی دعائیں پڑھنے کی وجہ کیا ہے؟
اس نے تحقیق کی اور پتا چلا کہ اتنی دعائیں پڑھنا فضول نہیں بلکہ اللہ کا شکر ہے، کیونکہ تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ دماغ کی رگوں میں ہوا رک جاتی ہے اور قدرت نے اس کو نکالنے کے لیے ایک پریشر کا انتظام کیا ہے اس طرح چھینک کر پریشر کے ذریعے ہوا ناک کے راستے خارج ہوتی ہے۔
اگر یہ ہوا رکی رہے تو فالج کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اس لیے چھینکنے والا .... الحمد للہ پڑھ کر اللہ رب العزت کی اس نعمت کا شکر ادا کرتا ہے۔ تمام دن کی مصروفیات زندگی میں انسان مختلف امور سرانجام دیتا ہے بعض حضرات کا پیشہ ایسا ہے کہ انہیں گرد وغبار میں کام کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح یہ گرد وغبار ناک تک پہنچتا ہے قدرت نے ناک کے بالوں کو انہی ذرات اور گرد وغبار.... میں موجود جراثیموں کے روکنے کا اہم کام عطا فرمایا ہے۔ چھینکنے سے یہ غبار اور جراثیم باہر نکل جاتے ہیں حتیٰ کہ چھینک کی ہوا اتنی زوردار ہوتی ہے کہ کسی جراثیم، گرد وغبار کو وہاں رکنے کی مہلت نہیں ملتی اگر یہی جراثیم گرد وغبار اندر چلے جاتے تو بے شمار امراض کا باعث بنتے۔
اللہ پاک نے چھینک کے نظام کو ان تمام امراض کے دفعیہ کے لیے تریاق بنا دیا ہے۔
ماہا ایمان، حافظ آباد

کرنے والا بٹن پش کر دیا اور کپ میں موجود تمام چائے ایک ہی گھونٹ میں پی گیا۔ بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے بڑبڑاتا جاتا تھا۔ ''سب ایک سے ہیں، سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ کوئی بھی میری پل بھر کی خوشی کو برداشت نہیں کر پاتا۔ ہاہ! دُنیا کی روندی مسلی ہوئی ایک لڑکی نے اگر میری جھولی میں محبت کی خیرات ڈالنے کی جرأت کر ہی لی ہے تو سب اُلو کے پٹھے اُسے مجھ سے چھیننے کے لیے پہنچ گئے ہیں۔''

بیڈ روم میں داخل ہوا۔ کھڑکی کے اَدھ کھلے طاق سے ماتھا ٹکائے ہچکیاں لے کر روتی ہوئی مصباح کو دیکھا۔ قریب آ کر بولا۔ ''میری جان! تم سر کے بال سے لے کر پیروں کے ناخن تک میری ہو۔ میری جنت کی حور ہو۔ جیو گی تو میرے ساتھ، مرو گی تو میرے ساتھ۔ میں تمہاری جدائی ایک پل کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ کم آن مصباح!''

وہ وہیں بیٹھی رہی۔ پروفیسر کی تشنہ بانہیں اُس کی طرف لپکیں۔ اُسے اٹھا کر ایڑیوں کے بَل گھومنے لگا۔ وہ بالکل مزاحمت نہیں کر رہی تھی۔ اُسے پیروں پر کھڑا کیا تو وہ قدموں میں گر گئی۔ پیروں کو تھام کر گھگیانے لگی۔ اپنے پیاروں سے ملنے کی اجازت طلب کرنے لگی۔ وہ بولا۔ ''مصباح! تم اُن لوگوں کے کام کی نہیں رہی ہو، اُنہیں بھول جاؤ۔ اِسی میں بہتری ہے۔ وہ تمہیں مُردہ سمجھ کر رو پیٹ لیں گے۔ مجھے رُلانے کی کوشش نہ کرو۔''

وہ اچانک اُٹھ کر حلق کے بَل چیخنے لگی۔ ''میرے دو بھائی ہیں۔ مجھ پر جان دیتے ہیں۔ عمران کبھی مجھے مُردہ تسلیم نہیں کرے گا۔ اُسے جب تک میں نہیں ملوں گی، وہ چین سے نہیں بیٹھے گا۔ جب میں نے ایک بار کہہ دیا ہے کہ میں آپ کے پاس لوٹ آؤں گی تو پھر کیوں مجھے بے اعتبار سمجھ کر قید میں کیے بیٹھے ہیں؟ چھوڑ دو مجھے۔ جانے دو۔ محبت قید کا نام نہیں ہے۔''

اُس کے آنسو تھم چکے تھے۔ آنکھوں میں وحشت اُتر آئی تھی۔ پروفیسر کو اس سمے وہ بھوکی بلی لگی۔ ایک قدم پیچھے ہٹا۔ دائیں ہاتھ کا زوردار طمانچہ اُس کے منہ پر جڑ دیا۔ پھر دوسرا، پھر کئی۔ وہ قالین پر ڈھیر ہو گئی۔ پھٹی پھٹی آواز میں کراہنے لگی۔ ''مجھے مار ڈالو۔ مجھے قتل کر دو۔ دریا میں پھینک دو۔ مجھے یہ زندگی نہیں چاہیے۔ مجھے یہ خیرات نہیں چاہیے۔''

پروفیسر نے اسے بانہوں میں بھر کر اُٹھایا اور بیڈ پر لٹا دیا۔ خود اُس کے متوازی لیٹ کر اس کے گال سہلانے لگا۔ اُس کی اپنی آنکھوں میں بھی نمی تیر رہی تھی۔ گلوگیر لہجے میں بولا۔ ''تم بھی مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہی ہو۔ میں بُرا نہیں ہوں۔ میں نفسیاتی مریض نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے تمہارے پچھلوں سے کوئی دشمنی ہے۔ میں نے کہا ناں کہ تمہیں تمہارے والدین سے ضرور ملواؤں گا۔ تمہارے بھائیوں کو یہاں بلوا کر پُراہتمام ضیافت کروں گا۔ اِس وقت ضد نہ کرو۔ اُنہیں جانے دو، پھر بیٹھ کر بہت سی باتیں کریں گے۔ تم جیسے کہو گی، ویسے کروں گا۔ پلیز! مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔''

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے پروفیسر کو دیکھ رہی تھی جو ایک پل میں تولہ بن کر ٹوٹ پڑا تھا، دوسرے پل میں ماشہ بن کر زمین سے چپک گیا تھا۔ وہ اُس کے عضو عضو کو سراہ رہا تھا۔ اپنے تشدد کی معافی مانگ رہا تھا اور وہ بے جان وجود لیے خاموش لیٹی تھی۔ اُس کے پاس ایسا کچھ بھی نہیں تھا جسے بچانا ضروری خیال کرتی۔ اُس کی ہیجانی شخصیت سے خوفزدہ ہونے کے باوجود اُس پر اعتماد کرتی تھی۔ وہ قاتل ہو سکتا تھا، درندہ نہیں۔

❁ ❁ ❁

سورج نے تپش اُتارنی شروع کر دی۔ ڈاکٹر اُشولال سرکنڈوں سے نکل کر افتخار کے پاس پہنچا، بولا۔ ''تم دوسری کشتی میں سوار اپنے ساتھیوں سے موبائل فون پر رابطہ کرو۔ اُنہیں کہو کہ وہ لمبا چکر کاٹ کر یہاں پہنچ جائیں۔ جس حد تک ممکن ہو، جنت سے دور رہیں۔''

عمران اُس کے قریب ہو کر اُمید بھرے لہجے میں سوال کناں ہوا ''ڈاکٹر صاحب! کیا آپ کو یقین ہے کہ مصباح اِسی کشتی میں موجود ہے؟''

''بیٹا! مجھے یقین کی حد تک شبہ ہے کہ وہ پروفیسر کے پاس ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے جس کی آواز سُنی ہے، وہ کوئی اور نہیں، مصباح ہی ہے۔''

''دکھائی تو نہیں دی۔'' افتخار نے کہا۔

''میں نے دیکھی ہے۔ ہیولے کی شکل میں۔ وہ وہیں ہے۔''

افتخار نے آگے بڑھ کر ہاتھ تھام لیا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ عمران کی غصہ بھری آواز کانوں میں پڑی۔ تھم گیا، پلٹ کر عمران کو دیکھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ مشتعل ہو کر بولا۔ ''تم سب بزدل ہو۔ کھڑے کھڑے باتیں کرنے کے سوا کچھ کرنے کے قابل نہیں ہو۔ چلو مظہر! ہم دونوں پروفیسر کی کشتی میں جاتے ہیں، اگر مصباح ہوئی تو لے آئیں گے ورنہ آگے بڑھ جائیں گے۔''

مُہانوں نے کشتی کھینے سے انکار کر دیا۔ اُنہیں علم تھا کہ پروفیسر کے پاس جدید طرز کا اسلحہ کافی تعداد میں موجود تھا جبکہ وہ نہتے تھے۔

عمران اور مظہر دونوں نے چپو تھام لیے۔ اُنہیں کشتی کھینے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اُنہیں پانی کا سینہ چیرنے کا کوئی گُر نہیں آتا تھا مگر اندر لگی ہوئی آگ اُنہیں پانی پر جنت کی طرف بڑھانے لگی۔ اُن کی رفتار بے حد سست تھی۔

مزار خان نے اُشولال سے کہا۔ ''دونوں موت کے منہ میں گھس رہے ہیں، اِنہیں روکیے۔''

''سئیں! غیرت کا معاملہ ہے۔ میں اِسے کیسے روک سکتا ہوں۔'' اُشولال کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی تھی۔

مزار خان کی نظریں کشتی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے بے ساختہ ڈاکٹر کا ہاتھ دَبایا۔ ''مرشد! معاملہ بگڑ رہا ہے۔''

ڈاکٹر نے چونک کر مزار خان کی طرف دیکھا جو عمران اور مظہر عباس کی طرف متوجہ تھا۔ ڈاکٹر نے اُس کی تقلید کی۔ دیکھا اور بے اختیار چیخ اُٹھا۔ ''عمران! رُک جاؤ، آگے مت جاؤ۔ وہ پاگل ہے، کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

اُس کی چیخ عمران اور مظہر کے کانوں تک پہنچی، لفظ نہیں پہنچے۔ ڈاکٹر اور مزار خان نے ہاتھ لہرا لہرا کر اُنہیں واپس آنے کا اشارہ کیا مگر وہ نہیں رُکے اور آگے بڑھتے چلے گئے۔

دوسری کشتی بھی پلٹ کر اِسی طرف آ رہی تھی۔ مزار خان کے چہرے پر تشویش کے آثار دیکھ کر ڈاکٹر نے استفسار کیا۔ وہ بولا۔ ''مرشد! دونوں کشتیوں کی حرکت دیکھ کر پروفیسر سمجھے گا کہ اُس پر حملہ کیا جا رہا ہے، وہ فائرنگ کر دے گا۔ نقصان ہو جائے گا۔''

ڈاکٹر نے ساگر فاؤنڈیشن کے ایک کارکن سے کہا۔ ''دوسری کشتی والوں سے رابطہ کر کے اُنہیں دُور رہنے کی تاکید کرو۔''

اُس نے منہ بنا کر رُخ پھیر لیا۔ ڈاکٹر نے پیر پٹخے اور دوسرے کارکن سے درخواست کی، وہ بولا۔ ''پلیز ہمیں ڈسٹرب نہ کریں۔ ہمیں آپ کی بے مقصد حرکتوں کی سمجھ نہیں آ رہی۔''

مزار خان نے ڈاکٹر کے ہاتھ سے موبائل پکڑا، کال چل رہی تھی، رابطہ منقطع کر کے پروفیسر کا نمبر ملانے لگا۔ پروفیسر نے کال اٹینڈ نہیں کی۔ اُس نے جھنجلا کر فون ڈاکٹر کو تھما دیا اور زیرِ لب بڑبڑایا۔ ''اللہ سوہنا خیر کرے پر خیریت کی اُمید معدوم ہوتی جاتی ہے۔''

ڈاکٹر کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ ہونٹوں کی رنگت بدلنے لگی تھی، بولا۔ ''مزار خان! سگریٹ سلگا کر دو۔ کام بگڑ رہا ہے۔''

واقعتاً کام بگڑ گیا۔ اچانک پروفیسر نے عرشے پر آ کر عمران اور مظہر پر برسٹ مارا۔ تڑتڑاہٹ کی تیز دہشت ناک آواز نے ماحول کو خوفناک بنا دیا۔ مظہر اور عمران لہرا کر کشتی میں گرے اور کشتی نے اچانک اپنی سمت بدل لی۔ وہ پانی کے بہاؤ کے رُخ پر تیزی سے جنت سے دور ہونے لگی۔

پروفیسر نے گن کا رُخ دوسری کشتی کی طرف کر دیا۔ اب کے اُس نے برسٹ نہیں مارا تھا بلکہ یکے بعد دیگرے چند گولیاں داغیں۔ اُشولال گھٹنوں کے بَل زمین پر گر گیا۔ مزار خان نے سہارا دے کر کھڑا کیا اور لرزتی ہوئی آواز میں کارکنوں کو عمران یا مظہر سے رابطہ کرنے کا حکم دیا۔

چند لمحوں میں ہی پتا چل گیا کہ دونوں بال بال بچے تھے۔ دوسری کشتی والے جنت کی طرف پیش قدمی کو ترک کر کے عمران کی کشتی کی طرف تیزی سے بڑھنے لگے۔

ڈاکٹر یک لخت بے چین ہو گیا۔ دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔ کبھی کسی کارکن کے پاس پہنچ کر چیختا۔ ''اپنی کشتیاں دور ہٹا لو۔ پروفیسر پاگل ہے۔ وہ جنت کو آگ لگا دے گا۔''

کبھی دوسرے کے پاس جاتا۔ ''وہ پاگل ہے، غصے میں ہے، اُسے روکو، وہ سب کچھ تباہ کر دے گا۔''

اچانک پروفیسر نے عرشے پر کھڑے ہو کر پتن کی طرف چند فائر داغے۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اُس نے دہشت زدہ کرنے کے لیے فائرنگ کی ہے، کسی کا نشانہ نہیں لیا تھا۔ کبھی اِدھر اُدھر لڑھک گئے۔

اُشولال پھٹی پھٹی نگاہوں سے جنت کو دیکھ رہا تھا۔ وہ پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔

ایسے میں نیا منظر طلوع ہوا۔ پروفیسر نے گن دریا میں پھینک دی۔ بھاگ کر کسی کمرے میں گھس گیا۔ واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں تیل کا کین دَبا ہوا تھا۔ ڈھکن کھول کر دوڑتے ہوئے جنت کے مختلف حصوں پر تیل چھڑکنے لگا۔ اُس نے چند ہی لمحوں میں کین خالی کر کے دریا میں پھینک دیا اور عرشے پر اُن کی جانب منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔

مزار خان کے ہاتھ میں دَبے ہوئے موبائل فون پر پروفیسر کی کال آنے لگی۔ اُس نے جلدی سے کال ریسیو کی، حلق کے بَل چیخا ''پروفیسر! یہ کیا کر رہے ہو؟''

اُشولال نے بڑی سرعت سے فون پر جھپٹا مارا۔ اپنے کان سے لگاتے ہوئے بولا۔ ''پروفیسر! خدا کے لیے خود کو

If you want to download Urdu novels,Imran series, Monthly Digests,Shuaa,Kiran,Khwateen Digest,Suspense digest, Vist
www.paksociety.com
if site is not opening send complaint at
admin@paksociety.com
or at
0336-5557121

سنبھالو۔ تم بہت بُرا کرنے چلے ہو۔"

"ہا...... ہاہاہا...... تم نے جہنم کی آگ دیکھی ہے، آج جنت کی آگ بھی دیکھ لو۔ دُنیا کو بتانا کہ تمہاری آنکھیں دُنیا سے الگ ہیں جنہوں نے جنت کو بھی جلتے ہوئے دیکھا ہے۔" پروفیسر نے ہیجانی انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

اَشولال کا سانس سینے میں ہی اَٹکنے لگا۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "تم اپنی جنت کو کیوں آگ دکھانا چاہتے ہو، یہ کوئی معمولی پراجیکٹ نہیں تھا، تمہارا خواب تھا جسے دیکھنے کے لیے پوری دُنیا بے تاب ہے۔ خدا کے لیے اِسے آگ مت لگاؤ۔"

"تم میری فکر نہ کرو مُرشد!" پروفیسر کی آواز آگ کا گولا بن کر اُس کے کانوں میں اُتر گئی۔ "مجھے دُنیا کی کوئی پروا نہیں۔ تم سب لوگ مجھ سے مصباح کو چھیننے کے لیے آئے ہو، میں جانتا ہوں۔ تم بھی جان لو کہ کوئی مجھ سے میری مریم کو چھین نہیں سکتا، رُباب جنت سے نکل کر نہیں جاسکتی، تم یہاں قدم نہیں رکھ سکتے۔ یہ مصباح ہے، میری جنت کی حور، سموں نہیں ہے جسے میں نے تمہارے حوالے کردیا تھا۔"

"ٹھیک ہے، تم مصباح کو اپنے پاس رکھو، ہم چلے جاتے ہیں۔" ڈاکٹر نے جلدی سے کہا۔

"اَب کچھ بھی نہیں ہوسکتا مُرشد! تم لوگوں نے میری حور کے دِل میں بغاوت بھر دی ہے، تمہارے جانے کے بعد وہ بھی چلی جائے گی۔ میں یہ نہیں چاہتا۔ اُسے ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گا...... اس کے لیے ایک ہی طریقہ باقی بچا ہے۔ وہ ہے لائٹر کا ننھا سا شعلہ۔"

"خدا کے لیے پروفیسر! بس کرو۔ اپنی جنت کو جہنم مت بناؤ۔"

"تم میری فکر نہ کرو، اپنی فکر کرو۔"

ایسے ہی وقت میں "ٹوں ٹوں" کی آواز نے ڈاکٹر کو بے چین کردیا۔ اس نے پروفیسر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ ناکام ہوا۔ حلق کے بل چیخ کر اسے باز رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک آنکھیں سامنے کا منظر دیکھ کر ٹھہر سی گئیں۔ پروفیسر نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا، لہرا کر الوداعی سلام کیا اور لائٹر کا بٹن دَبا دیا۔ ننھا سا شعلہ دور سے دکھائی نہیں دیا تھا، بھانبڑ دکھائی دینے لگا۔ آن کی آن میں پوری جنت سرخ شعلوں کی لپیٹ میں آگئی۔ اَشولال اور مزار خان کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ یوں لگا جیسے بھونچال آگیا ہو۔ شعلوں کے بیچ میں دو انسان دکھائی دیے۔ دونوں بغلگیر تھے۔ پروفیسر اُس کے چہرے پر جھکا ہوا دکھائی دیا۔

جونہی پروفیسر نے اُسے سینے سے لگائے رکھتے ہوئے گول چکر کاٹا، اَشو اور مزار خان کو اُس کے ساتھی کی کمر پر لہراتے سیاہ بال دکھائی دیے۔ دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا "ہائے مصباح!"

شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ پروفیسر اُسے بانہوں میں بھرے آگ کے بیچ میں ایڑیوں کے بل گھوم رہا تھا۔ اچانک "کڑاک" کی زوردار آواز کے ساتھ زنجیر ٹوٹ گئی اور 'جنت' کا اپنے ستون سے رابطہ ٹوٹ گیا۔ وہ لہرائی اور تیز رفتاری سے جنوب کی سمت میں بہنے لگی۔ تڑتڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ بجلی کے سرکٹ شارٹ ہونے لگے تھے۔

اچانک پروفیسر نے مصباح کو کندھے پر ڈالا اور دوڑتے ہوئے آگ میں گھس گیا۔ اُس نے پوری قوت سے مصباح کو دریا میں اُچھال دیا تھا۔ اَشولال کے حلق سے بے ساختہ چیخ نکلی۔ "مزار خان! عمران کو کہو، فوراً مصباح تک پہنچے ورنہ وہ ڈوب جائے گی۔"

مزار خان کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ رابطہ نہیں کر پایا مگر بھائی کو سمجھانا نہیں پڑتا، بہن کو دیکھ کر سمجھ جاتا ہے کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ عمران اور مظہر نے مصباح تک پہنچنے کے لیے اپنی زندگی بھر کی توانائی صرف کردی۔

پروفیسر کے کپڑوں نے آگ پکڑ لی تھی۔ چند ہی لمحوں میں وہ جل کر خاکستر ہوگیا، نظر کی حد میں رہتے ہوئے جنت کوئلہ بن کر پانی میں ڈوب گئی۔ ساگر خاموش ہوگیا، آسمان بین کرتا رہا۔ سیاہ دھوئیں کے مرغولے تاحدِ نگاہ دکھائی دیتے رہے اور چی لکڑی کے جلنے کی خوشبو کافی دیر تک فضا میں رَچی رہی۔

پانی میں آگ لگی کس نے دیکھی ہے؟

اَشولال نے دیکھی تھی۔ آگ کے بجھنے سے پہلے ہی وہ بجھ گیا۔ نڈھال ہوکر زمین پر گر گیا۔ مزار خان کے سنبھالنے سے پہلے ہی بے ہوش ہوگیا۔ ساگر فاؤنڈیشن کا ایک کارکن بھاگ کر گلاس میں سندھو سئیں کا پانی بھر لایا اور ڈاکٹر اَشولال کے حلق میں ٹپکانے لگا۔ ایسے میں مزار خان اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں پر بایاں ہاتھ رکھ کر سسکنے لگا۔ اُس کا لرزتا ہوا دایاں ہاتھ مُرشد کے ہونٹوں کے گوشوں سے بہتا ہوا میلا پانی صاف کرنے لگا۔ ڈاکٹر اشولال زیرِ لب کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ مزار خان نے کان لگائے، سنا، وہ کہہ رہا تھا۔ "ہائے سندھو سئیں! پروفیسر ٹھیک کہتا تھا۔ تم بہت ظالم ہوگئے ہو۔ تمہیں کسی پر رحم نہیں آتا۔"